رنگارنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ

ماہنامہ

نئے افق

کراچی

aanchalpk.com aanchalnovel.com

ماہنامہ نئے افق کراچی

مدیراعلیٰ
مشتاق احمد قریشی

مدیر
عمران احمد

مدیر معاون
اقبال بھٹی

مدیر مسئول
طاہر احمد قریشی

منتظمہ
نورالدین

جلد	40
شمارہ	05
اپریل	2016

رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز
رُکن چیمبر آف کامرس

NAEY UFAQ
PUBLICATION

پاکستان (فی پرچہ)............50 روپے
پاکستان (سالانہ)............500 روپے

اشتہارات اور دیگر معلومات
0300-8264242

aanchalpk.com
aanchalnovel.com
naeyufaqonlinemagzine
aanchal.com.pk/blog
onlinemagazinepk.com/recipes
editorufaq@aanchal.com.pk

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

دستک — مشتاق احمد قریشی — 10
گفتگو — عمران احمد — 12
اقرا — طاہر قریشی — 36
ملاقات — نادیہ احمد، سحرش فاطمہ — 38
دہری موت — ڈاکٹر ایم اے قریشی — 44
ڈاکو راج — شبیر سومرو — 70
رشتے — تفسیر عباس بابر — 82
روشنی — قیصر عباس — 90
عورت زاد — امجد جاوید — 98
احساس — سید وجاہت علی — 138
دیوار — کشاف اقبال — 146

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

تلاش — حسیب جواد علی — 164
کرن — انجم فاروق ساحلی — 170
پل صراط — ریاض حسین شاہد — 180
طرفہ تماشہ — مہتاب خان — 206
عزت — خلیل جبار — 214
بے وفا — حسن اختر — 224
اپنے دام میں — شاہدہ صدیقی — 231
فن پارے — ادارہ — 237
ذوق آگہی — سباس گل — 270
خوش بوئے سخن — نوشین اقبال نوشی — 274
قلعۃ الحرمین — زریں قمر — 278

خط و کتابت کا پتہ: ”نئے افق“ پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200، فون: 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 یکے از مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز۔ ای میل editorufaq@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

بھارت کے جھنڈے کے تین رنگ ہیں اس کے قومی نشان تری مورتی کے تین رخ ہیں۔ ایسے ہی اس کی سیاست، اخلاقیات، مذہب اور تجارت کے بھی کئی رخ ہیں اگر یوں کہا جائے کہ ہولی کے رنگوں کی طرح بہت سے رنگ ہیں جیسے ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں ایسے ہی ان کی سیاست، تجارت، اخلاقیات اور مذہب کے بھی الگ الگ رنگ ہیں سیاست دان تو سیاست دان ان کے تاجر بھی رنگ بدلنے کے بڑے ماہر ہیں۔ بھارت میں جہاں گائے کا گوشت ہندو دھرم کے لیے حرام اور پیشاب حلال ہے آخر ایسا کیوں ہے ہندو گائے کو ماتا یعنی ماں مانتے ہیں وہ ایک مقدس ترین ہستی کے طور پر مانی جاتی ہے لیکن گائے کے گوشت کو دنیا بھر میں فروخت کرنے میں بھارت سب سے آگے ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آخر بھارت جہاں گائے کو ماتا کہہ کر ماں کے درجے پر فائز کر دیا گیا ہے اور تو اور ہندو مذہب یا دھرم میں اس کو اس قدر مقدس اور محترم تصور کیا جاتا ہے کہ عام ہندو کو بڑی سوچی سمجھی سازش کے تحت گائے کے احترام اور اس کی پوجا پاٹ کا حصہ بنا دیا گیا ہے اور مسلمانوں کو گائے سے دور رکھنے کے لیے انتہا پسند ہندوؤں کا انتہائی رویہ ہے کہ ان کو اس کام پر ہندو مذہبی رہنماؤں کے ذریعے گائے کا ذبیحہ روکنے کا انتظام کیا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان گائے کاٹ لے یا اس کا گوشت ہی استعمال کرنے کے لیے خریدے تو وہ موت کا حقدار ٹھہرتا ہے آخر ایسا کیوں ہے۔ ایسے کئی سوالات ہیں جن کے جواب ہمارے سامنے ہیں لیکن زبان کھولتے ہوئے لکھنے والوں اور بولنے والوں کو ڈر لگتا ہے دراصل ہندوؤں میں گائے کا تقدس واحترام کو جس قدر ہوا دی گئی اس کا ان کی ویدوں یعنی مذہبی کتب میں بھی اس قدر ذکر نہیں ہے جس قدر گائے کا احترام اور عزت کی جاتی ہے ایسا صرف اور صرف اس لیے ہے کہ ہندو گائے کی پرورش کریں اس کے گوشت کے قریب بھی نہ جائیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کا معاملہ ہے ان کے مذہب میں گائے نا صرف حلال جانور ہے بلکہ اس کی قربانی بھی جائز اور حلال ہے اگر ہندو مسلمانوں کو گائے کے ذبیحہ کی اجازت دے دیں تو ہر سال لاکھوں گائے ذبح کر دی جائیں۔ گائے کے گوشت کے ہندو تاجروں کو گائے کی افزائش کے لیے اہتمام وانتظام کرنا پڑے گا اب تو بغیر کسی خاص انتظام کے لاکھوں گائے انہیں کوڑیوں کے مول مل جاتی ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے ہاں انہیں ہندو مذہبی پجاریوں اور رہنماؤں کو زبان بند رکھنے کے لیے معقول ماہانہ رقوم ادا کرنا پڑتی ہیں جسے ہم اپنی ملکی زبان میں بھتہ کہتے ہیں۔ دنیا بھر میں گائے کا گوشت بھارت ایکسپورٹ کرتا ہے دنیا میں گائے کا گوشت ایکسپورٹ کرنے والی بڑی کمپنیوں کے مالک ہندو ہیں ان کی جدید ترین فیکٹریوں میں کام کرنے والے تمام کارکن ہندو ہیں ہندوستان کی سب سے بڑی کمپنی النور ایکسپورٹ کے مالک ہندو ہیں جو گائے کا گوشت تیار کر کے نا صرف سعودی عرب بلکہ متحدہ عرب امارات، ایران، افغانستان جیسے مسلم ممالک میں بیچتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ الکبیر ایکسپورٹر کے مالک سدھیش اگروال اتل اگروال ہندو ہیں انہوں نے اپنی کمپنیوں کے مسلم نام صرف اور صرف مسلمان ممالک کے درآمد کنندگان کو دھوکہ دینے کے لیے رکھے ہوئے ہیں تاکہ نا صرف درآمد کنندگان بلکہ ان کے گاہک بھی یہی سمجھیں کہ انڈیا سے مسلمان کمپنیوں نے ہی بھیجا ہے تو یقیناً یہ حلال ہی ہوگا اس کے بارے میں کوئی تصدیق نہیں کہ وہ تمام برآمد کردہ گائے کا گوشت واقعی حلال بھی ہوتا ہے یا نہیں کیونکہ ان تمام ہی کمپنیوں میں تمام کام ہندو کارکن مشینوں کے ذریعہ انجام دیتے ہیں دھوکے باز لوگ متحدہ عرب امارت میں طیبتہ ال امارات اور تبرک کے نام سے گوشت فروخت کر رہے ہیں مسلمانوں کو یہ تاثر دینے یا دھوکہ دینے کی مذموم کوشش ہے مسلم نام کے پس پردہ درحقیقت ہندو بنیے کارفرما ہیں جو دونوں ہاتھوں سے مسلمانوں کی دولت اور ایمان دونوں ہی سمیٹ رہے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ بھارت کی تمام انتہا پسند یا اعتدال پسند ہندو جماعتوں کو سب پتا ہے کہ بھارت گائے کے گوشت کا دنیا بھر میں سب سے بڑا ایکسپورٹر ہے وہاں کوئی ہندو نہ انتہا پسند اعتدال پسند گرم سانس تک نہیں لیتا اور اگر کوئی مسلمان گائے کا گوشت کہیں سے حاصل کر لے تو اس کی بلی چڑھا دی جاتی ہے تاکہ مسلمان خوفزدہ ہو کر گائے کے قریب بھی نہ جائیں اور ہر سال اپنی عیدالضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی کا سوچیں بھی نہیں کیونکہ اگر مسلمان ہر سال گائے کی قربانی کرنے لگیں تو پھر عام دنوں میں بھی ہر سال لاکھوں گائے مسلمانوں کا لقمہ بن جایا کریں گی اور ہندو تاجر جو گائے کے گوشت کی تجارت کر رہا ہے اس کے منافع میں کٹوتی لگ جائے گی حالانکہ وہ بے وقوف ہر سال کروڑوں روپے ہندو پنڈتوں اور ہندو مذہبی اور سیاسی تنظیموں کو بطور بھتہ ادا کرتے ہیں کیونکہ وہ رقم ان کے اپنے مذہب کے لوگوں کو جاتی ہے ان کی پیٹ پوجا کا سامان ہوتا ہے اس لیے وہ ان کے خیال میں کہیں بہتر ہے کہ ان کی طرف سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچے۔ ان کی تاجرانہ ذہنیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب یہ کمپنی جاپان کو گائے کا گوشت بھیجتی ہے تو اس کا نام سمورائی ہو جاتا ہے اور برطانیہ کو گائے کا گوشت بھیجتی ہے تو اسی کمپنی کا نام فالکن فوڈ ہو جاتا ہے۔ آسٹریلیا کے محکمہ زراعت نے جو اعداد و شمار جاری کیے ہیں اس کے مطابق گزشتہ برس بھارت نے چوبیس لاکھ ٹن گائے کا گوشت مختلف ممالک کو بھیجا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اگر ہندو ہر روز لاکھوں گائے ذبح کر کے ہر سال چار ارب تیس کروڑ ڈالر کماتے ہیں ایسے منافع بخش کاروبار سے بھارت کثیر زرمبادلہ کماتا ہے بھارتی تاجروں کیساتھ گائے کے مقدس خون کی بہتی ندی میں سب ہی ہاتھ دھو لیتے ہیں اس لیے سب کی زبان پر تالے پڑ جاتے ہیں اور اگر مسلمان صرف گائے کے گوشت کو چھو لے تو مجرم ٹھہرتا ہے بھارت کی یہ دوغلی پالیسی صرف تجارت یا گائے کے گوشت کے بارے میں ہی نہیں ہے بلکہ ہر معاملے میں ہے چاہے وہ سیاسی ہو تجارتی ہو اخلاقی ہو یا مذہبی وہ ہر رنگ میں اپنی ہولی کے رنگوں میں رنگے نظر آتے ہیں دنیا حیران ہے کہ بھارت کی اکثریتی آبادی یعنی ہندو جو گائے کو اس قدر متبرک ومقدس مانتے ہیں کہ ان کا پیشاب اور گوبر تک متبرک تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے پینا بھی مذہبی رسوم کا حصہ مانتے ہیں وہ اپنی اتنی متبرک اور مقدس مذہبی ہستی کو بے دریغ اپنی تجارت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں کیونکہ بھارت دنیا میں گائے کے گوشت ایکسپورٹ کرنے والے ممالک میں نمبر ایک پر ہے جبکہ برازیل دوسرے اور آسٹریلیا تیسرے نمبر پر آتے ہیں دنیا حیران ہے کہ بھارتی تاجر اپنی ماں جیسی مقدس گائے کو بھی نہیں بخشتے تو ان سے کیسی خیر کی توقع کی جا سکتی ہے۔

گفتگو

عمران احمد

> ”حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ نیکی اور گناہ کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے اور تم اس بات کو برا سمجھو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔“ (مسلم)

عزیزان محترم ...... سلامت باشد۔

اپریل کا شمارہ حاضر مطالعہ ہے۔

گزشتہ ماہ ہم نے محترم کاشف زبیر کے لیے دعائے صحت کی اپیل کی تھی جونہی پرچہ چھپ کر بائنڈنگ کے مراحل میں داخل ہوا معروف مصنف کاشف زبیر جو اسپتال سے گھر شفٹ ہوگئے تھے اچانک ان کی رحلت کی خبر آ گئی، انا للہ وانا علیہ راجعون اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل دے ہماری تمام قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی مصروفیات میں سے چند لمحے نکال کر مرحوم کاشف زبیر کی مغفرت کے لیے دعا ضرور کریں۔

اس ماہ نئے افق میں ہم سب کے پسندیدہ کہانی کار امجد جاوید کی تحریر کردہ سلسلے وار کہانی عورت زاد اور مایہ ناز ادیب ریاض حسین شاہد کی پل صراط شامل اشاعت ہے۔ قارئین کو دونوں کہانیوں کا ذائقہ مختلف محسوس ہوگا۔ امید ہے آپ تمام قارئین کو یہ دونوں سلسلے بہت پسند آئیں گے۔

اب آیئے اپنے خطوط کی طرف

⟨اس ماہ کا انعام یافتہ خط⟩

ایم اے راحیل ...... بورے والا۔ محترم جناب عمران احمد، طاہر احمد قریشی، مشتاق احمد قریشی، اقبال بھٹی صاحب، تمام ریڈرز، لکھاریوں اور تمام اسٹاف کو نہایت عقیدت سے السلام علیکم! اُمید ہے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے خوش و خرم زندگی گزار رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خوشیوں کے ساتھ سلامت رکھے۔ شر پسند عناصر کے شر سے اپنی حفظ و امان میں رکھے اور صحت و تندرستی کی نعمت ہمیشہ رہے۔ آمین ثم آمین! جہاں رہیں خوشیاں تقسیم کریں کیونکہ یہی زندگی ہے۔ دُنیا اور آخرت میں کامیابی اِسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں سے نوازے اور اپنے قہر سے محفوظ فرمائے آمین۔ میرا نام ایم اے راحیل ہے۔ قارئین نئے اُفق کے لئے نیا ضرور ہوں مگر خاموش قاری کئی سالوں سے ہوں۔ جب بھی وقت ملتا ہے نئے اُفق کا مطالعہ کرتا ہوں۔ نئے اُفق سے خاصا لگاؤ بھی ہے۔ آج کاغذ قلم سنبھالنے کی وجہ ہے۔ جو میں آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ ماشاءاللہ! آپ مذہبی بندے ہیں اور نئے اُفق بہت سالوں سے لاکھوں قارئین کے بند دریچوں کو کھولنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ لیکن پچھلے چند مہینوں سے اِس میں بدمزگی سی ہو رہی ہے۔ ماہ مارچ 2016 کا پرچہ میرے ہاتھوں میں ہے اور تقریباً پورے کا پورا پڑھ چکا ہوں۔ چند ایک تحریروں پر اپنی رائے دینا چاہتا ہوں کیونکہ یہ قاری کا حق ہوتا ہے۔ سب سے پہلے سرورق کی بات کرتے ہیں۔ ماشاءاللہ! بہت خوبصورت ہے۔ نظریں ٹک سی جاتی ہیں۔ حیرت میں مبتلا لڑکی گم صم کسی کو نظروں سے ڈھونڈ رہی ہے یا پھر کسی کے بچھڑنے کے دُکھ میں مری جا رہی ہے۔ سوکھے درخت کی پتلی سی شاخ پر بیٹھی شاہین اپنے بچوں کی حفاظت پر مامور ہے اور اُس کا نر محو پرواز کسی محافظ کی طرح نگرانی کر رہا ہے۔ بہت خوب۔ زبردست سرورق دیا گیا ہے۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی صاحب سندھ کی سیاست کا ذکر فرما رہے ہیں اور عزیز بلوچ کو لے موجودہ حکومت اور مفاد پرست ٹولے کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں اور خود کو متحدہ قومی موومنٹ کے حامی ظاہر کر رہے ہیں۔ میں تو کہوں گا صحافی اور ادیب کو کسی سیاسی پارٹی کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ سیاسی پیچیدگیاں کبھی ختم نہیں ہونگی۔ (محترم! مشتاق احمد قریشی کا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں) گفتگو میں عمران احمد صاحب کا بڑا اچھا فیصلہ ہے کہ تنقید لکھاری کی شخصیت پر نہیں تحریر پر ہونا چاہیے۔ مجید احمد جائی نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا ہے۔ امجد جاوید کا تبصرہ بھی زبردست تھا۔ مجید احمد جائی کا طویل خط مدلل اور پیارا تھا۔ تحریروں پر باریک بینی سے تبصرہ کرتے ہیں، اِسی طرح صائمہ نور کا خط بھی خاصے کا ہے۔ احسن ابرار رضوی سے ہم اتفاق کرتے ہیں۔ ناز سلوش ذشے چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد آئیں اور انعام حاصل کیا بہت بہت مبارک باد۔ عمر فاروق ارشد دلائل کے ساتھ جواب دے رہے ہیں، عامر زمان عامر اپنی کہانی نہ لگنے کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ ممتاز احمد، انجم فاروق ساحلی، عابد غفار عابد، فلک شیر ملک، رانا حبیب الرحمان، ریاض حسین قمر، ایم حسن نظامی، علی حسین تابش اچھے تبصرے کر رہے ہیں اور احسان سحر نے دلائل کے ساتھ مجید احمد جائی کی سفارش کی ہے، آپ کا خط بہت پسند آیا۔ عبدالجبار رومی انصاری، غلام یاسین نوناری کے تبصرے بہترین رہے ماہ فروری ادیبوں پر بھاری گزر رہا ہے اور یکے بعد دیگرے نامور ڈرامہ نگار، افسانہ نگار اِس دُنیا سے چلے گئے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر و جمیل عطا کرے آمین۔ اقراء میں طاہر قریشی نے خوبصورتی کے ساتھ اللہ واحد ہے کے بارے میں بتایا۔ اِس بار انٹرویو کی جگہ تجزیہ پیش کیا گیا جو زبردست ٹھہرا۔ کہانیوں کی بات کی جائے تو سب سے پہلے (ضرورت) کی بات کروں گا۔ نوشاد عادل نے بہترین اور اچھوتا موضوع پکڑا اور واقعی رشتے بے مول اور انمول ہوتے ہیں۔ راہ خار، حلال رزق کا پیغام دیتی خوبصورت تحریر تھی۔ اوجھل، حسن عادل نے بہترین موضوع کا انتخاب کیا۔ اس کہانی سے شیر اور بلی والی کہانی یاد آ گئی۔ بلی نے شیر کو سارے گُر سکھا دیئے لیکن درخت پر چڑھنا نہ سکھایا اِسی طرح گلریز کے ساتھ بھی ہوا شیطان، عتیق حسن بیگ نے خوب لکھا لیکن جنات کے بارے میں اُن کی معلومات کم لگتی ہے۔ کہانی میں کہیں کہیں تسلسل ٹوٹتا رہا۔ گورکھ دھندا (آغاز الدین) نے مزاح کے انداز میں خوبصورت تحریر لکھی۔ پاداش (عامر زمان عامر) یہ کہانی 1996 کے مشہور و معروف پرچے میں معروف ادیب کے نام سے شائع ہوئی تھی لکھاری نے چند تبدیلیوں کے ساتھ من و عن یہاں اپنے نام سے شائع کرائی ہے۔ میں پروف پیش کر سکتا ہوں۔ ادارہ بنا تحقیق کئے کیسے کہانیاں لگا دیتا ہے۔ لکھاری سے کم از کم تحریری ثبوت لینا چاہیے۔ باعصمت پرویز احمد دلو نے خواہ مخواہ کی فلاسفری جھاڑ کر کہانی کو طول دینے کی کوشش کی ہے۔ شروع میں منصف نے غریب کو کتوں سے بھی گیا گزرا پیش کیا ہے۔ میاں فخر نے جب بشیراں کی ماں اور بھائی کو چھٹی دے کر بشراں کو روک لیا اور میاں فخر کی پوری فیملی باہر چلی گئی تھی۔ تو اُس کے اِس فعل سے شیطانیت نہیں ٹپکتی تھی۔ اور بشیراں کی ماں اور بھائی اتنے بیوقوف تھے کی جوان سالہ بہن، بیٹی کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے اور خود بشیراں کو پہلے بھی سبز باغ دِکھائے گئے تھے۔ وہ نادان کیسے رہ سکتی تھی۔ دوسری جگہ منصف کنفیوز ہوتا نظر آتا ہے کہ جب نادیہ یونیورسٹی سے گاؤں آ رہی ہے تو نصیر اور اُس کا دوست اتنے پاگل تھے کہ نادیہ کے گاڑی سے اُترتے ہی کھیتوں میں گھسیٹنے لگے۔ نصیر نے اپنی بہن کی عزت کا بدلہ لینا تھا۔ اور وہ غیر محفوظ طریقہ کیوں اپنا رہا تھا۔ اور پھر یہ تو کسی فلم کی کہانی لگتی ہے اور زادِ سفر کے آخری حصے نے رُلا دیا۔ سلگتے چنار والی مصنفہ نے بہترین لکھاری ہونے کا ثبوت دے دیا، ذوق آگہی اور خوشبوئے سخن بہترین رہے۔ اگر پورے پرچے کی بات کی جائے تو پروف ریڈنگ اور کمپوزنگ کی غلطیاں بہت پائی گئیں۔ لگتا ہے پرچہ جلدی نکالنے کی وجہ سے توجہ نہیں دی گئی۔ اِس کے علاوہ عرض کروں گا کہ نئے اُفق کے پلیٹ فارم میں عورت کی کردار کشی کی کہانیاں عام شائع کی جا رہی ہیں۔ کیا اِس طرح بُرائیوں، گناہوں کی طرف دعوت دینے کا سبق نہیں سیکھایا جا رہا ہے۔ کیا لکھاریوں کے پاس اس موضوع کے علاوہ کسی موضوع پر لکھنے کا ہنر نہیں ہے۔ عورت کی کردار کشی کے علاوہ دُنیا مسائل میں جکڑی ہوئی ہے۔ اِن مسائل کو اُجاگر کیا جا سکتا ہے اور ویسے بھی نئے اُفق کا اسٹاف مذہبی ہے۔ آخر کیا مجبوری ہے جو ادارہ اِس طرح کی کہانیاں کثرت سے شائع کرنے کو ترجیح دے رہا ہے۔ فروری میں (بھوک) (فریب خوردہ) مارچ میں (پاداش) (باعصمت) کی مثال سامنے ہے۔ ہندوؤں کی طرح عورت کو بالکل بدکردار کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ نئے اُفق لاکھوں لوگ پڑھتے ہیں، اُن میں کتنی بہنیں، مائیں، بیٹیاں، بیویاں نئے اُفق پڑھتی ہوں گی۔ وہ کیا تربیت لیں گی۔ خدارا ایسی کہانیاں شائع کر کے معاشرے کو مزید بُرائیوں کی دلدل میں نہ پھینکیں اُمید ہے میری عرض پر غور و فکر کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نئے اُفق کو مزید ترقی سے ہمکنار فرمائے آمین ثم آمین والسلام!

☆ محترم ایم اے راحیل! نئے افق کی پسندیدگی کا شکریہ، ہمیں خوشی ہوئی کہ آپ اتنی گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ کی بات درست ہے کہ جلدی کے چکر میں کوتاہیاں ہو جاتی ہیں، بہرحال ہم کوشش کریں گے کہ اس کا سدباب کریں۔ رہی کہانیوں کی بات تو عورت ہمارے لیے بھی محترم ہے۔ ماں، بہن اور بیٹی کی حیثیت سے عورت کا کردار بہت ہی پاکیزہ اور بلند ہے۔ مصنف جو کچھ معاشرے میں دیکھتا ہے اس سے متاثر ہو کر ہی کہانی لکھتا ہے، اس کا مقصد کسی کی کردار کشی نہیں ہوتا بلکہ تعمیر ہی ہوتا ہے۔

احسن ابرار رضوری ...... ساہیوال۔ السلام علیکم! تمام اسٹاف، لکھاریوں اور قارئین کو عقیدت بھرا اسلام قبول ہو۔ بہار کی رُت اپنے پر پھیلائے باہنوں میں لینے کو بے تاب کھڑی ہے۔ سردی کا زور ٹوٹا اور موسم خوشگوار ہو گیا ہے۔ زردی مائل

چہروں پر لالی آنے لگی ہے اور کسانوں کے چہرے کھلکھلا اٹھے ہیں۔ گندم کے کھیت ہر طرف لہلہاتے نظر آرہے ہیں۔ پرندوں نے سُریلے گیت گنگنانے شروع کردیے ہیں۔ ٹنڈ منڈ درختوں پر کونپلیں نکلنے لگی ہیں۔ اللہ کرے یہ بہاریں۔ یہ خوشبوئیں، یہ مسکراہٹ سدا رہیں۔ ملک میں امن کی فضا قائم ہو اور ہمارے ننھے معمار بے خوف وخطر اسکولوں میں پڑھ سکیں۔ سرورق خوبصورت لگا۔ نئے اُفق پچھلے چند شماروں سے ٹائٹل پر خوب توجہ دے رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کسی بھی پرچہ کی کامیابی کا راز سرورق ہی ہوتا ہے۔ کمرشل کی دُنیا کو سلامی دیتے، سرفہرست پر سرسری نظر ڈالی اور دستک میں جا قدم جمائے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب سیاست کو کرید رہے ہیں۔ ہمیشہ اداریہ ادبی ہوا کرتا ہے نہ کہ سیاسی۔ سیاست کے لئے ملکی اخبار، ٹی وی چینلز بہت ہیں۔ میں التماس کروں گا کہ نئے اُفق کا اداریہ خالص ادبی ہونا چاہیے۔ سیاست کے علاوہ اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ بحرحال مشتاق احمد قریشی تجربہ کار ہیں، بہتر سمجھتے ہیں۔ ہم تو مشورہ دے سکتے ہیں۔ گفتگو میں کاشف زبیر کی صحت یابی کے لئے دُعا کی اپیل کی گئی ہے اللہ تعالیٰ اُن کو اور سپتالوں ، گھروں میں جو بھی کسی مرض میں مبتلا ہیں اُن کو شفایابی عطا فرمائے آمین ثم آمین۔ مجید احمد جائی کو بحال کرکے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں جو اُس کی ذات، شہرت، کو داغ دار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجید احمد جائی اپنی توہین کا دعویٰ کرسکتے ہیں لیکن میں اُن کو داد دیتا ہوں کہ ایک تو اُن کا خط مدلل اور خوبصورت جملوں پر مشتمل تھا، دوسرا اعلیٰ ظرفی کا ثبوت بھی دیا۔ اپنا معاملہ اِنسانوں کی بجائے اللہ پر چھوڑ دیا۔ بہت خوب۔ امجد جاوید کا خط بھی اچھا رہا۔ صائمہ نور بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ معاشرے کی بُرائیوں کو خوبصورت لفظوں میں پیش کیا۔ میں شکر گزار ہوں کہ مجھے شاملِ اشاعت کیا گیا لیکن خط پر قینچی خوب چلائی گئی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایڈیٹر کو پورا حق ہوتا ہے، جو کانٹ چھانٹ کرے مگر انصاف کا دامن نہ چھوٹنے پائے۔ ناز سلوش ذشے۔ انعام یافتہ خط کے ساتھ حاضری لگوا رہی ہیں۔ اُن کے ساتھ متفق بھی ہوں۔ ریاض بٹ، عمر فاروق، رمشا ملک، ممتاز احمد، فلک شیر ملک، ریاض قمر، ایم حسن نظامی، علی حسنین تابش، احسان سحر تفصیلی خط، عبدالجبار رومی، غلام یاسین نوناری کے تبصرے مدلل اور پیارے تھے۔ مہر پرویز دولو ایم اے انگلش ہوکر بھی لفظوں ادائیگی کا علم نہیں ہے، اس کا جواب ادارے نے بھی دے دیا۔ (نفیسہ سعید لیکچرار اور سنیئر استاد ہیں) والا۔ کہانیوں میں ضرورت بہت پسند آئے، سلگتے چنار بھی زبردست تحریر تھی۔ ''راہ پُر خار'' محبت کی نادانیاں اجاگر کرتی تحریر نے بہت بڑا درس دیا اور حقیقت سے بھی پردا اٹھایا۔ یہی سب کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے۔ ''شیطان'' بہت پسند آئے۔ عتیق حسن بیگ واقعی داد کے مستحق ہیں۔ اوجھل بھی خوب رہی، عاقبت اندیش نے متاثر نہیں کیا۔ لفظوں کا تسلسل ٹوٹا رہا۔ عبدالحمید نے خوبصورت تجزیہ پیش کیا۔ گورکھ دھندا، لبِ بام اچھی تحریریں تھیں۔ زادِ سفر کا اختتام بہت پیارا تھا، آنکھوں سے آنسو آگئے۔ ذوق آگہی، خوش بوئے سخن اور اس بار زریں قمر صاحبہ کو شاعرہ کی حیثیت سے متعارف کروایا گیا۔ پورے نئے افق کی بات کی جائے تو خوب رہا اور کہیں کہیں خامیاں ضرور تھیں مگر امید کی جاتی ہے کہ ان پر قابو پالیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ حامی وناصر رہے۔ والسلام!

مجیداحمد جائی...... ملتان شریف مزاج گرامی! اُمید واثق ہے بخیریت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ دوست نما دُشمنوں اور حاسدین کے حسد سے محفوظ رکھے۔ صحت کی بادشاہی، ایمان کی سلامتی اور ہنستا مسکراتا رکھے۔ دین اور دُنیا میں کامیاب و کامران فرمائے آمین۔ ماہ مارچ کا نئے اُفق معمول کے مطابق جلد ہی مل گیا۔ سرورق پر بیٹھی حسینہ کھلے بالوں سے محوِ حیرت جانے کس غم میں جلی بیٹھی ہے۔ جیسے ابھی ابھی ٹی وی چینل پر بُری خبر سن لی ہو۔ ایک شاہین پرواز میں ہے تو اُس کی مادہ انڈوں پہ بیٹھی رکھوالی کر رہی ہے۔ کونے میں کسی جھیل کا منظر بھلا لگ رہا ہے، سورج دن بھر کی تھکن سے چُور آرام کرنے چلا ہے۔ بہت خوبصورت سرورق بنایا گیا۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی، کراچی کی سیاست بلکہ پورے ملک کی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہوئے عزیز بلوچ کا ذکر کررہے ہیں۔ کہتے ہیں سیاست میں جھوٹ نہ ہو تو اُسے کوئی سیاست مانتا ہی نہیں اور یہی سب کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ عوام کو نت نئے مسئلے میں اُلجھا کر اپنا اُلو سیدھا کررہے ہیں۔ باری کی سیاست پرانی روایات ہے اور کوئی بھی حکومت ہو ہمیشہ عوام کو خوار ہی کیا ہے۔ گفتگو میں عمران احمد زادِ سفر، عشق کسی کی ذات کے اختتام کی خبر سنا رہے ہیں۔ ناول کو دو تین اقساط میں ختم نہیں ہونا چاہیے۔ ایک ہی قسط وار ناول شروع کروایا جائے جو کم از کم ایک سال تو چلے۔ نامور لکھاری کاشف زبیر کی صحت یابی کے لئے ہمہ تن دُعا گو ہیں۔ امجد جاوید کے خط میں شروع کی سطور پسند آئیں۔ صائمہ نور نے خوبصورت پیراہن میں معاشرے میں پھیلی بُرائیوں کو اُجاگر کیا ہے۔ احسن ابرار رضوی، پہلے خط میں تنقید فرما رہے تھے۔ قارئین کو مکمل اختیار ہوتا ہے کہ وہ لکھاری کی تحریر پر اپنی تنقید اور تعریف پر رائے دے۔ ہاں لکھاری کی شخصیت کو نشانہ بنانا درست نہیں۔ ادب میں ایسا بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ لکھاری حضرات معاشرے میں پھیلی بُرائیوں کا تدارک کرنے کے لئے جہاد کریں نہ کہ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے پر وقت صرف کریں۔ ناز سلوش ذشے اللہ تعالیٰ

آپ کو صحت کے ساتھ ساتھ ہنستا مسکراتا رکھے۔ آپ کا خط واقعی انعام کا حقدار ہے۔ آپ سے ملاقات اسلام آباد میں ہوئی تھی اور اِس ملاقات کو چار سال بیت گئے ہیں۔ یقیناً آپ کو یاد ہوگا۔ ریاض بٹ صاحب آپ کا خط مختصر اور جامع تھا۔ لفظ ''خدا'' کی جگہ اگر ''اللہ'' لکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ اگر میں تفصیل میں جاؤں تو پورا مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ عمر فاروق ارشد بھائی میرا کسی سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے اور نہ ہی میں نئے اُفق کے پلیٹ فارم پر گھسیٹ کر آیا ہوں امن پسند ہوں۔ امن سے رہتا ہوں۔ ممتاز احمد صاحب کا تبصرہ شاندار اور جاندار تھا۔ رانا حبیب الرحمان صاحب اللہ تعالیٰ آپ پر آسانیاں فرمائے۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ فری لانسر لکھاریوں کے ساتھ ہوتا ہی یہی ہے۔ لمبا انتظار کروایا جاتا اور اگر ادارہ فوری طور پر اتنا ہی کہہ دے کہ آپ کی کہانی قابل اشاعت ہے تو لکھاری انتظار سے بچ سکتا ہے۔ رہی بات ریاض حسین قمر صاحب کی تو اُنہوں نے عمران احمد صاحب کے فیصلے کو سراہا اور ادب کی کالی بھیڑوں کا اشارہ کرتے ہوئے عمران صاحب کا فیصلہ بروقت ہے کہا۔ میں مودبانہ عرض کروں گا۔ میرے پیارے کم از کم حقیقت کو جان کر ہی اتفاق کیا جاتا ہے۔ بُرا کوئی نہیں ہوتا اور نہ کوئی جان بوجھ کر غلطی کرتا ہے۔ علی حسین تابش، احسان سحر، عبدالجبار رومی انصاری کے تبصرے بھرے بھرے تھے۔ اللہ زور قلم کرے اور زیادہ۔ اقراء میں طاہر قریشی صاحب بڑے خوبصورت انداز میں ''اللہ واحد ہے'' قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین! تجزیہ، عبدالحمید نے شاندار پیش کیا عرض کروں گا میرے 2015 میں تین لیٹر شائع ہوئے، ماہ جون، نومبر اور دسمبر۔ ماہ جون کا ذکر کرنا بھول گئے ہیں۔ بحرحال داد کے مستحق ہیں۔ شاندار تجزیہ پیش کرنے پر مبارک باد قبول کریں۔ کہانیوں میں اِس بار سب سے پہلے ''راہ پُر خار'' پڑھی، لکھاری نے خوب محنت کی، بحرحال فریب خوردہ سے پیچھے ہی رہی۔ ابھی تک تین کہانیاں پڑھیں اور تینوں ہی ماڈرن محبت کے موضوع پر تھیں۔ معاشرے میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور اگر بات کی جائے ''راہ پُر خار'' کی تو طاہرہ کا کردار بہت پسند آیا۔ آج کے پُرفتنہ دُور میں عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دُشمن ہے۔ عورت ہی عورت کا گھر اجاڑتی ہے مرد بیچارے تو خواہ مخواہ مجرم بن جاتے ہیں۔ کہیں ساس کے رُوپ میں، تو کہیں بہو کے رُوپ میں، کہیں نند اور کہیں سوکن کے رُوپ میں جھگڑے کرواتی اور گھر کو قبرستان بناتی نظر آتی ہے۔ کیا کمال فقرہ لکھا گیا ''چاروں طرف جھوٹ کی حکمرانی ہو تو سچ تنہا رہ جاتا ہے'' واقعی آج کے دُور میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کوئی بھی سچ بولنے کا روادار نہیں۔ جو سچ کی آواز بلند کرتا ہے اُس کا جینا حرام کردیا جاتا ہے۔ جھوٹ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ آج کا اِنسان اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اور انسان سے ڈرتے ہیں۔ مسلمان اِسی لئے مار کھا رہے ہیں۔ کہانی میں بہترین سبق بھی دیا گیا ہے۔ حلال، کا ایک نوالہ حرام کے سو نوالوں سے افضل ہوتا ہے۔ کمال تحریر تھی۔ عاقبت اندیش، ہمیشہ کی طرح کمال تحریر لائے۔ کمپوزنگ کی خال خال غلطیوں نے مزہ کرکرا کردیا۔ شائلہ نے خود کے ساتھ بہت بُرا کیا۔ آخری سطور سے میں اتفاق نہیں کرتا کہ ''انسانی خون بڑے بڑے مجرموں کو ہضم نہیں ہوتا'' یہ پرانے وقتوں کی باتیں ہیں آج قاتل سرعام دندناتے پھرتے ہیں اور مدعی کورٹ کچہریوں کی خاک چھانتے رہتے ہیں۔ یہ بھی کڑوا سچ ہے کہ پاکستان کی جیلوں میں اکثریت بے گناہ لوگوں کی ہے۔ مجرم آزاد پھرتے ہیں۔ آج کے انسان کی اوقات بھیڑ بکری سے بھی گئی گزری ہے۔ خون سے سڑکیں رنگین ہیں۔ درختوں پر انسانی اعضا لٹکے نظر آتے ہیں۔ اب انصاف بکتا ہے۔ انصاف ہوتا نہیں ہے۔ اگر آج بھی ہر فرد انصاف کرنے پر آجائے تو ملک کا نظام بدل سکتا ہے۔ (ریاض بٹ صاحب کئی بار آپ کے نمبر کر کال کی مگر رسیو نہیں ہوئی۔ ہو سکے تو میرے اِس نمبر پر رابطہ کریں 0301-7472712)۔ اس کے علاوہ ''ضرورت'' سلگتے چنار، شیطان، اوجھل، گورکھ دھندا، خوبصورت تحریریں تھیں۔ اگر تفصیلاً تبصرہ کروں تو خط بہت طویل ہو جائے گا۔ فن پارے بھی خوب رہے اور خوش بوئے سخن، ذوق آگہی نے اپنی روایات برقرار رکھی۔ زادِ سفر کا شاندار اختتام ہوا۔ اسی طرح عشق کسی کی ذات نہیں بھی خوبصورت موڑ پر ختم ہوا۔ اب اجازت۔

صائمہ نور...... بہاول پور روڈ ملتان السلام علیکم! اللہ تبارک وتعالیٰ سدا مسکراتا اور خوشیوں کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آپ کے ہاتھوں، باتوں، کردار سے کسی کی دِل آزاری نہ ہو اور دین اسلام کو پھیلانے میں ترغیب دلاتے رہیں۔ آمین ثم آمین۔ ماہ فروری سردیوں کے ساتھ ساتھ ادب کے اُفق پر جلاد بن کر اُبھرا ہے اور کئی ہیرے نگل گیا۔ نواب محی الدین، فاطمہ ثریا بجیا، محمد اعظم۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر کی دولت سے مالا مال فرمائے آمین! ماہ مارچ کا نئے اُفق 20 فروری کو ملا، بظاہر چند روز لیٹ سہی مگر جلد آگیا۔ سرورق اعلی اور جاذب نظر بنایا گیا۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی سیاست پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ جناب یہاں تو حالت یہ ہے کہ اندھے کے پاؤں تلے بیٹر آجائے تو وہ بھی نواب بن جاتا ہے اور کہتا ہے میں تو روز بیٹر کھاتا ہوں۔ سیاست میں یہی ہو رہا ہے۔ گفتگو میں عمران احمد اِس بار حدیث کا حوالہ دینا شاید بھول گئے۔ امجد جاوید، مجید احمد جائی، احسن

ابرار رضوی، عمر فاروق ارشد بھائی، رمشا ملک، انکل ممتاز احمد، انجم فاروق ساحلی، فلک شیر ملک، رانا حبیب الرحمان، ایم حسن نظامی، علی حسین تابش، احسان سحر، عبدالجبار رومی، کے تبصرے زبردست تھے۔ ریاض صاحب، آپ کی بہن بالکل ٹھیک ہے اور آپ کے لئے دعائیں کرتی رہتی ہے۔ ناز سلوش ذشے کو انعامی لیٹر کی بہت بہت مبارکباد۔ آپ کی باتیں بالکل دُرست ہیں اور میں آپ کی ہاں میں ہاں ملاتی ہوں۔ اقراء میں (اللہ) کی وحدانیت کو قرآن مجید اور حدیث سے ثابت کیا گیا۔ بہت خوب۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دُرست راستے پر گامزن فرمائے آمین۔ عبدالحمید نے نئے اُفق پر تجزیہ بہت خوب لکھا۔ اِس دفعہ شاعرہ زریں قمر سے ملاقات اچھی رہی۔ کہانیوں میں ”مفصر ورت“ بہت خوبصورت تحریر تھی۔ سائنس دان نے گھڑی کمال کی بنائی تھی۔ کاش کوئی سائنس دان ایسی ٹیکنالوجی متعارف کروائے جس سے دہشت گرد خود ہی بتائے کہ میں ہی وہ درندہ ہوں جو اِس وطن کے معماروں کو شہید کر رہا ہوں۔ عاقبت اندیش، ہمیشہ کی طرح اچھوتی تحریر تھی۔ لیکن مجرم خود تھانے پیش ہوا یہ بات دِل نہیں مانتا۔ گورکھ دھندا بھی خوبصورت تحریر تھی۔ سلگتے چنار میں زریں قمر نے وادی کشمیر میں ہندوؤں کے ظالمانہ تشدد کو لفظوں میں خوب پرو دیا۔ دِل غمگین اور آنکھیں نم ہیں۔ راہِ پُرخار، بہترین تحریر لکھی گئی۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو بدلنا چاہیے تو سبب بنا دیتا ہے۔ شیطان زبردست تحریر تھی۔ ہمارے معاشرے میں اِنسانی رُوپ میں کئی شیطان پیدا ہوگئے ہیں جو اپنی شیطانیت سے بہن، بیٹیوں کی عزتیں لوٹتے پھرتے ہیں۔ لب بام، ترجمہ شدہ تحریر نے متاثر نہیں کیا اور گورکھ دھندا میں مزاح نے تحریر کو چار چاند لگا دیئے۔ زادِ سفر کا اختتام ہوا، آخر بالی کے اوپر ایک اور ذمہ دار آن پڑی۔ بہت خوب لمحہ لمحہ روتا ناول تھا۔ کتنا خوبصورت جملہ لکھا گیا کہ (ادب اِنسان کو عظیم بناتا ہے مگر مستقبل نہیں سنوارتا) سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، ساغر صدیقی کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں اور مرزا غالب بھی۔ اِن کی زندگیاں کس کرب سے گزری ہیں۔ یقیناً سب جانتے ہوں گے۔ اور نواب محی الدین، فاطمہ ثریا بجیا۔ مرنے کے بعد ادیبوں کو تین دن مشکل یاد رکھا جاتا ہے اور پھر کوئی ذکر تک نہیں ہوتا۔ ہمیشہ کسی ادیب، لکھاری کی خدمات کا اعتراف بعد مرنے کے کیوں کیا جاتا ہے۔ گھنٹوں اِس کے سحر میں ڈوبی رہی۔ بہت اعلیٰ۔ عشق کسی کی ذات نہیں بھی اختتام کو پہنچا۔ اچھا رہا۔ اِس کے علاوہ باقی تحریریں پڑھنی باقی ہیں سو تبصرے سے معذرت۔ البتہ فن پارے کی تمام تحریریں خوب تر تھیں۔ ذوقِ آگہی اور خوش بوئے سخن کامیاب جا رہے ہیں اور انعام پانے والوں کو دلی مبارک باد۔ اللہ حافظ!

علی حسنین تابش...... چشتیاں۔ محترم چیف ایڈیٹر صاحب، ایڈیٹر صاحب اور اسٹاف و قارئین کو سلام قبول ہو۔ امید واثق ہے سب خیریت سے ہونگے۔ مارچ کا شمارہ ملا تو دل کے تار بجنے لگے۔ خوشی کی انتہاء نہ رہی۔ ٹائٹل لاجواب تھا۔ شامِ تنہائی اور اُفق سے پرے ڈھلتا سورج۔ واہ کیا بات ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ڈھلتا سورج اس بات کی ترجمانی کر رہا ہے کہ ہر عروج کو زوال پذیر ہونا ہے۔ اس بات سے شناسائی دلوا رہا ہے کہ نشیب و فراز تو زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہاں! اگر یہ نہ ہوں تو شاید یادِ خدا بھی کم کم ہو۔ بلندی و پستی خداوند کریم کے اپنے بندے سے امتحان ہیں۔ صابر لوگ ہی اس امتحان میں پاس ہوتے ہیں۔ جو امیری میں غرور اور غریبی میں شکوہ نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے رب کے شاکر بندے ہوتے ہیں۔ خیر بات کہاں نکل گئی۔ ڈھلتے سورج کے ساتھ میں اداس و منتظر نگاہوں والی حسینہ اس منظر کو اور والہانہ بنا رہی تھی۔ مجھ جیسے شاعر حضرات تو دل تھام کر بیٹھ گئے ہوں گے۔ معصوم چہرہ اور غمِ ہجر سچ پوچھو بہت ترس آیا۔ زبردست ٹائٹل تھا۔ اب بات ہو جائے ”دستک“ کی۔ اچھا لکھا گیا تھا۔ ”گفتگو“ میں سب دوستوں کے احوال اچھے تھے۔ اس بار میں تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا۔ کیونکہ پچھلی مرتبہ احوال پر زبردست قینچی چلائی گئی۔ سب دوستوں کا مشکور ہوں جو میرے تبصرے کو پسند کرتے ہیں۔ کہانیوں میں سلسلہ وار ناول کا اینڈ اچھا رہا۔ باقی کہانیوں میں ضرورت، عاقبت اندیش، لب بام، پاداش اور شیطان کے ساتھ ساتھ سب تحریریں اچھی تھیں۔ مستقل سلسلے بھی زبردست رہے۔ ممبر شپ کیلئے ادارے کا مشکور ہوں۔ اب اجازت دیں۔ حرفِ آخر سب کو سلام اللہ نگہبان۔

بشیر احمد بھٹی...... بہاولپور۔ السلام علیکم، جناب محترم عمران احمد صاحب ایک عرصہ سے ماہنامہ نئے افق تمام تر رعنائیوں سے مارکیٹ میں جلوہ افروز ہو رہا ہے لگتا ہے آپ اور آپ کی پوری ٹیم نئے افق پر خوب توجہ دے رہی ہے توجہ برقرار رہنی چاہیے۔ 290 صفحات کا نئے افق آپ 50 روپے میں قارئین کو فراہم کر رہے ہیں مجھے حیرانی اس بات پر ہے کہ کئی مدیران ڈائجسٹ کاغذ کی گرانی کا رونا رو کے قیمت بڑھاتے رہتے ہیں آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں کیا آپ کے لیے کاغذ مہنگا نہیں ہوتا، آپ بھی صابر شاکر بن کے متعدل قیمت پر اپنے پرچے فراہم کر رہے ہیں یہ اچھی بات ہے۔ قارئین کو عمدہ کاغذ والا ڈائجسٹ مناسب قیمت پر دینا بھی لالچ سے ماورا نظر آتا ہے اب اسکیچز بھی خوب صورت ہوتے ہیں انعامی سلسلے بھی جاری ہیں لکھائی بھی موٹی ہے کتابت خوب صورت ہے ہاں جملوں میں کہیں کہیں غلطیاں ہیں۔ اس طرف توجہ فرمائیں۔ ڈائجسٹوں کی دوڑ میں اب نئے افق عمدہ شکل میں پیش پیش ہے قارئین کی توجہ کے لیے محنت کی ضرورت ہے جو آپ کر رہے ہیں ورنہ قارئین کا کیا ہے یہ تو دس روپے کا پرانا ڈائجسٹ کباڑی سے لے کر بھی مزہ حاصل کر لیتے ہیں قارئین کو قابو کرنے کے لیے خوب صورتی بہت ضروری ہے جو نئے افق میں نظر آ رہی ہے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام ماہ مارچ 2016ء کا شمارہ منفرد اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ 19 فروری کو ہی بے قرار اور مضطرب نگاہوں کی تسکین کے لیے مل گیا یہ ادارے کی مہربانی ہے کہ ہمیں انتظار کی کوفت سے بچا لیتا ہے دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب باتوں سے اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن ایک بات سے انکار ممکن نہیں ہے کہ اس حمام میں سارے ننگے ہیں ہر ایک نے اپنے مفادات اور تحفظ کے لیے کسی نہ کسی کے پیچھے پناہ لی ہوئی ہے...... اب بڑھتے ہیں محفل گفتگو کی طرف۔ امجد جاوید آپ ایک منجھے ہوئے لکھاری ہیں ایک اور رسالے میں بھی آپ کی کہانیاں میں پڑھتا رہتا تھا آپ کو نہ صرف لکھنے کا فن آتا ہے بلکہ آپ اپنی بات قارئین تک پہنچانے کا گر بھی جانتے ہیں۔ یہی بات میں ناصر ملک صاحب کے لیے بھی کہہ سکتا ہوں۔ اس بار آپ دونوں حضرات کی کہانیاں اختتام پذیر ہوگئی ہیں میں آپ دونوں حضرات کو مبارکباد دیتا ہوں اتنی اچھی کہانیاں لکھنے پر، مجید احمد جائی بھائی شکر ہے آپ نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے معذرت کر لی اور نئے افق کے مدیر اعلیٰ مدیر اور دوسرے اسٹاف نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معاملہ رفع دفع کر دیا آپ کا اس بار کا خط بھی خوب صورت اور مدلل ہے۔ آپ نے میری تفتیشی کہانی کو پسند کیا جس کے لیے یہ بندہ ناچیز شکر گزار ہے آپ نے کچھ تحفظات کا اظہار کیا ہے تو اس بابت عرض ہے کہ اس قسم کے حالات میں تھانیدار کے لیے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ بندے کو اس کا بیان لے کر اسی طرح آزاد کر دے جو کچھ کترنیں میں ہوا اس کے متعلق آپ نے پڑھا ہوگا موقع کا کوئی گواہ نہیں تھا سب کچھ رات کی تاریکی میں ہوا جو کچھ ہوا اس کے متعلق خدا بزرگ و برتر کے علاوہ صرف فرحت اور امتیاز کو پتا تھا اگر امتیاز کو آزاد کر دیا جاتا تو فرحت کا باپ بذریعہ وکیل عدالت میں جا کر کہہ سکتا تھا کہ تھانیدار نے شاید پیسہ لے کر امتیاز کو آزاد کر دیا ہے یہاں میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ امتیاز کو بعد میں عدالت نے باعزت بری کر دیا تھا یہ میری غلطی یا کوتاہی ہے کہ میں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ آئندہ اس قسم کی تفتیشی کہانیوں میں میں عدالتی فیصلے کا ذکر بھی کر دیا کروں گا۔ یہی وضاحت بہن صائمہ نور کے لیے بھی ہے۔ بہن آپ نے جس کہانی کے متعلق لکھا ہے میں خالد بھائی کی ڈائری میں ڈھونڈوں گا اگر ہوئی تو ضرور تحریر کروں گا۔ مجھے خوشی ہوتی ہے جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ قارئین اتنی دلچسپی اور باریک بینی سے میری کہانیاں پڑھتے ہیں اب بات ہو جائے ناز سلوش ذشے کے خط کی، بہن یہ خط واقعی انعام کے قابل ہے یہ میں کوئی رسمی بات نہیں لکھ رہا بلکہ جو محسوس کیا وہ احاطہ تحریر میں لا رہا ہوں آپ کے خیالات بھی ارفع و اعلیٰ ہیں میری کہانیوں کے متعلق آپ کا تبصرہ میرے لیے باعث تقویت ہے۔ سدا سکھی رہو، احسن ابرار رضوی میرا تبصرہ پسند کرنے کا بے حد شکریہ، عمر فاروق ارشد بھائی اس بار آپ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں بہت خوب لکھتے ہیں مہروں کی تکلیف کے متعلق عرض ہے کہ کافی افاقہ ہے بس دوائیں کھاتا رہتا ہوں، میری کہانی پسند کرنے اور دعائیں دینے کا شکریہ۔ آپ قارئین کی دعائیں اور ڈاکٹروں کی دوائیاں ہی اس آخری عمر میں میرا سہارا ہیں پتا نہیں کب زندگی کا چراغ بجھ جائے رمشا ملک آپ نے جو کچھ لکھا اچھا لکھا اور ٹھیک لکھا اب آئندہ بھی آپ میری بہن آتی رہیے گا۔ انجم فاروق ساحلی صاحب میری کہانی پسند کرنے کا شکریہ، مہر پرویز دولو بھائی آپ کو محفل میں دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے بائیکاٹ کا سلسلہ ختم کر دیا ہے اور اپنے بھائی کا مان رکھ لیا ہے فلک شیر ملک صاحب کیسے ہو، میرا خط پسند کرنے کا شکریہ لیکن میری تحریر کردہ کہانی پر تبصرہ گول کر دیا، خیر کبھی کبھی ایسے ہو جاتا ہے خوش رہو ریاض حسین قمر بھائی آپ کے خطوط بہت خوب ہوتے ہیں میری تفتیشی کہانیوں کے متعلق آپ کے خیالات پڑھ کر ڈھیروں خون بڑھ جاتا ہے بہت مہربانی نوازش احسان سحر آپ کا بھی شکریہ آپ کو بھی میری کہانی پسند آئی آپ کا تبصرہ بھی جاندار اور قابل تعریف ہے خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی میں سب کا انتخاب خوب صورت ہے۔ زرین قمر کی کشمیر کی تحریک آزادی کے پس منظر میں لکھی کہانی سلگتے چنار اپنی مثال آپ ہے۔ بہن آپ کی تحریریں دکھ دیتی ہیں آپ نے جو موضوع چنا ہے وہ آپ کا یہ خاصا ہے باقی پرچا ابھی زیر مطالعہ ہے۔

علی اصغر...... منچن آباد۔ نئے افق کا تازہ شمارہ ملا تعریف کے لیے میری پاس الفاظ نہیں ہر لحاظ سے رنگارنگ تھا نئے افق میں جو حالیہ تبدیلیاں کی گئی ہیں سرورق سے لے کر اختتام تک اپنی مثال آپ تھا میں عرصہ دو سال سے نئے افق کے ساتھ منسلک ہوں۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر سانسوں کو روک کر ایک احمقانہ فیصلہ کیا ہے کہ میں باذوق اور اہل علم کی محفل میں شریک ہو سکوں۔ یقینا یہ فیصلہ احمقانہ فیصلہ ہی ہوگا آپ باشعور اعلیٰ قسم کے لوگوں میں، میں بھی شامل ہو سکوں گا۔ خیر ہمت کر کے یہ ٹھانی کہ نئے افق پر دستک

دوں گا۔ ماہ رواں کے شمارے میں بہن زریں قمر کی تحریر ”سلگتے چنار“ بہت اچھی لگی عامر زمان عامر کی تحریر ”پاداش“ نے اس قدر متاثر کیا کہ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں پیارے بھیا امجد جاوید آپ کی کہانی ”عشق کسی کی ذات نہیں“ اپنی مثال آپ تھی پڑھ کر ماضی کی یادوں میں کھو گیا۔ ”راہ پرخار“ محمد یاسین صدیق صاحب سے مجھے مستقبل میں بھی اچھی اور دل کو چھو لینے والی تحریروں کی امید رہے گی۔ دوسرے تمام رائٹرز نے بھی نئے افق کو چار چاند لگائے۔ یقیناً علم ہی کی بدولت معاشرہ پروان چڑھتا ہے۔ پیارے بھائی مجید احمد جائی آپ کی نذر حضرت علامہ اقبال شعر۔

ذرا سی بات تھی اندیشہ عجب میں
بڑھا دیا فقط زیب داستان کو

تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میری کوتاہیوں کو اپنی محبت کی نظر سے درگزر فرمائیں اللہ تعالیٰ میرا اور آپ کا حامی و ناصر ہو، آمین۔

ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم۔

قابل احترام جناب عمران احمد صاحب سلام شوق رب کریم سے امید واثق ہے کہ آپ کے رفقا بالکل خیریت سے ہوں گے اور ہم قارئین کی تسکین کے لیے اپریل 2016ء کے نئے افق کو سجا اور سنوار رہے ہوں گے مارچ 2016ء کا نئے افق زیر نگاہ ہے اس شمارے کے خوب صورت ٹائٹل کی تعریف نہ کرنا ایک مجرمانہ غفلت ہی تصور ہوگی۔ ٹائٹل پر جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ باعث تسکین ہے خوب صورت حسینہ کے پس منظر میں جو سین دیا گیا ہے بہت ہی خوب صورت ہے اس کے لیے آپ سب کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی میں شمار ہوگا دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ایک سو بیس فیصد سچ ہے آپ جس طرح برائی اور برائی کے مرتکب لوگوں کا بھانڈہ چوراہے میں پھوڑتے ہیں ایسا اور کوئی شاید نہ کر سکے رب ذوالجلال آپ کو سچ لکھنے اور اس پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین، گفتگو کے آغاز میں بیان کردہ حدیث مبارک مومن بندے کے لیے کتنی بڑی خوشخبری ہے گفتگو کے آغاز میں آپ نے اپنی بات میں معروف مصنف جناب کاشف زبیر کی شدید علالت کا بتایا پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور دل سے دعا نکلی کہ رب کریم ان کو جلد صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ کرسی صدارت پر متمکن جناب امجد جاوید صاحب نے قارئین کے بہت سے رویوں کی نشاندہی کی ہے۔ محترم آپ کی سب باتیں سر آنکھوں پر بعض اوقات سلسلہ وار ناول کی قسط قاری نہیں پڑھ سکتا اور وہ اپنا خط ارسال کر دیتا ہے جس میں جتنا پڑھا ہوتا ہے اس کا ذکر کر دیتا ہے اور ناول کی قسط اس کے بعد پڑھتا ہے۔ بہرحال ہم قارئین کو چاہیے کہ جریدے میں چھپنے والے مواد پر مثبت تبصرہ کریں جو مصنف کے لیے ایک گائیڈ لائن ہو آپ کے ناول کی تو ہر قسط قابل تعریف ہے آپ کہانی کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں اللہ کرے زور قلم اور زیادہ مجید احمد جائی صاحب کا مفصل خط پڑھا انہوں نے بہت خوب لکھا ہے اور جس طرح انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور معذرت کی وہ ان کی اعلیٰ ظرفی کو ظاہر کرتی ہے اب سب قارئین کے دل ان کی طرف سے صاف ہو جانے چاہئیں اور انہیں صاف اور کھلے دل سے خوش آمدید کہنا چاہیے انہوں نے پرچے پر بھی بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ محترمہ صائمہ نور بھی اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں۔ جناب احسن ابرار رضوی ایک اچھے اور جاندار تبصرے کے ساتھ تشریف لائے۔ ان کا خط ہر لحاظ سے ایک اچھا خط تھا آپ نے خوب فرمایا کہ ہر فرد اپنے ساتھ انصاف کرے تو معاشرے کی بہت سی برائیاں خود بخود ختم ہو جائیں۔ محترمہ ناز سلوش ذشے ایک بہترین انعامی خط کے ساتھ آئیں۔ انہوں نے بہت سی باتوں پر بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے مجھ ناچیز کی بھی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ جس کے لیے میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ مجھے ان کی اس تجویز سے اتفاق نہیں ہے کہ خوش بوئے سخن میں ایک ماہ غزلیں دی جائیں اور ایک ماہ نظمیں بلکہ موجودہ طریقہ ہی بہتر ہے کیونکہ غزل پسند کرنے والے قارئین اور نظم پسند کرنے والے قارئین کی ذہنی تسکین کا سامان ہو جاتا ہے محترم ریاض بٹ صاحب ایک بہت خوب صورت کہانی عاقبت اندیش اور اچھے تبصرے کے ساتھ جلوہ گر ہوئے۔ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ ریاض بھائی آپ کسی وجہ سے میرے ساتھ ناراض سے لگتے ہیں۔ بھائی اگر ایسا ہے تو میں آپ سے پیشگی معافی مانگتا ہوں۔ پیارے بھائی عمر فاروق ارشد ایک بہت ہی جاندار تبصرے اور خط کے ساتھ تشریف لائے۔ انہوں نے جناب نیر زیدی کے خط کے بارے میں جو وضاحت فرمائی ہے وہ بہت ہی واضح ہے اب موصوف کو سب باتیں دل سے نکال کر حسب سابق نئے افق کے صفحات پر جلوہ افروز ہوتے رہنا چاہیے پیارے بھائی آپ نے جس طرح میری شاعری پسند فرمائی ہے کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں، میرے اور میرے کلام کے بارے میں اتنی چاہت اور اتنی لگن یقیناً آپ نے اپنی چاہت اور محبت کا مجھے مقروض بنا دیا ہے۔ رب لم یزل آپ کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے، آمین۔ رمشا ملک صاحبہ کچھ باتوں سے بہت نالاں نظر آئیں ان کی بات یقیناً صحیح ہے کہ کسی بھی شخص کی کردار کشی سے ہر ایک کو اجتناب برتنا چاہیے بھائی عبدالغفار عابد بڑے اچھے اور نیک جذبات کے ساتھ تشریف لائے ہیں میں ان کی ہر بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں، محترم عامر زمان عامر کا خط بہت خوب تھا میں ان کی اس تجویز سے اتفاق کرتا ہوں کہ اس ماہ کا شاعر کا پورا کلام ایک جگہ شائع کیا جائے۔ محترم آپ نے میرے کلام کو پسندیدگی کی عطا فرمائی اس سے میرے حوصلے بہت بلند ہوئے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے آمین۔ اچھے بھائی ممتاز احمد صاحب خوب صورت تبصرے اور اچھی باتوں کے ساتھ تشریف لائے آپ نے میرے کلام کو اتنی پذیرائی بخشی خدا آپ کو خوش رکھے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائے مہر پرویز احمد دولو صاحب نئے افق کے بارے میں بڑے اچھے جذبات لے کر تشریف لائے ان کی ہر بات سو فیصد درست ہے۔ فلک شیر ملک صاحب کا تبصرہ خوب رہا۔ بھائی رانا حبیب الرحمان کا مفصل خط پسند آیا خدا انہیں اس اذیت ناک کیفیت سے باعزت نجات عطا فرمائے، آمین۔ ایم حسن نظامی بھائی میرا کلام پسند فرمانے کا شکریہ قبول فرمائیں۔ اچھے بھائی احسان سحر کا تبصرہ اس ماہ کی گفتگو کا طویل ترین اور بہت خوب صورت تبصرہ تھا لگتا ہے انہوں نے جریدے کا لفظ لفظ مطالعہ کیا اور اس کا نچوڑ اپنے خط میں پیش کر دیا محترم احسان سحر آپ نے جس طرح میرے کلام کو پذیرائی بخشی اور جس انداز سے اس کی تعریف کی میں اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت رنگ لائی ہے اور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ آپ جیسے زیرک قارئین کی سمجھ میں آ رہی ہے۔ جناب عبدالجبار رومی صاحب کا تبصرہ بھی خوب ہے۔ عبدالجبار بھائی میری شاعری پسند کرنے پر میں آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں، آخر میں جناب غلام یاسین نوناری صاحب کا مختصر تبصرہ اچھا تھا۔ عمران بھائی اس دفعہ آپ نے گفتگو میں تقریباً 21 قارئین کے تبصرے شائع فرما کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ ان میں اکثر تبصرے بڑے طویل تھے۔ فاطمہ ثریا بجیا کے انتقال کی خبر دل کو بہت غمگین کر گئی۔ ادب کا انوکھا باب ختم ہو گیا رب کائنات ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین، اقرا میں محترم طاہر قریشی صاحب جس طرح رب کائنات اللہ کے بارے میں ہمارے دل و دماغ کو روشن فرما رہے ہیں خدا انہیں اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔ تجزیہ میں واجب الاحترام جناب عبدالحمید صاحب نے جو معلومات ہمیں عطا فرمائی ہیں وہ بہت ہی قابل ستائش ہیں۔ تجزیہ کے آخر میں انہوں نے جس چاہت کے ساتھ میرے کلام کے چار اشعار پیش فرمائے ہیں وہ ان کی باریک بینی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کہانیوں میں ریاض بٹ صاحب کی عاقبت اندیش نے بہت متاثر کیا اس ماہ کے شاعر میں آپ نے محترمہ زریں قمر صاحبہ کا تعارف اور کلام پیش فرمایا اللہ کرے زور قلم اور زیادہ خوش بوئے سخن میں اور ذوق آگہی میں انتخاب بہت خوب ہے زریں قمر صاحبہ کی سلگتے چنار بھی خوب رہی۔

عالیہ انعام الٰہی...... کراچی۔

محترم عمران بھائی، السلام علیکم۔ رب تعالیٰ سے امید قوی ہے کہ آپ بخیریت و عافیت ہوں گے۔ آپ کی محنت، تگ و دو، مصروفیت اور ہمت لاجواب نئے افق کے ہر نئے شمارے کی صورت میں ظہور ہوتی رہتی ہے۔ نئے افق سے قطعی دور نہیں ہوں ہاں البتہ رابطہ منقطع ہوئے کافی لمبا عرصہ گزر گیا ہے کچھ تو مصروفیات آڑے آتی رہیں کبھی مزاج کی بدمزاجی راستہ روکتی رہی اور اکثر شمارہ موصول ہی بہت دیر سے ہوا اب شہر سے دور یہاں گلزار ہجری کی حدود میں آئے ہوئے تیسرا سال شروع ہو چکا ہے مگر نئے افق کے لیے وہیں فیصل بازار، مینا بازار کے اطراف کے چکر لگانے لڑتے ہیں جو کبھی بھی وقت پر ممکن نہیں ہو پاتا کہ رسالہ مل جائے۔ جنوری کا شمارہ ہی ابھی پچھلے ہفتے مل سکا ہے کہ اب شہر کی طرف جانا ذرا کم ہی رہ گیا ہے وہ تو قسمت کہ بھائی نے فروری کا نئے افق دو فروری کو لا دیا تو چانس لے کر خط لکھنے بیٹھ گئی ہوں حالانکہ مکمل مطالعہ تو قطعی ناممکن ہے پہلے جب آتش جوان تھا تو ایک ہی رات میں تمام شمارہ پڑھ کر دم لیتے تھے اب تو یقین کریں آٹھ بجتے ہی دماغ کی بتی گل ہونے لگتی ہے۔ سونے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں سوجھتا، کچھ دل سے لگن اور امنگ رخصت ہو چکی ہے جو مہمیز ہوا کرتی تھی قلم کو لگام ڈال کر صفحہ قرطاس پر ایڑ لگا کر دوڑ لگا دینے کی۔ مگر اب بھی سرد ہوتے ہوئے جذبوں کو نئے افق کا دیدار وہ حدت عطا کرتا ہے جو میں گیارہ سال کی عمر میں نئے افق کے مطالعے سے حاصل ہوا کرتی تھی اس ماہ کے نئے افق کا سرورق لاجواب رہا۔ شاید کسی کی راہ دیکھتی ہوئی خوب صورت دوشیزہ اور راستوں میں مائل بہ سفر مسافر مگر ایسا شاذ و نادر ہی ممکن ہو پاتا ہے کہ راستے کی دھول سے اڈتا ہوا پہلا چہرہ ہی آپ کے انتظار میں اختتام پذیر ہونے کا پیغام ثابت ہو، ورنہ اکثر اوقات راستے وقت کی دھول میں گم ہو جایا کرتے ہیں اور آنکھیں جذبے کی جگمگاتی ہوئی قندیل سے بے نیاز ہو کر اندھیرے غار جیسی ہو جایا کرتی ہیں۔ دستک میں مشتاق انکل کی موجودہ سیاسی منظر نامہ پر سیر حاصل گفتگو اچھی رہی۔ انکل ان موضوعات پر ہمارے گھر میں صبح و شام خوب تبصرے ہوتے ہیں کیونکہ ابو کا کمرہ ہو یا بھائی کا چاہے کامن ڈرائنگ روم میں ہر جگہ ٹی وی پر صرف نیوز چینل ہی چل رہے ہوتے ہیں گفتگو میں نئے پرانے بہت سے چہرے خوب رونق لگائے ہوئے تھے دنیا تو ہوتی ہے آگے بڑھنے کے لیے ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا۔ شہناز باجی، شہنی، عبدالمالک کیف، شاذ بھائی،

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

پیاری نازش اور سب سے بڑھ کر بخش انکل کی غیر حاضری بہت کھلی۔ ریاض صاحب خوب ہی اپنی تحریروں کے ذریعے ذہنوں پر خوشگوار طریقے سے اثر انداز رہتے ہیں عمر فاروق بھائی کا روایتی طنطنہ ہمیشہ کی طرح بہت خوب معلوم دیتا ہے۔ ان کی باتوں میں اثر ہی اتنا ہوتا ہے کہ اختلاف کرنے کا تو بنتا ہی نہیں ہے۔ بھائی آپ کو میں یاد ہوں یا بھول گئے۔ آپ جیسا لکھنے کی خواہش ہی رہتی ہے۔ اقرا کا سلسلہ باعث ثواب و آگہی ہے کہ ہم جیسے دین سے دوری پر رہنے والوں کو ایسے سلسلے نصیب ہو جانا بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ مختلف رائٹرز کے انٹرویو پڑھتے پڑھتے طبیعت جلد ہی اوب جائے گی۔ اب رونق کیسے لگی یہ تو مجھے نہیں معلوم بس جو بات محسوس ہوئی کہہ دی۔ ''ٹماٹو کیچپ'' انتہائی حساس تحریر تھی خود کو بیان کرنا ثابت کرنا اور منوا لینا ایک لڑکی کے لیے کسی پہاڑ کی چوٹی کو سر کر لینے سے ہی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ خود کو زندہ رہتے ہوئے ختم کر لینا بڑا اذیت ناک تجربہ ہوتا ہے۔ لفظوں کے نرم پھولوں کی صورت احساسات کی مالا پرونے والوں پر سماج کے ٹھیکیدار کچھ اس طرح پابندی لگاتے ہیں کہ پھول چننے والے ہاتھ رویوں کے کانٹوں سے چھلنی ہو جاتے ہیں ڈھیر سارا ہنر منوں کے حساب سے لطیف جذبات، کومل جذبات کے انبار، معاشرتی پابندیوں اور سماج کی جھوٹی اناؤں کی بھینٹ جب چڑھتے ہیں ناں تو نہ تو کہیں دھواں اٹھتا ہے نہ کہیں ماتم سنائی دیتا ہے اور نہ ہی کوئی آنسوؤں کا ریلا دکھائی دیتا ہے۔ بس فقط ایک وجود باقی رہ جاتا ہے جس کا کام صبح سے لے کر رات تک ذمہ داریوں کو پورا کر کے تھک ہار کے پڑ جانا ہوتا ہے۔ جیتے جی روزانہ بے حسی کی لحد میں اترنا اتنا آسان نہیں ہوتا جتنا ایک ہی بار کفن پہن کر قبر میں اتر جانا ہوتا ہے۔ فن پارے پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ ''دہلی میں موت'' سماعتوں کی زبان سناتی ہوئی زبان سے ادا نہ ہونے والی باتوں کو انداز تکلم عطا کرنے والی تحریر تھی۔ طبیعت حساس ہو تو دور و نزدیک بپا ہونے والے مغربی شور اور موت کے ہاتھوں اٹھنے والے بڑے طوفانوں کو سن بھی لیا جاتا ہے اور سمجھ بھی لیا جاتا ہے ورنہ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے زیست یونہی تمام ہوتی ہے۔ ''اگنی پریکشا'' بہت مختصر مگر بہت وسیع اثر انگیزی کی حامل تحریر تھی کہنے سننے کو اس میں شاید کوئی کہانی نہیں تھی مگر کیا کسی بھرپور زندگی کا موت میں ضم ہو جانا بذات خود کوئی بڑا قصہ نہیں ہے۔ ''کتنے دہشت گرد'' موجودہ حالات کے تناظر میں ایک جھنجوڑ دینے والی کہانی رائی کا پربت بنا لینا اندیشوں کو طوفان بنا لینا انسانی ذہن کی فکری کمزوریوں کو ظاہر کرتی ہے جو اکثر اوقات ایسے ہی کسی دلدوز سانحہ پر منتج ہوتی ہے۔ ''غدار'' حب الوطنی کے جذبے سے معمور ایک بوڑھے کی اولاد جو نادانستگی میں غداری کر بیٹھا مگر ضمیر کے شفاف لوگ کبھی خود سے جھوٹ نہیں بول پاتے۔ دنیا سے جھوٹ بول کر اپنا آپ بچا لینا بڑا آسان ہوتا ہے مگر اپنے دل اور روح کے آگے صاف نیت کے لوگ ایسے ہی جان لٹا دیا کرتے ہیں۔ ''یکم اپریل'' مغربی تقلید کی خاطر خود کو نقصان پہنچاتی ہوئی ہماری تہذیب اور اخلاق قدروں کے لیے ایک بھرپور طمانچہ تھی شاید کہ ہم آج بھی ہوش کے ناخن لینے پر آمادہ ہو جائیں ورنہ خود سے جدا ہو کر غیروں کی تقلید کرنے والی قوموں کی تقدیر میں فقط تباہی اور رسوائی ہی رہ جاتی ہے۔ ''میرا محرم میرا مجرم'' نئے افق کی روایتوں سے ہٹی ہوئی تحریر تھی۔ بہت سی پرنٹنگ کی غلطیوں کے باعث پڑھنے میں کافی دقت آتی رہی۔ غلط فہمیاں اور بدگمانیاں انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتیں۔ ایک لمبے عرصے کے لیے جدائی کی تڑپ سے متاثر ہوتے ہوئے جذبوں کی یہ کہانی دل کو لبھانے والے رومانس کا کہیں نام و نشان نہ تھا مگر دل بے نام سی اذیت اٹھاتا ہوا دکھائی دیا۔ کبھی ماضی تو کبھی حال کے قصے کہانی کو جوڑے رکھنا کافی مشکل کام تھا مگر خوب ہوا، حالانکہ پڑھتے ہوئے کافی الجھن ہوتی رہی۔ بہر حال یہ ناولٹ اچھا رہا حالانکہ اس تجربہ کو پسند کر لینا میرے مزاج کے خلاف ہے عمران بھائی مزید مطالعہ ناممکن ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی میں ضرور مطالعہ کر کے رائے سے آگاہ کروں گی۔ اللہ حافظ

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ محترم مدیر صاحب کیسی طبیعت ہے امید ہے کہ اللہ کی رحمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ قدرے دیر سے موصول ہوا جس کی وجہ ہماری یونیورسٹی میں طلبا تنظیموں کا تصادم اور حالات کی خرابی تھی۔ لائبریری کافی دیر بند رہی۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے کامیاب مذاکرات کے ذریعے صورت حال پر قابو پانے کی سعادت بھی اس بندہ ناچیز کے حصے میں آئی۔ بہر حال، حسینہ کی زلفوں کی اوٹ سے جھلک دکھلاتے ہوئے سورج کے ساتھ سرورق اس بار بھی منفرد تھا۔ بلاشبہ اس معاملے میں نئے افق نے بہت کم عرصے میں بہت زیادہ بہتری حاصل کی ہے۔ امید کرتا ہوں بہتری کا یہ سفر جاری رہے گا۔ سرورق سے جو چھلانگ لگائی تو سیدھا گفتگو میں جا ٹپکے۔ واللہ، اس دفعہ محفل گفتگو کو جس وسیع القلبی کو وسعت عنایت فرمائی گئی ہے اس نے تو ہمارا دل جیت لیا۔ میں چاہوں گا کہ مستقل طور پر خطوط کی تعداد اتنی ہی کر دی جائے جتنی اس مرتبہ تھی۔ امجد جاوید صاحب کرسی صدارت پر براجمان پائے گئے جناب جتنی اچھی کہانیاں لکھ لیتے ہیں اس سے کہیں بہتر تبصرہ کرتے ہیں۔ نا جانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ بھائی جان کو میرے اوپر خاص تپ چڑھی ہوئی ہے مگر

صبر کا پیالہ پی کر رہ گئے ہیں۔ محترم ہمارے سینئر لکھاری ہیں تنقید کے کوڑے برسا بھی دیتے تو ہم ہنس کر سہہ لیتے۔ خیر آپ کے تجویز کردہ دیسی نسخہ جات استعمال کرنے کی کوشش کروں گا، دعا فرما دیجیے گا۔ ناز سلوش ذشے آپ کے نام کا پس منظر جان کر میں دنگ رہ گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ بعض اوقات بندے کی اس حد تک بھی مت ماری جاتی ہے جو سیدھا سادا نام ہو انسان اس کو ہی آگے لے کر چلے تا کہ ان کا مان بھی بڑھے جنہوں نے جنم دے کر ہزاروں چاہتوں سے نام رکھا ہوتا ہے شاید کوا چلا ہنس کی چال بھی اسی کو کہتے ہیں۔ رانا حبیب الرحمان صاحب خوش آمدید۔ ماہنامہ سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ میں طبع آزمائی کرتے ہوئے آخر آپ نے نئے افق میں بھی قدم رنجہ فرما ہی دیا وہاں تو آپ خاصا اچھا لکھا کرتے تھے مگر یہاں کیا ہو گیا؟ کلومیٹرز کے حساب سے لمبا تبصرہ اور منہ متھے کے بغیر......؟ شروع میں کہہ رہے ہیں کہ چپ ہی بھلی اور آخر میں نئے افق کے تمام غریب لکھاریوں کو چیلنج کر دیا کہ ہو جس میں دم آئے آزمائے مجھے اس بہادری کے لیے تعریف قبول فرمائیں۔ مگر خیال رکھیے گا کہ نئے افق کے تبصرہ نگاروں میں بڑے بڑے توپ قسم کے بندے پڑے ہیں جو ایک ہی توپ سے اکیس توپوں کی سلامی دے دیتے ہیں محترم عبدالحمید صاحب نے اپنے تجزیے سے ہمیں حد درجہ متاثر کیا۔ یقین کریں اتنی محنت ہرایرے غیرے کے بس کی بات نہیں۔ یہ سب کچھ دلی تعلق کی بنیاد پر ہی ہو سکتا ہے۔ یقیناً عبدالحمید صاحب کے اس احسان کا بدلہ قارئین اور ادارہ چاہتے ہوئے بھی نہیں دے سکتا۔ ان کا تجزیہ ایک جھومر تھا جو انہوں نے نہایت ہی عقیدت سے نئے افق کی پیشانی پر سجا دیا۔ جب تک اس طرح کے مخلص لوگ ہمارے ساتھ منسلک ہیں تب تک ہم نئے لوگ بھی اپنی بساط کے مطابق نئے افق کی کامیابیوں میں حصہ ڈالتے رہیں گے۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف دو ناول اختتام پذیر ہوئے امجد جاوید صاحب ''عورت زاد'' کب تک لے کر آ رہے ہیں کوشش کریں کہ ذرا جلدی حاضری دیں ناصر ملک صاحب کو اب جانے مت دیجیے گا بلکہ ان سے کوئی طویل ناول شروع کرائیں دیگر کہانیوں میں ریاض بٹ سب سے اوپر موجود ہیں۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''شیطان'' نامی کہانی انتہائی دقیانوسی پلاٹ پر تعمیر کی گئی تھی۔ وہی پراسرار خوش بو، لوبان کی دھونی اور وہی بابا جی جو کہ اس طرح کی کہانیوں میں خاک چھانتے پھرتے ہوتے ہیں۔ البتہ سیاہ بکرے کی جگہ سیاہ مرغی اور کالے الو کی بجائے مرغی کا انڈہ شامل کر کے عزت مآب لکھاری نے دانشمندی کا ثبوت دیا۔ نوشاد عادل کی ''ضرورت'' نامی کہانی اچھی کاوش تھی۔ اس کے علاوہ راہ پرخار اور لب بام بھی زبردست تھیں۔ کہانیوں کے سلسلے میں میری ایک خواہش ہے کہ ہر بار کم از کم ایک آدھ تحریر تو مزاح پر مشتمل ہونی چاہیے گزشتہ دنوں میں نے ٹونی اور منظور سیریز شروع کر کے اپنی سی کوشش کی تھی جو کہ کسی حد کامیاب بھی رہی مگر اس کے بعد اس سیریز کی دو کہانیاں آپ کے پاس پڑی ہیں۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ آج کے اس دور میں جب ہر دوسرا بندہ ذہنی اذیت اور پریشانیوں سے دوچار ہے تو ایسے میں معیاری طنز و مزاح انسانی نفسیات پر ایک اچھا اثر ڈالتا ہے بڑھتے ہیں ذرا اپنے خوش بوئے سخن کی طرف آپ نے ریاض قمر صاحب کی پچھلی بار بلے بلے کرا کر اس دفعہ کھڈے لائن لگا دیا، یار کم از کم اس کی غزل تو ہر ماہ شامل کر دیا کریں دیگر ساتھیوں نے عمدہ لکھا خاص طور پر ڈاکٹر علی تابش کی غزل اچھی لگی آزاد نظموں کا لمبا سلسلہ چل نکلا ہے پہلے ایک فلسفے کی طالبہ ہوا کرتی تھیں اور اب نجانے کتنی محترمائیں اس میدان کارزار میں کود پڑی ہیں اس کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ایک آزاد نظم نجانے کتنی غزلوں کا حلق گھونٹ دیتی ہے۔ کیونکہ اس کا محل وقوع اور حدود دار بعہ خاصا وسیع ترین ہوتا ہے امید ہے کہ نوشین بہنا میری بات کو سمجھ گئی ہوں گی آخر میں اقبال بھٹی بھائی اور اپنے عمران صاحب کا خصوصی مشکور ہوں کہ ان کی پیار بھری توجہ سے میں نے مسلسل سب سے زیادہ خطوط لکھنے کا اعزاز اپنے نام کر لیا ہے دعاؤں میں یاد رکھیے گا، والسلام۔

بشریٰ کنول...... جناح کالونی، فیصل آباد۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب، سلام مسنون کیسے مزاج گرامی کیسے ہیں میں ایک اسکول ٹیچر ہوں اور ماہنامہ نئے افق کی خاموش قاری ہوں کئی جرائد پچھلے ایک لمبے عرصے سے میرے زیر مطالعہ رہتے ہیں مجھے مطالعے کا جنون کی حد تک شوق ہے یہ میرا نئے افق کو پہلا خط ہے اور خط لکھنے کی وجہ ڈائجسٹ کا معیاری ہونا ہے مجھے کوئی لمبا چوڑا تبصرہ کرنا تو نہیں آتا بس لگی لپٹی رکھے بغیر سیدھا سیدھا اپنے خیالات کو قلم بند کر رہی ہوں۔ دستک میں آپ نے عزیر بلوچ کی گرفتاری کے حوالے سے جو لکھا ہے اور جو نکتہ نظر آپ نے پیش کیا ہے وہ انتہائی اہمیت کا حامل قابل غور ہے۔ گفتگو میں سب لوگوں کے خطوط باریک بینی سے پڑھے۔ امجد جاوید، مجید احمد جائی، صائمہ نور کے خطوط مدلل تھے احسن ابرار رضوی نے زبردست انکشاف کیا ہے اور میں تائید کرتی ہوں صفحہ نمبر 158 پر شائع ہونے والی کہانی پاداش ایک چوری شدہ کہانی ہے۔ یہی کہانی کچھ عرصے پہلے ایک جریدے میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا عنوان ہوس کے پجاری تھا اور اصل مصنف سعید جاوید ہیں اب کئی سال کے بعد عامر زمان عامر نے اس کے کرداروں کے نام وغیرہ تبدیل کر کے اپنے نام سے شائع کرائی ہے تو یہ ایک انتہائی شرمناک اور

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

گھٹیا حرکت ہے۔ میں اس کی پرزور مذمت کرتی ہوں اور آپ سے ریکوئسٹ کرتی ہوں کہ خدارا ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی کریں کیونکہ اس طرح کی چوری شدہ تحریریں ڈائجسٹ کے معیار کو گرا رہی ہیں پیاری بہن ناز سلوش ذشے انعامی خط لگنے پر بہت بہت مبارک ہو آپ کا خط بہت خوب صورت تھا اور واقعی انعام کا حقدار تھا آپ نے درست کہا اب خواتین رائٹرز کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ ریاض بٹ صاحب آپ اگر برا نہ مانیں تو ایک گزارش ہے وہ یہ کہ انگریز دور کے احمد یار خان کی لکھی ہوئی کہانیوں کی طرز پر اب گھسی پٹی کہانیاں لکھنا چھوڑ دیں اب ان میں دم خم نہیں رہا۔ اب موجودہ دور کی پولیس کی تفتیش پر لکھیں جہاں ہر قدم پر ظالم اور مظلوم کی جیبیں کاٹی جاتی ہیں۔ پیسے کے بغیر نہ تو ایف آئی آر درج ہوتی ہے اور نہ ہی تھانیدار بات سنتا ہے جب تک اس کی جیب گرم نہ ہو، عمر فاروق ارشد تو صرف وضاحتیں کرتے نظر آئے۔ رمشا ملک میری بہن آپ نے ٹھیک کہا مذہب سے عاری اور ادب سے ناپید لوگ صرف کردار کشی ہی کر سکتے ہیں ان میں کوئی خوبی اور کمال تو ہوتا نہیں بس قلم کے ذریعے دوسروں پر برسنا ہی آتا ہے بھائی ممتاز احمد آپ نے محترم ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کے انٹرویو کی بات کی تو عرض کردوں میں خود ان کی بہت بڑی مداح ہوں وہ میرے استاد ہیں بس اب آپ اور انتظار نہ کرائیں جلد از جلد ان کا انٹرویو اور افسانہ بھیجیں یہ آپ کا ہم سب پر بہت بڑا احسان ہوگا اور ہاں اپنی بھی کوئی کہانی بھیجیں نا پلیز۔ فلک شیر ملک اور رانا حبیب الرحمان کے تبصرے بہت مدلل تھے بھائی ریاض حسین قمر کی شاعری بہت لاجواب تھی فروری کے شمارے میں بزرگوار جناب ایم حسن نظامی صاحب کی پہلی انٹری اچھی لگی۔ بھائی علی حسنین تابش کا خط مختصر مگر مدلل اور بہت اچھا تھا احسان سحر کا خط بہت طویل اور اچھا تھا۔ عبدالجبار رومی انصاری اور غلام یاسین نوناری کے خطوط بھی اچھے تھے۔ آپی جان زرین قمر کی شاعری اور کہانی سلگتے چنار نے تو دل جیت لیا۔ نوشاد عادل کی ضرورت بہترین کہانی تھی۔ راہ پرخار اچھی تحریر تھی۔ شاہدہ صدیقی بہت اچھی کہانی لے کر آئیں۔ شیطان شیطان زبردست کہانی تھی اوجھل اچھی کاوش تھی۔ باقی فن پارے ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ حنا نور، حمیرا فضا، عروج فاطمہ کی شاعری بہت اعلیٰ تھی۔ اب تک کے لیے بس اتنا ہی اگلے ماہ اپنے خط کے ساتھ حاضری کی کوشش کروں گی تب تک کے لیے اللہ حافظ۔

ریحانہ عامر...... بورے والا۔ پیارے انکل محترم مشاق احمد قریشی، محترم اقبال بھٹی، بھائی طاہر قریشی، ڈیر رائٹر حضرات۔ سلام مسنون۔ امید کو ہوں کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے، خداوند کریم ملک عزیز کو دشمن کے ناپاک عزائم اور ہر اندرونی و بیرونی آفت سے محفوظ رکھے (آمین) مارچ کے شمارے کا تفصیلی مطالعہ کیا جس کا خلاصہ و تبصرہ ذیل کی سطور میں حاضر خدمت ہے، اس دفعہ تو ٹائٹل بہت ہی پیارا تھا کیونکہ خوبصورت ریشمی زلفوں والی نازک حسینہ نے مارچ کے شمارے کا ٹائٹل جاندار اور قابل دید بنا دیا، ابتدا انکل مشتاق قریشی کے فکر انگیز اداریے سے کی جس میں سندھ کی برسر اقتدار حکومت کے کرتوں کا تجزیہ بیان کر کے انکل قریشی صاحب نے حق ادا کر دیا، حیرت انگیز انکشافات پڑھ کے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمرانوں نے صرف کرپشن، لوٹ مار کا ہی بازار نہیں گرم کر رکھا بلکہ قتل و غارت، بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان اسٹریٹ کرائم سمیت تمام مجرمانہ سرگرمیوں میں ملک دشمن عناصر کی پشت پناہی کرنے والے بھی ہمارے ہی حکمران ہیں جن کی بدولت روشنیوں کے شہر کا امن غارت ہو چکا ہے، مٹھی، تھر سمیت پورا سندھ مسائل کا شکار ہے، ان کی کارستانیاں جان کر دل تو کڑھتا ہے مگر پوری قوم سے میرا ایک سوال ہے کہ قوم کب تک چشم تماشائی رہے گی ہم عملی طور پر ان کے خلاف کب سرگرم ہوں گے کیا یہ فرض محض اہل قلم، میڈیا پر عائد ہے، کیا پست معیار زندگی، غربت، پسماندگی، بدامنی ہی ہمارا مقدر ہے، جن معصوم ہاتھوں میں قلم کتاب ہونی چاہیے تھی آج ان ہاتھوں میں یا تو بم، بندوق ہے یا کشکول گدائی ہے، بھوک زندگی کی تہذیب بھلا دیتی ہے۔

تُو تو رازق ہے تجھ سے کیا پردہ
کل سے بچوں نے کچھ نہیں کھایا

نئے افق کا مستقل سلسلہ اقراء پڑھ کر دلی تسکین ملتی ہے۔ معروف ڈرامہ، افسانہ نگار محترمہ فاطمہ ثریا بجیا کی جدائی کا دلی صدمہ ہوا ان کی رحلت کی صورت اردو ادب کا ایک سنہری باب بند ہو گیا، خدا ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔ خطوط کی محفل میں اول انعام کی حق دار آزاد کشمیر کی ہماری بہن ناز سلوش فشے لاجواب تبصرے کے ساتھ سرفہرست ہیں، پیاری ناز آپ کو کس نے کہہ دیا کہ نئے افق کی سرزمین پہ محض مردانہ رائٹرز کا قبضہ ہے، حال ہی میں میرا افسانہ ”کشکول“ نئے افق کے صفحات پہ جگمگایا تھا شاید آپ کی نظر سے نہیں گذرا، بہرحال فکر ناٹ ہم تمام بہنیں مل کر خواتین رائٹرز کی شرح کبھی کم نہیں ہونے دیں گی، گڈ سسٹر بلا تاخیر گفتگو میں شرکت کرتی رہنا، آپ کا خط پڑھ کے بہت خوشی ہوئی، گذشتہ ماہ کا خط جس میں ان تمام خواتین و حضرات کا شکریہ ادا کیا تھا جنہوں نے

میرے افسانے کو پسندیدگی کی سند سے نوازا اگر شاید وہ خط ادارہ کی ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا۔ بہرحال جن بہن بھائیوں نے حوصلہ افزائی کی ان کی تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔ خطوط میں ایک راز جو باوجود کوشش کے ہضم نہیں ہو سکا ایک ہی حضرت نے تین عدد خط تین مختلف ناموں سے لکھے بالترتیب تینوں ہی خطوط کا طرزِ تحریر اور متن بخوبی پول کھول رہا ہے، انکل حسن نظامی اور بھائی ممتاز احمد اچھے الفاظ میں یاد آوری کا شکریہ، سولہ سال بعد انکل عبدالحمید نے تو سولہ سال کی کسر ایک ہی شمارے میں پوری کر دی، آپ کے تبصرے کی داد دینا پڑے گی، ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے اپنی فیورٹ لکھاری پیاری آنٹی زرین قمر کی ”سلگتے چنار“ پڑھی جو کہ بہت متاثر کن تھی انشاء اللہ ایک نہ ایک دن تو ضرور ہمارے کشمیری بھائیوں کی قربانیاں رنگ لائیں گی، طاہرہ جبیں کی رگ جاناں، ریاض بٹ کی عاقبت اندیش اور نوشاد عادل کی ”ضرورت“ دونوں میں معاشرتی جھلک نظر آتی ہے، زینب اصغر کی پس آئینہ، یاسین صدیق کی تخلیق ”راہ پُرخار شاہدہ صدیقی کی لب بام، عتیق حسن بیگ کی شیطان لاجواب تخلیقات ہیں جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں، عامر زمان عامر کی پاداش جنسی ہوس کا شکار کرداروں کی نشاندہی کے ساتھ دوستی جیسے نازک رشتوں میں شعور کا درس بھی دیتی ہے، بھائی پرویز دولو کی لاجواب شاہکار تخلیق، باعصمت سبق آموز اور ٹاپ آف دی لسٹ کہانی تھی گڈ بڑے بھائی، ذوقِ آگاہی کالم میں بھی کے انتخاب اچھے تھے، خوشبوئے سخن میں حنا نور، حمیرا فضا، عروج فاطمہ اور کامی شاہ کی شاعری بہترین اور لاجواب تھی، نامور شاعرہ زرین قمر کا تعارف اور شاعری پڑھ کر خوشی کے ساتھ خوشگوار حیرت بھی ہوئی کہ آپ باکمال کہانی نویس کے ساتھ ساتھ بہترین شاعرہ بھی ہیں ان کے کلام میں فنی پختگی، گہرا مشاہدہ اور فطرت کے مناظر کی عکاسی، بے مثال ہے خدا آپ کو مزید کامرانیاں عطا کرے، کسی کو کوئی بات بری لگی ہو تو اس کے لئے معذرت بہت جلد تازہ کاوش کے ساتھ حاضر ہوں گی تب تک اجازت۔ خدا حافظ۔

عامر زمان عامر...... بورے والا۔ مدیر محترم و قارئین کرام آداب عرض! ورطہ حیرت کے تخیل میں ڈوبی دلکش حسینہ کے ساتھ سرورق جاذبِ نظر تھا، مارچ کے شمارے کی دستیابی اور راقم الحروف کی تخلیق ”پاداش“ شاملِ اشاعت کرنے پر ادارہ ”نئے افق“ کا ممنون ہوں ”جناب مشتاق قریشی“ کے نشتر قلم سے سیاسی قائدین کو آئینہ دکھاتا، عوام الناس کے ضمیر جھنجوڑتا ”دیکھنا ہے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا“ پڑھا، بہت خوب، کاش یہ بازگشت اقتدار کے نشے میں مست حاکم وقت کے ایوانوں تک سنائی دے، ازل سے غلام ابنِ غلام قوم کے لئے صورِ فیل کا کام کرے، صد افسوس کہ کرپشن زدہ نظام کا پودا ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے سیاست کی زمین پہ بویا ہے، جو ہماری لاچارگی کے صحنوں میں روز بروز پھیلتا جا رہا ہے۔ مقام غور و فکر تو یہ بھی ہے کہ قوم دلی یکسوئی و سنجیدگی کے ساتھ پختہ عزم کی ٹھان لے تو تقدیر بدل جائے بقولِ محسن نقوی۔

کل شب یوں ہوا کہ ہواؤں کے دوش پر
بجھتے ہوئے چراغوں نے جلنے کی ٹھان لی

قابل قدر امجد جاوید ”عورت زاد“ کے لئے پیشگی مبارکباد قبول کیجئے۔ خداوند کریم محترم کاشف زبیر صاحب کو شفائے کاملہ دے۔ اردو ادب کے معتبر حوالے ”فاطمہ ثریا بجیا“ ممتاز مصنف محی الدین نواب، محمد اعظم کو خدا جوارِ رحمت میں جگہ اور جملہ لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، بھائی ریاض بٹ، ریاض قمر، عزت افزائی کے لئے بے حد سپاس گذار ہوں۔ برادر عزیز ممتاز احمد سرگودھا۔ جس جنگ میں رشتوں کے ہار جانے کا اندیشہ ہو اس میں ہتھیار ڈال کر شکست تسلیم کر لینا ہی اصلی جیت ہے، اللہ رشتے برقرار رکھنے والوں کو پسند کرتا ہے، ہماری تو کسی سے کوئی ناراضگی ہے ہی نہیں کیونکہ ”مشک آنست کہ خود ببوید نہ عطار بگوید“ (خوشبو خود بتائے کہ ”میں“ خوشبو ہوں، نہ کہ دکاندار بتائے یہ خوشبو ہے) بڑے بھائی عبدالغفار عابد آپ کی مثبت سوچ اور محبتوں کا پیغام قابلِ صد تحسین ہے، بلاشبہ آپ کے تجزیے، تبصرے آپ کی بلند ظرفی کی واضح دلیل ہیں، آپ ہمارے قلمی فخر کا مان ہو حسن نظامی، آپ کے خط کی سطریں آپ کے ذوق کی آئینہ دار ہیں، اپنائیت کے لئے مشکور ہوں، ایمان افروز اسلامی سلسلے ”اقراء“ میں کتابِ حکمت کا ترجمہ و تفسیر پڑھ کر ایمان تر و تازہ ہو گیا، جزاک اللہ، سولہ سال کے طویل عرصے بعد محترم عبدالحمید نے چالیس سال چار ماہ تک کے نشیب و فراز کا تجزیاتی نچوڑ کاغذ کے حوالے کر دیا، قوتِ حافظہ اور ذوقِ مطالعہ پہ آفرین ہے۔ محترمہ زرین قمر کے قلم سے جدوجہدِ آزادی کی روداد پہ مبنی ”سلگتے چنار“ میں سطر بہ سطر غاصب سامراج کو آزادی کا پیغام دیا گیا ہے، گذشتہ کئی دہائیوں سے آزادی کے متوالے مظلوم کشمیری بھائی جذبہ آزادی لئے فصیلِ شب میں روزن بنانے نکلے ہیں، رات کس قدر کالی ہی کیوں نہ ہو چٹکی بھر روشنی سے ہار جاتی ہے، وہ دن دور نہیں جب کشمیری عوام کے نہ حق خون سے آزادی کا سورج پھوٹے گا (انشاء اللہ) ”عاقبت اندیش“ میں پیشہ ورانہ معمولات سے ایک واقعہ سادہ زبان میں بیان کیا گیا جو کہ شوہر سے ازدواجی انتقام کی عام سی کہانی ہے (معذرت کے ساتھ) بوقتِ تخلیق کہانی کے

متن کی مناسبت سے موزوں عنوان اور کردار کی مماثلت کے لحاظ سے نام کا انتخاب فنی پختگی کا لازمی جز ہے، جھگیوں میں رہنے والے پکھی واس کردار کا نام افشاں تجویز کرنا سوٹ نہیں کرتا، کردار سے مشابہت کا حامل نام منتخب کیا جاتا تو حسن اور بڑھ جاتا بہرحال تھیم اچھا تھا اور ہاں ریاض بٹ صاحب یہ میری ذاتی رائے ہے جسے قبول یا رد کرنے کا مکمل اختیار آپ کو حاصل ہے۔ نوشاد عادل کی ''ضرورت'' میں معاشرے کی تلخ حقیقت بے نقاب کرنے کی اچھی کاوش ہے۔ خواہشات کا دائرہ وسیع کرلینے سے اپنے ہی نفس کے ہاتھوں خواری ہوتی ہے ''عشق کسی کی ذات نہیں'' آخری کڑی لاجواب رہی۔

قُربتِ یار سے محسن کو بقا ملتی ہے
ظرف پروانے کا چھوٹا ہے جو مر جاتا ہے

محترم یاسین صدیق کی تخلیق ''راہ پُر خار'' مصنف کی عمدہ کاوش ہے، جذباتیت کی رو میں سرزد ہمارے اکثر فیصلے عمر بھر کے لئے پچھتاوے کے طوق بن کر گلے سے لٹک جاتے ہیں مغربی ادب سے کشید شدہ ''لبِ بام'' میں اندازِ بیان، منظر نگاری کا فن، الفاظ کی مینا کاری لاجواب ہے، عتیق حسن بیگ کی ''شیطان'' رحمن اور شیطان کی پیروی کے درمیان واضح خط کھینچتی ہے، جاگیردارانہ نظام کے خلاف بھرپور انداز میں کلمہ حق بلند کرتے نظر آئے بھائی مہر پرویز احمد دولوانی شاہکار تخلیق ''باعصمت'' میں، بطور ماہر کہانی کار مہر پرویز کی ہر تخلیق بذریعہ قلم مشاہدہ بلاشبہ منفرد ہوتا ہے۔ محترم حسن عادل کی ''اوجھل'' پڑھ کر دوستی جیسے مقدس رشتوں کے گرد گھومتا منفرد مشاہدہ ہے، جس میں ہر حال میں رشتے مقدم رکھنے کا درس ملتا ہے، صدرامین الدین کی ''بے چین شہر کی پرسکون لڑکی'' باہمی درد سے عاری لوگوں کے لئے اچھا میسج ہے بطورِ خاص مصنف کا شاعرانہ عنوان منتخب کرنا بے حد پسند آیا، فکر و فن کے نایاب گوہر یافتہ ''رگِ جاناں'' طاہرہ جبیں تارا کے نشترِ قلم سے معاشرے کے پوشیدہ کرداروں سے خوب انصاف کرتی ہے، جس میں ہر خاص و عام کو لاجواب انداز سے دعوتِ فکر دی گئی ''پسِ آئینہ'' ثمینہ چوہدری اور مہرین مرزا کی صورت رشتوں کو اجاگر کرتی ناقابلِ فراموش کہانی ہے ویلڈن زینب اصغر مغل عمران راجپوت کی ''یادوں کی پرچھائیاں ماضی کی یادوں سے جڑی تلخیوں کی ایک ہلکی سی تصویر ہے، یادوں سے کٹ کر جینا بھی ممکن نہیں مگر جو اپنے ماضی کو یاد رکھتا ہے اس کے زخم ہمیشہ تازہ رہتے ہیں۔ ''خالد جاوید کی قربانی'' کی پیشانی پر ایڈیٹر کی جانب سے زریں الفاظ کچھ اس طرح رقم تھے ''وہ محبوبہ تھی، دوست تھی، محبوبہ تھی، محافظ یا قاتل تھی'' جو کہ یقیناً پروف ریڈنگ کی غلطی ہو سکتی ہے مگر ایڈیٹر محترم سے گذارش ہے گو کہ معمولی غلطی ہے مگر معیار کے ساتھ پروف ریڈنگ کسی بھی پرچے کی مقبولیت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے بہرحال کہانی اچھی تھی۔ آغاز الدین کے قلم سے ''گورکھ دھندا'' لمحاتی مشاہدے کے ساتھ مغربی و مشرقی کلچر کی بھرپور نمائندگی کرتی بہترین کوشش ہے، ذوقِ آگاہی پڑھ کر خوشی ہوئی کہ میرے اپنے ضلع وہاڑی سے محترمہ شمائلہ رفیق نے میدان مارا ہے علاوہ ازیں مہر پرویز، ریاض بٹ اور گل مہر کے انتخاب اچھے تھے خوشبوئے سخن میں صداقت حسین ساجد کا احمد فراز کے کلام سے انتخاب انعام یافتہ ٹھہرا، حنا نور، عروج فاطمہ، عمر فاروق ارشد، سید کاظمی شاہ کا کلام قابلِ تعریف تھا ناصر ملک کے قلم سے مخصوص کیفیت میں تخلیق شدہ زادِ راہ کے آخری حصے کا اختتام بھی اچھا رہا اپنے نام کی معنوی تعبیر رکھنے والی خوش شکل، شاعرہ محترمہ زریں قمر کا تعارف اور دلوں کے تار چھوتا کلام پڑھ کر شاعرانہ جذبوں کو تقویت میسر آئی، مشاہدات سے ذات کے سفر پہ نکلنا درحقیقت آگاہی کی طرف بڑھنے کا واضح اشارہ ہے کیونکہ باہر کے مناظر سمٹ کر ذات میں حلول ہوتے ہیں تو احساس و جذبے نمو پاتے ہیں، پھر یہی جذبے اظہار کو الفاظ کے ڈھانچے میں ڈھالتے ہیں تو حرف صورتِ بسمل قرطاس کی چادر پہ ٹوٹنے لگتے ہیں، زریں قمر کے کلام میں نئی تراکیب، لفاظی و مینا کاری پڑھنے والے کو مجبور کرتی ہے کہ ٹھٹک کے رک جائیں، عجیب سی دھند کے غلاف میں لپٹے مناظر کے بیان میں لفظوں کا برمحل استعمال جملوں کو دو آتشہ کر دیتا ہے، اس کے اندازِ اسلوب میں خیال کی کوملتا بھی ہے اور الفاظ کی سندرتا بھی اسے لفظوں کو اذنِ خرام دینا بھی آتا ہے اور خیال کو پر لگانا بھی آتا ہے۔ زریں قمر کی جو خوبی عہدِ حاضر کے جملہ ہم عصر شعراء سے ممتاز کر کے اسے پروانے جیسا ظرف بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ نہ صرف فطرت کے بیان میں قدرت نے آپ کو مناظر کی زبان دے رکھی ہے بلکہ آپ کمال فطرت شناس بھی ہیں جیسا کہ انگریزی ادب میں رجحان ہے کہ (William Words Worth) کو فطرت کا شاعر کہا جاتا ہے۔ کلام میں جا بجا عصری شعور، قومی و ادبی فکر، ملی احساس، عوامی درد اور معاشرتی زبوں حالی کی کسک بھی نظر آتی ہے۔ کلام میں مشاہدے کے بیان کے موضوعات اور شیڈز مختلف ہیں، لہجے کی کاٹ، بلند خیالی، منظر کشی، محبوب سے مکالمہ، آگاہی، غمِ دنیا و دل، زمانے سے گلہ گزاری، زندگی و کائنات کے بارے سوالات اور مذہبی فکر اس کی اجزائے ترکیبی ہیں دلی دعا ہے کہ اس کی شاعری دوائمی پذیرائی حاصل کرے اور کومل جذبوں کی عکاس زریں قمر اپنے مداحوں کے لبوں پہ مانندِ گلاب

سدا مہکتی رہیں۔ (آمین)

گل مہر ...... کراچی۔ السلام علیکم امید ہے کہ آپ اور نئے افق کا اسٹاف خیریت سے ہوں گے سب سے پہلے تو مارچ کے مہینے کی غیر حاضری پر معذرت مصروفیت کے باعث گفتگو کی محفل میں شریک نہ ہوسکی جس کا بے حد افسوس ہوا۔ مارچ کا نیا افق بھی اس بار ہماری طرف دیر سے آیا لیکن شکر ہے کہ مل گیا بہرحال مارچ کا شمارہ ملاحظہ کیا حسب معمول ٹائٹل پر نگاہ ڈالی بدیسی گرل کا کلوز اپ اس کے عقب سے طلوع آفتاب کا حسین منظر ہمیں امید صبح بہار رکھنا کا پیغام دیتا محسوس ہوا۔ پھر افق پر محو پرواز عقاب کو دیکھا واہ کیا شان ہے اس کی اور کس شان سے فضا میں محو پرواز ہے۔ غالباً ان کی جوڑی دار ہیں جو اپنے سرتاج کو بڑے فخر سے گردن اٹھا کر پرواز کرتا دیکھ رہی ہیں لیکن یہ خوب صورت منظر لڑکی کے عقب میں چھپ گیا بہتر ہوتا کہ لڑکی کے کلوز اپ کے بجائے اس کی تصویر کو چھوٹا کر دیا جاتا اور بیک گراؤنڈ کو نمایاں کر دیا جاتا تو یہ خوب صورت بیک گراؤنڈ اور واضح ہو جاتا ہمیں تو طلوع آفتاب کا منظر بے حد پسند ہے ایک سحر سا طاری کر دیتا ہے طلوع اور غروب ہوتا آفتاب، ٹائٹل گرل سو سو لگا بحیثیت مجموعی سرورق اچھا لگا۔ ٹائٹل دیکھنے کے بعد جناب مشتاق احمد قریشی کی دستک پر لپکے اس بار انہوں نے دستک کے نیچے کیپشن لگایا دیکھنا ہے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا؟ آپ نے عزیر بلوچ کے بارے میں بتایا کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ یہ سب آپ پہلے بھی دیکھ چکے ہیں آگے دیکھنے کے بجائے ہم پیچھے مڑ کر کیوں نہ دیکھیں جب بالکل اسی طرح صولت مرزا کو میڈیا کے سامنے پیش کیا جارہا تھا روز نئی تفتیش، روز نئے ہولناک انکشافات اس نے بھی اپنے گاڈ فادر کے متعلق سب بتا دیا تھا لیکن آؤٹ کم کیا نکلا وہ تو قاتل تھا اپنے انجام کو پہنچ گیا لیکن اس کے کرتا دھرتا اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا لیکن کیا یہ منصفانہ عمل ہے ایک شخص سب کے کرتوت کھلے بیان کر رہا ہے لیکن انہیں اپنے اشاروں پر نچانے والے آزاد ہیں دندنا رہے ہیں حالانکہ ان کے سارے کرتوت قانون نافذ کرنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں اب کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی چلے گی اور کچھ نہیں ہوگا۔ قانون واقعی اندھا ہے ملک میں انصاف ملنا محال نظر آتا ہے ان مجرموں کی پشت پناہی کرنے والے آزاد رہیں گے۔ عزیر بلوچ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا اس کے بعد کوئی اور عزیز بلوچ یا صولت مرزا کی شکل میں اسکیپ گوٹ تیار ہوجائے گا جانے کب تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اب کچھ خطوط کے بارے میں اس بار اکیس خطوط گفتگو کی محفل میں شامل تھے ایسا لگ رہا تھا کہ اکیس تارے محفل کو روشن کر رہے ہیں۔ مزید کچھ کہنے سے پہلے میں ان تمام اراکین محفل کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے میرے خط اور تبصرے کو پسند کیا محترم مجید احمد جائی، صائمہ نور، احسن ابرار رضوی، ریاض بٹ، عامر زمان عامر، ممتاز احمد، ریاض حسین قمر، ایم حسن نظامی، احسان سحر، عبدالجبار روحی انصاری، غلام نوناری یاسین اگر کوئی نام رہ گیا تو معذرت آپ سب کا بے حد شکریہ، خطوط میں سب سے پہلا خط امجد جاوید صاحب کا تھا جو کچھ شکایتی سا لگا آپ جناب نے ارشاد فرمایا کہ دل کے پھپھولے پھوڑنے اور علمیت جھاڑنے کے لیے علیحدہ سے صفحات مختص کیے جائیں امجد صاحب نہایت معذرت کے ساتھ مجھے آپ کی بات سے اختلاف ہے بقول آپ کے خطوط میں صرف کہانیوں پر تبصرہ کیا جائے شاید آپ نے غور نہیں کیا کہ ان خطوط میں قارئین اور رائٹرز بھی ہر موضوع پر دل جمعی سے سیر حاصل تبصرہ کرتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں ان معاملات سے دلچسپی ہے خط آدھی ملاقات کہلاتا ہے اب اتنے طویل خط میں انسان صرف کہانیوں پر تبصرہ کر کے گفتگو کا اختتام نہیں کر سکتا۔ اپنے دکھ درد ایک دوسرے سے شیئر کرنا یا ملکی اور غیر ملکی معاملات پر تبصرہ کرنا علمیت جھاڑنا نہیں بلکہ یہ اپنی رائے کا اظہار ہے میرے خیال میں محفل گفتگو میں ہر طرح کی ورائٹی ہونی چاہیے۔ اس سے محفل کا حسن برقرار رہتا ہے۔ اگر کسی ایک ہی چیز کو موضوع بحث بنا لیا جائے گا تو اس سے محفل کی رونق ماند پڑ جائے گی اور لوگ بے زاری کا اظہار کرنے لگیں گے۔ بہرحال ہر شخص کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسرا خط مجید احمد جائی صاحب کا تھا آپ نے فرمایا کہ سیاست کو ادب میں نہ گھسیٹا جائے بجا فرمایا لیکن جناب کون سا شعبہ ایسا ہے جہاں سیاست نہیں چل رہی ادب میں سیاست آل ریڈی موجود ہے میں نے فروری کے نئے افق کے خطوط پڑھے تھے میں حیران رہ گئی تھی پڑھ کر مجھے ایسا لگا تھا کہ جیسے ہماری نام نہاد گریجویٹ اسمبلی کے اراکین آپس میں دست و گریباں ہوں خواتین تو مفت میں بدنام ہیں مرد حضرات میں برداشت صبر و تحمل ناپید ہوگیا ہے۔ یہ ہمیں خطوط پڑھ کر اندازہ ہوا دستک میں محترم مشتاق قریشی انتہائی مہذب انداز میں ملکی حالات بیان کرتے ہیں ان کی باتیں ہمیں قبول ہیں ان خرافات کے مقابلے میں خیر یہ بتائیے کہ آپ کی تحریر کب پڑھنے کو ملے گی، صائمہ نور آپ نے مختصر خط لکھا لیکن بہت اچھا لکھا بڑی بہادری کا ثبوت دیا آپ نے جعلی ووٹنگ کا بھانڈا پھوڑ کر ہمارے علاقے میں تو مرحومین نے بھی ووٹ ڈالے تھے ہے نا مزے کی بات۔ محترمہ ناز سلوش ذشے آپ میری طرف سے مبارکباد وصول کریں اپنے انعام یافتہ خط کی، محترم عامر زمان آپ کی تجویز قابل عذر ہے واقعی ہر شاعر کا انٹرویو اور شاعری ایک ساتھ

دی جانی چاہیے الگ الگ صفحات پلٹنے سے تسلسل ختم ہو جاتا ہے محترم ریاض حسین قمر صاحب میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے کھلے دل سے میرے تبصرے کو سراہا یہ آپ کا بڑا پن ہے محترم میں واقعی آپ کی باتوں کو غور سے پڑھتی ہوں ایک خط رانا حبیب الرحمان کا تھا آپ نے اپنے خط میں لکھا کہ آپ کو میرا خط پڑھ کر ہنسی آئی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے کوئی جوک لکھ کر نہیں بھیجا تھا انتہائی سنجیدہ موضوع پر لکھا تھا لگتا ہے اوپر والے نے آپ کو حد سے زیادہ اعلیٰ درجے کے سینس آف ہیومر سے نوازا ہے مجھے تو آپ کا اپر چیمبر خالی لگا میرا خط دوبارہ غور سے پڑھیے گا پھر رائے دیجیے گا۔ اب کچھ تحریروں کے بارے میں جو کچھ پڑھ چکی اس پر تبصرہ ضرور کروں گی پہلی تحریر محترمہ زرین قمر کی تھی سلگتے چنار جو مقبوضہ کشمیر سے متعلق تھی مسئلہ کشمیر کا ہو یا فلسطین کا دونوں جگہ مسلمان ہنود اور یہود کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ ہمارا بڑا دل دکھتا ہے یہ سب پڑھ کر مجاہدین کی جدو جہد سے متعلق اس کہانی کو پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا امجد جاوید کی سلسلہ وار تحریر عشق کسی کی ذات نہیں اپنے انجام کو پہنچی۔ امجد صاحب کی اس تحریر کا آغاز خوب صورت اور انجام شاندار تھا نہایت خوب صورت طریقے سے انہوں نے اسے وائنڈ اپ کیا کہانی کے تینوں کرداروں کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ غور و فکر کو دعوت دیتی اس تحریر نے بہت سارے لوگوں کو اپنا محاسبہ کرنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔ دوسری سلسلے وار تحریر ناصر ملک کی زاد سفر تھی جس کی پہلی قسط تو ہمیں اچھی لگی تھی لیکن دوسری اور تیسری قسط بالکل متاثر نہ کر سکی۔ کہانی میں بے تحاشہ لفاظی کی گئی ہیروئن کا کردار بھی عامیانہ سا لگا پھپالی کا بار بار صرف رنگت کی وجہ سے مسترد کیا جانا بے تکا سا تھا یہ سب۔ سب سے زیادہ ناگوار اس تحریر کا اختتام تھا جس طرح فضول تاویلیں پیش کر کے دونوں یعنی بانو اور بالی کو ازدواجی بندھن میں باندھا گیا جبکہ وہ بچپن سے ایک دوسرے کو سگے بہن بھائی کی طرح چاہتے تھے بے شک دونوں میں کوئی رشتہ نہ تھا اگر سب ایسے کرنے لگیں تو اخلاقیات کا جنازہ نکل جائے گا۔ میرے خیال میں رشتوں کے تقدس اور حرمت کو ایسے پامال نہیں کرنا چاہیے افسوس کے ساتھ ہمیں بالکل متاثر نہیں کر سکی یہ تحریر۔ اس کے علاوہ ریاض بٹ کی عاقبت اندیش محمد یاسین صدیق کی راہ پر خار، عتیق حسن بیگ کی شیطان اور پرویز احمد دولو کی با عصمت اچھی تحریریں تھیں۔ فن پارے کی پانچوں تحریریں لاجواب تھیں ابھی یہ ہی سب پڑھ سکی ہوں خط کافی طویل ہو گیا آخر میں یہی کہوں گی کہ سب کے خطوط اور تبصروں نے گفتگو کی محفل کا لطف دوبالا کر دیا تھا میں ایک بار پھر آپ سب کا بے حد شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے میرے خط اور تبصرے کو توجہ سے پڑھا اور پسند کیا اب اجازت اللہ حافظ۔

محمد یاسر اعوان...... رحیم یار خان۔ محترم جناب مشتاق احمد قریشی، عمران احمد آداب عرض ہے خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ شمارہ مارچ ملا دل بے قرار کو سکون ملا جیسے صحرا میں کسی پیاسے کو پانی مل جائے یا صحرا میں سایہ دیوار نصیب ہو جائے اس دفعہ کمال کی کہانیوں کے ساتھ ساتھ فن پارے، ذوق آگہی، خوشبوئے سخن اور پھر زرین قمر صاحبہ کا کلام دل کو اتنا چھو گیا کہ کچھ چیزیں بار بار پڑھیں دستک میں مشتاق احمد قریشی سندھ کی حکومت پر خوب برستے ہوئے دکھائی دیے۔ گفتگو میں پہلے کی طرح عمران صاحب بڑی ہی خوب صورت حدیث بیان کرتے ہیں کوئی نہ سمجھے تو، امجد جاوید اور ناصر ملک کے ناولوں کا جلدی اختتام پڑھ کر دل کو دھچکا سا لگا۔ یہ دونوں ناول رسالے کی جان تھے نواب محی الدین اور فاطمہ ثریا بجیا کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ عزوجل دونوں کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے اور کاشف زبیر کو صحت کاملہ سے نوازے۔ یہی لوگ ہمارے ادب کا سرمایہ ہیں۔ محفل یاراں میں نازسلوش ذشے صاحبہ کو اول انعام یافتہ ہونے پر ڈھیر ساری مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ناز صاحبہ کی زندگی میں کبھی غم کی پرچھائیاں نہ آئیں آمین بڑے دلکش لکھے گئے خطوط تھے پیارے امجد جاوید صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے میرے خط کو پسند کیا سر جی کہانی بھی لکھوں گا مگر ابھی تو طفل مکتب ہوں۔ عشق کسی کی ذات نہیں کی تیسری اور آخری قسط نے بھی خوب رنگ جمایا۔ زرق شاہ کو حسینیت کی سمجھ آ گئی اور شبانہ وقار واقعی باوقار نکلی جس نے اپنے پیار کی قربانی دے دی اینڈ بہت زبردست رہا مکالمہ نگاری انتہا پر تھی۔ زاد سفر بھی جلدی ختم ہو گیا دوسرے حصے میں تو ملک صاحب نے کسر نکال دی کہانی پڑھتے پڑھتے آنکھوں میں اشک رواں ہو چکے تھے اور اینڈ پر تو ہچکیوں کی نوبت آ پہنچی بے چاری بانو کو خوشیاں بھی ملیں مگر ادھوری اتنے خوب صورت الفاظ نجانے ملک ناصر صاحب کہاں سے چنتے ہیں اگر اس اسٹوری کو آگے چلایا جاتا تو کیا بات تھی بہر کیف ناصر ملک کو بہت بہت مبارکاں، آئندہ بھی خطوط میں مجید احمد جائی کو شامل کیا گیا جو کہ بڑی خوش آئند بات ہے ویل کم جائی صاحب آپ کا خط بھی زبردست تھا ریاض بٹ اپنی خوب صورت کہانی اور خط کے ساتھ حاضر پائے گئے تبصرہ اور کہانی دونوں پسند آئے عامر زمان عامر اور پرویز دولو اپنے خوب صورت خطوط اور کہانیوں کے ساتھ شمارے کی دلکشی میں اضافہ کرتے نظر آئے عبدالغفار عابد، ممتاز احمد، انجم فاروق ساحلی، احسان سحر اور رانا حبیب الرحمان کے تبصرے بھی شاندار تھے عبدالجبار رومی کا تہہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے میرا تبصرہ پسند کیا آپ کا تبصرہ بھی کسی سے کم

نہیں جناب۔ اقرا طاہر قریشی صاحب کو داد تحسین دیتا ہوں جو مختصر الفاظ میں اللہ پاک کی اتنی تعریف کر جاتے ہیں کمال کا فن ہے طاہر صاحب کے پاس بے شک سب نظام وہی بابرکت اور عظیم ذات چلا رہی ہے جو اکیلا ہے اور سب پر حاوی ہے۔ عبدالحمید نے تجزیہ بڑی سوچ اور سمجھداری سے کیا ہے جس سے ان کی نئے افق سے محبت چھلکتی نظر آئی۔ زرین قمر نے سلگتے چنار لکھ کر کیا خوب صورت سبق دیا کہ گردن در باطل پہ جھکائی نہیں جاتی کے مصداق آزادی وطن یا آزادی کشمیر کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا جائے گا۔ سلگتے چنار نے خون کے آنسو رلایا ان کا کلام بھی ایک پیغام تھا جو بڑی خوب صورتی سے دیا گیا خاص کر ہندوؤں اور گوروں کو آزاد نظم نعتیہ کلام اور یو این او پر لکھی گئی نظمیں بہت دلچسپ تھیں عاقبت اندیش، ریاض بٹ کی زبردست کاوش شمائلہ نے منصوبہ تو اچھا بنایا تھا مگر قانون تو قانون ہے مجرم کو پاتال سے بھی کھینچ لاتا ہے۔ ضرورت سبق آموز داستان لالچ بری بلا ہے پر یہ کہانی فٹ آتی ہے راہ پرخار محمد یاسین صدیقی کی دسمبر میں لکھی گئی نا تمام عشق کے مقابلے میں کچھ ماٹھی رہی، مگر پلاٹ اچھا تھا۔ لب بام مختصر مگر سسپنس بھری کتھا چوری کی واردات تھی چھپتی کے غباروں نے اس کا بھانڈا پھوڑ دیا دلچسپ رہی۔ پاداش عامر زمان عامر جب بھی لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں کاغذی رشتے بھی انہوں نے ایک دلفریب انداز میں لکھی تھی اور پاداش ہمارے معاشرے میں پھیلتی برائیوں کی آگ پر بڑی پیاری تحریر تھی۔ شیطان دلچسپ تحریر نے مجھے بہت متاثر کیا۔ باعصمت محمد پرویز دولو بھی خوب لکھتے ہیں مگر کم کم اسیر غم کے بعد باعصمت لائے ہیں۔ یہ چھوٹی سی تحریر ہمیشہ یاد رہے گا۔ اوجھل حسن عادل کی یہ کہانی ضرورت جیسی تھی۔ گلریز بھی لالچ میں آ کر ڈاکٹر ناصر جیسے دوست کو مار بیٹھا اور خود بھی زندگی سے گیا فن پاروں میں پانچوں تحریریں شاندار تھیں لیکن طاہرہ جبیں تارا کی رگ جاناں نمبر ون رہی الفاظ کا چناؤ خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ مکالمہ بندی، منظر نگاری، پلاٹ سب کچھ زبردست تھا خوشی کو خوشی اس وقت ملی جب وہ عمر کے اس حصے میں تھی جہاں پہنچ کر انسان کے جذبات و احساسات کچھ مدھم پڑ جاتے ہیں اتنی اچھی تحریر میں نے پہلے کبھی نہیں پڑھی فن پاروں کی بجائے اس کہانی کو رسالے کے درمیان جگہ ملتی تو...... اپنوں کے ستائے ہوئے لوگ بڑے مظلوم ہوتے ہیں طاہرہ جبیں تارا صاحبہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں دوسرے نمبر پر بے چین شہر کی پرسکون لڑکی تھی صدرا مین الدین بھایانی نے بھی خوب لکھا ہلکی پھلکی مختصر تحریر دل کو بھا گئی پس آئینہ دوستی کا گلا گھونٹنے والوں کے لیے دلچسپ اور مختصری تحریر اچھی لگی۔ قربانی ایک تجسس اور سسپنس والی داستان بھی اچھے انداز میں لکھی گئی گورکھ دھندا واقعی گورکھ دھندا تھی ایلینا کا کردار اچھا رہا۔ اس دفعہ ذوق آگہی میں جو کچھ لکھا گیا قابل تعریف ہے پہلے چاروں اقتباسات نے دل موہ لیا بلکہ باقی مواد بھی قابل درد تھا شمائلہ رفیق صاحبہ کو مبارک ہو خوشبوئے سخن میں احمد فراز کے کلام نے نمبرون لیا۔ زبردست تجدید وفا حمیرہ فضا، عروج فاطمہ سیدہ اور سید کامی شاہ کراچی کا انتخاب بھی خوب تھا۔ سچ پوچھیں تو یہ شمارہ بہترین ادب پر مشتمل تھا اہل ادارہ کو ڈھیر ساری مبارکباد۔

احسان سحر...... میانوالی۔ السلام علیکم اے اللہ پاک جو اس جہان فانی سے چلے گئے ہیں ان کی بخشش فرما اور جو زندہ ہیں ان پر اپنی رحمت کا نزول عطا فرما آمین، ہر ایک کو اپنی پناہ میں رکھ میرے اللہ۔ نئے افق کے اسٹاف ممبرز پڑھنے اور لکھنے والوں کو دل کی گہرائیوں سے محبت بھرا اسلام۔ اللہ پاک آپ سب کو خوش رکھے۔ ہر ایک کے اپنے دکھ ہوتے ہیں چاہے جاندار ہوں یا بے جان فرق صرف محسوس کرنے کا ہے ان کے بھی اپنے دکھ سکھ ہوتے ہیں سکھ میں ہوائیں چلتی ہیں اور درختوں کو جھوم جھوم کر نچاتی ہیں اور ان کی خوشی میں اس کا ساتھ دیتے ہیں اور دکھ میں اپنے آنسو (بارش) زمین پر گرا دیتے ہیں وہ بھی ایسی ہی گیلی گیلی صبح تھی آسمان پر بادلوں کا رقص تھا رقص کسے اچھا نہیں لگتا ہمیں بھی لگا محو حیرت ہو کر بادلوں کو دیکھنے میں اس قدر کھو گئے کہ ہوش اس وقت آیا جب ٹھنڈی بوندوں نے گالوں کو چوما تیز تیز قدم بڑھائے اچانک نیازی نیوز ایجنسی پر نئے افق کا گلدستہ نظر آیا اسے بانہوں میں بھر کر کالج پہنچ گئے خالی پیریڈ میں باہر رقص کرتی مسکراتی ٹھنڈی ہواؤں میں بیٹھ کر ٹائٹل کا نظارہ کیا نصف شب کے چاند کی سنہری کرنیں ندی کے پانی کو بوسہ دے رہی تھیں اور پانی اس کرنوں کے پیار پر مسکرا رہا تھا صنف نازک خوب صورت رات کے خوب صورت چاند کی مانند محسوس ہوئی۔ خوب صورتی دل کو کھینچتی ہے دل بے قابو ہوتا رہا دل پر جوانی کا زور ہو تو یہ منہ زور ہو جاتا ہے ان خوب صورت جھیل جیسی آنکھوں میں چاند کا عکس صاف نظر آیا۔

یہ تیری جھیل سی آنکھوں میں رتجگوں کے بھنور
یہ تیرے پھول سے چہرے پر چاندنی کی پھوار

ستاروں کی محفل میں دل کو شاد کرے نیچے لیکن دستک پر پہلے کچھ عرض کر دوں عزیز بلوچ کا موضوع گرم رہا ویسے یہاں ہر چھوٹے سے چھوٹا موضوع بھی بہت دنوں تک گرم ہی رہتا ہے جب تک خود ہمیں ہوش نہیں آتا ان لوگوں نے تو عیاشی کرنی ہے آگے جانے کی

جلدی ہو تو پیچھے مڑ کر دیکھا نہیں کرتے۔ خوشی ہوتی مجید احمد صاحب نے وضاحت اور معافی مانگ لی بہت ہی اچھا لگا۔ محی الدین نواب، فاطمہ ثریا بجیا اور محمد اعظم ایسے ہیرے ہیں جن کی چمک کبھی ماند نہیں پڑے گی۔ نواب صاحب کو کافی پڑھا ہے معاشرے میں ان کے قلم میں جو کاٹ تھی وہ بہت کم رائٹروں میں پائی جاتی ہے صحیح معنوں میں وہ معاشرے کے جراح تھے اللہ پاک تینوں مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرماتے۔ نہایت ہی محترم جناب امجد جاوید کا محبت نامہ پڑھا جہاں کی خوش بو وجود کا حصہ بن گئی، بہت شکریہ جناب آپ نے اپنے قیمتی الفاظ سے مجھے نوازا جو بھی غذا کھائی جائے لطف تب آتا ہے جب اس کا ذائقہ محسوس کیا جائے اب بھی اسی طرح ہے جب تک پڑھتے ہوئے اس کو محسوس نہ کیا جائے سمجھا نہ جائے کہ لکھنے والا یہ سمجھانا اور سبق دینا چاہ رہا ہے کیا پیغام دے رہا ہے یہ پڑھنا پھر کس کام کا مجید احمد جائی خوشی ہوئی کہ آپ نے معذرت کرلی اچھے لوگوں کو یہی بات اچھی لگتی ہے مخالفوں کی پرواہ مت کریں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ خوب صورت جذبات جب دل میں سما جائیں تو وہ آنکھوں سے عیاں ہوتے ہیں اس ماہ بھی ہر خط میں مسکراتے لفظوں کی بھرمار اپنے وجود کے گرد منڈلاتی رہی ریاض بٹ محبت کا شکریہ صائمہ نور صاحبہ نوازش بہت شکریہ۔ رانا حبیب الرحمان اتنے عرصے بعد آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی کالم آپ پڑھتے رہیں گے وقفے وقفے سے اللہ پاک آپ کو رہائی عطا فرمائے، آمین۔ یاسین نونار آپ جیسے مخلص دوستوں کے سہارے ہی تو زندگی خوشگوار گزر رہی ہے ورنہ ماضی کی گزری تلخ یادیں اور کسی ہرجائی کا ہرجائی پن...... فلک شیر ملک نے بھی اچھا لکھا احسن ابرار رضوی نے بھی اچھا لکھا۔ ناز سلوش ذشے کو انعامی خط کی دلی مبارکباد محمد فاروق نے بھی اچھا لکھا رمشا ملک، عبدالغفار، عامر زمان، ممتاز احمد کے مختصر نامے اچھے لگے۔ انجم فاروق ساحلی، مہر پرویز نے اچھا لکھا عبدالجبار رومی خوش آمدید خوشی ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر۔ اقرا، خوب صورت سلسلہ قلب وجگر کو منور کرتا رہا بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ عبدالمجید کی محبت نئے افق پر بکھری ملی محبت ہی تھی جو ماضی کی یادوں میں گھماتی رہی واقعی گزرے لمحے کسی خزانے سے کم نہیں ہوتے بالترتیب سے پیش کی گئی کہانیوں کا ٹائم ٹیبل ہو یا نواز برادرز کے کرتوت ہر چیز نگینے کی مانند فٹ رہی اللہ پاک آپ کو تندرست و توانا رکھے۔ سلگتے چنار اور حساس موضوع پر پہلی کہانی کشمیر اور کشمیریوں پر ہوتا ظلم کیسے بھلایا جا سکتا ہے دل خون کے آنسو رو رہا ہے جہاں ہزاروں نوجوان شہید کیے جارہے ہیں۔ عاقبت نااندیش، عورت اور مرد کی بے حسی کی داستان محبت کی جگہ میں ضرورت دل میں جگہ پالے تو دیر نہیں لگتی رنگ بدلنے کی اور جب انسان رنگ بدلتا ہے تو ایسے سانحات ہی رونما ہوتے ہیں ضرورت، دولت کی ضرورت کسے نہیں ہوتی لیکن جب یہی لالچ کے روپ میں ڈھل جاتی ہے تو طارق جیسے ہزاروں نوجوان گمراہ ہو کر حقیقی رشتوں جیسے خوب صورت بندھن کو بھلا دیتے ہیں بے شک جو سکون حقیقی قلبی رشتوں میں ہے وہ دنیا کی کسی بھی چیز میں نہیں۔ عشق کسی کی ذات نہیں کا آخری حصہ پڑھا بہت سا پیغام دے گیا بہت کچھ ہے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کر گیا ہم کیا ہیں اور کیا بنے ہوئے ہیں ہماری نسبت کن سے ہے جن سے ہماری نسبت ہے۔ اللہ پاک ہمارے حال پر رحم کرے لب بام ہوس دولت اور سب کچھ پانے کے چکر میں مارا گیا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا جو پاس تھا اس سے بھی گئے پاداش، یہ کہانی دو ماہ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں صرف کرداروں کے نام تبدیل تھے۔ باعصمت چوٹ لگانے والے کو جب چوٹ لگتی ہے تو درد کی صورت میں چوٹ کا احساس ہوتا ہے میاں فخر کو بھی چوٹ کا سامنا کرنا پڑا ایسے لوگوں کو ایسی چوٹ لگتی ہے ظلم کر کے بھیانک انجام سے بچا کوئی بھی نہیں ہے۔ ہر بڑے کام کا مکافات عمل ضرور ہوتا ہے اوجھل یہاں بھی دولت کی ہوس ذہن پر چھائی رہی۔ لالچ جب دل میں پیدا ہوتا ہے تو اچھائی برائی اور رشتے میں تمیز کھو بیٹھتا ہے راہ پرخار جہاں محبت دل میں پلتی نظر آئی وہاں حرام اور سچائی کا عکس بھی نظر آیا اس ملک کے لوگوں نے اپنے اوپر جو بے حسی طاری کر رکھی ہے وہی بھگت بھی رہے ہیں اور بھگتے رہیں گے فن پاروں میں سب بہترین اور خوب صورت انتخاب رہا سوائے قربانی کے جو قطعی پسند نہیں آئی۔ گورکھ دھندہ بور اور فضول کہانی رہی۔ انعام یافتہ اقتباس اچھا رہا باقی مضمون بھی شاندار تھے۔ انعام یافتہ غزل احمد فراز کی ہو اور انعام یافتہ نہ ہو کیسے ممکن تھا شمائلہ رفیق (اقتباس) اور صداقت حسین (غزل) کو انعام کی دلی مبارکباد۔ باقی میاں بیوی اور احساس بھی اچھی رہی۔ زریں قمر کی شاعری عمدہ رہی کہیں وطن سے محبت تو کہیں ہجر وصال کی جھلک تو کہیں حکومت پر طنز بہت پسند آئی شاعری کا ہر رنگ لاجواب رہا۔ زادسفر بھی اختتام کو پہنچا زندگی دیتی بھی ہے اور لیتی بھی ہے دکھ بھی آتے ہیں اور سکھ بھی برداشت کرنے بھی پڑتے ہیں بانو اور بالی کا سفر دکھ سکھ کی چھاؤں میں گزرتا ہوا بہن بھائی کی دھوپ چھاؤں سے ہوتا ہے میاں بیوی کے سفر پر اختتام پذیر ہوا لوگ آتے بھی اور جاتے بھی ہیں بانو چلی گئی خوشبو آ کر جب چلی جاتی ہے تو اپنی مہک کا احساس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتی ہے بانو بھی اپنی مہک چھوڑ گئی واقعی زندگی تلخ بھی ہے تو شیریں بھی یادگار ناول ختم ہوا۔ اجازت دیجیے زندگی رہی تو اگلے ماہ حاضر ہوں گے، اللہ حافظ۔

ممتاز احمد...... سرگودھا۔

واجب الاحترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب عمران احمد، طاہر قریشی صاحب سدا سلامت اور خوش رہیں، آمین۔ اپنے خط کی ابتدا اس دعا کے ساتھ کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت اپنے پیارے حبیب نبی مکرم رحمت دو عالم حضور نبی کریم ﷺ کے صدقے ہر انسان کو دشمنوں کی دشمنی، جھوٹوں کے جھوٹ، منافقوں کی منافقت حاسدوں کے حسد اور تہمت لگانے والوں بہتان باندھنے والوں کے شر اور خباثت سے ہمیشہ محفوظ رکھے، آمین۔ سب سے پہلے محترم طاہر قریشی صاحب کو عمرہ کی ادائیگی کا مقدس فریضہ ادا کرنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں ماہ مارچ کا شمارہ 19 فروری کو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موصول ہوگیا ڈوبتے سورج کے منظر اور پرندے کے گھونسلے میں واپسی کا خوب صورت ٹائٹل دل کو بہت بھایا دستک میں پاکستانی سیاست کے افق پر رونما ہونے والے واقعہ کی روشنی میں دیکھنا ہے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا کے عنوان سے مستقبل کے آنے والے حالات پر ایک زبردست تجزیہ تھا گفتگو میں پہنچا تو یہ جان کر از حد خوشی ہوئی اور فیصلہ انتہائی قابل تحسین ہے کہ تنقید کا دائرہ صرف تحریر کے گرد ہی گھومے گا اور ہونا بھی ایسے ہی چاہیے کچھ لوگوں کا مشن اور شیوہ ہی یہی ہے کہ دوسروں کی ذات پر کیچڑ اچھالنا، کردار کشی کرنا بہتان بازی کرنا تہمت لگانا تو اس فیصلے سے ایسے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوگی، امجد جاوید صاحب کا خط مفصل تھا اور میں ان کی بات کی بھرپور تائید کرتا ہوں کہ تحریروں پر مثبت تنقید اور بھرپور تبصرہ ہونا چاہیے تاکہ لکھاری اس تبصرے اور تنقید کی روشنی میں مزید بہتر لکھ سکیں۔ مجید احمد جائی صاحب آپ نے اچھا کیا فیصلہ قدرت خداوندی پر چھوڑ دیا اللہ بہتر حساب لینے والا ہے آپ کی تجویز بہت اچھی ہے کہ اگر کسی مصنف کی کہانی پر تحریر نا قابل اشاعت ہو تو بتا دیا جائے۔ احسن ابرار رضوی کا تبصرہ بہت زبردست اور عمدہ تھا پہلے خط میں شاندار اور بھرپور تبصرے کے ساتھ موجود تھا۔ ناز سلوش ذشے کو انعام یافتہ خط پر ڈھیروں مبارکباد آپ کا خط شاندار تھا۔ عمر فاروق ارشد صاحب نے بہت اچھا تبصرہ لکھا۔ رمشا ملک ویلڈن آپ نے جو لکھا حقائق پر مبنی لکھا۔ کچھ لوگوں کو چوہدری بننے کا شوق ہوتا ہے مگر ان کو یہ نہیں پتا کہ ادب کی دنیا میں کسی کی چوہدراہٹ نہیں چلتی مجھے یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ میری درخواست پر آپ نے محترم پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کا انٹرویو شائع کرنے کی نوید سنائی ہے تو پیشگی آپ کا بے حد ممنون و مشکور ہوں ان شاء اللہ چند دنوں تک ان کا انٹرویو اور افسانہ آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا محترم رانا حبیب الرحمان صاحب نے بہت اچھی تجاویز پیش کیں جو کہ قابل ستائش ہیں علی حسنین تابش اور احسان سحر اپنے خوب صورت خیالات اور باتوں کی خوشبو سے گفتگو کی محفل کو مہکا رہے تھے عبدالجبار رومی انصاری نے اچھا تبصرہ لکھا۔ محترم طاہر قریشی صاحب نے اقرا میں قلم کے موضوع کو اپنا سخن بنایا ماشاء اللہ سب سے پہلی وحی جو ہمارے آقا کریم رحمت دو عالم ﷺ پر نازل ہوئی اس میں قلم کا ذکر ہے۔ جس سے قلم اور علم کی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ عبدالحمید صاحب نے سال 2015ء کے حوالے سے اور دیگر تحاریر کے بارے میں بہت شاندار تجزیہ کیا بہت پسند آیا ویری گڈ۔ ”سلگتے چنار“ بہت زبردست اور لاجواب کہانی تھی۔ زریں قمر صاحبہ کی شاعری بھی بہت پسند آئی انہوں نے لکھنے کا حق ادا کر دیا بہت خوب عاقبت اندیش تھوڑی ہلکی کہانی تھی اتنی جاندار کہانی نہیں تھی نوشاد عادل کی ضرورت کا انجام چونکا دینے والا تھا۔ راہ پرخار ایک سبق آموز کہانی تھی اچھا درس دیا کبھی کسی کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ شیطان اچھی تحریر تھی فن پارے پانچ کہانیوں کا خوب صورت گلدستہ تھا گورکھ دھندا ایک پراثر اور ایک پیغام لیے ہوئے تھی یہ حقیقت ہے وقت بدلتا رہتا ہے ذوق آگہی میں شمائلہ رفیق کا انتخاب انعام یافتہ ٹھہرا مبارک ہو، خوش بوئے سخن میں صداقت حسین ساجد کو انعام ملا بہت مبارکباد۔ ناصر ملک صاحب کے زادسفر کا اختتام اچھا رہا۔ اب اجازت چاہوں گا ان شاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو۔

مہر پرویز دولو...... میاں چنوں۔

محترم ایڈیٹر صاحب سلام مسنون۔ تبصرہ حاضر خدمت ہے اصلاح کرکے قابل اشاعت بنا دیں بہت مہربانی ہوگی۔ پھولوں کے کاروبار میں آدمی ہمیشہ خوشبوؤں میں گھرا رہتا ہے۔ جس طرح پھول کھل کر ماحول کو مہکائے رکھتے ہیں پھولوں جیسی صفات کے مالک حضرات کو بھی ہمیشہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کی چال، ڈھال، گفتار، افعال سے ماحول معطر رہے اپنے پرائے کی تفریق کیے بنا ہر من کے مہمان بن جاتے ہیں۔ آج کل کے آپا دھاپی کے دور میں انسانی رشتے حرص و ہوس کی ندی کے پار غرض کے جنگل میں روپوش ہوگئے ہیں۔ مایوسی کے اس دور میں ہر شخص محبت کے دو بول سننے کے لیے غرض کا کاسہ اٹھائے دردر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ ہم جوں جوں ترقی کرتے جارہے ہیں اپنے خونی رشتوں اور انسانیت کے تقاضوں سے کوسوں میل دور روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ اسپیڈ کے ساتھ دور ہوتے جارہے ہیں۔ ایسی بے حسی کے دور میں اگر کوئی محبت کے گلدان میں خلوص کے پھول سجا کر ڈرائنگ روم میں مہمانوں کا منتظر ہوتا ہے تو ایسے عظیم انسان کی جتنی عزت و تکریم اور حوصلہ افزائی کی جائے کم ہے۔ ایسے عظیم لوگوں کا اگر کال نہیں پڑ گیا تو اس بات میں رائی برابر شک نہیں کہ ایسے لوگوں کو تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اگر خلوص کے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.urdubooksfree.pk

منبع یہ لوگ مل جائیں تو پھر ان کے فیض سے جھولیاں ضرور بھرنی چاہیے۔ نئے افق کے سالاروں کا شمار بھی کچھ ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جو خود تو کڑی دھوپ میں چلتے رہتے ہیں لیکن پناہ گزینوں کو سائے کی نعمت سے محروم نہیں کرتے۔ ان مفکرین نے نئے افق کے روپ میں محبتوں کا اک جہاں آباد کر رکھا ہے رشتوں کی کبھی نہ ٹوٹنے والی زنجیر میں نتھی کتنے ہی لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہیں۔ ہر ماہ منتظر آنکھوں کا تانتا بندھا ہوتا ہے۔ اس کی دید سے فیضیاب ہوتے ہی دلوں کے مضطرب تالاب میں سکون آ جاتا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں محبتوں کے سفیروں کا جمگھٹا اس کے خوب صورت صفحات پر براجمان ہوتا ہے۔ جن سے ملاقات ہوتے ہی مہینے کی مونجھ لمحوں میں ختم ہو جاتی ہے۔ سرورق کی حسینہ کی تصویر ندی کنارے ڈوبتے منظر کے اوپر لگائی اگر اس کو حقیقت میں ندی کنارے کھڑا کر دیتے تو بہت مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ دستک میں تلخ حقیقت پڑھی کاش دیگر جماعتوں کے عزیر بلوچ بھی پکڑے جائیں۔ ادارے سے ایک گزارش ہے اس دفعہ کتابت کی بہت غلطیاں نظر آئیں مہربانی کر کے اس طرح توجہ دیں۔ گفتگو میں استاد محترم جناب امجد جاوید صاحب کا خط پڑھ کر جی خوش ہو گیا تمام الفاظ سنبھال کر رکھنے کے قابل ہیں۔ اقوال زریں سے کم نہیں۔ ان کا یہ مشورہ بہت پسند آیا کہ قارئین تحریر پر تبصرہ کیا کریں لیکن ایک خدشہ ضرور رہتا ہے بعض اوقات مجھ سے لوگ برا مان جاتے ہیں اگر تنقید کی جائے ابرار رضوی کی بات دل کو لگی امید ہے آپ تمام ثبوت بھیج کر ادیب کو حقیقت کا آئینہ دکھائیں گے ریاض حسین قمر عظیم لوگ اپنی تحریروں سے پہچانے جاتے ہیں فلک شیر ملک، ایم حسن نظامی، احسان سحر آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں۔ تجزیہ میں عبدالحمید کی نئے افق سے محبت کا کیا کہنا اب تو یہ جذبہ ہم لوگ بھی اپنے آپ میں پیدا کریں گے زریں قمر صاحبہ کے سلگتے چنار نے رونے پر مجبور کر دیا۔ نوشاد عادل کی ضرورت نے ہلا کر رکھ دیا کسی دور میں کلاس ہشتم کی اردو کی کتاب میں انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا سبق ہوتا تھا یہ تحریر بالکل اس کی عکاس تھی غرض کے سودے میں دونوں کروڑ پتی بن گئے مگر کوئی پھر بھی تہی دامن رہا جناب امجد جاوید کی عشق کسی کی ذات نہیں بہت چبھتے حقائق پر مبنی تحریر تھی۔ شاہدہ صدیقی کی لب بام نے نصیحت کی ہے کہ غباروں پر کبھی اعتبار نہ کرو، عتیق حسن بیگ کا شیطان سکھ تھا یہ بھارتی ہمیں ہر طرح سے تنگ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ انگار وادی پی ٹی وی پر ڈرامہ چلتا تھا سلیم خواجہ ہندو آرمی کا آفیسر بنتا تھا جو کشمیری مسلمانوں پر ظلم کرتا تھا ایک دفعہ مارکیٹ میں ایک بوڑھی اماں نے پکڑ کر مار مار کر برا حال کر دیا کہ کشمیری مسلمانوں پر ظلم کرتے ہو۔ باعصمت تحریر ساتھی ہیڈ ٹیچر صاحبہ کو دی تو پڑھنے کے بعد انتہائی غصے اور خوشی سے لبریز لہجے میں بولی۔ بھائی پرویز انہاں وڈیریاں نال انج ای ہونی چاہی دا اے ان وڈیروں سے ایسے ہی ہونی چاہیے۔ یہ سنتے ہی مجھے اپنی تحریر کا معاوضہ مل گیا۔ حسن عادل کی اوجھل یوں لگتا تھا جیسے کسی انگریزی کہانی کا ترجمہ ہو بہت خوب تحریر تھی۔ آغاز الدین کے گورکھ دھندے میں شہزادہ، شہزادی مل گئے اور کسی کو جیل مل گئی ذوق آگہی میں معلومات کا خزانہ تھا۔ میرے ایک مہربان حضرت علامہ مولانا شمس الزماں صدیقی صاحب کا فرمان ہے ایک بزرگ مانگنے والا اپنے بچوں کو نصیحت کر رہا تھا بیٹا ہر جگہ مانگو ہر کسی سے مانگو ہر وقت مانگو اور ہر چیز مانگو۔ میں جب سے خط لکھ رہا ہوں ایک ہی درخواست کر رہا ہوں کم از کم دو صفحات اشعار کے لیے ضرور مختص کریں اور اب نیا مطالبہ یہ ہے کہ گفتگو میں صرف تحریروں پر بات ہو، ایک دوسرے کو احوال سنانے کے لیے الگ کالم پیغام یا احوال کوئی بھی نام ہو اور اس کے ساتھ اپنی سوچ کو الفاظ کا روپ دینے کے لیے بھی کالم ہو، جہاں ذاتی سوچ شائع ہو۔ نام کوئی بھی رکھ لو اگر ان میں سے کچھ بھی منظور فرمالیں تو شکریہ اور اگر توجہ نہیں فرمائیں گے تو میرے مطالبات کی فہرست لمبی ہوتی جائے گی۔ آپ کی محبتوں کا منتظر۔

عبدالغفار عابد...... چیچہ وطنی۔ قابل قدر جناب مشتاق احمد قریشی صاحب ایڈیٹر اور اس محفل سے وابستہ سبھی لوگوں کی خدمت میں سلام محبت عزیز ساتھیو پچھلے دنوں کراچی جانا ہوا میرے شہر چیچہ وطنی کی گولڈن پرل بیوٹی کریم کی 7,6 فروری کو حسن اسکوائر ایکسپو سینٹر کراچی میں نمائش تھی گولڈن پرل پروڈکشن کی پبلسٹی مہم سائرہ علی اینڈ کمپنی کے سپرد ہے اس کمپنی کے اہم رکن محمد ارشد انصاری میرے دوست ہیں اپنے دوست کے پرزور اصرار پر مجھے بھی کراچی جانا پڑا۔ یہاں گولڈن پرل بیوٹی کریم نے کراچی کی خواتین کا رنگ گورا کیا وہیں کراچی کے دوستوں کی محبتوں نے مجھے حسین فل سیکورٹی بمع پروٹوکول انسانیت نما مہمانان نوازی نے وی آئی پی بنا دیا آفس میں طاہر بھائی سے ہونے والی ملاقات ادارے کی طرف سے محترم اقبال بھٹی کی دعوت مدتوں یاد رہے گی۔ اب ایک نظر مارچ کے پرچے پر پہلے ذکر اداریے کا مشتاق بھیا یہی تو بدقسمتی ہے اس ملک کی کہ یہاں ہر پارٹی میں عزیر بلوچ جیسے کردار نمایاں ہیں لاکھوں ماؤں کے خون کی آبیاری سے معرض موجود میں آنے والا گلستان اجڑ رہا ہے مگر نام نہاد باغبانوں کو اس کی کوئی فکر ہے اور نہ کوئی پرواہ، اداریے کے بعد رخ محفل گفتگو کی طرف کیا تو یہاں کی رونق دیکھ کر جی خوش ہو گیا رب العزت سدا اس آشیانے کی خوشیاں سلامت رکھے آمین، سسٹر ناز سلوش یہ ہمارے نصیب کہ آپ جیسی بہن ملی ہمیں آپ کا انعام ہمارے لیے باعث فخر ہے۔ مگر ہمارے دل عزیز قلم کار محترم امجد جاوید اپنی آنے والی تحریر ''عورت زاد'' میں آپ جیسی خواتین کی تعریف اپنے مخصوص انداز میں ضرور فرمائیں گے۔ عبدالجبار رومی آپ کا تبصرہ قابل تعریف غریب آدمی کی جس چائے کی پیالی سے صبح ہوتی ہے اس پر بھی وہ سیلز ٹیکس ادا کرتا ہے اس کے باوجود اس کو دو وقت کی روٹی تو کیا سردرد کی گولی نصیب نہیں اچھے عمر فاروق ارشد میں اس بحث کو پہلے ہی سمیٹ چکا ہوں اور ادارے کی پالیسی کو مدنظر رکھنا میرا فرض ہے احسان سحر یونانی مفکر جالینوس نے ایک احمق کو دیکھا کہ وہ ایک دانش مند آدمی کے گریبان میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا اور اس کی بے عزتی کر رہا تھا یہ ناخوشگوار منظر دیکھ کر جالینوس نے کہا اگر یہ شخص فی الحقیقت دانا ہوتا تو یہاں تک نوبت نہ پہنچنے دیتا کہ ایک احمق اس کو پیٹنے لگے عامر جی جس طرح اس ملک میں بھیک مانگنے پر کوئی پابندی نہیں بالکل اسی طرح ہر کوئی جھوٹ بولنے میں بھی آزاد ہے احسن ابرار رضوی ہم دوسروں پر تنقید اس وقت شروع کرتے ہیں جب خود کو بھول جاتے ہیں تنقید ایسا ہتھیار ہے جو ہم دوسروں کے کاندھے پر رکھ کر دراصل خود پر چلاتے ہیں ویسے عبدالحمید کی تجزیہ رپورٹ میں آپ کا کہیں ذکر نہیں۔ رانا حبیب الرحمان میں آپ کی بات نہیں سمجھ پایا۔ محترم ممتاز احمد خدارا ہمیں گناہگار نہ کریں آپ تو بڑے ہیں ہمارے لیے قابل احترام خلوص اور اچھائی اپنے الفاظ میں نہیں اپنی نیت اور فطرت میں بھی پیدا کرنی چاہیے بے شک یہ عمل ہماری بخشش کا وسیلہ ہے۔ بہت سی دعائیں آپ کے نام برادر زریاض بٹ، فلک شیر ملک اور محترم ایم حسن نظامی آپ کی حوصلہ افزائی مہمیز کا درجہ رکھتی ہے طاہر بھائی کی اقرا حکمرانوں سمیت ہم سب کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لا رہی ہے بات ہے عمل کی۔ عبدالحمید کے تجزیے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کشمیریوں کو صرف دعا کی ہی نہیں بلکہ دعا کے ساتھ ساتھ دوا کی بھی ضرورت ہے آزادی کے لیے چھوٹی چھوٹی قربانیوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے زریں قمر نے سلگتے چنار لکھ کر اپنا حق ادا کر دیا یہی کردار کشمیریوں کے لیے امید کی کرن ثابت ہوں گے جب انسان اپنی خواہشات کا غلام بن جاتا ہے تو پھر اس کی اولین ضرورت دولت ہوتی ہے نوشاد عادل نے اپنی ضرورت اور شاہدہ صدیقی نے لب بام میں اس کی وضاحت بہت خوب صورت انداز میں محترم امجد جاوید کی تحریر ''عشق کسی کی ذات نہیں'' کا آخری حصہ پڑھا اس پر صرف اتنا ہی لکھوں گا کہ محبت اور اختیار ایک ہی راستے کے سنگ میل ہیں جہاں اختیار کی حد ختم ہو جائے وہاں سے محبت کی سرزمین کا آغاز ہوتا ہے اور عشق اس راستے کا آخری موڑ ہے محمد یاسین صدیق کی راہ پرخار کا مرکزی خیال یک طرفہ محبت کی ناکامی تھا میری رائے میں تو یہ پرکھ محبت کا معیار نہیں منزلیں محبت کا درجہ نہیں محبت اپنے سفر کا وہ پہلا نشان ہے جو آخری بھی ہے عامر زمان عامر کی پاداش عورتوں کے لیے سبق آموز تحریر تھی۔ عتیق حسن بیگ کی تحریر شیطان میں ان شیطان نما مردوں کا ذکر ہوا ہے جو عورتوں کے تن کے پجاری ہوتے ہیں کہتے ہیں کہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ میری رائے میں پڑھنا اپنی جگہ مشکل مرحلہ ہے لکھنے والے کے لیے شاید لکھنے کے بعد کا ہر مرحلہ آسان ہے لیکن پڑھنے والے کی ٹینشن پڑھنے کے بعد شروع ہوتی ہے مہر پرویز احمد دولو کی باعصمت پڑھ کر آپ بھی میری رائے سے اتفاق کریں گے خاص کر خواتین۔ حسن عادل کی اوجھل بھی لازوال تحریر تھی فن پاروں میں طاہرہ جبیں تارا کے افسانے رگ جاناں میں آج کے نفسانفسی کے دور کی نشاندہی کی ہم لفظوں کی جنگ تو جیت لیتے ہیں مگر عملی جنگ ہار جاتے ہیں۔ محبت پر ہزاروں لفظ لکھنے سے بہتر ہے انسان ایک لفظ محبت پر عمل کرے کچا گھڑا تو غنیمت ہے محبت کا دریا تو پیار کرنے والے محض جذبوں سے عبور کر لیتے ہیں آج کی پالیسی ساز محبت محبت نہیں بلکہ کاروبار ہے جس میں نفع، نقصان کو اولین ترجیح دی جاتی ہے۔ ریاض بٹ نے عاقبت اندیش میں اس محبت کا ذکر کیا جس سے کائنات کی حروفیت شروع ہوتی ہے۔ آخر میں اس پیغام کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ آئیں سب مل کر اخوت، رواداری پیدا کریں۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی۔ محترم مدیران و اقبال بھٹی صاحب السلام علیکم خوب صورت ٹائٹل اور رنگوں کے امتزاج سے نئی بہار دکھاتا ہوا میگزین ملا جیسے انٹرنیشنل ڈائجسٹ ہے حسینہ بھی صبح صبح نئی تبدیل شدہ اور جوش و خروش لیے ہوئے آفتاب کی روشنی جیسے کہ میگزین کی شہرت چاروں جانب پھیلے جا رہی ہے اور فرسودہ ایک ہی لائن پر چلنے والا یہ پرندہ آزاد ہو کر فضا کی تازہ اور زمین و آسمان کی تمام رعنائیوں میں گہرا سانس لے کر آزادی کا سانس لے رہا ہے۔ پرچے کا جنرل مواد بھی بہترین ہے اور پورے رسالے کا لے آؤٹ زبردست ہو چکا ہے۔ کہانیوں کا انتخاب انتہائی معیاری ہے۔ لکھائی کے باعث مواد بھی بڑھ گیا ہے پاکستان سے باہر کے لکھاریوں کو شامل کر کے آپ نے ترقی اور بڑھائی کا ایک زینہ بھی طے کر لیا ہے۔ بہرحال آج کی سیاست میں ہر بڑا آدمی داڑھی میں تنکا کی تصویر بنا ہوا ہے اور عزیر بلوچ کے انکشافات سے بہت سے حرام سے کمائے ہوئے شان و شوکت دکھانے والے لرزہ براندام ہیں اور واقعی اب دیکھیے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ گفتگو میں عمران صاحب کی بیان کردہ حدیث مبارک بہت سوں کے لیے چشم کشا ثابت ہوگی جزاک اللہ۔ امید ہے کہ کاشف زبیر بخیریت تمام گھر شفٹ ہو چکے ہوں گے۔ تبصرہ میں امجد

جاوید بڑی سنجیدہ اور گہرائی لیے باتیں لے کر آئے میرا تذکرہ کیا شکریہ عورت زاد شروع ہو تو تبصرہ ضرور کریں گے مجید احمد جائی کا کیس خوب نپٹایا ہے اور صحیح فیصلہ ہے احسن ابرار رضوی بھی خوب تبصرہ لائے میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ انعامی خط زبردست تھا قلمی نام کی وضاحت بھی خوب رہی بہر حال حاضری دی خوب بھئی، ریاض بٹ اس دفعہ پھر بہت سے لکھنے والوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں مبارک یکم اپریل والی کہانی کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ عمر فاروق کا تبصرہ حسب معمول گہرا اور سنجیدہ تھا، شکر ہے ریاض حسین قمر بھی تشریف لائے بڑا اچھا اور بھر پور تبصرہ تھا باقی تبصرے بھی معیاری اور کہانیوں کا تجزیہ گہرائی اور سنجیدگی سے کیا ہے۔ اس دفعہ محترمہ زریں صاحبہ کی شاعری کو پذیرائی ملی تعارف بھی تھا اور تمام غزلیں اور نظمیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اس دفعہ ڈاکٹر ایم اے قریشی اور حسام بٹ کیوں غیر حاضر تھے۔ گفتگو کے بیس کے قریب خطوط تھے اور یقین کریں انتہائی مزہ آیا اور بڑی ہی دلچسپی سے پڑھتے ہیں یہ آپ لوگوں کا بہتری کی طرف ایک اور قدم ہے اور جو ساتھی ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ان کے لیے دعا مغفرت۔ نواب صاحب کا سانحہ تو عظیم کمی ہے۔ اس دفعہ پچھلے سال کی تمام تر معلومات اور مختلف نمبرز بے حد زبردست تھے۔ آپ کی وضاحت بے حد صحیح رہی۔ بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے تمام کیا گیا عبدالمجید صاحب کو بے حد مبارک ہو، دو تین جگہ اپنا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ انوکھی چیز آخر میں عمران سیریز کے شائع کردہ ناولوں کی فہرست یہ ظالم نے کیا یاد کرا دیا زاد سفر کا اختتام ہوا کامیاب رہی آگے کب ناصر ملک آئیں گے۔ کہانیوں میں تو ایک سے ایک بڑھ کر ایک ہے میرے خیال میں کوئی بھی جھول معلوم نہ ہو سکا۔ سوائے ایک کہانی کے کہ اسی موضوع اور طرز پر پہلے بھی ذرا مختلف انداز میں کہانیاں پرکھ چکا ہوں پھر بھی ہر کہانی اپنی جگہ ایک نگینہ ہے اور چند ایک کہانیاں تو بالکل ہی الگ طرز اور موضوع کی ہیں معاشرے ہی کے اندر سے یہ کہانیاں یہ خیالات یہ واقعات لے کر انہیں تحریر کردہ ادیب ذرا گہرے سنجیدہ اور سبق آموز طرز پر صفحہ قرطاس پر بکھیر کر قارئین سے داد بھی حاصل کرتا ہے۔ آپ لوگوں کی محنت اور لگن ساتھ ہی بہتر ہے بہتر مواد حاصل کرنا ہی ان لکھاریوں کو اتنی اچھی مختلف اور سبق آموز کہانیاں لکھنے پر مجبور کرتا چلا جاتا ہے اب دیکھیں بھارت سے اور انگلش کی کہانیاں بھی موصول ہو رہی ہیں اور یہ سب سے انوکھا طرز تحریروں اور ان کو فن پارے کر کے شامل کرنا بھی زبردست کامیابی ہے۔ فن پارے تمام ایک سے ایک بڑھ کر تھے کیا بات ہے اور پھر نئے افق کی قیمت اور صفحے اس کے لیے جناب عمران صاحب اور محترم طاہر قریشی صاحب بے حد تعریف کے قابل ہیں کہ اتنے زیادہ صفحات میں کسی بھی ڈائجسٹ کی قیمت 80 روپے سے کم نہیں بلکہ صفحات تو انتہائی کم رکھے جاتے ہیں اور مواد انتہائی کم چند ڈائجسٹ جو دماغ کی آخری سیڑھی پر سمجھا جاتا تھا اور اب انتہائی کم مواد صفحات اور قیمت آسمان تک جبکہ یہ لوگ لاکھوں پتی کروڑ پتی بن چکے ہیں خیر ہمیں اپنے کام سے مطلب ہاں ٹائٹل پر نئے افق کے نیچے ماہ کا نام ضرور لکھا کریں پلیز خوش بو سخن میں انعامی شعر بہت اچھا ہے اور اس کے علاوہ ضیا نور، عروج فاطمہ، عمر فاروق، کامی شاہ، محمد اسلم بہترین رہے۔ حقیقت پوچھیں تو ایک بھی کوشش کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ نوشین صاحبہ کی عرق ریزی ہے۔ ذوق آگہی میں سباس گل بھی زبردست سلیکشن سے آئی ہیں انعامی انتخاب لاجواب تھا۔ باقی ریاض بٹ کا انتخاب تو کوئی سال پیچھے لے گئی اور کئی واقعات کے در کھل گئے مبارک باد فرداً فرداً سب کو سلام دعائیں۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد۔ شمارہ مارچ 2016ء کا نئے افق 22 فروری کو ملا منفرد ٹائٹل رنگوں سے سجا ہاتھوں میں آیا تو طمانیت کا احساس ہوا جس طرح کھوئی ہوئی چیز دوبارہ مل جائے حالانکہ رابطہ ضرور ٹوٹا تھا (تبصرے نہیں لکھ رہا تھا) لیکن بھرپور توجہ سے مطالعہ ہو رہا تھا ہوا یوں کہ اس دفعہ جب تبصرے وغیرہ پڑھے تو سوچا بہت ہو گئیں چھٹیاں اب پھر سے میدان میں اترنا پڑے گا ٹوٹا پھوٹا کچھ نہ کچھ تخلیق تو ہو معیاری تحریریں تو خود جگہ بناتی ہیں۔ باقی اللہ پاک ہر کسی کا نگہبان اور پالنے والا ہے۔ اوسوری میں بھی نہ بہت سارے نوے نکور (میرے لیے) چہروں کو دیکھ کر بوکھلا گیا ہوں آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا بد تمیز ہے نہ سلام نہ دعا ایویں فری ہونے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہے تو جناب ایسی بات نہیں ادب سے جھک کر بہت پیار سے پہلے تو محترم عمران احمد قریشی، محترم مشتاق احمد قریشی صاحب اور نئے افق پبلیکیشن کے پلیٹ فارم کی ساری ٹیم کو السلام علیکم...... اب آؤں گا گفتگو کی طرف کاشف زبیر کی علالت کا سن کے اور ان کی صحتیابی کے لیے دعا کی ہمارے ملک کے بہترین رائٹر اور ہمارا اثاثہ ہیں اللہ پاک ان کو ہمیشہ صحتیاب رکھے، آمین۔ اس کے بعد عمران احمد کی درخواست تھی مجید احمد جائی کے بارے میں سچ بات تو یہ ہے کہ پچھلے ماہ ہی سے تبصرہ کے لیے تیار تھا مگر ٹائم نہ ملا مجید احمد جائی بلاشبہ ایک اچھے رائٹر ہیں غلطی ان سے ہوئی مگر یہ اچھی بات نہیں کہ ہر کوئی اس کے پیچھے ہی پڑ جائے مثبت رویے سے بھی تو کسی کو سمجھایا جا سکتا ہے تنبیہ بھی کی جا سکتی ہے پھر بھی وہ اپنی ہٹ دھرمی پہ قائم رہے تو بائیکاٹ کا سوچا جا سکتا ہے ہم لکھنے والوں کی بھی کچھ مجبوریاں کچھ جذبات ہوتے ہیں۔ جائی بھائی نے بھی اپنی غلطی تسلیم کر کے

بڑے پن کا ثبوت دیا ہے بس اب بات کو ختم کیا جائے نئے افق ہم سب کا ایک گھر ہے گھر میں اگر ماحول کشیدہ ہوگا تو سکون ندارد، اصل میں ہوتا یہ ہے کہ کوئی لکھاری کسی ایک ڈائجسٹ میں جب مواد بھیجتا ہے کئی ماہ کی انتظار کی سولی پہ لٹکا رہتا ہے یا تو اسے بتایا جائے کہ بھئی آپ کی تحریر نا قابل اشاعت ہے تو وہ پھر کسی اور ڈائجسٹ میں بھیج سکے تھوڑی اور محنت کر کے میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی پر زور مطالبہ کرتا ہوں کہ نا قابل اشاعت تحریروں کا بتایا جائے بڑی مہربانی ہوگی گفتگو میں پہلا تبصرہ محترم امجد جاوید حاصل پور کا تھا تبصرہ دل کو بھا گیا جناب کی قیمتی باتیں دل میں رکھ لی ہیں اس امید کے ساتھ کہ ہمارے جیسے نوآموز لکھاریوں کے لیے مشعل راہ ہوں گی، امجد جاوید صاحب اگلے مہینے کے نئے افق کا انتظار مشکل ہوگا کیونکہ آپ کی اسٹوری عورت ذات کا سن کر اشتیاق بڑھ رہا ہے آپ کی اسٹوری اینڈ تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے دوسرا محبت نامہ مجید احمد جائی ملتان کا تھا جس نے معذرت بھی کی اور اپنی غلطی کا اعتراف بھی ویلکم مجید احمد جائی امید ہے پہلے کی طرح اپنے محبت نامے بھیجتے رہیں گے اور پھر صائمہ نور بہاولپور سے اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں تبصرہ خوب رہا ہے اپنی کہانی بھیج دیں دیکھی جائے گی۔ احسن ابرار رضوی صاحب کا سلام عقیدت دل سے قبول کیا اور تبصرہ پڑھ کر انعامی خط کی طرف چھلانگ لگائی جو پیاری بہن ناز سلوش زشے نے خوب محنت سے لکھا اور تفصیل سے بہت سی باتیں گوش گزار دیں زشے بہن خدا آپ کو خوش رکھے دکھ سکھ انسان کا ساتھی ہے آپ کے خطوں سے وہ کھلنڈرا پن غائب ہے جو شروع شروع میں تھا آپ کی کوئی نئی کہانی پڑھنے کو نہیں ملی کیا وجہ ہے؟ ریاض بٹ صاحب کیسے مزاج ہیں امید ہے خیریت سے ہوں گے بھلا ہی دیا بھائی آپ کی کہانیاں نظر سے گزرتی رہتی ہیں ویل لکھتے ہیں قربانی بھی پڑھی تھی۔ بیٹیوں پر لکھا گیا شعر دل میں پیوست ہو گیا اور آیئے ملتے ہیں محترم جناب عمر فاروق ارشد صاحب سے جنہوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں نئے افق میں گھس کر قبضہ جما رکھا ہے جی ہاں محترم عمر فاروق ویل ڈن جناب اور خطوط میں پہلے نمبر پر آنے پر بہت بہت مبارکباد قبول کریں۔ مجید احمد جائی کے بارے میں آپ کے تاثرات اور جذبات کی قدر کرتے ہیں لکھاریوں کو محتاط رہ کر تنقید کرنے کی ضرورت ہے لکھے ہوئے الفاظ واپس نہیں آتے تبصرہ شاندار رہا چلو یہ بھی مبارک باد قبول فرما لو رمشا ملک آزاد کشمیر کے جذبات اچھے لگے بے جا تنقید سے پرہیز کیا جائے انتشار پھیلانے کا سبب بن جاتی ہے۔ عبدالغفار عابد بھائی کا تبصرہ بھی اچھا رہا عامر زمان عامر بورے والا میرا سلام قبول کریں اور خوش رہیں۔ ممتاز احمد سیٹلائٹ ٹاؤن جناب کا تبصرہ تفصیل کے ساتھ انجم فاروق ساحلی جناب کی آدھا بٹن بہترین کہانیوں میں سے ایک تھی اور مہر پرویز دولومیاں چنوں سے تشریف لائے واقعی جناب نئے افق نہ ہوتا تو ہم جیسے کم علم جنہیں ادب کی الف سے شناسائی نہ تھی کون پوچھتا، فلک شیر ملک رحیم یار خان جناب السلام علیکم کیسے ہیں آپ نے کہانیوں پر کھلے دل سے تبصرہ کیا رانا حبیب الرحمان سینٹرل جیل لاہور آپ کو سلام کہ جیل جیسی سخت جگہ بیٹھ کے بھی پڑھنے لکھنے سے منہ نہیں موڑا۔ میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ نئے رائٹرز کا دل نہ توڑا جائے ان کا مواد اصلاح کے بعد شائع کر دیا جائے ہر کوئی پیدا ہوتے ہی شاعر نہیں ہوتا مطالعہ اور شوق یہ لگن پیدا کرتی ہے۔ پیارے ریاض حسین قمر جو نئے افق کا مستقل قاری اور رائٹر ہے کا بھرپور تبصرہ بھی نگاہوں کا مرکز رہا۔ ویل ڈن ایم حسن نظامی قبولہ شریف موسٹ ویلکم بھائی نئے افق آپ ہی کا رسالہ ہے علی حسنین تابش احسان سحر میانوالی، آپ کا شعر سر کے اوپر سے گزر گیا آپ نے حسام بٹ کی بات کی واقعی ہر ماہ ان کی کمی محسوس ہوتی ہے باقی تبصرہ شاندار رہا مبارکباد۔ عبدالجبار رومی انصاری شاداب کالونی لاہور، بہت پیارا تبصرہ لکھا۔ آخری محبت نامہ غلام یاسین نوناری صاحب چوک سرور شہید نے ارسال فرمایا سب اپنی اپنی جگہ فٹ تھے تبصرے پڑھتے ہی نیچے لکھی سانحہ ارتحال کی خبر نے بہت ہی اداس کر ڈالا محترم اعظم خان، محترم محی الدین نواب، ڈرامہ نگار محترمہ فاطمہ ثریا بجیا ہمارا قیمتی اثاثہ تھے ادبی دنیا کا یہ خلا ممکن ہی نہیں کہ بھرا جا سکے ہم ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔ محترم عبدالحمید کے تجزیہ کو نمایاں جگہ دے کر آپ نے ثابت کر دیا کہ نئے افق اپنے چاہنے والوں سے کس قدر اپنائیت و محبت رکھتا ہے نئے افق میں خطوط کی تفصیل کی عنایت بھی کی گئی جو اچھی لگی ذیل میں ایک خط میں خود کو دیکھ کر افسوس ہوا اور اپنی سستی کاہلی کا ادراک ہوا۔ آگے کے صفحات پر کہانیوں کی تفصیل جامع اور مفصل انداز میں ہمارے علم میں لائی گئی ویلڈن نئے افق، کہانیوں کی طرف آئے تو سب سے پہلے محترم ناصر ملک کی ''زاد سفر'' کی آخری قسط کو انجوائے کیا بانو کی موت نے بہت افسردہ کر دیا اتنا اچھا ناول لکھا کہ دل پہ نقش ہو گیا دوسری کہانی امجد جاوید صاحب کی عشق کسی کی ذات نہیں جس میں شانہ کی سحر انگیز شخصیت نے سعدیہ تو سعدیہ زرق شاہ ماڈرن بندے کو بدل ڈالا اللہ جسے توفیق دے اور عقل سے پردے ہٹ جائیں تو کسی کی نسبت ہی سہی اللہ پاک ہدایت نصیب فرما دیتا ہے زریں قمر کی ''سلگتے چنار'' کا غور سے مطالعہ کیا بہت اچھے انداز میں رائٹر نے کہانی پہ اپنی گرفت رکھی۔ راہ پر خار محمد یاسین صدیق کہانی زبردست رہی۔ فن پارے کی مختصر کہانیاں بھی عروج پر تھیں ساری سلیکشن بہترین تھی

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

جن میں امین صدرالدین بھایانی، طاہرہ جبیں تارا، زینب اصغر، عمران احمد راجپوت، محمد خالد جاوید ٹاپ پر رہے۔ نوشاد عادل کی ضرورت لاجواب رہی۔ ذوق آگہی میں شمائلہ رفیق، فلک شیر ملک، عائشہ اعوان، مہر پرویز دولو، احسان سحر، ریاض بٹ، جاوید احمد صدیقی، نادیہ حسین، آسیہ اشرف، سائرہ بتول کی تحریریں اچھی لگیں اور آخر میں اپنے من پسند ٹاپک خوش بوئے سخن کو ٹائم دیا۔ ماشاء اللہ نوشین اقبال بہت محنت کر رہی ہیں عمدہ سلیکشن رہی صداقت حسین ساجد، حنا نور، حمیرا فضا، سیدہ عروج فاطمہ، سیدہ مدینہ صادقہ فاطمہ، ظہور دین، محمد فاروق ارشد، بہنیں تو جگر کا ٹکڑا ہوتی ہیں بہت ہی معصوم اور نازک سی سید رضوان حیدر گردیزی، سید کاظمی شاہ فلک شیر ملک، عاطف محمود، عدیل مرتضی، سیف السلام، ڈاکٹر علی حسنین تابش، محمد اسلم جاوید اور مس عرشیہ ہاشمی کل 17 نظمیں غزلیں تھیں۔ باقی سب رائٹرز کو سلام نئے افق کی تبدیلی نے چار چاند لگادیے ڈائجسٹ کو نئے افق کی ساری ٹیم کو مبارکباد۔

عبدالحمید...... ہری پور۔

محترم وقابل احترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب، السلام علیکم۔ سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے میرا خط (تجزیہ) مارچ 2016ء کے پرچے میں لگایا میں کسی لالچ یا انعام کے لیے نہیں لکھتا یہ میرا آپ سے محبت کا اظہار ہے ایک ناول کے پیشرس میں ابن صفی نے آپ کو ایک مخلص دوست کہا ہے آپ ابن صفی کے جانشیں ہیں آج اگر ابن صفی موجود نہیں ہیں لیکن وہ ہمارے لیے آج بھی زندہ ہیں آپ کے روپ میں نظر آتے ہیں آپ نے ان کے مشن کو جاری رکھا ہوا ہے اور لگن اور محنت سے کام کر رہے ہیں ان کے پودے کو آپ نے ایک تناور درخت بنادیا ہے وقت کے تھپڑے ان سے ٹکرا تو سکتے ہیں مگر اس کو اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتے وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم ہے جو اس سے ٹکرائے گا پاش پاش ہوجائے گا لیکن نئے افق سے جب آپ نے عارضی طور پر کنارہ کشی کی اس وقت نئے افق کو دھچکا لگا پرچہ کچھ عجیب سا لگا۔ ٹائٹل بدزیب ہوگیا تھا اور کہانیوں کے معیار میں بھی فرق محسوس ہونے لگا تھا پرچہ اپنی ڈگر سے ہٹ رہا تھا عجیب قسم کے ٹائٹل لگنے شروع ہوئے جو سمجھ میں نہیں آتے تھے ٹنڈ منڈ درخت، سبزہ عجیب قسم کے مکان، پگڈنڈیاں، ندی نالے اور نہ سمجھ آنے والی چیزوں نے ٹائٹل کو چوں چوں کا مربہ بنادیا تھا ایسے مناظر دیکھ کر میرا دل دکھی ہوتا تھا کہ اتنا خوب صورت اور معیاری پرچہ تنزلی کی طرف کیوں جارہا ہے معلوم ہوا کہ آپ نے اس پر سے ہاتھ اٹھالیا ہے ٹائٹل پرچے کی جان ہوتا ہے اچھا ٹائٹل ہوگا تو پڑھنے والا اس کی طرف کھنچا چلا جائے گا۔ ٹائٹل خوب صورت ہوگا تو اس کے اندر کا مواد بھی معیاری سمجھا جائے گا۔ میں نے اس سے منہ نہیں موڑا باقاعدگی سے پڑھتا رہا مجھے امید تھی کہ ان شاء اللہ جلد ہی سنبھل جائے گا اور اپنی راہ پر دوبارہ گامزن ہوگا میں اس کی بہتری کے لیے دعا یا اللہ اس کو دوبارہ اپنے مقام پر آنے کی توفیق دے اور پہلے سے بہتر کر اور اس کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچادے اللہ نے میری سن لی آپ نے توانا کندھوں سے اس کو سہارا دیا اور اس کو صحیح مقام پر لانا شروع کیا اب آپ نے پرچے کو ایک مقام پر پہنچادیا ہے اب دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کی طرف گامزن ہے۔ سب معاملات ٹھیک ہوگئے ہیں پرچہ اب پہلے سے بہتر ہوگیا ہے ٹائٹل میں نکھار آگیا ہے کہانیوں کا معیار بھی بلند ہوگیا ہے لکھاریوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے اس میں بڑے پائے کے لکھاری لکھ رہے ہیں اور بہت اچھا لکھ رہے ہیں خطوط کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے ذیل میں ان لکھاریوں کے نام جو مسلسل طور پر لکھ رہے ہیں۔ زرین قمر، خلیل جبار، مشتاق احمد قریشی، ریاض بٹ، محمد سلیم اختر، حسام بٹ، راحیلہ ناز، حسیب جواد علی، انجم فاروق ساحلی، آشبہ مخدوم، جاوید احمد صدیقی، ابن حق، ناصر ملک، اقبال بھٹی، علی اختر، دستگیر شہزاد، سید احتشام، طاہرہ جبیں تارا، اسعد علی، ریحانہ سعیدہ، خورشید پیرزادہ، احمد صغیر صدیقی، مجید احمد جائی، نوشاد عادل، محمد یاسین صدیقی، امجد جاوید، عامر زمان عامر، شاہدہ صدیقی، پرویز احمد دولو، عمران احمد، ذوالفقار احمد، نسیم سکینہ صدف، نازش سلوش ذشے، وقار الرحمان راجپوت اقبال احمد، آغاز الدین، احسن طارق چوہدری، فوزیہ کنول، محترمہ زرین قمر صاحبہ نے مارچ 2015ء کے پرچے ایک کہانی ''لارنس آف پاکستان'' لکھی تھی۔ عمر فاروق ارشد نے ان کے متعلق بہت سخت ریمارکس دیے اور ہتک آمیز رویہ اختیار کیا بہت افسوس ہوا ایک منجھی ہوئی رائٹر اور محترم ہستی کے خلاف جملے کسے ہیں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ مشتاق احمد قریشی صاحب نے اپریل 2015ء میں شمارے میں اس کی وضاحت کردی تھی محترمہ زرین قمر صاحبہ ایک منجھی ہوئی مصنفہ اعلیٰ شخصیت اور محترم ہستی ہیں میں اس کی تحریریں بہت شوق سے پڑھتا ہوں، پرچے میں سب سے پہلے ان کی کہانی پڑھتا ہوں ماشاءاللہ اب تو وہ بہت اچھی شاعرہ بھی ہیں قریشی صاحب خط کے ابتدائی صفحہ پر میں نے پرچے کے متعلق کچھ سخت جملے تحریر کیے ہیں ان کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں، اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا اللہ آپ کو اور دیگر اسٹاف کو اپنی امان میں رکھے کامیابیاں نصیب ہوں ہر منزل آسان ہو ترقی اور خوشحالی ہو تمام بلاؤں سے محفوظ رکھے آپ کے کاروبار میں ترقی ہو اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو صحت اور تندرستی عطا فرمائے، آمین۔

ایم ریاض الحق رضوی...... میاں چنوں۔

السلام علیکم! ماہ مارچ کا شمارہ ملتے ہی دل باغ باغ ہوگیا۔ سرورق کی باجی کے لمبے بال حیران چہرہ منتظر آنکھیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ گفتگو میں میٹھے، کڑوے، کھٹے اور پھیکے خطوط کا میلہ لگا ہوا تھا۔ غلطی مان لینا عظمت کی بات ہے، معافی دے دینا اس سے بھی بڑی عظمت ہے۔ ویسے بھی مسلمان ہونے کے ناتے معاف کردینا بڑائی ہے۔ انہوں نے واسطہ ہی اس ذات کا دیا ہے جن کے صدقے ہم اشرف المخلوقات ہیں صائمہ نور کا خط الیکشن کی تلخ یادیں دلا رہا تھا۔ احسن رضوی کا خط عجیب الجھن میں ڈال گیا۔ بھائی عبدالحمید کا تجزیہ لاجواب تھا سلگتے چنار، آزادی کی تحریک پر لاجواب تحریر تھی۔ عاقبت اندیش میں عورت کا ازلی حسد ایک زندگی چاٹ گیا۔ پاداش میں سنی کی ماں کو سنی کے دوست سے عشق لڑاتے ہوئے شرم نہیں آئی، مہر صاحب کی تحریر باعصمت میں نادیہ نے جان دے کر باعصمت ہونے کا حق ادا کردیا۔

محمد سانول...... کسوال۔

السلام علیکم! میں نئے افق کا خاموش قاری ہوں ہر ماہ اس سے مل کر خوب حال دل سناتا ہوں۔ اس ماہ کا سرورق کمال تھا شکر ہے باز حسینہ سے دور اڑ رہا تھا۔ وگرنہ ضرور کوئی حرکت کرتا۔ اقرا قلم کی اہمیت پر بہترین مضمون تھا۔ عبدالحمید کی کاوش تجزیہ اچھی لگی۔ خطوط میں دوستوں کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ بہت خوب محبت کا پیغام تھا۔ سلگتے چنار مجاہدین کشمیر کی ہمتوں کی داستان تھی۔ ضرورت پوری ہونے کی خوب سزا ملی راہ پرخار میں اختتام سے آگاہی کے لیے مدتوں سفر کرنا پڑا ذوق آگہی میں دینی معمولات پڑھ کر ایمان تازہ ہوا۔

انجم فاروق ساحلی...... لاہور۔

آداب امید ہے آپ ادارہ کے دیگر احباب بخیر وعافیت ہوں گے اس بار نئے افق کا ٹائٹل خوب صورت اور جاذب نظر ہے خطوط کی محفل جامع اور بھرپور ہے بھائی امجد جاوید نے صحیح لکھا ہے خط میں کہانی پر تبصرہ زیادہ ہونا چاہیے باقی حال احوال یا ملکی حالات کا تذکرہ مختصراً قلمبند کیا جائے جن قارئین نے میرا تذکرہ قلمبند کیا میں ان کا مشکور ہوں۔ اعزازی پرچہ موصول ہونے پر عمران صاحب اور بھٹی صاحب کا بھی شکریہ اس بار کاغذ اور پرنٹنگ کا معیار بھی خوب ہے۔ اس مرتبہ کہانیوں میں سلگتے چنار، عاقبت اندیش، ضرورت، راہ پرخار، لب بام، شیطان سبھی کہانیاں خوب تھیں۔ مختصر تحریروں میں رگ جاناں اور قربانی بھی اچھی تھیں۔ انعام یافتہ اقتباس اہل تصوف کی کرامت ایمان افروز تھا۔ عبدالحمید صاحب کا تجزیہ اور ریکارڈ محنت اور لگن سے بھرپور ہے۔ انہیں واقعی ابن صفی مرحوم اور نئے افق سے والہانہ عقیدت ہے زرین قمر صاحبہ کی تعارفی گفتگو بھی اچھی رہی۔ آدھا بٹن کہانی کے سلسلے میں خواتین قارئین کو کچھ الجھن پیش آئی چنانچہ اس کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں آدھا بٹن ایک رشتے کی کہانی تھی نیا تجربہ تھا ایک شادی شدہ خاتون اپنے خوب صورت با اخلاق اور مختلف با کردار ملازم کو مستقل ملازم رکھنا چاہتی ہے۔ یہ جاسوسی کہانی تھی لیکن ایسی نہیں کہ قاتل کو بالکل ہی مخفی اور دھند میں چھپا کر رکھا جاتا جذباتی رشتہ ماں بیٹے کا تھا جسے غلط سمجھا گیا ڈائری کے الفاظ کے علاوہ صفحہ اول پر کرن نے خود خاوند کے متعلق کہا مثلث کچھ ایسی تھی کہ کرداروں نے کھل کر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ کہ اس کے دل میں شک کا کانٹا چبھتا رہتا ہے اگر خاوند کی نفرت اجاگر نہ کی جاتی اس پر شک وشبہ نہ دکھایا جاتا تو کہانی کا مرکزی ٹکراؤ سامنے نہیں آسکتا تھا۔ مسز چنگیزی کو مشابہت کی بنا پر چاند اپنا بھائی معلوم ہوتا وہ ان کے دل میں بھائی کی طرح اترا تھا ہوس پرست کی طرح نہیں، چنگیزی بلاوجہ ہی بیوی پر شبہ کرتا تھا مسز چنگیزی نے جھوٹی قسم کسی جگہ بھی نہیں کھائی ہر جگہ چاند سے ملنے کا اقرار کیا۔ آدھا بٹن کو بالکل منطقی انداز میں موڑا گیا یہ کہانی میں بھی منطقی ربط کو کہیں بے ربط نہیں کیا گیا اگر انداز بیان میں کمزوریاں تھیں تو گزشتہ ماہ کسی پیراگراف کا حوالہ دیا جاتا۔ مجھے صرف تعریف مرغوب نہیں لیکن تنقید کو دلیل سے واضح کیا جائے تو بہتر ہے تاکہ غلطی کا نوٹس لیا جاسکے امید ہے عمران صاحب اور بھٹی صاحب ناچیز کی وضاحت قارئین تک پہنچادیں گے۔

ناقابل اشاعت کہانیاں:۔

کاغذ کی کشتی (عامر زمان عامر)، جادوگر اور کتا (نازک شاہین)، فریب (کشاف اقبال)، قدرت کا فیصلہ (صفدر شاہین)، سبز باغ (قیصر عباس)، دیوانہ پن (روحان اعوان)، ناساز بن گئی محبت، شیشے کی محبت (نبیلہ نازش راؤ)، اناڑی، محافظ (نسیم سکینہ صدف)، زخم وفا (ندیم عباس)، ٹک ٹک، اور میں رجسٹر ہوگیا (مجید احمد جائی)، محبت کی میراث، ماہر فنکار، معجزہ (منشی محمد عزیز)، کھیل نہیں (نمرہ محمد)، آزاد غلام (محمد شعیب)، محبت ہے زندگی (سید سالار احمد)، ساحل تشنہ (گل مہر)، میری ڈائریاں (محسن علی شامی)، توکلی مست اور سمو (ساحل ابڑو)، ہم صورت گر خواب کے (محسن علی)، مکافات عمل (ممتاز احمد)، مکافات عمل (شمسہ فیصل)، گل ہوئے چراغ کیسے (سجاد بشیر)، مرغ بسمل (رشک حبیبہ)، تہی دست (اقصیٰ پیا)، جگو (مہر پرویز)، پوشیدہ قاتل (مونا صفدر)

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

اللہ

ترجمہ:۔ زمین اور آسمانوں میں جو بھی مخلوق ہے وہ اللہ کی ہے۔ اور جو (فرشتے) اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے سرتابی کرتے ہیں اور نہ تھکتے ہیں۔ وہ دن ورات اس کی تسبیح بیان کرتے رہتے ہیں۔ دم تک نہیں لیتے۔

(الانبیاء۔۱۹۔۲۰)

تفسیر:۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ تمام کائنات جس میں سیکڑوں کہکشائیں اپنے اپنے مدار میں گردش میں ہیں جبکہ ہمیں تو صرف اپنی زمین وآسمان ہی نظر آتے ہیں یا وہ کہکشاں جس میں یہ زمین' چاند' سورج اور دیگر سیارے محو گردش ہیں یہ تمام نظام کائنات ایک ایسے قانونِ قدرت پر قائم ہے۔ جس کے سبب تمام اجزائے کائنات کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور رابطہ قائم ہے۔ کسی بھی ایک جزو کائنات کی حرکت کل کائنات سے مربوط ومنسلک ہے اور یہ سب قانون ایک قانون نافذ کرنے والے' قانون بنانے والے خالق کے ارادے واختیار کا مرہونِ منت ہے۔

اگر کہیں اس عظیم ترین کائنات کی تدبیر وقوانین بنانے والی ایک ہستی کی جگہ کئی اور ہستیاں ہوتیں تو متعدد قانون ساز اپنے اپنے قوانین نافذ کرتے' کیونکہ ارادہ کرنے والی ذات کا مظہر کچھ اور ہوتا ہے اور کوئی قانون اور ضابطہ نافذ کرنے والی ذات کے ارادے کا مظہر کچھ اور ہوتا ہے اور اگر ایسا ہوتا تو کائنات کا یہ مکمل نظام وانتظام کب کا بکھر چکا ہوتا۔ اول تو اس سارے نظام میں ہم آہنگی' یہ ربط وضبط کبھی پیدا ہی نہ ہوتا۔ اور کائنات میں آئے دن تصادم ہوتا رہتا اور قیامت اس کی آفرینش کے فوری بعد ہی برپا ہوجاتی۔ چونکہ پوری کائنات کے عظیم ترین نظام کو ایک ہی ہستی اپنے اختیار وارادے سے چلا رہی ہے اس اکیلی منصوبہ سازی وسارا انتظام واہتمام ہے یہ کائنات اپنے ایک اکیلے خالق ومالک کے اختیار وارادے کے مطابق سرگرم عمل ہے' اس سارے نظام سے سمجھنے والے بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا اور تمام کائنات کی ہر قسم کی تمام مخلوقات کا خالق ومدبر ایک ہی ہے۔ اسی لئے اس کے انتظام وانصرام میں' ساخت واختیار میں کبھی کوئی فساد برپا نہیں ہوتا' یہی وجہ ہے کہ زمین وآسمان کی تمام مخلوقات اللہ کی بندگی اور حمد و تسبیح کرتی ہے اور تمام فرشتے جو اس مالک وخالق کے پاس ہیں وہ بھی بندگی سے سرتابی نہیں کرتے نہ وہ بندگی سے ملول ہوتے ہیں' وہ تور کے بغیر شب وروز ہر دم اللہ کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں' نہ کبھی وہ کسی طرح کی برائی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

زمین وآسمان میں جو کچھ بھی ہے اس کا مکمل علم صرف باری تعالیٰ کو ہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو ہر چیز کا احاطہ کر سکتا ہے وہ علیم ہی انسانوں اور جنوں اور دیگر تمام مخلوقات کے بارے میں یقین سے جانتا ہے۔ اہلِ ایمان کو حکم ہے جنوں اور فرشتوں پر ایمان لانے کا' لیکن ان دونوں کے بارے میں انسان صرف اس قدر ہی جانتا ہے' جس قدر خالقِ کائنات نے علم عطا کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ بھی کواکب ہیں کچھ اور ذی عقل مخلوق بھی ہوں' ان کی شکل وصورت اسی سیارے کے ماحول کے طبعی ماحول وحالات کے مطابق ہوں۔ یہ علم بھی اسی ذاتِ علیم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لاتعداد مخلوق رات ودن اللہ کی عبادت میں مصروف ہے۔ لیکن انسانوں میں سے بہت سے ایسے ہیں خصوصاً مشرکین جو اللہ واحد کی عظمت واطاعت اور بندگی نہیں کرتے۔ حالانکہ اس زمین وآسمان کی ایک ایک چیز ایک ایک حرکت رات ودن کا ہونا اور پوری کائنات میں چلنے والا نظامِ فطرت اس بات پر روشن دلیل ہے کہ مدبرِ کائنات واحد ولاشریک ہے اور اللہ تعالیٰ ہی معبود واحد ہے۔ یہی تعلیم قرآن کریم اور اس سے پہلے کی تمام کتب آسمانی نے دی ہے۔

صفات الٰہی

جس طرح دنیا میں حکومت چلانے اور اسے قائم رکھنے کے لئے ہر حکومت تین مضبوط ستونوں پر قائم ہوتی ہے (۱) مقننہ یعنی قانون ساز ادارہ (لیجسلیٹو کونسل) (۲) عدلیہ' جو نافذ قوانین کی روشنی میں عدل وانصاف کرے۔ (۳) انتظامیہ۔ جو نافذ قوانین اور ان کی روشنی میں عدل وانصاف کے مطابق فیصلوں پر عمل درآمد کرے اور کرائے اور حکومتی انتظام انصرام کو قوانین کے مطابق چلائے۔

ربّ ذوالجلال کی ذاتِ عالی جو خود قانون ساز اور عادل ونگہبان و منتظم بھی ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی تمام صفاتِ عالی جن کے باعث یہ عظیم ترین کائنات کا سارا نظام قائم ودائم ہے اور بغیر کسی نقص کے مسلسل چل رہا ہے۔ ان تمام صفاتِ الٰہی کے لئے بھی بنیادی عنوانات قائم کئے جاسکتے ہیں۔ (۱) اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحیمی وکریمی (۲) اللہ تعالیٰ کا جاہ وجلال (۳) تنزیہ وکمال۔ ایسی تمام صفاتِ الٰہی جن سے اللہ تعالیٰ کی بڑائی' کبریائی' عظمت وجلال' بزرگی وبرتری' رحم وکرم' پرورش ونگہداشت غرض ہر وصف میں اس کا کامل ہونا اس طرح سے ان صفات کا مزید پانچ اقسام میں تعین ہوسکتا ہے۔ ایک وہ جن میں وحدانیتِ الٰہی ثابت ہے' دوسری وہ جو وجود باری تعالیٰ سے متعلق ہیں' تیسری وہ جو اس ذاتِ عالی کے علم سے وابستہ ہیں' چوتھی صفاتِ الٰہی اس کی قدرت کاملہ سے تعلق رکھتی ہیں اور پانچویں صفاتِ باری وتعالیٰ وہ ہیں جو اس کی تنزیہ وپاکی سے آراستہ ہیں۔ انہیں علمائے تفسیر نے مندرجہ ذیل طریقہ پر رقم کیا ہے۔

(۱)۔ ”جمالی“ صفات الٰہی۔ ایسی صفات جن سے اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اور شفقت کا اظہار ہو رہا ہو۔

(۲)۔ ”جلالی“ صفاتِ الٰہی۔ وہ صفاتِ الٰہی جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی بڑائی' کبریائی اور شہنشاہی کا اظہار ہو۔

(۳)۔ ”وحدانی اور وجودی“ صفاتِ الٰہی۔ ایسی صفات جو اللہ کی یکتائی اور بے مثالی کی مظہر ہو' جن سے اللہ کا وجود' بقاء ودوام' ازلیت اور لازوالی ظاہر ہو۔

(۴)۔ ”قدرت“ کی صفاتِ الٰہی۔ ایسی صفات جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہو۔

(۵)۔ ”تنزیہ“ صفاتِ الٰہی۔ وہ صفاتِ الٰہی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی بزرگی' بڑائی' پاکی' نیکی اور ہر عیب ونقصان سے اس کی برات کا مظہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا عقیدہ دینِ اسلام میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس کے اوصاف اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں' ان اوصاف کو چھوڑ کر جو ربّ ذوالجلال کے لئے خاص ہیں اور جو بندے کی اوقات' حیثیت وطاقت سے زیادہ ہیں۔ بقیہ اوصاف انسان کے لئے قابل نقل وعمل ہیں کہ وہ اوصافِ الٰہی سے دور کی نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے انسان پر لازم آتا ہے کہ اگر اسے اپنے مالک وخالق سے نسبت پیدا کرنا ہے تو اپنے اندر اس ذاتِ عالی سے نسبت کے اوصاف پیدا کرے اور ان اوصاف کی خوبیوں کو اپنا معیار جان کر اس کی پیروی کی خواہش کرے۔ تاکہ قربِ الٰہی کی لذت سے قلب ونظر آشنا وشادکام ہوسکیں۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو تمام انسانیت کے لئے آیا ہے نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین اور عظیم ترین نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی خاص قوم یا کسی خاص علاقے کے لئے مبعوث نہیں فرمایا' تمام عالم کے لئے بھی نہیں بلکہ تمام عالموں کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سرتاجِ رسالت بنا کر آپ کو تکمیل دین کا فریضہ عطا فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ربّ العلمین جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے نے رحمت اللعالمین بنا کر مبعوث فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین اسلام مکمل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے جو اللہ کا پسندیدہ دین ہے۔

(جاری ہے)

ملاقات

انٹرویو: زرین قمر

سحرش فاطمہ۔ نادیہ احمد

انٹرویو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے اس بار انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مصنفین کا انٹرویو پیج پر کیا جائے۔ اس بار انٹرویو کے لئے جن مصنفہ کا انتخاب کیا گیا ہے ان کا نام ہے محترمہ زریں قمر صاحبہ۔ زرین قمر صاحبہ اردو ادب کا ایک ایسا چمکتا ستارہ ہیں جن کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ایک مصنفہ، شاعرہ اور گلوکارہ کی حیثیت سے ہم سب ان سے واقف ہیں۔ زرین قمر نے 1969 میں ہمدرد نونہال، کراچی سے اپنے تحریری سفر کا آغاز کیا۔ ''موتی کی تلاش'' اور ''روشنی کی رہبر'' ان کی پہلی تحاریر ہیں اس کے بعد انہوں نے اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ، حکایت ڈایجسٹ، آنگن لاہور، سسپنس ڈائجسٹ، ایکشن ڈائجسٹ، نیا رخ اور آنچل ڈائجسٹ کے لئے لکھا۔ 1976 میں کراچی یونیورسٹی سے جرنلزم میں ماسٹرز کرنے کے بعد زرین قمر نے بطور سب ایڈیٹر ماہنامہ آنچل ڈائجسٹ سے اپنے پیشہ ورانہ کرئیر کا آغاز کیا۔ ایک عظیم مصنفہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک باکمال شاعرہ، گلوکارہ، آرٹسٹ اور استاد بھی ہیں۔ ایک طویل عرصہ ریڈیو پاکستان سے بھی منسلک رہیں اور بے شمار انعامات اور اعزازات حاصل کئے۔ آپ کے اب تک لگ بھگ چار ہزار صفحات مختلف جرائد اور اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔ کشمیر اور غزہ جیسے حساس اور متنازعہ موضوعات پر آپ کی دل کو چھو لینے ……والی کہانیاں اس وقت مختلف جرائد میں قارئین کی توجہ کا مرکز ہیں۔۔ محترمہ زرین قمر صاحبہ نے ہمارے نئے افق کے قارئین کے لئے اس انٹرویو کی درخواست کو قبول کیا ہے۔

سحرش فاطمہ: السلام علیکم آپا کیسی ہیں آپ؟ آپ کو یہاں خوش آمدید!

یہ بتائیں اپنی ایسی کوئی تحریر جسے لکھتے ہوئے دکھی ہوں؟ کسی اور کی تصنیف جسے پڑھ کر آب دیدہ ہوئی ہوں؟

اب تک آپ کے جتنے افسانے اور ناولز آئے ان میں سے آپ کو کونسا ذاتی طور پر پسند ہے؟

کوئی کردار جو خود سے منسلک کریں؟

کون کون سے مصنفین کو پڑھتی ہیں؟ کوئی پسندیدہ مصنف اور تصنیف؟ نئے لکھنے والوں کو کیا میسج دینا چاہیں گی؟

زرین قمر: وعلیکم اسلام۔ شکریہ آپ سب کا۔ الحمدُ للہ ٹھیک ٹھاک۔

ایسی بیشمار تحاریر ہیں کسی ایک کا نہیں بتا سکتی۔

میرے اب تک جتنے افسانے اور ناولز آے ہیں ان میں سے مجھے گزشتہ ماہ نئے افق میں شائع ہونے والا ناول تلاش سحر پسند ہے خود سے کوئی کردار منسلک نہیں کرنا چاہتی خاص طور سے کسی ایک مصنف کو نہیں پڑھتی جو کہانی اچھی محسوس ہو وہ پڑھتی ہوں اس طرح زیادہ لوگوں کو پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔

سحرش فاطمہ: آپ کو کہانیاں لکھنے کا شوق کب اور کیسے ہوا؟

زرین قمر: بچپن میں جب پڑھنا سیکھ رہے تھے تو اردو کو امپرود کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھتے تھے اس سے ہی لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوگیا۔

سحرش فاطمہ: پہلی کہانی کب اور کہاں چھپی؟

زرین قمر: میں نے اپنی پہلی کہانی 1969 میں نونہال کراچی میں لکھی اس کا نام موتی کی تلاش تھا۔

سحرش فاطمہ: آج کل کی رائٹرز اور ریڈرز کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گی؟ کبھی ٹی وی کے لئے لکھا؟

زرین قمر: آج کل کی رائٹرز کے بارے میں میں یہی کہوں گی سحرش کہ ماشاءاللہ سب بہت اچھا لکھ رہی ہیں اور اگر کسی نئی رائٹر کے کام میں کہیں کوئی کمی ہوتی ہے تو ڈائجسٹوں کی انتظامیہ اس کی نوک پلک سنوار کر ان کی رہنمائی بھی کرتی ہے اور حوصلہ افزائی بھی میں نے ٹی وی کے لئے تو نہیں لیکن ریڈیو کے لئے کافی لکھا ہے۔

سحرش فاطمہ: نئے افق کی کوئی خاص بات؟

زرین قمر: نئے افق کی خاص بات یہ ہے کہ آپ اس میں پیار محبت کی کہانیوں کے علاوہ گلوبل مسائل پر بھی کہانیاں لکھ سکتے ہیں۔

سحرش فاطمہ: ریڈیو سے متعلق کوئی یاد ہم سے شیئر کرنا چاہیں گی؟

زرین قمر: ضرور سحرش میں نے اپنے کالج کے زمانے میں ریڈیو اسٹیشن کراچی جوائن کیا تھا گئی تو بزم طلبہ پروگرام کے موسیقی کے مقابلے میں تھی جس میں پورے کراچی کے کالجز کی ٹیموں نے حصہ لیا تھا میں نے سیکنڈ انعام حاصل کیا تھا وہ مشہور شاعر صہبا اختر کا نغمہ تھا جو انہوں نے خاص طور سے میرے لئے لکھا تھا بعد میں یہ نغمہ مزدور بھائیوں کے پروگرام کے علاوہ دوسرے پروگراموں میں بھی براڈ کاسٹ ہوا تھا اس کے بعد میں نے ریڈیو پر 1973 سے 1993 تک پروگرام کیے ان میں خبریں میوزک انٹرویوز تبصرے صبح نو پروگرام کے اسکرپٹ شامل ہیں میرے زمانے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ریڈیو یا ٹی وی کا کوئی پروگرام بغیر تلفظ کی غلطیاں درست کیے آن ائیر نہیں جاتا تھا

سحرش فاطمہ: جیسا کہ آپ فنِ مصوری میں بھی ہیں اور گلوکارہ بھی دونوں فیلڈ میں کیسا پایا خود کو اور مصوری میں کون سا میڈیم پسند ہے؟ مزے کی بات بتاؤں میں نے بھی دو سالہ کورس کیا ہوا ہے مجھے آئل پینٹس کبھی پسند نہیں آئے۔

آپ کو کیا پسند ہے؟ کوئی نمائش ہوئی اب تک؟

زرین قمر: میں نے باقاعدہ مصوری کا کوئی کورس نہیں کیا سحرش دراصل یہ اللہ کی دین ہی کہوں گی مجھے خود بھی اپنی اس صلاحیت کا پتہ نہیں تھا ہوا یوں کہ ایک بار میں نے اسکول میں ایک بچے کو سر سید احمد خان کی تصویر بنانے کے لئے دی جب وہ بنا کر لایا تو اس میں مجھے کچھ غلطیاں محسوس ہوئیں میں نے وہیں کلاس میں بیٹھے بیٹھے پینسل اور ربر لے کر اسے درست کرنا شروع کر دیا پیریڈ ختم ہونے سے پہلے تصویر بن گئی کیونکہ دور سے کلاس کی طرف آتی ہوئی ایک ٹیچر نے پوچھا کیا سر سید احمد خان بنائے ہیں سب نے بہت تعریف کی پھر میں نے کئی لوگوں کی تصاویر بنائیں ان میں میرے اسکول کے ڈائریکٹر جنرل ڈی جی کوسٹ گارڈ بریگیڈیر محمود بھی شامل ہیں جب میں نے انہیں تصویر پیش کی تو وہ بہت حیران ہوئے تھے۔

امیر نذیر بلوچ: السلام علیکم، آپ سے پہلا سوال: آپ نے غزہ اور کشمیر جیسے اہم موضوعات کو سپرد قلم کیا ہے تو کیا آپ سمجھتی ہیں کہ صرف قلم سے ان سلگتے ایشوز کو حل کیا جا سکتا ہے؟ دوسرا سوال: موجودہ معاشرے میں خواتین رائٹرز کو آپ کہاں دیکھتی ہیں یعنی ان کا کردار کتنا کارگر رہا ہے مسائل کے حل کی جانب؟

زرین قمر: امیر نذیر آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں نے غزہ پر لکھنے کا فیصلہ اس لیے کیا کہ یہ بھی جہاد کی ایک قسم ہے کہ اگر میں محاذ پر جا کر غزہ کے لوگوں کے ساتھ دشمن سے لڑنے میں ان کی مدد نہیں کر سکتی تو ان کے ساتھ جو ظلم ہو رہا ہے اس کے بارے میں دنیا کو بتا تو سکتی ہوں اور اس کے لیے بھی میں مشتاق احمد قریشی صاحب کی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ موقع فراہم کیا ورنہ ہمارا میڈیا تو اس بارے میں خاموش ہے۔

آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ نئی قلمکار بہنیں اچھا لکھ رہی ہیں بس اپنی تحریروں میں عشق و محبت کے افسانوں کی

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

جگہ کچھ ایسے مسائل بھی شامل کرلیں جو آج انسانیت کے لیے عذاب بنے ہوئے ہیں ان میں لکھنے کی صلاحیتیں بہت ہیں۔

امیر نذیر بلوچ: ریڈیو پاکستان سے بھی آپ وابستہ رہیں تو وہاں کا تجربہ کیسا رہا؟

آپ نے زیادہ تر ایکشن میگزینز میں لکھا ہے جہاں مردوں کی اجارہ داری ہے تو اس حوالے سے کبھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

گلوکاری کا شوق کب اور کیسے ہوا؟ اور ذاتی طور پر کیا گانا پسند کرتی ہیں مثلاً غزل، گیت یا کلاسیکل وغیرہ؟

مغربی ادب سے تراجم کرتے وقت کن باتوں کا خیال از حد ضروری ہے؟

زرین قمر: مجھے جو تجربہ ہوا وہ بہت اچھا تھا اتنا اچھا کہ میں نے 1973 سے 1985 تک پروگرام کیے جن میں خبریں میوزک انٹرویوز تبصرے سب شامل تھے۔ بہت سے پروگرام تو لائیو ہوتے تھے آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ نہیں مجھے کہیں کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوا در اصل جب آپ اپنے کام سے مخلص ہوتے ہو اور دوسروں کی عزت کرتے ہو دوسروں کے کام کی تعریف کرتے ہو تو مخالفت کے بجائے آپ کو پزیرائی اور رہنمائی ملتی ہے مخالفت نہیں آپ لوگوں کو آگے جانے کا راستہ دیں لوگ آپ کو آگے جانے کا راستہ دیں گے گلوکاری کا شوق بچپن سے تھا گانوں میں گیت اور غزل زیادہ پسند ہے اور مغربی ادب سے تراجم کرتے وقت ضروری بات یہ ہے کہ کہانی کو اگر آپ ایڈاپٹ کر رہے ہیں تو اپنے رسم و رواج اور سوسائٹی کے تقاضوں کو مدنظر رکھیں اور اگر صرف ترجمہ کر رہے ہیں تو جس زبان اور معاشرے کی کہانی ہے اسے مسخ نہ ہونے دیں اور آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

انمول اعوان: کیا کبھی آپ کو ایسا لگا زندگی میں کہ اپنا قلمی سفر جاری نہیں رکھ پائیں گی۔ پھر بھی حالات کا مقابلہ کیا ہو؟

زرین قمر: جی انمول ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب میں نے کچھ عرصے کے لیے لکھنا چھوڑ دیا تھا تب میرے شوہر کا انتقال ہوگیا تھا اور مجھے ملازمت کرنا پڑی تھی آپ بھی جانتی ہونگی کہ صرف کہانیاں لکھنے سے گھر نہیں چلایا جاسکتا چنانچہ میں نے لکھنا چھوڑ کر ملازمت کی اور اب 14 سال بعد پھر اس دنیا میں واپس آ گئی ہوں۔

انمول اعوان: آج کل میں لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن ایک پیراگراف بھی ٹھیک سے نہیں بن رہا مجھ سے۔ اب تو حوصلہ ہی ختم ہوتا جا رہا ہے۔

زرین قمر: میرا مشورہ ہے کہ کچھ دن لکھنا چھوڑ کر اچھے لکھاریوں کو پڑھیں۔

انمول اعوان: اچھے لکھاریوں کی تحریر پڑھ کر ان پر تبصرہ لکھنا چاہتی ہوں، لیکن مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ لکھوں کیا؟ ایک تبصرہ ہی نہیں لکھ پائی۔

زرین قمر: انمول پہلے لکھنا سیکھیں پھر لکھنے والوں پر تبصرہ کریں۔

صداقت حسین ساجد: آپ کی ترجمہ کردہ تحریر اغوا برائے تاوان کس ادیب کی ہے؟

زرین قمر: یہ ایک انگریزی ناول Thenigotiator کا ترجمہ ہے اور اس کے رائٹر ہیں fredrickforsyth

صداقت حسین ساجد: آپ اپنی کالج لائف اور یونی ورسٹی لائف کے بارے میں بتانا پسند کریں گی؟

زرین قمر: جی ہاں صداقت کالج میں پڑھائی کے علاوہ میں نے activities curricularCo میں بھی حصہ لیا میں اپنے کالج کی طلبہ یونین کی صدر تھی میں نے اپنے کالج میں ہفتہ طلبہ منعقد کروایا تھا جس میں اس وقت کی ملک کی مشہور شخصیات کو مدعو کیا تھا۔

بیگم رعنا لیاقت علی خان اس وقت کی گورنر سندھ جن کے بائیں جانب میں بیٹھی ہوں اس موقع پر مجھے چار بہترین کارکردگی کے انعامات ملے تھے اور بیگم رعنا لیاقت علی نے خاص طور سے اپنی طرف سے سرٹیفکیٹ عطا کیا تھا۔

یاسین صدیقی: آپ سب سے زیادہ کس مصنف سے متاثر ہیں صرف دو نام۔

زرین قمر: اپنے زمانے کے لکھنے والوں میں ایک مشتاق احمد قریشی صاحب سے متاثر ہوں ان کی مذہبی تحریریں بہت جامع اور سبق آموز ہوتی ہیں اور دوسرے اظہر کلیم صاحب تھے جن کو کہانی کی بنت پر بڑی دسترس تھی۔

قاری ابوبکر: آپ کی کوئی ایسی یادگار تحریر جو آپ کو کبھی نہ بھولی ہو؟

زرین قمر: جی غزہ کی سسکیاں۔

قاری ابوبکر: نئے افق میں کس موضوع پر سب سے زیادہ لکھا؟

جرم و سزا اسپنس، فکشن وغیرہ

زُہرہ نور: السلام علیکم، ایک بہترین لکھاری کی کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟

زرین قمر: وعلیکم السلام زہرہ نور ایک اچھے قلمکار کی خصوصیت یہ ہونا چاہیے کہ جو لکھے سچ ہو اور دلوں کو چھو لینے والا ہو۔

رابعہ عمران چوہدری: میں یہ پوچھنا چاہوں گی کہ ایک رائٹر کو بھی زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیا آپ اپنی مشکلات کو بھی افسانے، ناول کے ذریعے اپنے قارئین سے شیئر کرتی ہیں اور آپ کو کون سا ناول پسند ہے اور اس کی وجہ؟ ویسے تو ایک رائٹر کو اپنے لفظوں سے اتنی محبت ہوتی ہے جیسے ماں کو بچے سے‘ یہ میرا ذاتی خیال ہے تو کیا اس بات سے آپ متفق ہیں؟ اور بہت سی دعائیں۔

زرین قمر: شکریہ رابعہ میں بھی یہی سمجھتی ہوں کہ ہر تحریر مصنف کو پیاری ہوتی ہے میں نے کبھی اپنی مشکلات کو کہانیوں میں بیان نہیں کیا یہ اور بات ہے کہ کہانی میں کبھی ایسی مشکلات کا ذکر آیا جن کا کبھی میں نے سامنا کیا ہو تو اسے بیان کرنے میں زیادہ دلچسپی سے کام لیا مجھے اپنی کہانی تلاش سحر بہت پسند آئی جو جنوری 2016ء کے نئے افق میں شامل ہوئی ہے اور اس کی وجہ لیلیٰ خالد کی بہادری اور اپنے وطن کو کافروں سے آزاد کروانے کی لگن ہے

کنول خان: آپ کے خیال میں کیا لکھنا زیادہ مشکل ہے؟ شاعری یا پھر کہانی؟

کوئی ایسا کردار جس میں آپ کو اپنی جھلک نظر آتی ہو؟

زرین قمر: میں نے کبھی کسی کردار کا اپنے آپ سے مقابلہ نہیں کیا اس لئے اپنی جھلک کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی اس کے علاوہ Poetry یا story لکھنا ان کے لئے آسان ہے جن میں لکھنے کی صلاحیت ہوتی ہے اگر کسی کو لکھنے کی سمجھ ہی نہیں تو وہ poetry یا story کچھ بھی نہیں لکھ سکتا اور اس کے لئے دوسرے قلمکاروں کی تحریریں پڑھنا بہت ضروری ہے۔

محسن علی شامی: کسی بھی کہانی کی طاقت کون سی چیزوں پر قائم رہتی ہے؟

کیا آج رائٹر کی وہی اہمیت مل رہی ہے جو پہلے ہوتی تھی یا کچھ فرق پڑا ہے؟ اور کیا آج کے حالات میں لکھائی کو پروفیشن کے طور پر اپنایا جاسکتا ہے؟

آپ کے پہلے اور دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مرکزی خیال اچھا ہو مکالمے جاندار ہوں اور سسپنس آخر تک قائم رہے ایک اچھے مصنف کی اہمیت آج بھی پہلے جیسی ہی ہے اور آج کے دور میں لکھنے کو ذریعہ معاش نہیں بنایا جاسکتا آپ شوق کی حد تک لکھ سکتے ہیں۔

فیصان خورشید: کیا کہانی میں مشکل الفاظ ضروری ہیں؟ اگر کہانی ریجیکٹ ہوجائے تو کیا کرنا چاہیے؟

زرین قمر: فیصان خورشید کہانی میں مشکل الفاظ کا استعمال ضروری نہیں لیکن یہ اپنا اپنا انداز بیان ہے کچھ لوگ مشکل الفاظ استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔

اگر کہانی مسترد ہوجائے تو دوبارہ اور محنت سے لکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

حنا مہر: محبت کے لئے آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

زرین قمر: محبت کے لئے میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ بےلوث ہو جس سے آپ محبت کرتے ہیں اسے کبھی آزمائش میں نہ ڈالیں

حنا مہر: اپنی ذات کی خوبیاں اور تعریفی جملے سن کر کیسا محسوس کرتی ہیں؟

زرین قمر: بہت خوشی ہوتی ہے اور زیادہ اچھا کام کرنے کو دل چاہتا ہے میں نے کرن ڈائجسٹ میں جب ملک کی مایہ ناز رائٹر فردوس حیدر کا انٹرویو لیا تھا تو اسے بہت پسند کیا گیا تعریف نے اتنی ہمت بندھائی کے میں نے لگاتار کئی لوگوں کے انٹرویوز کیے جن میں ملک کی مایہ ناز گلوکارہ مہناز کا انٹرویو بھی شامل ہے اس وقت تک مہناز کا کوئی انٹرویو کہیں شائع نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ کسی کو انٹرویو نہیں دیتی تھیں میں نے انھیں بہت مشکل سے راضی کیا تھا پھر میں بھی ان کے ساتھ ریڈیو کے پروگراموں میں حصہ لیتی تھی ہماری دوستی نے بھی میرا کام آسان بنایا تھا۔

حنا مہر: زندگی کب بہت اچھی لگتی ہے؟

زرین قمر: مجھے تو زندگی جب اچھی لگتی ہے جب آپ کسی ضرورت مند کے کام آئیں بغیر کسی صلے کی امید رکھے یقین جانئے بہت خوشی ہوتی ہے۔

حنا مہر: اچھی تحریریں لکھنے کے لیے کیا ضروری ہے؟

زرین قمر: مہر اس سوال کا جواب بھی دیا جا چکا ہے چلیں میں اپنے بارے میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتاؤں جس کا خیال مجھے ابھی آیا ہے اتفاق سے میں نے دو جگہ ملازمت کی اور دونوں جگہ میں ان اداروں کی بنیاد رکھنے والوں کی ٹیم کا حصہ تھی آنچل کے پہلے شمارے کی سب ایڈیٹر کے طور پر محترم مشتاق احمد قریشی صاحب کے ساتھ کام کیا جو میرے لئے ایک اعزاز ہے اور جب اسکول میں جاب کی تو وہاں اپائنٹ ہونے والی پہلی ٹیچر تھی اس وقت اسکول میں ایک بھی بچے کا داخلہ نہیں ہوا تھا یہ 1996 کی بات ہے اور جب میں نے اسکول چھوڑا تو وہاں 1500 بچے تھے۔

عروج فاطمہ: السلام علیکم' زرین قمر صاحبہ کیسی ہیں آپ؟ میرا سوال یہ ہے کے جب آپ کی تحریر پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا اور میں یہ کہنا چاہوں گی کے ایک اچھے رائٹر کو عاجزی اور انکساری کا پیکر ہونا چاہیے اور وہ آپ ہیں میں بتا بھی نہیں سکتی کے آج آپ سے بات کر کے مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے۔ (امین)

زرین قمر: آپ کی پذیرائی کا شکریہ میں کچھ نہیں اصل میں اہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا میں اس سوال کا جواب دے چکی ہوں کہ پہلی تحریر شائع ہونے پر میرے جذبات کیا تھے۔

عروج فاطمہ: میں شاعری بھی کرتی ہوں آپ کے لیے کچھ لکھا ہے۔

یاد رکھیں گے کچھ اس طرح سے ہم
ہر دعا میں نام پکارا کریں گے

زرین قمر: عروج آپ کے شعر کے جواب میں خاص طور سے آپ کے لئے۔

آپ کی ہر دعا کے بدلے ہم
اپنی ساری وفائیں دے دیں گے

فہمیدہ انجم: السلام علیکم میم
میرا آپ سے سوال ہے کہ کیا آپ کو کبھی ریجیکشن کا سامنا کرنا پڑا؟
کبھی بے جا تنقید ہوئی؟
کوئی ایسی تحریر جس کا توقع سے زیادہ رسپانس ملا؟
کوئی ایسا موضوع جس پر لکھنے کی خواہش ہو؟
کوئی ایسا شمارہ جس میں اپنی تحریریں پبلش کروانا زیادہ پسند ہو؟
آپ کی لائف کا کوئی انٹرسٹنگ واقعہ جو فینز سے شیئر کرنا چاہیں؟
ماشاء اللہ ہر فن مولا ہیں شاعرہ، ناول نگار، آرٹسٹ ٹیچر بھی ہیں کس فیلڈ میں کام کر کے زیادہ مزا آتا ہے؟

زرین قمر: آپ کی محبت کا شکریہ اتفاق سے مجھے کبھی ریجیکشن کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ میں نے لکھنا بعد میں شروع کیا اور پڑھنا پہلے بہت پڑھا ہر موضوع پر پڑھا اپنے سلیبس کے نوٹس بغیر کسی کی مدد کے لائبریری میں بیٹھ کر مستند کتابوں سے خود تیار کرتی تھی پر ان میں جو سب سے بہتر ہوتا اسے کسی اخبار میں شائع ہونے کے لئے بھیج دیتی تھی پھر ریجیکشن کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا میں نے پہلا تحقیقی مضمون بابائے اردو مولوی عبدالحق پر لکھا تھا جو سلیبس کے لئے تھا جب لکھ لیا تو میں نے سوچا کہ کوئی اسے پڑھے اور مجھے پتہ چلے کہ کیسا لکھا ہے دوستوں نے تو تعریف ہی کرنی تھی چنانچہ میں نے سوچا کہ کسی اجنبی اور ماہر سے رائے لی جائے تو میں نے وہ مضمون روزنامہ جنگ میں بھیج دیا اور ایک ہفتہ بعد وہ مولوی عبدالحق کی برسی کے موقع پر جنگ کے سرورق پر شائع ہوا اس وقت میں فرسٹ ائیر میں تھی اور مضمون میں نے ایڈوانس اردو کے سبجیکٹ کے لئے لکھا تھا یہی میری زندگی کا انٹریسٹنگ واقعہ بھی ہے اور نئے لکھنے والوں کے لئے ایک پیغام بھی کہ کس طرح ان کی تحریریں مسترد ہونے سے بچ سکتی ہیں مجھے سب سے زیادہ نئے افق میں لکھنا پسند ہے اور الحمد اللہ میں لکھ رہی ہوں۔

حرا طاہر: کیا حال ہے آپ کا؟
آپ ایک کامیاب انسان ہیں ماشاء اللہ آپ کو مزید کامیابیوں سے نوازے آمین' آپ کو ایسے فیس بک پر لوگوں کا ٹیلنٹ آزمانا چاہیے اور جو چھوٹے موٹے رائٹر ہیں ان کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا چاہیے۔ اس سے پاکستان کے بڑے بڑے اچھے قلم کار سامنے آئیں گے۔ کوئی بھی ڈائجسٹ میں جتنا مرضی محنت کر کے افسانے بھیجو وہ اپنی مرضی سے پوسٹ کرتے ہیں بلکہ کچھ تو مہینا مہینا ر پلائی بھی نہیں کرتے۔ اگر آپ اس معاملے میں کچھ کر سکتی ہیں تو پلیز۔

زرین قمر: والسلام!
حرا پریشان نہ ہوں میں نئے لکھنے والوں کی رہنمائی ضرور کروں گی یہ کام میں اس وقت بھی کرتی تھی جب میں نے آنچل سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا ایک سب ایڈیٹر کا کام صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ اچھی کہانیاں منتخب کرے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی کہانی میں کوئی کمی ہے تو اس کی نوک پلک سنوار کر اسے بھی شامل اشاعت کرے اس میں محنت تو ہوتی ہے لیکن رائٹر کو سیکھنے کو ملتا ہے اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے جس سے اس میں مزید لکھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

ندا حسنین: میں جاننا چاہوں گی کہ آپ نے ماشاء اللہ بہت خوبصورت کام کیا مگر کیا ابھی بھی تشنگی رہ گئی ہے کہ کام ابھی بھی رہتا ہے؟ یا یوں کہیں کہ ایسا کون سا موضوع جس پر لکھنے کی ابھی بھی خواہش ہے؟ یا پھر جتنا لکھا وہ کم محسوس ہوتا ہو؟

زرین قمر: ندا میں بہت سے موضوعات پر لکھ چکی ہوں اور لکھ رہی ہوں موقع کے حساب سے موضوع منتخب کرتی ہوں اتنے عرصے لکھنے کے باوجود یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہر موضوع پر لکھ چکی ہوں موضوع تو بے شمار ہیں لیکن اب بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ کچھ کمی ہے اور بہتر لکھنے کی خواہش ہے جی چاہتا ہے کہ الفاظ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہوں اور جیسے چاہوں استعمال کرتی چلی جاؤں لیکن ابھی مزید محنت کی ضرورت ہے جو شاید ہمیشہ رہے لکھاریوں کی دنیا تو اک گہرا اور بیکراں سمندر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں جب غوطہ لگائیں نئے جواہر ہاتھ آتے ہیں۔

ندا حسنین: کبھی الفاظ روٹھتے ہیں آپ سے؟ اگر روٹھ جائیں تو کیسی کیفیت ہوتی ہے آپ کی؟ کس طرح مناتی ہیں؟

زرین قمر: ندا آپ کا یہ سوال بہت اچھا ہے ایسا میرے ساتھ بہت کم ہوا لیکن جب ہوا تو بہت الجھن ہوتی تھی لاکھ یاد کرنے کے باوجود موقع کی مناسبت کا لفظ تحت الشعور میں ہونے کے باوجود قلم کی نوک تک آنے کو تیار نہ ہوتا تھا تو خود پر بہت غصہ آتا ایسے موقع پر کچھ دیر کے لئے کام چھوڑ دینے سے میرا مسئلہ حل ہو جاتا تھا ذہن کو تھوڑا آرام دیں تو لفظ یاد آ جاتا ہے۔

ندا حسنین: آپ کو یہ فخر حاصل ہے کہ انتہائی مہربان اور معزز لوگوں سے ملاقات کا شرف پایا۔ کس شخصیت نے اتنا متاثر کیا کہ اس کی شخصیت کے رنگ چرانے کا دل چاہا؟

زرین قمر: اس کا جواب ہے محترم اظہر کلیم صاحب جو نئے افق پبلیکیشن کا حصہ تھے جب میرے لئے اجنبی تھے میں نے آنچل جوائن کیا تھا تب سے وہ میری تحریروں پر بے باک تنقید کرتے تھے نقائص بتاتے تھے گر بتاتے تھے کہ کہانی میں قاری کی دلچسپی کیسے برقرار رکھی جائے میں ان سے بہت متاثر ہوئی وہ بے لوثی سے مشورے دیتے بھے عام لوگوں کی طرح ہنر کی باتیں چھپاتے نہیں تھے میں بھی ایسا ہی کرنا چاہتی ہوں

سحرش فاطمہ: زرین قمر صاحبہ آپ کا بے حد شکریہ ہمیں وقت دیا۔ نئے افق کے فیس بک کے آفیشل گروپ کے ایڈمنز اور ممبرز کے لئے کچھ کہنا چاہیں گی؟ اور نئے افق میں آپ کو پڑھنے والوں کے لئے کوئی پیغام؟

زرین قمر: میں یہی کہنا چاہتی ہوں کہ اس گروپ کے ایڈمنز بہت محنتی اور اچھے ہیں وہ ہر کسی کے سوالات کا جواب بہت خوش دلی سے دیتے ہیں اور لوگوں سے بھی کہوں گی کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو اسے خوش دلی سے حل کریں نئے افق پڑھیں اور اپنی رائے سے آگاہ کریں۔

......☆☆☆......

دہری موت

ڈاکٹر ایم اے قریشی

ایک ایسے شخص کی روداد' جس نے ایک سیاست دان اور دو پولیس اہلکاروں کے قتل کا اعتراف کیا تھا لیکن قانون نافذ کرنے والے اسے قاتل قرار دینے پر تیار نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کسی کو بچانے کے لیے خودکشی کر رہا تھا۔

سائنس فکشن پر مبنی ایک ایسا ناول جسے پڑھتے ہوئے آپ کا دوران خون بڑھ جائے گا۔

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

ایک سال سے میں بہت پریشان تھا مجھے ایک مجرم نے پریشان کر رکھا تھا وہ ایک دبلا پتلا، زرد رو اور پستہ قد شخص تھا۔ اتنا مختصر جیسے پورٹیبل ریڈیو مگر اس کی قوت ارادی کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی سے بھی ناقابل تسخیر تھی اور میں کوئی ایڈمنڈ ہلیری نہیں تھا ایک معمولی سا سراغ رساں تھا۔ اس میں تھوڑا سا انکسار شامل ہے کیونکہ میں نے اچھے خاصے پیچیدہ جرائم کا سراغ لگایا ہے اور بڑے بڑے مجرموں سے اقبال جرم کرایا ہے مگر یہ مجرم میرے لیے چیلنج بن گیا تھا میں نے اس پر سارے طریقے آزمائے سوائے تشدد کے کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ اس کی ذرا بھی تاب نہ لا سکے گا۔ اس کا نحیف اور بیمار جسم محض قوت ارادی کے بل پر تشدد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا پہلے میں نے جائے واردات پر موجود شہادتوں کی مدد سے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی۔ انگلیوں کے نشانات کو پولیس کے ریکارڈ سے ملایا۔ ان کے کمپیوٹرز نے ان کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا حالانکہ ان کے برقی دماغ میں ہزاروں مجرموں کے فنگر پرنٹ دیگر تمام تفصیلات کے ساتھ موجود تھے۔ اگر وہ ان میں سے ایک ہوتا تو کمپیوٹر فوراً ایک کارڈ نکال دیتے جس پر مجرم کا نام ولدیت، تصویر جرائم کا مکمل ریکارڈ اور موجودہ پتا درج ہوتا۔

پھر میں نے جائے واردات سے بہت سی چیزیں اکٹھی کیں، سگریٹ کے بجھے ہوئے ٹکڑے جو نہ مقتول پیتا تھا اور نہ قاتل۔ مقتول سگار کا شوقین تھا اور قاتل کو تمباکو نوشی کی عادت ہی نہ تھی۔ ہوتی تو وہ مقتول سے پہلے مر چکا ہوتا اور یہ واردات ہی نہ ہوتی، مقتول کے گھر میں آنے جانے والے افراد کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان میں سے بیشتر یہی سگریٹ پیتے تھے اور چونکہ قتل میں نے نہیں کیا تھا اس لیے میں یہ برانڈ پینے والے دوسرے افراد کو بھی قتل کے الزام میں نہیں پکڑ سکتا تھا۔ تاہم میں نے ان سب افراد سے سوال جواب کیے اور ان میں سے ہر ایک نے یہ ثابت کر دیا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا جو وقت بتایا گیا ہے اس وقت وہ جائے واردات سے کم از کم ایک کلومیٹر دور تھے اور جہاں جہاں تھے وہاں ان کی موجودگی کے گواہ تھے، ان کے پاس سے آلات قتل بھی برآمد نہیں ہوئے اور مجھے مجسٹریٹ نے بیس بار ناکام ہونے کے بعد اکیسویں مرتبہ خانہ تلاشی کے وارنٹ دینے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ ایک ہی بار مجھے سارے شہر کی خانہ تلاشی لینے کے وارنٹ دے دیتا تو میں کبھی نہ کبھی یقیناً آلہ قتل ضرور برآمد کر لیتا مگر اس قسم کا پستول تو مجسٹریٹ کے گھر سے ہی مل سکتا تھا اور سارا شہر چھاننے سے پہلے میرا مستقبل یا میں خود ختم ہو جاتا۔

جائے واردات سے جہاں یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں لڑائی اور مار کٹائی سے بھرپور فلم کی فلمبندی کی گئی ہے وہاں چند اور بھی چیزیں ملیں، بکھرے ہوئے کاغذات، الٹے ہوئے صوفوں، ٹوٹے ہوئے شیشوں، گلدانوں اور مجسموں کے ٹکڑوں کے درمیان ایک گھٹیا سا کف لنک جسے مقتول کے گھر میں آنے والے کسی فرد کی ملکیت نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہ بھی لکھ پتی تھا اور اس کے دوست بھی اس کے تو ملازم بھی سونے چاندی کے کف لنک لگاتے تھے۔ پھر کف لنک سے کیا ہوتا ہے قاتل تقریباً ایک لاکھ ڈالر کی مالیت کے نوٹ لے گیا تھا اس نے باہر نکلتے ہی دوسرا کف لنک گٹر میں ڈال دیا ہوگا اور اعلیٰ قسم کے کف لنک لے لیے ہوں گے جو شخص پکڑا گیا تھا وہ کف لنک استعمال ہی نہیں کرتا تھا اور اس کے پاس سے سوائے چند ڈالر کے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس کے بنک اکاؤنٹ میں چند سو ڈالر تھے۔ اس کے سارے رشتہ دار غریب تھے۔ بیوی بچے تھے ہی نہیں۔ بہت عرصے تک اس نے اس کے گھر آنے جانے والوں پر نگاہ رکھی اور ان کے بارے میں ہر طرح کی تحقیقات کی اس کے گھر پر موصول ہونے والے ٹیلی فون ٹیپ کیے مگر نتیجہ صفر رہا۔ ان میں نہ کوئی لڑکی تھی نہ مشکوک کردار کی کوئی عورت، ایک اس کی بہن کا فون تھا کیلی فورنیا سے وہ ایک ڈاکٹر کی بیوی تھی جسے اپنے بھائی کے بارے میں سخت تشویش تھی اور ایک اس کی رشتے کی خالہ وہ ایک پرانی وضع کی بوڑھی عورت تھی۔ مقتول کے ساتھی بچپن کے دوست کارخانے میں کام کرنے والے سب شریف لوگ تھے اس کے پڑوسی ملنے جلنے والے سب قسم کھانے کو تیار تھے کہ مقتول کی کسی سے کاروباری رقابت یا دشمنی نہ تھی اور اس کا سلوک سب سے بہت اچھا تھا چنانچہ قتل کا واحد مقصد چوری تھا۔ قاتل کے بارے میں کہیں سے یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ اس نے اپنی زندگی میں کوئی جرم کیا ہو، ذہنی اور جسمانی طور پر وہ جرم کرنے کے قابل ہی نہ تھا۔ اس نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری تھی، اس کے ساتھی ہمسائے اور رشتہ دار سب اس کی شرافت کے گواہ تھے چنانچہ قانوناً مجھے اس کو نہیں پکڑنا چاہیے کیونکہ وہ کسی صورت قاتل ثابت نہیں ہوتا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ اقبال جرم کرتا تھا وہ کہتا تھا قتل اسی نے کیے ہیں۔ جمع کا صیغہ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ تین آدمی مارے گئے تھے، ان میں سے دو سارجنٹ تھے جو فائرنگ کی آواز سن کر اچانک جائے واردات پر پہنچے تھے۔

کہانی کچھ یوں تھی کہ قاتل البرٹ ڈیوڈسن کو قتل کرنے کی نیت سے کوٹھی میں داخل ہوا مقتول البرٹ ڈیوڈسن نے مزاحمت کی اور اس کی قاتل سے زبردست لڑائی ہوئی۔ مقتول چالیس سال کا تندرست جسم والا صنعتکار تھا جو اتفاق سے اس وقت تنہا تھا۔ اس کے بیوی بچے کینیڈا گئے ہوئے تھے نوکروں کو اس نے خود چھٹی دے دی تھی اور رات کا وقت تھا مقتول غالباً کاروباری نوعیت کے کاغذات دیکھ رہا تھا نقد رقم اس نے کسی کو ادائیگی کے لیے منگوائی تھی۔ ادائیگی کے لیے اس نے چیک کیوں نہیں دیا اس کا کوئی سبب معلوم نہ ہو سکا کیا وہ رقم کسی بلیک میلر کو ادا کرنے کے لیے تھی، مگر اسے بلیک میل کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح تھی وہ ایک خوش اخلاق، ہمدرد اور فیاض شخص تھا نجانے کتنی رقم خیراتی اداروں اور نیک کاموں کے لیے دیتا تھا اچھا باپ اور اچھا شوہر تھا۔ مذہب کا پابند تھا ماتحتوں کا دوست اور مددگار تھا سینیٹ کا رکن تھا اور لوگوں کی نگاہ میں مستقبل کا صدارتی امیدوار، گویہ مستقبل ابھی دور تھا۔ لڑائی کے دوران وہ مارا گیا، چور نے سنگ مرمر کا وینس کا مجسمہ اس کے سر پر مارا جس سے اس کا سر پھٹ گیا مگر اس کی موت گولی سے ہوئی۔ ایک پیٹرول کار میں پولیس کے دو سارجنٹ سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے گولی کی آواز سنی اور مکان کے اندر گھس گئے قاتل نے انہیں بھی گولی مار دی، ڈرائیور جو کار میں بیٹھا تھا مزید دو گولیوں کی آواز سن کر اندر دوڑا اور اس نے قاتل کو پکڑ لیا۔ قاتل کے ہاتھ میں خالی پستول تھا جسے کھلونے کی طرح تھامے وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔

مگر یہ کہانی غلط تھا، یہ وہ کہانی تھی جو ملزم خود بار ہا سنا چکا تھا۔ مقتول کے مقابلے میں قاتل جسمانی طور پر کمزور تھا کمرے سے رقم غائب تھی مگر رقم قاتل کے پاس سے بھی برآمد نہیں ہوئی، قاتل کے جسم پر لڑائی سے لگنے والی کسی چوٹ یا خراش کا نشان نہ تھا۔ وہ بالکل پرسکون اور مطمئن تھا۔ اس نے گرفتاری سے بچنے کے لیے مزاحمت کرنے یا فرار ہونے کی کوشش نہیں کی اور آرام سے پولیس اسٹیشن آ گیا، قتل کی کوئی وجہ نہ تھی، قاتل کوئی اور تھا۔ وہ محض الزام اپنے سر لے رہا تھا، کیوں اور کس کے لیے یہ وہ کچھ نہیں بتاتا تھا اور اقبال جرم کی ایک بے بنیاد کہانی پر اسے موت کی سزا نہیں دی جا سکتی تھی لیکن اسے بچایا بھی نہیں جا سکتا تھا، ایک بات بالکل واضح تھی، وہ قاتل کو جانتا تھا اور اس کا نام نہیں بتانا چاہتا تھا بظاہر وہ قاتل سے خوفزدہ بھی نہیں تھا، بات کچھ اور تھی، حقیقت حال اگلوانے اور اسے بچانے کے لیے مجھے اس کی بہن نے معاوضہ ادا کیا تھا چنانچہ ایک بار پھر میں اس سے جیل میں ملا۔

"دیکھو، فریڈ تم کیوں مرنا چاہتے ہو، مجھے معلوم ہے قتل تم نے نہیں کیا۔" اس نے جیب سے ہاتھ نکال کر میرے کندھے پر رکھا اور مسکرایا۔ "قتل میں نے ہی کیا ہے۔"

"فریڈ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے، وہ بہت تگڑا تھا۔" میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مگر میں نے اسے پستول سے ہلاک کیا ہے تم جانتے ہو پستول تمہارے پاس ہے گولیاں بھی جو مرنے والوں کے جسم سے نکلیں۔"

"مگر کمرے کی حالت اور رقم۔"

"وہ حالت اس نے خود کی وہ نشے میں تھا رقم کے بارے میں مجھے نہیں معلوم۔" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ نشے میں تھا۔"

"پھر وہ اداکاری کر رہا ہوگا۔" وہ پھر مسکرایا۔ "یا اس کا دماغ چل گیا ہوگا۔"

"اداکاری کرنے کی اسے کیا ضرورت تھی۔" میں نے چڑ کر کہا۔ "اور اس کا دماغ ٹھیک تھا۔"

"پھر مجھے نہیں معلوم۔" وہ میری بے بسی کا مذاق اڑا رہا تھا۔ "مگر تم نے اسے کیوں قتل کیا آخر کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔" میں نے زور سے کہا۔

"ہاں اس نے ابراہیم لنکن کو پوپ کو اور الزبتھ ٹیلر کو گالی دی تھی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"شٹ اپ۔" میں نے دہاڑ کر کہا اور چلا آیا۔

اس نے ضمانت پر رہائی حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ تھا تو یہ مشکل کام لیکن اس کی بہن خاصی بڑی رقم کے عوض ضامن بننے پر تیار تھی۔ اس کا شوہر ڈاکٹر تھا

ڈسٹرکٹ اٹارنی ویسے تو ہمیشہ پرائیویٹ سراغرساں کیخلاف ہوتے ہیں لیکن اس کیس میں ڈسٹرکٹ اٹارنی میرا ہم خیال تھا کہ قتل اس نے نہیں کیا لیکن واقعات کی شہادت اوران سب سے بڑھ کراس نے اپنا اقبال جرم اسے تختہ دار تک پہنچانے کے لیے کافی تھا۔

آخری کوشش کے طور پر میں نے ماہر نفسیات سے یہ رائے حاصل کرنے کی کوشش کی کہ وہ نفسیاتی مریض ہے اور خودکشی پر آمادہ ہے۔ ماہرین نفسیات کے ایک بورڈ نے ڈسٹرکٹ اٹارنی کے مشورے سے اس کا معائنہ کیا، انہوں نے اسے ایک طویل سوالنامہ دیا جواوٹ پٹانگ باتوں پر مشتمل تھا، کہیں اسے اپنی پسند کے رنگ کا نام لکھنا تھا تو کہیں اپنی پسندیدہ عورت کی خصوصیات. بہت سے سوالوں کا جواب ہاں یا نہیں میں تھا۔ ماں باپ کے بارے میں کچھ تصویریں اور خاکے اور ڈیزائن تھے کہ ان میں سے کسے دیکھ کر اسے اپنے والدین کے بارے میں کیا یاد آتا ہے پھر اسے سوڈیم پینٹی تھال انجیکشن بھی دیے گئے اور آخر میں انہوں نے فیصلہ دیا کہ وہ بالکل متوازن دماغ کا مالک ہے اور اس کی ذہنی کیفیت ہرگز ایسی نہیں کہ وہ قتل یا خودکشی کرسکے۔ اس کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کسی کو بچانا چاہتا ہے۔ اسباب کچھ بھی ہوں لیکن اپنی زندگی قربان کردینے کا یہ جذبہ اور اس راز کو افشا نہ ہونے دینے کا عزم بڑے مضبوط کردار کی عکاسی کرتا تھا، میں نے اپنی شکست قبول کرلی، لیکن ڈسٹرکٹ اٹارنی مجھ سے زیادہ ذہنی عذاب میں مبتلا تھا۔ میں فریڈ کو بے گناہ ثابت نہ کرسکا لیکن مائیکل یعنی ڈسٹرکٹ اٹارنی کے لیے اس کی بے گناہی پر یقین رکھتے ہوئے اسے گناہ گار ثابت کرنا اور اس کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کرنا زیادہ مشکل تھا۔ سماعت میں صرف دودن باقی تھے جب وہ رات کو میرے پاس آیا۔

"الفریڈ، کل میں استعفیٰ دے دوں گا۔" اس نے کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔

"اس سے مقدمہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، تمہارا ڈپٹی مقدمہ لے لگا۔" میں نے کہا۔

"الفریڈ میں ایک بے گناہ کے لیے سزائے موت کا مطالبہ نہیں کرسکتا جبکہ میرے فرائض میں یہ شامل ہے کہ میں کل اپنا سارا زور خطابت اسے مجرم ثابت کرنے پر صرف کردوں، چلا چلا کر یہ کہوں کہ اسے ایک الیکٹرک چیئر پر بٹھادیا جائے۔" اس نے مایوسی سے کہا۔

"زورخطابت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، اس کا اقبال جرم کافی ہوگا، تم صرف واقعاتی شہادت پیش کردینا، پستول...... گولیاں...... پوسٹ مارٹم رپورٹ۔" اس نے ہمیشہ میری مخالفت کی تھی اور اب اسے ذہنی عذاب میں مبتلا دیکھ کر مجھے اگر خوشی نہیں ہورہی تھی تو رنج بھی نہیں تھا۔ میں نے اسے وہسکی کا ایک جام دیا جسے وہ وحشیوں کی طرح پی گیا۔

"الفریڈ جو کام تم نہیں کرسکے وہ میں کروں گا۔" اس نے خالی گلاس ہاتھ میں تھام کر دیوار کو گھورتے ہوئے کہا۔

"میں اصلی قاتل کا پتا چلاؤں گا۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"اب اس کے لیے وقت نہیں ہے، جتنا وقت میں لے سکتا تھا لے چکا سماعت اب ملتوی نہیں ہوگی، اس نے تو اپنے دفاع کے لیے وکیل بھی نہیں کیا ہے۔"

"وہ تو اسے حکومت کی طرف سے مل چکا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے اس نے وکیل سے ملنے سے بھی انکار کردیا تھا اور جب وہ اقبال جرم کرلے گا تو وہ بچارا وکیل کیا کرے گا شہادتیں بھی ساری اس کے خلاف ہیں۔" میں نے کہا۔

"الفریڈ، میں یہ قتل کرنا نہیں جانتا، میں ساری زندگی یہ عذاب جھیل نہیں سکتا، تم سمجھتے کیوں نہیں۔" اس نے گلاس دیوار پر کھینچ مارا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنا پریشان ہے۔ "مائیکل۔" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔

"یہ سارا قصور اس نظام کا ہے جسے نہ تم بدل سکتے ہو نہ میں اور نہ یہ کسی صورت قتل کہلا سکتا ہے۔ اگر یہ قتل ہے تو اس میں ہم سب شریک ہیں۔ میں جو اسے بے گناہ ثابت نہ کرسکا۔ تم جو صرف واقعاتی شہادت پیش کروگے۔ جج جو فیصلہ سنائے گا اور جیوری جو اتفاق رائے سے شریک ہوگی۔ وہ خود جو اقبال جرم کرے گا اور وہ اصل قاتل ہے مگر روپوش ہے اور خاموش ہے اور وہ جو اسے الیکٹرک چیئر پر بٹھائیں گے۔ ہم سب اس میں شریک ہیں۔ تم اکیلے مجرم کیسے ہوگئے۔ اپنے دماغ پر بوجھ مت ڈالو، ورنہ پاگل ہوجاؤ گے۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔" اور ہیٹ اٹھا کر باہر نکل گیا، وہ اتنا برا آدمی نہیں تھا جتنا میں اسے سمجھتا تھا۔

اگلے دن ہم دونوں نے اس سے آخری بار ملاقات کی، گزشتہ شب مجھے اس کی بہن کا فون موصول ہوا تھا اور اگرچہ میں نے اسے صحیح صورت حال بتادی تھی کہ اس کا بھائی کسی کی خاطر جان دینے کا تہیہ کرچکا ہے اور اسے کوئی ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا لیکن اس نے فیس کا ذکر کرتے ہوئے مجھے مجبور کیا تھا کہ مجھے آخری وقت تک کوشش کرنی چاہیے اور یہ میرا اخلاقی فرض ہے صبح سویرے مجھے ڈسٹرکٹ اٹارنی نے فون کیا، وہ رات بھر سو نہیں سکا تھا اور میرے ساتھ جانا چاہتا تھا ہمارے ساتھ وہ سرکاری وکیل بھی ہولیا جو ملزم کو حکومت نے فراہم کیا تھا۔

"فریڈ، آخر تم سچ سچ کیوں نہیں بتادیتے کہ تمہارے ساتھ کون تھا؟" مائیکل نے کہا۔

"ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔" مائیکل نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے تم بے گناہ ہو۔"

"ہاں، میں بے گناہ ہوں، تمہارا خیال ٹھیک ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ یہ الفاظ میں نے پہلی بار اس کی زبان سے سنے تھے۔

"کیا کل یہی بیان دو گے۔" سرکاری وکیل صفائی نے پر امید لہجے میں پوچھا مائیکل نے میری طرف دیکھا۔

"نہیں میں صرف اقبال جرم کروں گا۔" اس نے مختصراً کہا ہم سب کی امیدوں پر اوس پڑگئی، مائیکل کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"آل رائٹ فریڈ۔" میں نے کہا اور مائیکل کا ہاتھ دبایا۔

"زندگی تمہاری اپنی ہے وہاں نہ سہی یہاں ہمیں بتادو تمہارے ساتھ کون تھا، قتل کس نے کیا۔" وہ ہنسا۔

"یہاں نہ وہاں میری زبان پر اس کا نام کبھی نہیں آئے گا۔" زناٹے سے مائیکل کا تھپڑ اس کے گال پر پڑا۔

"باسٹرڈ۔" وہ گر پڑا مگر فوراً اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا۔

"مسٹر ڈسٹرکٹ اٹارنی، تم مجھے قتل کرسکتے ہو یا الیکٹرک چیئر پر بٹھا سکتے ہو، لیکن تم مجھ سے کبھی یہ معلوم نہیں کرسکتے کہ وہ کون تھا۔" پھر اس نے پہرے دار کو آواز دی۔

"سارجنٹ ڈسٹرکٹ اٹارنی کو باہر لے جاؤ۔" مائیکل بپھر گیا مگر میں نے اور وکیل صفائی نے مائیکل کو پکڑ لیا، وہ فریڈ کو مسلسل گالیاں دے رہا تھا۔

"میں تجھ سے ضرور معلوم کروں گا، تجھے بتانا پڑے گا۔"

"گٹ آؤٹ مسٹر اٹارنی، میری زبان پر وہ نام کبھی نہیں

AANCHALPK.COM
تازہ شمارہ شائع ہوگیا ہے
آج ہی قریبی بک اسٹال سے طلب فرمائیں
ماہنامہ آنچل کراچی
ملک کی مشہور معروف قلمکاروں کے سلسلے وار ناول، ناولٹ اور افسانوں سے آراستہ ایک مکمل جریدہ گھر بھر کی دلچسپی صرف ایک ہی رسالے میں ہے جو آپ کی آسودگی کا باعث ہوسکتا ہے اور وہ ہے صرف آنچل۔ آج ہی اپنی کاپی بک کرالیں۔
ٹوٹا ہوا تارا
امید وصل اور محبت پر کامل یقین رکھنے والوں کی ایک دل نشیں زیر ترتیب کہانی سمیرا شریف طور کی زبانی
شب ہجر کی پہلی بارش
محبت و جذبات کی خوشبو میں بسی ایک دلکش داستان نازیہ کنول نازی کی دلفریب کہانی
موم کی محبت
پیار محبت اور نازک جذبوں سے گندھی معروف مصنفات وفا کی ایک دلکش و دل ربا نایاب تحریر
AANCHALNOVEL.COM
[illegible] (021-35620771/2)

آئے گا۔ وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"کیسے نہیں آئے گا۔" وہ چلایا اور ہم نے مائیکل کو باہر گھسیٹ لیا، دو پہریدار یہ ہنگامہ سن کر آ گئے تھے مگر ڈسٹرکٹ اٹارنی کی موجودگی میں وہ ملزم کے احکامات کی تعمیل کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ جب انہوں نے مائیکل کو طیش کے عالم میں دیکھا تو میرے اشارے پر سلاخوں والا دروازہ بند کر دیا اور تالا لگا دیا۔ اب ہم تینوں باہر کھڑے تھے مائیکل نے سلاخیں تھام لیں۔

"فریڈ، میں معلوم کر کے رہوں گا، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہارے خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔" وہ چیخ کر بولا۔

"تم کبھی معلوم نہیں کر سکتے، کبھی نہیں۔" وہ اعتماد سے بولا۔

"تم مجھے گدھا سمجھتے ہو، تمہاری مدد کے بغیر بھی میں اس کا سراغ لگا لوں گا، کبھی نہ کبھی اس کا پتا چل جائے گا، فریڈ میں اسے اسے ضرور الیکٹرک چیئر پر لے جاؤں گا۔" مائیکل نے چلا چلا کر کہا۔

"مجرم کبھی نہیں چھپ سکتا، سنا تم نے۔" میں اور وکیل صفائی اسے گھسیٹ کر لے گئے مگر وہ آخر تک چلاتا رہا۔

"جب تک میں اصل قاتل کو سزائے موت نہیں دلواؤں گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" غنیمت ہے وہاں پولیس کا کوئی نمائندہ نہ تھا۔

اگلے دن جب سماعت کا آغاز ہوا تو ملزم کو عدالت کے سامنے پیش کیے جانے کے بعد جیوری کے ارکان کے ناموں کا اعلان ہوا اور جب جج کے ساتھ وکیل صفائی۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اور کمرہ عدالت میں دیگر افراد اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو ملزم کو فرد جرم پڑھ کر سنائی گئی اور اس نے حسب توقع اقبال جرم کر لیا۔

سب سے پہلے پولیس کے اس ڈرائیور کا بیان ہوا جس نے ملزم کو موقع واردات سے محاورے کے مطابق رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش کی۔ تینوں قتل ایک ہی پستول سے ہوئے تھے تینوں کے جسم سے دو دو گولیاں برآمد ہوئی تھیں۔ چھ کی چھ گولیاں اسی پستول کی تھیں جو ملزم کے قبضے سے دستیاب ہوا تھا۔ پہلے مقتول کے جسم پر خراشیں تھیں جو دست بدست لڑائی سے لگی تھیں۔ اس کے سر پر کسی بھاری چیز کی ضرب کا نشان تھا جو تحقیقات کے مطابق سنگ مرمر کا ایک آرائشی مجسمہ تھا مگر یہ چوٹ بیرونی اور معمولی تھی اور موت کا سبب نہیں بن سکتی تھی ڈسٹرکٹ اٹارنی نے پستول، گولیاں، سنگ مرمر کے مجسمے کے ٹکڑے جو سر سے ٹکرا کر نہیں بلکہ فرش پر گر کر ٹوٹا تھا اور تقریباً ایک لاکھ ڈالر نقد کی گمشدگی کی شہادت پیش کی۔

پھر ملزم نے اپنا بیان دیا۔

"میں رات دس بجے اس کے گھر پہنچا۔ میں چوری کرنے نہیں اس کو قتل کرنے گیا تھا مجھے معلوم تھا وہ گھر پر تنہا ہے۔ کیونکہ اس کے بیوی بچے کینیڈا گئے ہوئے تھے۔ پستول میں چھ گولیاں تھیں جو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں نے اس پر دو فائر کیے۔ وہ مر گیا، پھر پولیس کے دو آدمی آ گئے اور مجھے انہیں بھی قتل کرنا پڑا۔ اگر میرے پستول میں مزید گولیاں ہوتیں تو تیسرا پولیس والا بھی مارا جاتا، مجھے افسوس ہے دو پولیس والے بے گناہ مارے گئے مگر مجھے اپنی جان بچانے کے لیے یہ جرم کرنا پڑا۔"

وکیل صفائی نے اسے بے گناہ ثابت کرنے کے لیے جرح کی اجازت چاہی مسٹر فریڈ مقتول البرٹ ڈیوڈسن سے تمہارا کیا تعلق تھا۔"

"کوئی نہیں میں اس کے پاس ملازمت حاصل کرنے گیا تھا۔"

"کب؟"

"موت سے تین دن پہلے اس نے مجھ سے کہا کہ میں کیا کام کر سکتا ہوں اور میں نے کہا کچھ نہیں، چنانچہ اس نے مجھے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا۔ اس نے کہا مفت خوروں کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں ہے اور وہ خیرات دے کر حرام خوروں کی تعداد میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے کہا اس کے پاس اتنی رقم ہے کہ اگر وہ ہر مہینے چند سو ڈالر مجھے دے دے تو اس کے خزانے میں کمی نہیں ہوگی کیونکہ ہر مہینے اس کے سرمائے میں ہزاروں ڈالر جمع ہوتے ہیں لیکن اس نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ اسی دن اس کے بچے اور بیوی کینیڈا جا رہے تھے، میں باہر کھڑا رہا اور وہ میرے سامنے کار میں ان کے ساتھ ائرپورٹ چلا گیا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اسے قتل کر دوں گا تین دن تک میں اس کے معمولات کا مشاہدہ کرتا رہا مگر اسے پتا نہ چلا مجھے معلوم ہو گیا کہ رات کو وہ تنہا ہوتا ہے۔ اس کی کوٹھی اتنی بڑی تھی کہ میں تین دن اس میں چھپا رہا اور کسی کو خبر نہ ہوئی میں رات کو اس کے بچوں کے کمرے میں آرام سے سوتا تھا، باورچی خانے سے کھانا چرا کر کھا لیتا تھا اس گھر کے بہت سے کمرے ایسے تھے جہاں وہ بہت کم آتا جاتا تھا اور وہاں نوکر بھی

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

نہیں آتے تھے صرف ایک بار ایک نوکر صفائی کے لیے اس کمرے میں آ گیا تھا جہاں میں تھا لیکن میں آسانی سے پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ تیسرے دن میں نے اسے مار دیا۔" یہ بالکل نئی کہانی تھی اور بظاہر بالکل درست۔

"کمرے کی حالت بتاتی ہے کہ مقتول نے سخت مقابلہ کیا مگر نہ تمہارے جسم پر کوئی نشان ہے اور نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ تم اس کا مقابلہ کر سکتے تھے۔" وکیل صفائی نے کہا۔

"میں جب کمرے میں پہنچا تو کمرہ الٹا پڑا تھا میں یہ بتا دوں کہ اسی دن دوپہر کو میں اپنے گھر سے پستول لینے چلا گیا تھا رات کو جب میں پچھلی طرف سے مکان میں داخل ہوا تو وہاں بہت شور مچ رہا تھا جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو میں اندر داخل ہوا وہ زخمی تھا اور اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ کسی کو ٹیلیفون کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے پہلی گولی اس کے سر میں اور دوسری گرنے کے بعد سینے میں مار دی۔"

"تم نے کسی کو وہاں سے نکلتے دیکھا۔" وکیل صفائی نے کہا۔

"کوٹھی سے۔"

"نہیں لیکن میرا خیال ہے چند منٹ پہلے وہاں کوئی تھا۔ پولیس اٹارنی کا کہنا ہے کہ وہاں سے تقریباً ایک لاکھ ڈالر غائب ہیں خیر مجھے معلوم نہیں، ممکن ہے اس کی لڑائی کسی چور سے ہوئی ہو، میرے لیے یہ بہترین موقع تھا میں دبے پاؤں اس کے پیچھے پہنچ گیا مگر اس کو علم نہیں ہوا میں اسے مار کر صوفے پر بیٹھا ہی تھا کہ دو سارجنٹ آ گئے میں نے فوراً انہیں بھی مار دیا۔"

"اسے قتل کرنے کے بعد تم نے بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی، صوفے پر کیوں بیٹھ گئے۔"

"مجھے اس کا موقع نہیں ملا میں صرف سانسیں قابو میں کرنے کے لیے صوفے پر بیٹھا تھا کہ پولیس پہنچ گئی۔"

"تم اس کے بعد بھی بھاگ سکتے تھے۔" وکیل صفائی نے کہا۔

"ہاں مگر وہ تیسرا اپنا ریوالور لیے پہنچ گیا، میرے پاس اس وقت کوئی گولی نہیں تھی۔"

"تم نے ضمانت کی یا اپنے دفاع کی کوئی کوشش نہیں کی۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا جرم میں نے کیا تھا جائے واردات سے پکڑا بھی گیا تھا آلہ قتل میرے پاس تھا۔"

"ڈسٹرکٹ اٹارنی اور پرائیویٹ سراغ رساں الفریڈ کو تم بالکل مختلف کہانیاں سناتے رہے ہو، اس کا کیا مقصد تھا۔"

"انہیں ٹالنا، ان کا خیال تھا کہ میں کسی کے ساتھ ایک لاکھ ڈالر چرانے گیا تھا وہ میرے ساتھی کا نام معلوم کرنا چاہتے تھے میرے ساتھ کوئی نہ تھا اور حقیقت وہی ہے جو میں نے ابھی عدالت کو بتائی، چور مجھ سے پہلے بھاگ چکا تھا، اس کو پکڑنا اور ایک لاکھ ڈالر برآمد کرنا پولیس کا کام ہے۔ میں اس میں ان کی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے اسے ذاتی وجوہ کی بنا پر سوچ سمجھ کر قتل کیا ہے میں پاگل نہیں ہوں، ماہرین نفسیات کی رپورٹ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ میں نشے میں نہیں تھا اور میرے ہوش و حواس قتل کے وقت درست تھے۔"

جیوری نے اتفاق رائے سے اسے سزائے موت دی اور جج نے اس کا اعلان کر دیا اپیل کے لیے اسے اجازت اور مہلت دی گئی اور چند گھنٹے کے اندر اندازاً قتل کا ایک سیدھا سادا مقدمہ ختم ہو گیا سزائے موت پر عمل کی تاریخ اپیل کی مہلت کے ختم ہونے کے ایک ماہ بعد رکھی گئی۔

حسب توقع نے اس نے اپیل داخل کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ اس کی زندگی کے صرف دو ماہ ہو گئے اس نے سب سے ملنے سے انکار کر دیا اور کال کوٹھری میں سکون سے موت کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی بہن کا روتے روتے برا حال ہو گیا مگر اس پر ذرا اثر نہ ہوا۔

"اس سے کہہ دو کہ وہ چلی جائے، مسٹر جیلر قانوناً کوئی مجھے کسی سے ملنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس لیے اگر تم نے کسی کی سفارش کی کوشش کی تو مصیبت میں پڑ جاؤ گے، میں صدر کو رحم کی درخوست نہیں بھیجوں گا، لیکن یہ ضرور لکھ بھیجوں گا کہ ایک سزا یافتہ شخص کو زندگی کے آخری لمحات میں ذہنی عذاب دینے والا شخص جیلر بننے کا مستحق نہیں۔" جیلر کا کہنا تھا کہ اس نے ملزم کو پہلی بار مشتعل دیکھا تھا ظاہر ہے اس کے بعد ہمارے لیے اس سے ملنے کا سوال ہی نہ تھا ہم اس کی موت کی تاریخ کو بھولنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے، ناکام کوشش میں کیونکہ ہر نئے دن کے غروب ہوتے ہی ہمارا ذہن ایک کمپیوٹر کی طرح ہمیں یہ بتا دیتا تھا کہ اب فریڈ کی زندگی کے کتنے دن گھنٹے منٹ اور سیکنڈ باقی رہ گئے ہیں۔

……☆☆☆……

مائیکل پاگل ہو گیا تھا اس نے مقدمے کے فیصلے کے بعد پولیس اور سراغ رسانی کے سارے محکمے کو اس کو چور کا پتا لگانے

پر مامور کر دیا جو ایک لاکھ ڈالر لے کر فرار ہو گئے تھے اس کو فریڈ کی کہانی پر ایک فیصد بھی یقین نہ تھا اور اس نے جیوری کے ارکان جج پولیس کے اعلیٰ حکام سب کو ذاتی طور پر اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا اور ان سب نے اس پر یقین کر لیا تھا۔ یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہ تھی لیکن ملزم کی رہائی صرف دو صورتوں میں ممکن تھی یا تو وہ اپیل کرے اور اقبال جرم نہ کرے یا دو ماہ کے دوران اصل مجرم کا پتا لگ جائے۔ دو ماہ بہت ہوتے ہیں گورنر اور پولیس کمشنر کے حکم پر تمام متعلقہ اور غیر متعلقہ افراد اور ادارے تحقیق میں شریک ہو گئے۔ اخبارات میں اپیلیں شائع ہونے لگیں انعامات کے اعلان ہو گئے۔ سرکاری حکام کے ساتھ پرائیویٹ سراغ رساں بھی سرگرم عمل ہو گئے، عدالت کے فیصلے کو غلط قرار دے کر کوئی توہین عدالت کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن یہ بات کہ فریڈ کسی کو بچانے کے لیے اپنی جان کی قربانی دے رہا ہے اور اصل مجرم کے پکڑے جانے کی صورت میں اسے بچایا جا سکتا ہے۔ اخبارات کا موضوع بن گئی، فریڈ کی تصاویر اس کی سابقہ بے داغ زندگی کے حالات اس کے کردار کا تجزیہ شائع ہوا تو ان گنت لوگوں نے فریڈ سے ملنے کی کوشش کی۔ ان میں نامی گرامی وکیل تھے جو اس کا مقدمہ کسی معاوضے کے بغیر لڑنے کو تیار تھے۔ جذباتی لڑکیاں تھیں جو اپنے آنسوؤں کے خوب صورت مگر خوفناک ہتھیار سے اس کی قوت ارادی کو شکست دینا چاہتی تھیں چرچ کے معزز اور محترم ارکان تھے جو گلے میں صلیب لٹکائے بائبل ہاتھ میں لیے جیلر سے بحث کرتے رہے کہ کسی شخص کو خودکشی سے روکنا کار ثواب ہے اور اس کے لیے اگر اسے نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں تو یہ بھی کار ثواب ہے لیکن جیلر کا صرف ایک جواب تھا، بات نوکری کی نہیں قانون کی ہے اگر اس کی جگہ کوئی اور جیلر آئے گا تو وہ بھی قانون سے مجبور ہوگا ملزم کی مرضی کے بغیر کوئی اس سے نہیں مل سکتا۔

ذاتی جذبات کے علاوہ اخبارات اور رائے عامہ کے دباؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے گورنر نے جیل کے معائنے کے بہانے فریڈ کی کوٹھڑی کے سامنے رک کر اس سے چند منٹ بات کی۔ ”ہیلو فریڈ، کیا حال ہے۔“

”فائن مسٹر گورنر...... تھینکس۔“ اس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

”کیا تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے، مدد یا کچھ اور؟“

”نو سر...... تھینکس۔“ گورنر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بہرحال گورنر تھا۔

وقت گزرتا جا رہا تھا جدوجہد بے مصرف ثابت ہو رہی تھی، اصل مجرم خاموشی سے سب تماشہ دیکھ رہا تھا اور جسے سزا ملی تھی وہ سکون سے سو رہا تھا۔

”میرا خیال ہے اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ اب کتنے دن باقی ہیں۔“ جیلر نے ایک بار مائیکل کو بتایا۔

”مائی گاڈ میں نے ایسا مجرم نہیں دیکھا، یوں لگتا ہے جیسے وقت آئے گا تو ہمیں اسے سوتے سے جگانا پڑے گا اور وہ کوئی سوال کیے بغیر آنکھیں ملتا ہمارے ساتھ چل پڑے گا اور خود ہی کرسی پر جا بیٹھے گا اور اپنے فیتے باندھ لے گا اور سر ہلائے گا یس۔“ میں اس وقت مائیکل کے ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا اس کی حالت غیر ہو رہی ہے۔

”مسٹر مائیکل قاتل ایسا نہیں ہو سکتا خواہ اسے کتنا بھی یقین ہو کہ قتل کر کے اس نے کوئی نیک مقصد حاصل کیا ہے۔“

”شٹ اپ یو باسٹرڈ۔“ مائیکل دھاڑا۔ ”اس کے باوجود تم اسے قتل کرنا چاہتے ہو، تم۔“ جیلر ہکا بکا رہ گیا۔ مسٹر مائیکل کیا آپ کا دماغ چل گیا ہے میں اگر چاہوں بھی تو اس کی جگہ کرسی پر نہیں بیٹھ سکتا۔“

واپسی پر میں نے سوچا کہ مائیکل اگر اس وقت پاگل نہیں سزائے موت کی تاریخ تک یقیناً ہو جائے گا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان گنت قاتلوں کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کرنے والے کے سینے میں اتنا حساس اور نرم دل ہے۔

صرف ایک ہفتہ باقی تھا جب صبح سویرے کسی نے میرا دروازہ بجایا میں نے سوتے سے اٹھ کر دیکھا۔ وہ مائیکل تھا پرانا مائیکل، معقول لباس میں سنجیدہ اور شگفتہ تازہ شیو کیے ہوئے چہرے کے ساتھ پوری طرح چاق و چوبند، اب تک ہم اچھے دوست بن چکے تھے۔ چنانچہ دروازہ کھول دیا اور وہ اندر آ گیا اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔

”الفریڈ۔“ اس نے کرسی پر بیٹھ کر فائل کھولتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں میرے پاس وقت نہیں ہے یہ دیکھو۔“ اس نے فائل میں لگا ہوا ایک سال پرانا اخبار میرے سامنے رکھ دیا، میں نے اسے غور سے پڑھا۔ اس میں البرٹ ڈیوڈسن کے قتل کی خبر تھی پھر

میں نے سر ہلایا۔

”کیا پڑھا ہے تم نے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ۔“ میں نے انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ خبر البرٹ ڈیوڈسن کے قتل کی۔“

”احمق۔“ اس نے ایک اور جگہ انگلی رکھی۔

”یہ خبر پڑھو، اسے پڑھ کر مجھے ایک خیال آیا ہے۔“ یہ اس روسی کتے کی خبر تھی جس کے دماغ کو اس کی کھوپڑی سے نکال کر بجلی سے چلنے والے دل کی مدد سے زندہ رکھا گیا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

”مائیکل۔“ میں نے کہا۔

”تم یقیناً اتفاق کرو گے کہ کھوپڑی کے اندر انسان کا دماغ اس وقت تک کام شروع نہیں کرتا جب تک وہ سو کر اٹھنے کے بعد پیٹ نہ بھر لے اور کافی نہ پی لے۔“

آدھے گھنٹے بعد میں شیو اور غسل سے فارغ ہوا، کافی بنائی، انڈے تلے، مکھن اور توس کے ساتھ ساری چیزیں ٹرے میں رکھ کر واپس پہنچا۔ مائیکل ابھی تک فائل پر جھکا کچھ سوچ رہا تھا وہ ناشتہ کر آیا تھا چنانچہ اس نے صرف کافی پی اور مجھے ناشتا کرتے دیکھتا رہا۔ اس دوران اس نے مجھے جو بات بتائی اسے سن کر میں پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے اور یہ بات میں نے اس سے کہہ بھی دی۔

”الفریڈ میں شام کی پرواز سے ماسکو جا رہا ہوں، میں نے ایک نظریہ قائم کیا ہے جو درست بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے برا مانے بغیر کہا۔

”اور غلط بھی۔“ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”کامیابی کے امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔“

”پچاس فیصد امکانات بہت ہوتے ہیں۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو تم فریڈ کی بہن کی طرف سے ایک درخواست دو گے کہ موت کے فیصلے پر عمل درآمد دو ہفتے کے لیے روک دیا جائے پھر کرسمس قریب آ جائے گی اور سزائے موت نئے سال کے دوسرے ہفتے سے پہلے ممکن نہ ہوگی۔ میں گورنر سے بات کر چکا ہوں لیکن کسی چوتھے شخص کو یہ بات معلوم نہیں ہوگی، سمجھے؟“ اس نے فائل سمیٹ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے شام تک بہت سے کام کرنے ہیں۔“

......☆☆☆......

اگلے دن صبح کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر تھی کہ تین امریکی ڈاکٹروں پر مشتمل ایک وفد سوویت روس کے دورے پر روانہ ہو گیا ہے دورے میں یہ وفد سوویت یونین کے طبی تحقیقاتی مراکز دیکھے گا طب کے میدان میں روسی ڈاکٹروں کی کاوشوں کا جائزہ لے گا اور دونوں ملکوں کے درمیان میڈیکل سائنس میں تعاون بڑھانے کا معاہدہ کرے گا۔ اس میں مائیکل کا نام نہیں تھا مگر مجھے معلوم تھا وہ اسی پرواز سے گیا ہے اس روز فریڈ کی زندگی کے چھ دن باقی دن تھے۔

ایک ایک کر کے یہ چھ دن گزر گئے چھٹے دن میں نے گورنر کو درخواست دے دی جو اسی وقت منظور ہو گئی۔ اگلے دن صبح طلوع آفتاب سے قبل سزائے موت ایک ماہ کے لیے ملتوی کر دی گئی معلوم نہیں فریڈ پر اس کا کیا اثر ہوا۔ رات کو مجھے مواصلاتی سیارے کے ذریعے مائیکل کی ٹیلیفون کال موصول ہوئی جس کا مجھے بے چینی سے انتظار تھا۔

”الفریڈ تم نے وہ کام کیا؟“

”ہاں سزا ایک ماہ کے لیے ملتوی ہو گئی ہے تمہیں کوئی کامیابی ہوئی؟“

”ہاں تھوڑی سی مگر میں مایوس نہیں ہوں وہ تو خبطی ہے پولیس کا نام سنتے ہی اس نے مجھے باہر نکال دیا۔“ میں ہنسا۔

”پھر؟“

”میں دوسرا طریقہ آزما رہا ہوں مجھے ایک ڈاکٹر کو اپنے ساتھ اس راز میں شریک کرنا پڑے گا۔ ایک آدمی ان تینوں میں سے ذرا قابل اعتماد ہے مگر میں ذرا یہاں سے فارغ ہو لوں میرا خیال ہے کرسمس ماسکو میں گزرے گا، خدا حافظ۔“ ہاٹ لائن بند کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ”گڈ لک مائیکل میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا۔“ اس وقت تک میں ذہنی طور پر پوری طرح مائیکل کے ساتھ تھا۔

”کرسمس سے ایک دن قبل وہ اچانک آ پہنچا کامیابی کے پہلے مرحلے کی تکمیل سے وہ خاصا مطمئن تھا اگلے دن ہم کیلی فورنیا چلے گئے اور کرسمس ہم نے فریڈ کی بہن الزبتھ جورڈن کے ساتھ منائی۔ فریڈ نے اس سے ملنے سے پھر انکار کر دیا تھا اور وہ سخت دل شکستہ اور مایوس تھی۔ ڈاکٹر جورڈن اس سے بھی زیادہ مضطرب تھا۔ الزبتھ کی حالت ایک ایسی بہن کی حالت تھی جس کے واحد بھائی کو سزائے موت دی جانے والی تھی اور جسے اس نے بچوں کی طرح پالا تھا مگر جورڈن اپنی بیوی کی حالت سے پریشان تھا اور اسے سخت شکایت تھی کہ الزبتھ اپنے پاگل بھائی

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

کے لیے خود کو اور اپنے گھر کو تباہ کر رہی ہے۔ الزبتھ کو گلہ تھا کہ جورڈن اس کے جذبات نہیں سمجھتا، چنانچہ ان کے تعلقات سخت کشیدہ تھے اور اس کشیدگی کا اثر گھر کے ماحول اور بچوں پر پڑ رہا تھا۔ کرسمس کے دن ان کے گھر پر موت کی ویرانی مسلط تھی۔

”مسٹر مائیکل وہ اصل مجرم کا نام نہیں بتاتا اور خودکشی کرنا چاہتا ہے تو اس کی سزا میں کیوں بھگتوں، آپ نے بھی ہزاروں لوگوں کی طرح پوری کوشش کرلی ہے اور الزبتھ نے اس سے ملنے کی کتنی بار کوشش کی ہے مگر وہ شخص پاگل ہے، پاگل۔“

”مسٹر مائیکل۔“ الزبتھ نے روتے ہوئے کہا۔

”میرا بھائی پاگل نہیں ہے میں اسے جانتی ہوں جب وہ پیدا ہوا تو اس کی ماں مرگئی تھی۔ اسے میں نے پالا ہے۔ وہ میرے بچوں کی طرح ہے وہ بچپن میں اتنا بیمار رہا کہ کئی بار مرتے مرتے بچا، میں نے دن رات ایک کردیے اور اسے موت کے منہ سے نکالا۔ وہ اس لیے اتنا کمزور ہے لیکن اب وہ اتنا بڑا ہوگیا ہے اور میں اسے موت سے نہیں بچاسکتی اس سے تو بہتر تھا کہ میں اسے بچپن میں ہی مرجانے دیتی۔ وہ ایسی موت تو نہ ہوتی۔“ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ جورڈن کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے باہر دیکھتا رہا۔

”مسٹر الفریڈ۔ اس میں ضرور کوئی راز ہے ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ مجھ سے نہ ملے۔ وہ ضرور کسی کو بچا رہا ہے یہ تو سبھی جانتے ہیں مگر وہ شروع سے ایسا ہے، ہمیشہ دوسروں کے لیے دکھ اٹھانے والا۔ دوسروں کے لیے قربانی دینے والا یہ کوئی نہیں جانتا۔“

”بس کرو لزی، سب جانتے ہیں کہ وہ پاگل ہے۔“ اس کے شوہر نے اچانک پلٹ کر کہا۔

”صحت ٹھیک نہ ہو تو دماغ بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔“

”اس کا دماغ تو درست ہے مسٹر جورڈن یہ تو میں بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کیونکہ ماہرین نفسیات کے ایک بورڈ نے اس کی تصدیق کی ہے۔“ مائیکل نے کہا۔

”ماہرین نفسیات، ان کا دماغ صحیح تھا۔“ وہ باہر دیکھتے ہوئے بولا۔

شام کو ہم بچوں کو اور الزبتھ کو باہر لے گئے۔ جتنی فیس مجھے اس کی بہن نے دی تھی اس سے دگنی رقم میں نے دعوت اور تحائف پر خرچ کردی۔ ڈاکٹر جورڈن ہمارے ساتھ نہیں گیا مگر واپسی پر جب اس نے بیوی بچوں کو تحائف کے ساتھ خوش وخرم لوٹتے دیکھا تو اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔

”آپ نے میرے گھر کے ماحول کو خراب ہونے سے بچا لیا۔“

”مسز جورڈن۔“ رات کو لوٹتے ہوئے میں نے کہا۔

”آپ کا بھائی کسی عظیم تر مقصد کے لیے جان دے رہا ہے آپ کو اس پر فخر کرنا چاہیے۔“

”اگر میں اسے شہید کہوں تو غلط نہ ہوگا۔“ مائیکل نے کہا۔

”میں آپ دونوں کی بے حد ممنون ہوں، آپ نے مجھے نیا حوصلہ دیا ہے ورنہ میں یہ صدمہ برداشت نہ کرسکتی۔“ الزبتھ جورڈن نے کہا۔

……☆☆☆……

مقررہ وقت کے چوبیس گھنٹے بعد فریڈ کو الیکٹرک چیئر پر بٹھا کر سزائے موت دے دی گئی، جیل کے باہر سخت پہرہ تھا پریس کے کسی نمائندے یا فوٹو گرافر کو اس کا پتا نہ چل سکا۔ ایک دن قبل جیل کے باہر لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہوگیا تھا ان میں مظاہرین بھی تھے جو ایک بے گناہ کی موت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے تنقید اور احتساب کا نشانہ پولیس اور سراغ رسانی کے ادارے تھے جو اصل مجرم کو دو ماہ میں بے نقاب نہ کرسکے۔

عدالت کے فیصلے کے پیش نظر کانگریس کی ایک تحریک خلاف ضابطہ قرار دی جا چکی تھی مگر کانگریس اور سینیٹ میں حزب اختلاف کے ارکان حکومت کی نااہلی پر کڑی نکتہ چینی کر رہے تھے اور اخبارات کے سیکڑوں صفحات کے تبصروں میں جرائم کی تفتیش کرنے والے اداروں کے طریقہ کار کے ساتھ عملے میں تبدیلی کا مسلسل مطالبہ کر رہے تھے فریڈ قومی ہیرو بن گیا تھا اور خدشہ تھا کہ اس کی لاش ورثا کے حوالے کی گئی تو ٹی وی، فلم اور پریس والے نجانے صورت حال کو کس حد تک ڈرامائی بنادیں گے اور عوامی جذبات پر اس کا ردعمل کتنا شدید ہوگا چنانچہ الزبتھ جورڈن کو مطلع کردیا گیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی آخری رسوم اپنی مرضی کے مطابق ادا نہ کرسکے گی اور اسے سرکاری تدفین میں شرکت کی اجازت بھی نہ ملے گی۔ اس کے باوجود جیل کے باہر مجمع بڑھتا گیا۔ متوقع ہنگامے کے پیش نظر آخری وقت میں گورنر نے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے سزائے موت کو ملتوی کردیا۔ سرکاری اعلان کے مطابق غیر معینہ مدت کے لیے لیکن اسے چوبیس گھنٹے بعد خاموشی سے چند سرکاری حکام کی موجودگی میں سزائے موت دے دی گئی۔

موت کے بعد اس کی لاش قبرستان نہیں لے جائی گئی کسی گرجا میں بھی نہیں پہنچی۔ اسپتال کی ایمبولینس نے اسے سات منٹ بعد سٹی سینٹرل اسپتال پہنچا دیا دروازے پر مستعد سرجن کھڑے تھے انہوں نے تین منٹ بعد فریڈ کی لاش کو گراؤنڈ فلور کے ریسرچ سینٹر میں پہنچا دیا۔ یہ پوسٹ گریجویٹ اسکالرز کے لیے وقف تھا اور اس کے جدید ترین ساز و سامان سے آراستہ آپریشن تھیٹر اور تجربہ گاہوں میں دنیا بھر کے ممتاز سرجن اپنا کمال فن دکھا چکے تھے اور ان سے جو کچھ دوسروں نے سیکھا تھا وہ ساری دنیا میں انسانی زندگی کے دفاعی نظام کو مضبوط تر بنانے میں کام آرہا تھا۔ امریکہ کے محقق اور سائنسدان اور ڈاکٹر و کیمسٹ مل کر جو کچھ یہاں کرتے تھے وہ کامیابی اور ناکامی کے مرحلوں سے گزر کر تکمیل تک پہنچتا تھا اور انسانیت کی ملکیت بن جاتا تھا۔

وسیع و عریض بے داغ شیشوں والی کھڑکیوں کے ایک ہال میں بہت سے لوگ جمع تھے شیشے کا گھومنے والا دروازہ بغیر آواز کے کھلا اور سفید ایپرن باندھے ماسک چڑھائے تین افراد اسٹریچر پر فریڈ کی لاش لیے اندر داخل ہوئے۔ ایئر کنڈیشنڈ ہال کی چھت پوری طرح روشن تھی۔ وسط میں آپریشن ٹیبل کے اوپر ایک حلقے میں سرچ لائٹیں نصب تھیں ہر لائٹ کو ہر رخ پر موڑا جاسکتا تھا اور ان کی روشنی کم زیادہ کی جاسکتی تھی اِدھر اُدھر بہت سی مشینیں نصب تھیں اور ان کی ہلکی سی بھنبھناہٹ کے سوا کمرے میں کوئی آواز نہ تھی مشینوں سے موٹے پتلے بہت سے رنگین تار نکل کر اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے اور شیشوں کے گول اور چوکور شیشے کے ڈائل اور اسکرین مختلف رنگوں کی روشنی کے نقطوں، لکیروں اور لہروں کو حرکت کرتے دکھا رہے تھے۔ مختلف مشینوں میں سے کچھ چھوٹی تھیں اور کچھ بڑی اور ان کے اسٹین لیس اسٹیل کے چمکیلے حصے سیاہ، سفید، سبز اور سرخ رنگوں کے بٹن پھیلے ہوئے آڑے ترچھے بازو، حرکت کرنے والے پرزے ہال کے ماحول کو بے حد دہشت ناک بنا رہے تھے جراثیم سے پاک فضا میں ایک طویل میز پر سرجری کے چمکیلے آلات قطار میں رکھے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے نرسوں کی ایک پوری ٹیم صف بستہ کھڑی تھی۔ ان کے سفید لباس سفید ماسک دستانوں جوتوں اور سر کے سفید رومال میں صرف ان کی آنکھیں نظر آرہی تھیں جو لوگ مشینوں کے سامنے کھڑے تھے یا اسٹولوں پر بیٹھے تھے وہ بھی سفید پوش تھے۔

فریڈ کی لاش کے ٹیبل پر پہنچتے ہی آٹھ دس ڈاکٹر تیزی سے بڑھے وہ سب ملحقہ کمرے میں خاموشی سے بلیک بورڈ پر پھیلے ہوئے لکیروں کے جال اور آڑے ترچھے خطوط کے پس منظر میں ایک لیکچر سن رہے تھے۔ لیکچر دینے والا چالیس سال کا مضبوط جسم والا روسی تھا اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا ایک مترجم بڑی روانی سے انگریزی میں بتاتا جارہا تھا پل بھر میں وہ سب میز کے گرد جمع ہوگئے وہ سب آپریشن کے لیے بالکل تیار تھے۔ انہوں نے اپنے منہ پر ماسک چڑھائے نرسیں اور دوسرے لوگ مستعد ہوگئے۔

آپریشن کے دوران روسی ڈاکٹر اور اس کے مترجم کی آواز کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی اس کی زبان سے جیسے ہی کوئی لفظ نکلتا تھا مترجم کی زبان سے انگریزی میں ادا ہوتا تھا فوراً کوئی نرس کوئی آلہ اٹھا کر پکڑا دیتی تھی کوئی مشین چلنے لگتی تھی یا اس پر بیٹھا ہوا آپریٹر کسی نہ کسی بٹن کو دبا دیتا تھا یا کسی ڈائل کی ریڈنگ بتا دیتا تھا۔ کوئی دوسرا ڈاکٹر کسی تار کو کسی ٹیوب کو فریڈ کے جسم کے کسی حصے میں لگا دیتا تھا۔ جس سے ادویات اور مختلف رنگ کے محلول کا قطرہ قطرہ گزرتا نظر آتا تھا۔ وقت گزرتا گیا صبح سے دوپہر ہوگئی سورج ڈھل گیا لیکن آپریشن تھیٹر میں سب لوگ اپنے کام میں مگن تھے نرسیں، آپریٹر، سرجن، خاموش، سر جھکائے۔ ایک معجزے کے انتظار میں سانس روکے کھڑے تھے جو لمحہ ان کی آنکھوں کے سامنے تکمیل کو پہنچ رہا تھا لنچ کا وقت گزرا پھر چائے کا وقت گزر گیا دس گھنٹے گزر گئے کسی کو تھکن اور بھوک کا اور وقت کے گزرنے کا علم ہی نہ ہوا۔

سورج غروب ہوا تو روسی سرجن نے نقاب ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی باقی ڈاکٹروں نے نقاب اتار دیے۔ ڈاکٹروں نے محسوس کیا کہ اب فوری طور پر ان کے لیے سیدھا کھڑا ہونا مشکل ہے کیونکہ ان کی کمریں میز پر جھکے جھکے اکڑ گئی تھیں۔ نرسیں معمول کے مطابق ان کے ایپرن کی ڈوریاں کھولنے آگے بڑھیں مگر انہوں نے ایک نظر چھوٹی سی سائڈ ٹیبل پر بھی ڈال لی۔ شیشے کے مرتبان میں پیرافین کے بے رنگ محلول میں فریڈ کا سر معلق تھا۔ گردن سے اوپر تک کا مکمل حصہ، لاتعداد باریک اور موٹی نلکیاں کٹی ہوئی رگوں سے جوڑ دی گئی تھیں اور ان میں سرخ خون حرکت کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ یہ نلکیاں ایک بہت بڑی مشین کے مختلف حصوں میں گم ہوگئی تھیں، جو ٹیبل سے متصل تھی۔ مشین کے چلنے کی کوئی آواز نہ تھی مگر اس کے

ڈائل اور اسکرین روشن نقطوں لکیروں اور لہروں کی صورت میں فریڈ کے دماغ میں گردش کرنے والے خون کی کیفیت کو ظاہر کر رہے تھے۔ فریڈ کی آنکھیں کھلی تھیں، مگر سیدھی اپنے باقی جسم کو دیکھ رہی تھیں جو اب بے مصرف میز پر پڑا تھا کانوں سے بھی دو نلکیاں نکلی تھیں جو مرتبان سے باہر لٹک رہی تھیں، اس کے منہ کے سامنے ایک ننھا سا مائیکرو فون تھا جس کے تار باہر ایک ایمپلی فائر سے جوڑ دیے گئے تھے بے رنگ محلول میں ہر چیز واضح تھی۔

"اس شخص کا دماغ زندہ ہے۔" روسی نے کہا اور مترجم نے اعلان کیا۔

"آپ لوگ آزمائش کے لیے اس سے بات کر سکتے ہیں مگر آپ کو مائیکرو فون میں بولنا پڑے گا جو مرتبان سے باہر ہیں۔" مترجم نے روسی سرجن کی بات دہرائی۔ باقی سب دم سادھے کھڑے مرتبان کو گھور رہے تھے۔ ڈاکٹر برنارڈ نے مائیک ہاتھ میں اٹھایا۔

"کیا تم میری آواز سن سکتے ہو۔" اس نے واضح صاف الفاظ میں کہا پھر ایک سیکنڈ کی خاموشی میں سب کے دلوں کی دھڑکن جیسے رک گئی۔ فریڈ کے ہونٹ ہلے۔ "ہاں میں سن رہا ہوں۔" آواز ہال کے تمام اسپیکرز پر گونجی، ایک نرس نے چیخ ماری اور دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی، دوسری نے اپنے سینے پر صلیب بنائی باقی کی حالت بھی غیر تھی مگر وہ کھڑی رہیں ان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا ڈاکٹر پرسکون تھے۔

"تمہارا نام کیا ہے۔" دوسرے ڈاکٹر نے دوسرا مائک اٹھایا۔

"فریڈ کاپٹن۔" ہال کے اسپیکرز نے ایک ساتھ کہا، سب لوگ دم بخود یہ آواز سن رہے تھے آپریٹرز کو مشین سے نہ ہلنے کا حکم تھا مگر آواز وہ بھی سن رہے تھے، مسحور خوفزدہ ایک ڈاکٹر نے اس کی آنکھوں کے سامنے تین انگلیاں کیں اور دوسرے کو اشارہ کیا۔

"یہ کتنی انگلیاں ہیں۔" دوسرے نے پوچھا "تین۔" فریڈ کے سر نے جواب دیا۔ مگر اس کی آنکھیں سامنے دیکھتی رہیں پلکیں جھپکے بغیر روسی سرجن مسکرایا اور ملحق کمرے میں داخل ہو گیا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا۔

……☆☆☆……

اگلے دن جب سارے امریکا کے لوگ اخبار میں ایک روسی سرجن کے امریکی ڈاکٹروں کے ساتھ مل کر ایک انقلاب آفریں آپریشن کی خبر پڑھ رہے تھے اور دونوں ممالک کے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشن ساری دنیا کو یہ بتا رہے تھے کہ کس طرح ایک شخص کی موت کے بعد اس کے سر کو جسم سے الگ کر کے مشینی دل کی مدد سے زندہ رکھا گیا تو الزبتھ جورڈن کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اس کے بھائی کا سر ہے کیونکہ کسی خبر میں مرنے والا کا نام نہیں تھا۔ روسی سرجن نے اسی شام میڈیکل ایسوسی ایشن کے ڈنر میں آپریشن کی تفصیلات بتائیں جسے ڈنر میں شریک ڈاکٹرز کے علاوہ ملک کے طول وعرض میں ہزاروں ڈاکٹروں نے سنا اور ساری دنیا کے ڈاکٹرز نے پڑھا میڈیکل ایسوسی ایشن نے اس آپریشن پر ایک مکمل تحقیقاتی کتاب شائع کرنے کا اعلان کیا۔

روسی ڈاکٹر نے صرف ایک بات پر احتجاج کیا کلوز سرکٹ ٹی وی پر یہ آپریشن کیوں نہیں دکھایا گیا اور اس کی فلم کے پرنٹ پریس اور ٹی وی کو ریلیز کیوں نہیں کیے گئے سٹی سینٹرل اسپتال کے حکام نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ عین وقت پر کلوز سرکٹ ٹی وی کا نظام کہیں سے بگڑ گیا تھا اور آپریشن کے دوران ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بات غلط تھی فلم کے پرنٹ لیبارٹری سے موصول نہیں ہو سکے۔ اس لیے اخبارات میں تصویر شائع نہ ہو سکیں اور ٹیلی ویژن کے ناظرین کو فلم نہ دکھائی جا سکی اس کے ایک دو روز میں یہ ممکن ہو سکے گا مگر یہ بات بھی غلط تھی کیونکہ جس وقت روسی ڈاکٹر کے اعزاز میں عشائیہ منعقد ہو رہا تھا سٹی سینٹرل اسپتال میں ڈسٹرکٹ اٹارنی صرف ایک ڈاکٹر، پولیس کمشنر اور میں، ہم سب فریڈ کے سر کے گرد بے بس سے کھڑے تھے۔ اسپتال کے گرد پہرہ تھا اور اس ہال میں داخل ہونے کی اجازت کسی پانچویں شخص کو نہ تھی یہ ڈاکٹر ان تین ارکان کے وفد میں شامل تھا جو روسی سرجن کو لینے ماسکو گئے تھے ڈاکٹر برنارڈ اور ہم لوگ تھک چکے تھے۔

"وہ بھی عجیب آدمی ہے کہتا تھا پولیس کے لیے کچھ کرنے کو تیار نہیں۔" مائیکل نے بیٹھتے ہوئے کہا بڑی مشکل سے ڈاکٹر برنارڈ نے اسے اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ یہ تجربہ صرف میڈیکل سائنس کے لیے کرے وہ کتے کے سر پر کامیاب تجربے کے بعد فوری طور پر آدمی کے سر پر تجربہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، گو وہ اس کی تیاری کر رہا تھا۔"

"ہم نے اسے تعاون کا یقین دلایا یہ بتایا کہ اسپتال میں کسی مریض کی موت کے بعد اس کے دماغ پر کوئی تجربہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" ڈاکٹر برنارڈ نے کہا۔

"اس کے بعد اس نے شرط عائد کردی تھی کہ لواحقین کی رضامندی ضروری ہوگی اور پولیس کا کوئی آدمی نہیں ہوگا تجربے کو پولیس کی مدد کے لیے قطعی استعمال نہیں کیا جائے گا مجبوراً ہمیں جھوٹا وعدہ کرنا پڑا۔"

"مگر اس کا کوئی فائدہ ہوتا نظر نہیں آرہا ہے۔" پولیس کمشنر نے کہا۔

ہال میں ہم چاروں کے سوا کوئی نہ تھا آپریشن کے بعد چار بجے صبح کے قریب ہم اندر داخل ہوئے تھے اور ہمیں سولہ گھنٹے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ آپریشن کو چوبیس گھنٹے پورے ہو چکے تھے روسی ڈاکٹر کے بیان کے مطابق جسم سے الگ کر کے فریڈ کے دماغ کو اس مصنوعی نظام کی مدد سے بہتر گھنٹے تک زندہ رکھا جا سکتا تھا اس دوران اس کے سننے دیکھنے اور بات کرنے کی صلاحیت برقرار رہے گی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اس میں کمی واقع ہوگی اور ایک ہفتہ بعد بالکل ختم ہو جائے گی فریڈ کا جسم بدستور آپریشن ٹیبل پر رکھا تھا۔ ہدایات کے مطابق ہال کی ایئر کنڈیشنگ بند کردی گئی اور بے سر جسم کا تعفن پھیلنے لگا جسم سے کپڑے اتار لیے گئے تھے فریڈ کی آنکھیں مستقل طور پر اس جسم پر جمی ہوئی تھیں۔

صبح پہلا سوال مائیکل نے کیا تھا۔ "فریڈ مجھے پہچانتے ہو؟"

"تم ڈینس مائیکل ہو، ڈسٹرکٹ اٹارنی تم مجھے مرنے کیوں نہیں دیتے۔" فریڈ نے کہا۔ مائیکل کے چہرے کا رنگ پل بھر کے لیے بدلا۔

"ہم تمہیں ایسے نہیں مرنے دیں گے فریڈ تمہیں اس کا نام بتانا ہوگا۔"

"میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا مجھے مرنے دو۔" اس کی آواز ہال کے اسپیکرز پر صاف سنائی دیتی تھی مگر وہ زیادہ اونچا نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے لیے ایمپلی فائر کی آواز بڑھانی پڑتی تھی۔ اس ہال میں یہ گونجتی ہوئی آواز ایک کٹے ہوئے سر کے ہونٹوں سے نکل کر آتی تھی۔ اس منظر کو دیکھنا اور برداشت کرنا خاصے دل گردے کا کام تھا۔

"فریڈ تمہارے سامنے کیا ہے؟" پولیس کمشنر نے کہا۔

"میرا اپنا جسم تم نے اس کے کپڑے کیوں اتار دیے ہیں۔" فریڈ کے سر نے کہا۔ اس کا لہجہ سرد بدہم اور پرسکون تھا یوں جیسے وہ نشہ میں بول رہا تھا یا غنودگی کے عالم میں۔

"فریڈ تم اصل مجرم کو نہیں چھپا سکتے۔ تم اس کا نام نہیں بتاؤ گے تو یہ جسم ایسے ہی تمہارے سامنے پڑا رہے گا۔" مائیکل نے کہا۔

"مائیکل تم شیطان ہو، غلیظ کتے ہو، تم مجھے مجبور کرنا چاہتے ہو میں ہر عذاب جھیل سکتا ہوں۔" فریڈ کے سر نے اسی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"نہیں، تم بتاؤ گے، تم ضرور بتاؤ گے۔" مائیکل نے کہا مگر اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے مرنے دو۔" فریڈ کی آواز نے لجاجت سے کہا۔

ہمارے سارے سوال جواب بے کار ثابت ہوئے، ان سولہ گھنٹوں میں ہم بار بار اس کی زبان سے صرف ایک جملہ سنتے رہے۔ "میں کچھ نہیں بتاؤں گا مجھے مرنے دو۔" سارا دن یہی سنتے گزر گیا تھا اور اب بھی یہ آواز بار بار ہمارے کانوں سے ٹکرا تھی۔ ہال میں اس کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ "مجھے مرنے دو، مجھے مرنے دو۔" یہ آواز دیواروں سے پھوٹ رہی تھی اور سر ٹکرا رہی تھی ان چمگادڑوں کی طرح جو چیختی چلاتی کھنڈروں کے ویران اندھیروں میں چکر لگاتی ہیں مگر باہر نکلنے کا راستہ نہیں پاتیں۔ اس آواز میں بے بسی تھی۔ منت تھی، خدا کے لیے یسوع مسیح کے لیے اس کی آواز ہال کے ہر اسپیکر سے پکار رہی تھی مجھے مرنے دو...... مرنے دو۔

"مائیکل۔" میں نے کہا۔

"میں اب برداشت نہیں کر سکتا میرے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں۔"

"او کے تم جا کے سو جاؤ کوئی سکون آور دوا کھا لینا۔" پولیس کمشنر نے کہا۔

"میں بھی کل صبح سے جاگ رہا ہوں، مجھے بھی سونا ہے۔" ڈاکٹر برنارڈ نے کہا۔ "ہم سب جا رہے ہیں۔" مائیکل نے کہا وہ آخری بار فریڈ کے پاس گیا۔

"فریڈ۔" اس نے مائیکرو فون اٹھا کر کہا میں تمہیں ایک رات کی مہلت اور دیتا ہوں سوچ لو میں جا رہا ہوں۔"

"مائیکل یو باسٹرڈ۔ سن آف اے بچ، مجھے مرنے دو۔" فریڈ کے سر نے کہا۔ مگر مائیکل نے ایک ایک کر کے ہال کی روشنیاں بند کردیں ہم تینوں باہر کھڑے تھے جب ہم نے آخری بار اس آواز کو سنا، مائیکل...... مجھے اکیلا مت چھوڑو، مجھے

مرنے دو...... پولیس کمشنر یہ خلاف قانون ہے۔" پھر شاید میں نے ایک سسکی سنی وہ رو رہا تھا یا یہ میرا وہم ہے۔ میں نے سوچا مائیکل نے آپریشن تھیٹر کے پردے برابر کیے اور دروازے میں تالا لگا دیا۔ خالی کاریڈور میں ہلکی سی روشنی تھی۔ کاریڈور کے آخر میں لوہے کی جالی کا دروازہ تھا۔

"کوئی ادھر آئے تو گولی مار دو۔" پولیس کمشنر نے کہا۔ دروازے پر کھڑے ہوئے سارجنٹ نے سیلوٹ کیا۔

"یس سر۔" مائیکل نے دروازہ کھینچ کر برابر کیا اور تالا لگا دیا۔ چابی اس نے جیب میں ڈال لی۔ صدر دروازے پر استقبالیہ کے کاؤنٹر پر رات کی ڈیوٹی والا اسٹاف موجود تھا اور بڑے تجسس کے ساتھ تاریک کوریڈور کو دیکھ رہا تھا مگر وہاں اس قسم کے ڈرامے ہوتے ہی رہتے تھے۔ صرف پولیس کا پہرہ نئی چیز تھی۔ صدر دروازے پر پولیس لیفٹیننٹ کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ "تم اندر جا کر استقبالیہ کے پاس بیٹھو۔" پولیس کمشنر نے ناگواری سے کہا۔

"جب تک گورنر یا میں خود ساتھ نہ آؤں کوئی اندر نہ جانے پائے...... اُدھر۔"

"یس سر۔" نوجوان لیفٹیننٹ نے اندر جاتے ہوئے کہا۔

"مائیکل۔" راستے میں پولیس کمشنر نے کہا۔

"کیا یہ خلاف قانون نہیں ہے، اگر یہ بات۔"

"چیف یہ مت بھولو کہ اصل مجرم کو گرفتار نہ کرنے کی ساری ذمہ داری تم پر عائد ہو رہی ہے۔" مائیکل نے کہا۔ "اور اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم۔"

"یہی بات تو خلاف قانون ہے۔" پولیس کمشنر نے کہا۔

"عدلیہ یا لواحقین۔"

"سنو چیف صرف دو تین دن کی بات ہے پھر ہم اسے دفنا دیں گے۔"

"مگر میرے ضمیر پر ایک بوجھ ہے ہم نے اسے ایک دفعہ مار دیا اب دوسری بار چوری چوری اسے اتنے عذاب سے ہلاک کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس کوئی قانونی یا اخلاقی جواز نہیں ہے۔"

"کیا واقعی فریڈ ہی نے تین آدمی مارے تھے۔" مائیکل نے کہا" یا مجرم نے یہ چوتھا قتل کیا ہے؟"

"وہ تین آدمی مر گئے تھے کسی تکلیف کے بغیر اور اس کی سزا اسے کل مل چکی کسی جرم کے بغیر مگر اس کے بعد کی سزا اور یہ عذاب خدا مجھے معاف کرے یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔" کمشنر نے کہا۔

"اس کی تلافی اصل مجرم کی گرفتاری سے ہو سکتی ہے۔" ڈاکٹر برنارڈ نے کہا۔

"اور اگر یہ گناہ ہے تو مردے کی آنکھیں یا دل نکالنا یا مرنے کے بعد اس کے جسم کو چیرنا کاٹنا بھی گناہ ہے کمشنر اگر یہ سب نہ ہوتا تو کیا یہ ترقی ممکن تھی جو سرجری نے کی جس نے اتنی بہت سی جانیں بچائیں اور جرائم کے سراغ لگائے۔"

......☆☆☆......

مائیکل رات کو میرے ساتھ ٹھہر گیا مگر اس رات سکون آور ادویات کے باوجود میں نہ سو سکا۔ جیسے ہی میری آنکھ لگتی تھی میرے کانوں میں ایک سرگوشی سی سنائی دیتی تھی۔ "مجھے مرنے دو۔" کبھی یوں لگتا جیسے فریڈ کا بے سر جسم میرے دروازے پر دستک دے رہا ہے اندھیرے میں اس کا کٹا سر کھلی آنکھوں کے ساتھ تیرتا ہوا میرے سامنے آ جاتا تھا۔

"یسوع مسیح کے لیے مجھے مرنے دو۔" میں نے لائٹ جلا دی۔ مائیکل بالکل سیدھا بستر پر بیٹھا تھا۔ "تمہیں بھی اس کی آواز سنائی دے رہی ہے؟" میں نے پوچھا مائیکل نے نفی میں سر ہلایا مگر اس کا چہرہ اس کے جھوٹ کی گواہی دے رہا ہے اکیلا ہے اور اپنی موت مانگ رہا ہے۔ "مجھے زندگی نہیں موت چاہیے تم نے مجھ سے زندہ رہنے اور مرنے کا حق بھی چھین لیا ہے۔"

"اس کی آواز یہاں نہیں آ سکتی۔" مائیکل نے اچانک کہا۔

"میں نے آتے وقت ایمپلی فائر بند کر دیا تھا اور اس کے بغیر اس کی آواز سنائی نہیں دے سکتی۔" ہم نے ایک ایک سکون آور گولی اور کھائی سگریٹ سلگائی اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

اگلی صبح ہم نے آپریشن ہال میں قدم رکھا تو بدبو نے ہمارا استقبال کیا سڑے ہوئے گوشت کی بدبو بند کھڑکیوں اور دروازے پر پڑے ہوئے پردوں میں قید تھی۔ فریڈ کا جسم سڑ رہا تھا مشین چل رہی تھی اور خون پلاسٹک کی نلکیوں میں آتا جاتا نظر آ رہا تھا۔ دوسری مشین خاموش تھی اگر رات کو کسی خرابی کے باعث پہلی مشین خراب ہو جاتی تو دوسری خود بخود چل پڑی مگر اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ دونوں ریزرو جنریٹر بھی خاموش تھے۔ ڈاکٹر برنارڈ نے آپریشن ٹیبل پر پڑے ہوئے جسم کو انگلی سے دبا کر دیکھا۔ وہ نرم پڑ چکا تھا اور اس میں سے پانی خارج ہو رہا تھا لاش کا پیٹ پھول گیا تھا ہم نے رومال اپنی ناک پر رکھ لیے۔

گڈ مارننگ فریڈ مائیکل نے کہا "رات کیسی گزری" اور ایمپلی فائر کو آن کر دیا۔

"مائیکل مجھے اس عذاب میں ڈال کر گناہ گار مت بنو مجھے مر جانے دو۔"

"فریڈ ایک شخص نے تین قتل کیے ہیں اور ہمارے ہاتھوں تمہارا خون کرایا ہے ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے اور جب تک تم اس کا نام نہیں بتا دو گے تمہیں نہیں مرنے دیں گے۔" مائیکل نے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔ بہتر ہے تم مجھے مرنے دو، ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گے۔" فریڈ کے سر نے کہا۔

"اس گناہ کا خمیازہ بھگتو گے۔"

"میری فکر مت کرو، اپنے جسم کو دیکھو کیسے سڑ رہا ہے۔ تمہیں بدبو آ رہی ہے نا، یہ تمہارا اپنا جسم ہے۔" مائیکل نے کہا۔

اسے میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹا لو۔" اس نے بڑی تکلیف سے کہا۔

"نہیں تم اسے سڑتا گلتا دیکھتے رہو، ہمارے لیے تم مر چکے ہو اور ایک مرے ہوئے آدمی سے ایک مجرم کا پتا پوچھنا ہو تو سب جائز ہے۔" مائیکل نے کہا۔

"مائیکل میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔" فریڈ نے یوں کہا جیسے وہ رو رہا ہے۔

"کچھ نہیں مجھے صرف ایک نام بتا دو، ورنہ یہ سمجھ لو یہ جسم تمہارے سامنے رہے گا اس میں کیڑے پڑ جائیں گے تم انہیں اس جسم کا گوشت کھاتا دیکھو گے، تمہارا پیٹ پھٹ جائے گا اور وہ اس میں گھس جائیں گے۔ کلبلاتے ہوئے تمہارے سارے جسم کو چاٹتے رہیں گے تمہارا گوشت ٹوٹ ٹوٹ کر گرے گا۔"

"مائیکل مائیکل تم مجھے نہیں جانتے مجھے عذاب دے کر تم خود عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" فریڈ کے سر نے کہا۔ مائیکل نے اسپیکرز کی آواز کم کر رکھی تھی چنانچہ فریڈ کی آواز سرگوشی کی طرح آ رہی تھی۔ "تم تباہ ہو جاؤ گے۔"

"او کے، میں جا رہا ہوں شام کو پھر آؤں گا۔" مائیکل نے ایمپلی فائر بند کیا، روشنیاں بجھائیں پردے برابر کیے تالے لگائے اور چابی جیب میں ڈال کر چل پڑا، رات کے مقابلے میں دن بہتر تھا ہم خواب آور گولیاں کھا کر سو گئے مائیکل کے فلیٹ میں۔

شام کو میری آنکھ کھلی تو مائیکل ریڈیو لگائے بیٹھا تھا۔

"پولیس کمشنر نے خودکشی کر لی۔" وہ یوں بولا جیسے یہ خبر بالکل متوقع تھی۔

"کیا؟" مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ "خودکشی؟" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ریڈیو والے کہتے ہیں وہ دوسری منزل پر اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے گر گیا مگر مجھے معلوم ہے۔" مائیکل نے کہا اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا ہم فوراً پولیس کمشنر کے گھر پہنچے۔ تعزیت کے رسمی الفاظ کے بعد مائیکل نے اپنے شبہ کا اظہار کمشنر کی بیوی سے کیا۔

"نہیں، اس نے خودکشی نہیں کی، رات ہوا تیز تھی، اس نے دو مرتبہ کھڑکی بند کی مگر وہ بار بار کھل جاتی تھی۔ شاید کنڈی ڈھیلی تھی۔ وہ ویسے بھی پریشان تھا تیسری مرتبہ وہ کھڑکی کا پٹ پکڑنے آگے جھکا اور باہر گر گیا۔" اس کی بیوی نے کہا۔ "اسے خودکشی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے مائیکل کی طرف دیکھا گزشتہ شب بالکل ہوا نہ تھی۔ ہم دونوں اکٹھے ساری رات جاگتے رہے۔ "ہاہاہاہا" دور سے ایک آواز آئی۔ "دیکھا تم نے تم سب تباہ ہو جاؤ گے سب مگر میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" اور اب ہمیں اسپتال میں وہیں جانا تھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ۔

"مجھے مر جانے دو، اب بھی وقت ہے ورنہ تم سب مر جاؤ گے، برباد ہو جاؤ گے۔" اس کی بازگشت ہر طرف تھی۔

اسپتال کے تاریک کوریڈور کے دروازے پر دونوں سارجنٹ مستعد کھڑے تھے۔

......☆☆☆......

وہ بالکل پرسکون تھے انہیں کوئی آواز سنائی نہ دی رہی تھی۔

ایک نے مائیکل کو روک لیا۔ "آپ اندر نہیں جا سکتے مسٹر مائیکل۔" ایک نے کہا۔ "کمشنر کے بغیر یہ اسی کا حکم ہے۔"

"کمشنر مر چکا ہے۔" ڈینس مائیکل نے سکون سے کہا۔

"پھر تو گورنر کو موجود ہونا چاہیے کیوں ٹام۔" اس نے دوسرے سارجنٹ سے پوچھا۔ اس نے تائید میں سر ہلایا۔

"آرڈرز یہی ہیں۔"

"گیٹ آؤٹ۔" مائیکل نے دہاڑ کر کہا۔ "چابی میرے پاس ہے میں ڈسٹرکٹ اٹارنی ہوں۔"

"چابی سے کیا ہوتا ہے۔" سارجنٹ نے فوراً پستول نکال

ہم لیفٹیننٹ سے بات کرلیتے ہیں۔'' میں نے مائیکل کے کندھے پر ہاتھ رکھا مگر لیفٹیننٹ بھی نہ ڈسٹرکٹ اٹارنی سے متاثر ہوا نہ ڈاکٹر برنارڈ سے۔ ''میں مجبور ہوں، پولیس کمشنر کے احکامات ابھی تبدیل نہیں ہوئے ہیں۔'' جس وقت پولیس کمشنر نے ہمارے سامنے یہ بات کہی تھی، ہم بالکل مطمئن تھے ہم خود ایسے ہی حفاظتی انتظامات چاہتے تھے اور اس نے ہم دونوں کو جس اختیار سے نادانستہ طور پر محروم کردیا تھا۔ ہمیں اس کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ مائیکل نے گورنر کو فون کیا۔ وہ کسی ڈنر میں شریک تھا اور رات نو بجے سے پہلے اس کی واپسی کا امکان نہیں تھا۔

''مس جین، میں ڈسٹرکٹ اٹارنی ہوں ڈینس مائیکل مجھے اسی وقت ان سے بات کرنی ہے۔ وہ جہاں بھی ہیں ان سے فون پر رابطہ قائم کرو، کہاں پریس کلب میں؟ اوہ مائی گاڈ اچھا میں وہیں مل لیتا ہوں۔'' اس نے فون بند کردیا اور ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔

پریس کلب کی شاندار عمارت میں روشنی ہی روشنی تھی۔ مائیکل نے کار روک دی۔

''الفریڈ اگر میں اندر گیا تو وہ سب بھڑوں کی طرح مجھ سے چمٹ جائیں گے اور مجھے گورنر سے بالکل الگ بات کرنی ہے کسی پریس والے کے کان میں یہ بات پڑ گئی تو مصیبت آجائے گی، بتاؤ میں کیا کروں۔'' پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ''نو بج چکے ہیں ڈنر ختم ہونے والا ہوگا۔''

''میرا خیال ہے، ہم پچھلی طرف سے چلتے ہیں۔'' میں نے مشورہ دیا۔ کار ہم نے سڑک پر ہی چھوڑ دی اور عمارت کے عقب سے اندر آگئے ہال میں بہت شور تھا ہم باورچی خانے میں گھس گئے وہاں ویٹرز آجا رہے تھے اور دروازہ باہر کی طرف بار بار کھلتا تھا۔ مائیکل نے ہیڈ ویٹر کو بلالیا۔

''دیکھو، میں ڈسٹرکٹ اٹارنی ہوں، کسی طرح یہ پیغام گورنر تک پہنچادو مگر کسی کو خبر نہ ہو، ٹاپ سیکرٹ اور یہ بتاؤ کوئی کمرہ ایسا ہے جہاں کسی کے آنے کا امکان نہ ہو، مجھے گورنر سے بات کرنی ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ہیڈ ویٹر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''آپ خود اندر کیوں نہیں آجاتے مسٹر مائیکل۔''

''جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسے ہی کرو، یہ صدر کا حکم ہے۔''

میں نے حیرت سے اس جھوٹ کو سنا مگر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا، ہیڈ ویٹر نے پرچہ لے لیا۔ ''آل رائٹ سر آپ اوپر چلے جائیں، یہ میرے کمرے کی چابی ہے مگر کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے نا، میرا کمرہ دائیں ہاتھ پر پہلا ہے۔''

''نہیں، نہیں تم جاؤ۔'' مائیکل نے جھنجلا کر کہا وہ دو قدم چلا اور رک گیا۔

''یہ دوسرا شخص کون ہے سر، کیا آپ لوگ مسلح ہیں؟'' مائیکل نے اپنا پستول نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ میرا ڈپٹی ہے تم اس کی تلاشی لے لو، تھوڑے سے تامل کے بعد ہیڈ ویٹر نے پستول لے لیا ہم دونوں کی جیبوں کو ٹٹولا۔

''برا مت ملنیے گا سر اگر گورنر کا کوئی دشمن۔'' وہ معذرت سے مسکرایا۔ مائیکل کا پارہ چڑھ گیا، اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ''ایڈیٹ یہ دیکھو میرا کارڈ، میں ڈسٹرکٹ اٹارنی ہوں۔'' ہیڈ ویٹر فوراً باہر نکل گیا ہم پچھلے زینے سے اوپر چڑھے اور دائیں ہاتھ کے پہلے کمرے میں بیٹھ گئے ایک چھوٹا سا غلیظ کمرہ پندرہ منٹ گزر گئے پھر دروازہ آہستہ سے کھلا اور گورنر اندر آیا۔ اختصار سے کام لینے کے باوجود ہمیں ساری بات گورنر کو سمجھانے میں آدھا گھنٹہ لگ گیا لیکن جب ہماری بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ گرم ہوگیا۔

''تم لوگ یہ کیا غیر قانونی ڈرامہ کر رہے ہو، خیر میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں مگر مجھے قانونی مشیر یا صدر سے بات کرنی ہوگی۔'' ویٹر نے پستول مائیکل کو واپس کردیا۔ ہال کے اسپیکرز پر اعلان کیا گیا کہ ناگزیر وجوہ کی بنا پر گورنر رخصت ہوگئے ہیں اس کا پریس سیکرٹری مصیبت میں پھنس گیا اور ہم خاموشی سے نکل گئے اسپتال میں گورنر کی اچانک آمد نے خاصی سنسنی پھیلائی جس وقت ہم ہال کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم بے ہوش ہوکر گر جائیں گے۔ اندر شدید بدبو تھی۔ مائیکل نے روشنیاں جلائیں پردے برابر کیے اور دروازہ اندر سے بند کردیا۔ گورنر کی نگاہ سیدھے کمرے کے وسط میں گئی، وہ کچھ دیر تک ساکت کھڑا رہا جو کچھ گورنر کے سامنے تھا وہ اس کے لیے ناقابل یقین تھا آپریشن ٹیبل پر سر کے بغیر ایک جسم پڑا تھا۔ لاش کا پیٹ پھٹ گیا تھا غلاظت پوری میز پر پھیلی ہوئی تھی۔ سفید گوشت میں جگہ جگہ دھبے سے نمودار ہوگئے تھے اور ان میں باریک باریک کیڑے کلبلا رہے تھے گورنر نے رومال ناک پر رکھا اور فریڈ کے سر کو دیکھا جو مستقل

اپنی لاش کو گھور رہا تھا۔ مائیکل نے ایمپلی فائر آن کیا اور مائیکرو فون اٹھالیا۔

''فریڈ۔'' مائیکل نے کہا ''گورنر تم سے ملنے آئے ہیں۔''

گورنر شیشے کے مرتبان کے سامنے جھک کر فریڈ کے سر کو غور سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک ہال کے سارے اسپیکرز بول پڑے۔

''جہنم میں جائے گورنر بھی اور تم بھی تم مجھے مرنے کیوں نہیں دیتے۔'' گورنر اچھل پڑا اور دہشت زدہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سر پر رکھ لیا۔ مائیکل نے ایمپلی فائر بند کردیا۔

''مائیکل یہ خلاف قانون ہے خلاف اخلاق ہے۔ بند کرو یہ سلسلہ کیا تم بالکل پاگل ہوگئے ہو، اگر کسی کو معلوم ہوگیا تو کیا ہوگا نہیں میں اس میں پارٹی نہیں بن سکتا۔'' اس نے طیش میں کہا۔ ''میں تباہ ہوجاؤں گا میرا سیاسی مستقبل ختم ہوجائے گا۔''

''مجھے چوبیس گھنٹے اور دیں سر۔'' مائیکل نے کہا۔ ''صرف ایک دن۔''

''میں دوں تم مجھ سے اجازت مانگ رہے ہو، تاکہ تمہارے پاس ایک قانونی جواز ہوجائے قطعی نہیں میں تمہیں گورنر کی حیثیت سے حکم دیتا ہوں کہ اسی وقت یہ سب ختم کردو، ورنہ تم جیل میں ہوگے میں تمہیں اسی وقت برطرف کردوں گا۔'' گورنر نے بپھر کر کہا۔

''کس جرم میں مسٹر گورنر؟'' مائیکل نے اچانک سخت لہجہ میں کہا۔

''یہ ایک سائنسی تجربہ ہے جو ملک کے ممتاز ڈاکٹروں نے کیا ہے پولیس کمشنر کسی ادارے کے بغیر ایک ایسا حکم دے کر مر گیا جس کی وجہ سے ہمیں آپ کے پاس آنا پڑا ورنہ آپ کو معلوم بھی نہ ہوتا۔''

''شٹ اپ تم اس تجربے کے بعد جو کچھ کررہے ہو، کس کی اجازت سے کررہے ہو تمہارا یہ غیر انسانی فعل۔''

''مسٹر گورنر۔'' ڈاکٹر برنارڈ نے کہا۔

''غیر انسانی تو بہت کچھ ہوتا ہے جب ایک نیگرو حادثے میں ہلاک ہوا تھا تو اس کا دل ایک سفید فام کے سینے میں لگادیا گیا تھا ڈاکٹر کرسچن برنارڈ نے یہ آپریشن افریقہ میں کیا تھا یہاں ہم ہر روز ایسے آپریشن کرتے ہیں۔''

''مگر ڈاکٹر اس کے لیے قانونی جواز ہوتا ہے لواحقین کی اجازت ہوتی ہے۔'' گورنر نے کہا۔

''آپ ہی نے اس کی لاش ورثا کے حوالے نہ کرنے کے حکم پر دستخط کیے تھے۔'' مائیکل نے کہا۔

''مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا۔''

''قانوناً لاوارث لاشیں اسپتال کی ملکیت ہوتی ہیں اسپتال والے اس کے ساتھ جو چاہیں کریں جسم کے ٹکڑے کردیں یا......!'' ڈاکٹر برنارڈ نے کہا ''اور ہمیں کوئی واضح حکم بھی نہیں ملا تھا۔''

''مگر وہ مرا نہیں ہے۔'' گورنر نے کہا ''وہ مرنا چاہتا ہے۔''

''وہ مر چکا ہے جیلر نے اسے الیکٹرک چیئر پر بٹھایا اور جیل کے ڈاکٹر نے اس کی موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کیے کیا آپ یہ سرٹیفکیٹ دیکھنا چاہتے ہیں آپ کے حکم سے اسے مقررہ وقت کے چوبیس گھنٹے بعد خاموشی سے مار دیا گیا تھا۔'' ڈاکٹر برنارڈ نے کہا۔

''اوہ میرے خدا۔'' گورنر کرسی پر بیٹھ گیا، بدبودار گرمی سے ہم سب کا برا حال تھا۔ ''آپ مجھے برطرف کرسکتے ہیں مگر قانوناً میں مجرم نہیں ہوں۔'' مائیکل نے کہا۔

''اور اپنی غیر قانونی برطرفی کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔''

''اس کے علاوہ یہ ایک سائنسی تجربہ ہے۔ آپ اس میں مداخلت نہیں کرسکتے جیسے آپ پوسٹ مارٹم نہیں روک سکتے۔'' ڈاکٹر برنارڈ نے کہا۔ ''ورنہ آپ کو بے ہوش کردوں گا۔'' چند سیکنڈ خاموشی میں گزر گئے۔ گورنر نے محسوس کیا کہ وہ پھنس چکا ہے۔

''دیکھو مسٹر مائیکل یہ مسئلہ دوسرا رخ بھی اختیار کرسکتا ہے اگر میں تمہیں اجازت دے دوں تو کل مجھے بھی تمہارے ساتھ پکڑا جاسکتا ہے کیونکہ یہ امریکی اور روسی حکومت کے درمیان کیے گئے معاہدے کی کھلی خلاف ورزی ہے ڈاکٹر برنارڈ تم جس سرکاری وفد کے ساتھ گئے تھے۔ اس نے روسی سرجن سے کیا وعدہ کیا تھا، اگر کسی بھی طرح یہ بات پھیل گئی تو کیا ہوگا۔ روسی سرجن ایک بیان دے گا اور روسی حکومت صدر کے نام پر احتجاجی مراسلہ بھیج دے گی کہ سرکاری وفد نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تجربے کو پولیس کے لیے استعمال کیا...... نہیں میں ایسی اجازت دینے کا مجاز نہیں ہوں، تمہیں صدر سے بات کرنی ہوگی اور مجھے یقین ہے وہ معاہدے کا پاس کریں گے۔'' گورنر نے کہا ''یہ بین الاقوامی سیاسی معاملہ ہے۔''

مائیکل نے مایوسی سے میری طرف دیکھا اب کیا ہوگا، یہ سوال ہم دونوں کی صورت پر صاف لکھا تھا ڈاکٹر برنارڈ بھی

چپ کھڑا تھا۔

"آل رائٹ گورنر ہم صدر سے بات کریں گے کیا آپ ہمیں ایک گھنٹے کی مہلت دیں گے؟" مائیکل نے کہا۔ "صرف ایک گھنٹہ۔"

"سوری میں سرکاری طور پر ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں دے سکتا پولیس نے مجھے یہاں آتے دیکھا ہے پریس کلب میں میری اچانک روانگی کا اعلان کیا گیا ہے مجھے ان سب کو بتانا پڑے گا کہ میں رات کیوں آیا تھا میں ایک گواہ بن گیا ہوں۔" گورنر نے کہا۔

"مائیکل۔" میں نے کہا "ایک مشین خراب ہوگئی ہے "ڈاکٹر برنارڈ نے مائیکل کے ساتھ سر گھما کر دیکھا ایک مشین بند پڑی تھی نہ معلوم دن میں کسی وقت ایک مشین بند ہوئی اور دوسری چل پڑی۔ اب یا تو ہمیں فوری طور پر انجینئرز کو بلوا کر پہلی مشین کو ٹھیک کرانا تھا اور اس طرح ایک اور شخص کو اس راز میں شریک کرنا تھا بصورت دیگر دوسری مشین کے کسی بھی وقت خراب ہونے کا امکان تھا۔ اس کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہوجاتا۔ صدر کے پاس جانے اور اجازت لینے کا وقت نہیں تھا، میں نے ڈاکٹر برنارڈ کی طرف اور اس نے مائیکل کی طرف دیکھا، اچانک مائیکل نے پستول نکال لیا۔

"مسٹر گورنر اب اس کمرے سے کوئی باہر نہیں جائے گا تجربہ مکمل ہونے تک۔" گورنر بھونچکا رہ گیا۔

"مائیکل۔" میں نے کہا۔

"کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟"

"الفریڈ ادھر آؤ یہ پستول لے کر دروازے پر کھڑے ہو جاؤ اگر گورنر باہر جانا چاہے تو اسے گولی مار دو۔" مائیکل نے کہا "میں اپنی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔" مجھے معلوم تھا میں گولی نہیں چلا سکتا مگر ہم گورنر کو روک سکتے تھے۔ وہاں اس کی چیخ پکار سننے والا کون تھا چنانچہ ایک لمحہ بعد میں نے پستول لے لیا۔ ڈاکٹر برنارڈ کے چہرے کا رنگ کپڑے کی طرح سفید ہوگیا تھا گورنر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

"صبح تم سب جیل میں ہوگے۔" اس نے کہا۔

"مسٹر گورنر ہمیں صبح کی فکر نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کے علاوہ میں اس تجربہ کو ابھی ختم کر رہا ہوں۔" مائیکل نے کہا اور ہسپیلی فائر کو چلا دیا۔

"ڈاکٹر برنارڈ ٹیپ ریکارڈر چلا دو۔" ڈاکٹر نے ٹیپ ریکارڈر چلا دیا اس کے ساتھ ہی گورنر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر وہ دروازے کی طرف نہیں بڑھا میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

"فریڈ۔" مائیکل نے کہا

"تم نے اپنے جسم کی حالت دیکھ لی۔"

"ہاں مائیکل یہ ناقابل برداشت منظر ہے خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" فریڈ کے سر نے کہا۔

"مجھے مرنے دو۔" گورنر اس کے لبوں کی حرکت کو دیکھتا رہا۔

"فریڈ میں تمہیں آخری موقع دوں گا ایک گھنٹے بعد میں تمہاری بہن کو یہاں لا رہا ہوں۔" مائیکل نے کہا۔

"نہیں خدا کے لیے نہیں۔" فریڈ نے شدید کرب میں کہا۔

"بالکل وہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوگی۔ شاید وہ زندگی بھر اس منظر کو نہ بھول سکے شاید وہ پاگل ہو جائے شاید وہ خودکشی کرے۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔" فریڈ کے سر نے کہا پہلی بار مجھے اس کی آواز میں شکست کا احساس ہوا۔ "میں ضرور کروں گا۔ میں تمہاری بہن کے بچوں کو بھی لا رہا ہوں۔" مائیکل ہنسا اس کی ہنسی میں اعتماد تھا فریڈ نے کوئی جواب نہیں دیا، پورا ایک منٹ گزر گیا لیکن اسپیکرز خاموش تھے۔

"تم نے سنا فریڈ میں سیدھا کیلی فورنیا جا رہا ہوں۔ الزبتھ کو لینے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا مائیکروفون ڈاکٹر برنارڈ نے سنبھال لیا۔ "فریڈ وہ واقعی جا رہا ہے۔"

"ٹھہرو خدا کے لیے رک جاؤ۔" فریڈ کے سر نے کہا۔ "میں بتاتا ہوں۔" میرے ہاتھ پیر کانپنے لگے گورنر لڑکھڑا کر ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ برنارڈ مسکرایا۔

"مائیکل۔" ہال کے سارے اسپیکرز بولے۔ "اسے مت لاؤ، ڈاکٹر جورڈن کو لے آؤ۔" اس ہیبت ناک ہال کے المیے کا آخری منظر ہمارے ساتھ گورنر بھی دیکھ رہا تھا۔

"کیا مجرم ڈاکٹر جورڈن ہے؟" مائیکل نے پوچھا۔

"ہاں، مگر وہ قاتل نہیں ہے ایک لاکھ ڈالر اسی کے پاس ہیں میں نے اسے فرار ہونے کا موقع دیا تھا تینوں قتل میں نے کیے تھے۔" فریڈ کے سر نے کہا۔

"کیا تم اس کے ساتھ تھے؟" مائیکل نے کہا ہر لفظ ٹیپ پر ریکارڈ ہو رہا تھا۔

"ہاں جب ان دونوں کی لڑائی شروع ہوئی تو میں نے

البرٹ ڈیوڈسن کو گولی مار دی اور اس سے کہا کہ وہ چلا جائے۔" گورنر اب دم بخود بیٹھا ایک مردے کا اقبال جرم سن رہا تھا۔ "اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو درست ہے۔" مائیکل نے پوچھا۔

"اسے میرے سامنے لے آؤ، وہ قبول کرلے گا لیکن خدا کے واسطے الزبتھ کو میرے متعلق کچھ نہ بتانا، جورڈن چند سال میں چھوٹ جائے گا اس پر صرف چوری کا الزام ہوگا نا۔"

"ہاں۔" مائیکل نے جیب سے نوٹ بک نکال کر ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور گورنر کے سامنے رکھ دیا۔ "گورنر اس پر دستخط کردو ہمیں ہیلی کاپٹر چاہیے اسی وقت۔" گورنر نے چند سیکنڈ تک خاموشی سے دیکھا پھر دستخط کردیے۔

"الفریڈ تم ڈاکٹر برنارڈ کے ساتھ جاؤ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اپنے گھر سے دوسرا پستول لے جاؤ اور اسے اٹھا لاؤ" مائیکل نے کاغذ مجھے تھما دیا اور پستول لے لیا۔

"مگر وارنٹ۔" میں نے تامل کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی وارنٹ نہیں تم دونوں اسے زبردستی لے آؤ میں اور گورنر یہیں ٹھہریں گے۔" اس نے ہمیں باہر نکال کر دروازہ بند کردیا۔

"ہیلی کاپٹر حاصل کرنا ایک اور مرحلہ ثابت ہوا ڈیوٹی آفیسر نے کاغذ کے اس پرزے کو دیکھا جس پر ڈسٹرکٹ اٹارنی کا حکم اور گورنر کے دستخط تھے اس نے فون پر ڈائریکٹر پولیس آپریشن سے رابطہ قائم کیا۔ آدھے گھنٹے تک ہم انتظار کرتے رہے پھر ایک طویل قامت شخص اندر داخل ہوا۔ ڈیوٹی آفیسر نے سلپ اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے کاغذ میز پر رکھ دیا اور ہمیں دیکھا۔

"گورنر کہاں ہے؟" اس نے مشتبہ لہجے میں پوچھا۔

"وہ پریس کلب کے ڈنر سے سٹی سینٹرل اسپتال گیا ہے میں اسی اسپتال کا ڈاکٹر برنارڈ وائٹ مین ہوں۔" برنارڈ نے اپنا کارڈ سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"استقبالیہ پر ایک پولیس لیفٹیننٹ موجود ہے آپ تصدیق کرسکتے ہیں۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اس کے ساتھ ہے۔"

"کیا میں اس سے بات کرسکتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے یہ مشکل ہے۔ مگر اسپتال میں ان کی موجودگی کی تصدیق ہوسکتی ہے۔"

"وہ وہاں کیا کر رہا ہے گورنر۔"

"یہ اسٹیٹ سیکرٹ ہے صدر کا حکم۔" میں نے کہا۔ "آپ پریس کلب میں اس کے پریس سیکرٹری سے پوچھ سکتے ہیں کہ ایک گھنٹے پہلے وہ اچانک ڈنر پارٹی سے رخصت ہوگیا تھا یا نہیں مگر اسپتال نہیں جاسکتے۔" وہ غور سے دستخط دیکھتا رہا پھر اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔

"او کے، ہیلی کاپٹر میں مسلح پولیس جائے گی۔"

"ٹھیک ہے مگر وہ ایئرپورٹ پر رہیں گے ہم ایک مجرم کو لینے جا رہے ہیں ایئرپورٹ پر ہمیں ایک پولیس کار اور گارڈ بھی چاہیے لیکن وہ کوئی سوال نہیں کریں گے اور کسی معاملے میں مداخلت نہیں کریں گے۔" میں نے کہا۔ ڈائریکٹر پولیس آپریشن نے کچھ کہنے کے لیے سر اٹھایا ہی تھا کہ برنارڈ نے کہا "صدارتی حکم۔" وہ چپ ہوگیا اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے ایک گھنٹے بعد ہم کیلی فورنیا کے فوجی ہوائی اڈے پر اترے۔ پولیس کار میں موجود تھی۔ دس منٹ بعد ہم نے الزبتھ کے دروازے پر دستک دی۔ ڈاکٹر جورڈن نے دروازہ کھولا۔ وہ ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"مسٹر الفریڈ خیریت ہے، اندر آئیے۔" ہم اندر چلے گئے۔

"الزبتھ بچوں کے ساتھ اوپر سو رہی ہے کیا میں اسے جگاؤں؟" اس نے پوچھا میں نے اطمینان کا سانس لیا ہمارا کام آسان ہوگیا تھا۔

"نہیں مسٹر جورڈن، ہم ایک کام سے آئے ہیں آپ ایک منٹ ہمارے ساتھ باہر آئیے۔" میں نے کہا۔ "باہر؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "آپ یہاں بات کرسکتے ہیں گھر میں کوئی نہیں ہے سب سو رہے ہیں۔"

"ڈاکٹر جورڈن آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے، پولیس اسٹیشن۔" برنارڈ نے کہا۔

"پولیس اسٹیشن اتنی رات کو، کس لیے۔"

"ہم کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ آپ اگر مرضی سے نہیں جائیں گے تو ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی۔" میں نے پستول نکالتے ہوئے کہا میں اس کے پیچھے تھا ڈاکٹر برنارڈ نے بھی پستول نکال لیا وہ ایک قدم پیچھے ہوگیا۔ "یہ کیا بکواس ہے وارنٹ کے بغیر تم مجھے کہیں نہیں لے جاسکتے میں نے کیا جرم کیا ہے۔" میں نے اسے آگے دھکیلا اور اس کی کمر پر پستول کی نالی رکھ دی۔

"کم آن۔" میں نے سیفٹی کلچ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں

جائے کہ ہمارے پاس وقت کم ہے۔“

”مگر یہ خلاف قانون ہے مجھے اپنے وکیل سے بات کرنی ہوگی۔“ میں نے اسے پیچھے سے دھکا دیا وہ مشتعل ہو کر پلٹا۔ ”تم مجھے اغوا کرنے آئے ہو۔“

”ہاں۔“ برنارڈ نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا وہ لڑکھڑا کر گر پڑا، ہم نے اسے اٹھا کر پولیس کار میں ڈالا، چلتے چلتے میں نے الزبتھ کے لیے ایک نوٹ چھوڑ دیا کہ اس کا شوہر ایک کام سے گیا ہے اور ممکن ہے دو دن نہ لوٹے کار ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔

راستے میں جورڈن کو ہوش آ گیا مگر ہم دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔

”تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو، یہ پولیس اسٹیشن کا راستہ نہیں ہے، چھوڑو مجھے۔“ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام جدوجہد کرتے ہوئے کہا ہم نے اسے جکڑ رکھا تھا ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھنے کی کوشش کی ”سامنے دیکھو۔“ میں نے ڈانٹ کر کہا۔

”کیا تمہیں ہدایات نہیں ملیں۔“

”یس سر، سوری۔“ جورڈن پر اس کا خاطر خواہ اثر ہوا مگر ہیلی کاپٹر پر چڑھاتے ہوئے ہمیں زبردستی کرنی پڑی۔ پندرہ منٹ بعد ہیلی کاپٹر نے پھر پرواز کی۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے ہیلی کاپٹر کے اندر مسلح پولیس کو دیکھ کر ڈاکٹر جارڈن نے مزاحمت ترک کر دی۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی۔

”میں تمہیں بتا دیتا ہوں تم سب مصیبت میں پڑ جاؤ گے تم نے کسی جرم کے بغیر ایک شہری کو اس کے گھر سے اٹھایا ہے کسی وارنٹ کے بغیر۔“

”مسٹر جورڈن۔“ میں نے کہا ”تمہارا جرم یہ ہے کہ چھبیس اکتوبر کی شب کو تم نے البرٹ ڈیوڈسن کے گھر میں گھس کر ایک لاکھ ڈالر چرائے تھے اسی رات اسی جگہ البرٹ ڈیوڈ اور دو پولیس مین مارے گئے اور ان کے قتل کے الزام میں تمہاری بیوی کے بھائی کو سزائے موت دی گئی۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے مجھے کیا ضرورت تھی ایک لاکھ ڈالر چرانے کی۔“ ڈاکٹر جورڈن نے کہا۔

”یہ تو ہمیں معلوم کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مگر یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تھا اس میں کہیں میرا نام نہیں آیا فریڈ نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا پھر اب......!“

”اب ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ایک لاکھ ڈالر لے کر تم فرار ہوگئے تھے۔ فریڈ نے تمہیں بھاگنے کا موقع دیا اور خود پکڑا گیا تمہاری البرٹ ڈیوڈسن سے لڑائی ہوئی تھی تم نے اس کے سر پر وینس کا سنگ مرمر کا مجسمہ مارا تھا۔ اس پر تمہاری انگلیوں کے نشان ہوں گے۔ فریڈ نے تمہیں بچانے کے لیے البرٹ کو گولی مار دی اور بعد میں دو پولیس والوں کو تم یہ ایک لاکھ ڈالر لینے کیوں گئے تھے؟“ میں نے کہا۔

”یہ سب بے بنیاد بکواس ہے۔“ ڈاکٹر نے سگریٹ پیر سے مسلتے ہوئے کہا۔

”تم اسے بکواس کہہ سکتے ہو مگر یہ بے بنیاد نہیں ہے۔ ہمارے پاس اس کا ثبوت ہے۔“ ڈاکٹر برنارڈ نے کہا۔

کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں، تم مجھے پھنسانا چاہتے ہو، مگر تم خود پھنس جاؤ گے۔“

”ڈاکٹر۔“ میں نے کہا۔

”وہ ایک لاکھ ڈالر کہاں ہیں۔“

”ایک لاکھ ڈالر، میں نے زندگی میں کبھی اتنی رقم دیکھی تک نہیں تم نے میرا بینک اکاؤنٹ دیکھا ہے؟“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں ایک غریب ڈاکٹر ہوں۔“

”بینک اکاؤنٹ تو کسی بھی نام سے ہو سکتا ہے مگر خیر یہ بتاؤ کیا تم نے وہ تین قتل بھی کیے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یا فریڈ بے گناہ مارا گیا۔“

”میرا خیال ہے فضول باتوں سے کوئی فائدہ نہیں، مجھے صرف یہ اطمینان ہے کہ میں پولیس کی تحویل میں ہوں اور تم مجھے کہیں قتل کرنے نہیں، لے جا رہے ہو۔“ وہ ہنسا۔ ”مگر ممکن ہے تم یہ سب ریکارڈ کر رہے ہو، میں اب اپنے وکیل سے مشورہ کیے بغیر ایک لفظ نہیں بولوں گا۔“

”ڈاکٹر جورڈن، میں ڈاکٹر برنارڈ ہوں، سٹی سینٹرل اسپتال میں سرجن ہوں، جہاں تک مجھے یقین ہے کہ تم قتل کے الزام سے محفوظ ہو، لیکن البرٹ ڈیوڈسن کے گھر سے ایک لاکھ ڈالر لے جانے کا الزام تم پر ثابت ہے اسے زخمی کرنے پر اقدام قتل کا الزام بھی آ سکتا ہے۔“

جورڈن باہر دیکھتا رہا وہ بالکل مطمئن اور پرسکون تھا اور اپنی بے نیازی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے ہماری باتوں کی بالکل پروا نہیں ہے۔ ”ڈاکٹر جورڈن چند منٹ کی بات اور ہے اس کے بعد تمہاری یہ اداکاری کی صلاحیت باقی نہ رہے گی۔“ میں نے کہا۔ ”تم اپنی زبان سے اپنے جرم کا اقرار کرو گے۔“ جورڈن کے چہرے کا رنگ بدلا اداکاری ثابت ہوا تھا۔

”جو ثبوت ہم پیش کریں گے ناقابل تردید ہوگا اور تمہارے اقبال جرم کے گواہ بھی جھٹلائے نہ جا سکیں گے۔“ سگریٹ جورڈن کے ہاتھوں میں کانپنے لگا مگر وہ خاموش رہا مگر اس کی حالت کے تغیر نے مجھے بڑا سکون بخشا ہم نے کوئی غلطی نہیں کی تھی، غلط آدمی کو نہیں پکڑا تھا سوائے گورنر کے مگر وہ مجبوری تھی شاید وہ معاف کر دے۔

ملٹری ائرپورٹ سے اپنی ہی کار میں روانہ ہوئے جواب تک وہیں کھڑی تھی جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔ پولیس کی رخصت ہونے کے بعد معاملات پھر ہمارے ہاتھ میں تھے۔

”برنارڈ میں ڈرائیو کرتا ہوں تم اس کے ساتھ بیٹھو اگر یہ کوئی حرکت کرے تو سوچے سمجھے بغیر گولی مار دو، مگر ٹھہرو۔“ میں نے اپنی جیب سے رومال نکالا۔

”میں اس کے ہاتھ باندھ دیتا ہوں۔“

”اس سے آسان یہ ہے۔“ برنارڈ نے پھر ایک بار سر پر پستول کا دستہ مارنے کی کوشش کی مگر وہ بچ گیا اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے اور میں نے انہیں ملا کر مضبوطی سے باندھ دیا میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لیا جورڈن میرے ساتھ بیٹھ گیا برنارڈ پچھلی سیٹ پر پستول لے کر بیٹھا کار اسپتال کی طرف روانہ ہوگئی۔

”تم اب مجھے کہاں لے جا رہے ہو، پولیس کہاں گئی۔“ جورڈن نے تشویش سے پوچھا۔

”ہم تمہیں قتل کرنے لے جا رہے ہیں پولیس گواہ بننا نہیں چاہتی تھی۔“ برنارڈ نے کہا۔

رات کے دو بجے کار سٹی سینٹرل اسپتال کے دروازے سے اندر داخل ہوگئی، اس وقت تک گورنر کو قید ہوئے ساڑھے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ صدر دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی جورڈن ٹھٹک گیا۔ استقبالیہ پر پولیس لیفٹیننٹ کھڑا تھا۔ ایک تاریک کاریڈور کے آہنی دروازے پر دو سارجنٹ ایستادہ تھے۔ میں نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا استقبالیہ کی نرس سب سے پیچھے ڈاکٹر برنارڈ کو پستول لیے دیکھ کر حیران کھڑی تھی۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی، گورنر، یہ شخص جس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور برنارڈ پولیس اور یہ راز داری اس نے سوچنا شروع کیا یہ کیا چکر ہے۔

سو لفظی کہانی

یوم کشمیر اور ہم

”یاہو کل چھٹی ہے۔“ جماعت میں خوشی کا عالم تھا۔

”بچو چھٹی کشمیر ڈے کی وجہ سے ہے۔ ہم کشمیر ڈے کیوں مناتے ہیں؟“

”ٹیچر! نہیں معلوم۔“

”اس دن ہم کشمیری عوام کی جنگ آزادی کی حمایت کرتے ہیں اور بھارتی مظالم کی مذمت کرتے ہیں۔“ ٹیچر نے سمجھایا۔

”آپ چھٹی کیسے منائیں گے؟“

”ہمارے کزن کی شادی ہے ہم ڈانس پریکٹس کریں گے۔“ عروہ نے کہا۔

ہم پاپا کے ساتھ شاہ رخ کی فلم دیکھنے جائیں گے۔“ ایمن بولی۔

ٹیچر سوچنے پر مجبور ہو گئیں ہمیں دشمن کے بچوں کو پڑھانے سے پہلے اپنے بچوں کو پڑھانے کی اشد ضرورت ہے!

نفیسہ عبدالرزاق

ہال کا دروازہ کھولتے ہی بدبو کا اتنا شدید بھبکا آیا کہ میرا دماغ چکرا گیا مائیکل اسی طرح دروازے کے قریب پستول لیے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ گورنر کمرے کے آخری کنارے پر بدبو سے بچنے کے لیے ناک پر رومال رکھے بیٹھا تھا کمرے میں گھستے ہی میں نے دروازہ پھر بند کر دیا۔

”مائیکل۔“ میں نے کہا۔

”میں اب یہاں بیٹھوں گا باقی کام تمہارا ہے۔“ جورڈن نے ایک نظر ہال پر ڈالی اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا وہ ڈاکٹر تھا اس کے لیے یہ سارا نقشہ سمجھنا مشکل نہیں تھا گورنر اٹھ کر قریب آ گیا۔

”مسٹر گورنر۔“ مائیکل نے کہا ”ایک مہمان آیا ہے۔“ خلاف توقع گورنر کا موڈ خراب نہیں تھا۔ اس نے غور سے جورڈن

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

"ڈاکٹر جورڈن یہ سر ملاحظہ فرمایا آپ نے۔" مائیکل نے کہا جورڈن نے کوئی جواب نہیں دیا وہ آپریشن ٹیبل پر پڑے گلے سڑے جسم اور اس کے سامنے شیشے کے مرتبان میں معلق فریڈ کے سر پر نظریں جمائے کھڑا تھا آہستہ آہستہ اس کی نظریں تاروں اور ٹیوبوں سے ہوتی ہوئی مشین پر گئیں، اس نے خون کو گردش میں دیکھا اور سب کچھ سمجھ گیا۔ روسی ڈاکٹر کے آپریشن کے تجربے سے عام لوگ بھی واقف تھے۔ وہ تو ایک ڈاکٹر تھا صرف اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ آپریشن اس کے اپنے سالے کے سر پر کیا گیا ہے۔

مائیکل نے ایمپلی فائر کو آن کیا ڈاکٹر برنارڈ نے ٹیپ ریکارڈ چلا دیا۔

"فریڈ تمہارے سامنے کون ہے۔" مائیکل نے کہا۔

"ڈاکٹر جورڈن آئی ایم سوری۔" فریڈ کے سر نے جواب دیا۔ مائیکل نے عمداً آواز زیادہ رکھی تھی جیسے ہی یہ آواز ہال کے اسپیکرز پر گونجی جورڈن پر اس کا شدید ردعمل ہوا۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا وہ پلٹا اور بھاگنے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر برنارڈ سے ٹکرایا۔

"ڈاکٹر جورڈن یہ البرٹ ڈیوڈسن کا گھر نہیں ہے تم کہیں نہیں بھاگ سکتے۔" ڈاکٹر برنارڈ نے کہا وہ جسمانی طور پر بہت مضبوط اور جورڈن سے قد میں چھ انچ لمبا تھا۔ "فریڈ تمہارا بہنوئی بھاگنا چاہتا ہے۔" مائیکل نے کہا۔ "اسے کہو سب کچھ صحیح صحیح بتا دے۔"

"جورڈن انہوں نے مجھے مجبور کر دیا ہے بتا دو۔" فریڈ کے سر نے کہا۔

"میں......!" جورڈن ہکلایا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا میں نے کچھ نہیں کیا۔" وہ پھر بھاگا برنارڈ نے اس کے پیروں میں ٹانگ اڑا دی۔ وہ دھڑام سے فرش پر گرا۔ اٹھا اور پھر بھاگا۔ "مجھے جانے دو، وہ جھوٹ بول رہا ہے۔"

"جورڈن، میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں قتل میں نے کیے ہیں تم ایک لاکھ ڈالر لوٹا دو۔" سارے اسپیکرز نے ایک ساتھ کہا۔ "الزبتھ کو۔"

"نو۔" جورڈن چلایا۔ "یہ نہیں ہو سکتا وہ مر چکا ہے وہ نہیں بول سکتا۔"

"وہ بول رہا ہے مسٹر جورڈن۔" گورنر نے کہا۔ "وہ مرا نہیں ہے۔"

"وہ مر گیا ہے، مر گیا ہے۔" جورڈن نے دیوانوں کی طرح سر کے بال نوچتے ہوئے کہا۔

"اب میں محفوظ ہوں کوئی مجھے نہیں پکڑ سکتا کوئی نہیں۔" وہ پھر دیوانہ وار بھاگا اور مجھے اس کا مقابلہ کرنا پڑا مائیکل اور برنارڈ اسے گھسیٹ کر پھر سر کے سامنے لے گئے، وہ مچلتا رہا ہاتھ اور ٹانگیں چلاتا رہا۔ اس نے مائیکل کے ہاتھوں پر کاٹ لیا۔ اس کے کپڑے پھٹ گئے۔ بالآخر برنارڈ اور مائیکل نے اسے اپنے شکنجے میں کس لیا۔ اس کشمکش میں ان دونوں کے چہروں پر خراشیں آئیں اور ان کی قمیص پتلون سے باہر نکل آئیں ٹائیاں لٹکنے لگیں بال بکھر گئے۔

"گورنر۔" مائیکل نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔ "مائیکروفون اٹھاؤ، فریڈ سے کہو اس رات کا سارا واقعہ پھر سنا دے۔" انہوں نے خونخوار جورڈن کو تھامنے میں ساری طاقت صرف کر دی پھر گورنر نے مائیکروفون اٹھایا۔

"فریڈ جو کچھ تم نے ابھی بتایا ہے جورڈن کے سامنے دہرا دو، اس کے بعد ہم تمہیں کوئی تکلیف نہیں دیں گے۔ ہم تم سے اس تکلیف کے لیے معافی مانگتے ہیں، خدا بھی ہمارے گناہ کو معاف کرے۔" میں نے پستول جیب میں ڈالا اور جورڈن کے بالکل پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا تا کہ وہ بھاگنے یا خود کو چھڑانے کی کوشش کرے تو میں برنارڈ اور مائیکل کی مدد کر سکوں۔

"گورنر جورڈن کو کلینک قائم کرنے کے لیے پیسے کی ضرورت تھی وہ اور البرٹ ویت نام میں......!"

میرا خیال ہے صرف ایک لمحے کے لیے غافل ہو گیا تھا اور شاید ہم سب کی کیفیت ایک جیسی تھی کہ ہم فریڈ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کی طرف زیادہ متوجہ تھے اچانک جورڈن نے ایک جست لگائی اور ہماری گرفت سے نکل گیا۔ میں دروازے کی طرف بھاگا، اچانک میں نے ایک چھناکا سنا دو تین شعلے سے لپکے میں نے پلٹ کر دیکھا جورڈن اور گورنر گتھم گتھا تھے اور مرتبان فرش پر گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ تاریں اور ٹیوبیں الگ ہو گئی تھیں۔ فریڈ کا سر فرش پر پڑا تھا خون اور پیرافین بہہ رہے تھے پھر گورنر کا ایک مکہ جورڈن کے جبڑے پر پڑا اور وہ مشین پر جا گرا جس کے روشن نقطے اور لکیریں درہم برہم ہو گئی تھیں۔ فریڈ کے گرنے سے ڈائل اور اسکرین ٹوٹ گئے۔ آسلی اسکوپ کے پھٹنے سے ایک دھماکا ہوا پھر برنارڈ اور مائیکل جورڈن پر جا پڑے مشین الٹ گئی۔ گورنر نے میری طرف دیکھا۔ "مشین کو آف

کرو۔" وہ چلایا۔ "نہیں کرنٹ لگ جائے گا۔" میں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ "مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا پھر میری نگاہ دیوار کے کونے میں دروازے کے ساتھ سوئچ بورڈ پر گئی سوچے سمجھے بغیر میں نے لیور کھینچ لیا سارا ہال تاریک ہو گیا۔

"یو فول۔" گورنر نے چلا کر کہا۔ "یہ تم نے کیا کیا وہ دروازے سے نکل جائے گا۔"

اسی وقت جورڈن دوڑتا ہوا مجھ سے ٹکرایا میں اس سے لپٹ گیا۔ ہم دونوں فرش پر گرے وہ پاگل ہو رہا تھا اس نے مجھے کسی جگہ سے کاٹ لیا، مجھے خدشہ تھا وہ باہر نکل جائے تب بھی نہیں بھاگ سکتا کاریڈور کے آخر میں لوہے کی جالی کا دروازہ مقفل تھا اور دو سارجنٹ مسلح پہرے پر کھڑے تھے مگر اس ہال کے اندر ہونے والے ڈرامے کے آخری سین کو بھی سب سے پوشیدہ رکھنا تھا۔ میں نے اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کر اندھیرے میں دو مرتبہ فرش سے ٹکرایا۔ اتنی دیر میں گورنر نے لائٹر جلایا اور مین سوئچ آن کر دیا۔ ڈاکٹر برنارڈ نے فوراً ایک الماری سے سرنج اور شیشی نکالی میں اور مائیکل جورڈن پر سوار رہے۔ اس کی چیخ و پکار اور وحشیانہ جدوجہد کے باوجود ڈاکٹر برنارڈ نے سوئی اس کے بازو میں داخل کر دی چند لمحوں بعد وہ ساکت ہو گیا۔ ہم نے ایک طویل سانس لیا اور ایک دوسرے کی خستہ حالت کو دیکھا۔

سرکاری اعلان کے مطابق فریڈ کی سزائے موت جو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی اگلے دن دے دی گئی مگر لاش ورثا کے حوالے نہیں کی گئی فریڈ کی آخری رسوم میں جو پانچ آدمی شریک ہوئے وہ مائیکل ڈاکٹر برنارڈ جیلر میں اور گورنر تھے پھولوں کی چادر چڑھانے کے بعد ہم بہت دیر تک سرنگوں اور شرمسار کھڑے رہے وہ آواز جو ہمیں دن رات پکارتی رہی تھی بلاتی رہی تھی بالآخر خاموش ہو گئی تھی دو دن تک ہم نے اس آواز کو ایک کمرے میں قید رکھا تھا تا کہ وہ دنیا کے کانوں تک نہ پہنچ سکے چنانچہ کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ فریڈ جو پہلی بار بجلی کے ایک جھٹکے سے چند سیکنڈ میں ہلاک ہو گیا تھا دوسری بار کتنے عذاب سے گزر کر اڑتالیس گھنٹے میں مرا۔ اس کی بہن کو بھی نہیں جس کی خاطر اس نے دو بار موت کا یہ عذاب جھیلا تھا کیونکہ اخبارات میں جو خبر شائع ہوئی وہ بالکل مختلف تھی اس میں کہا گیا تھا کہ ملزم فریڈ نے جس پر تین افراد کے قتل کا الزام تھا آخری وقت میں گورنر، ڈاکٹر برنارڈ ایک پرائیویٹ سراغ رساں اور ڈسٹرکٹ اٹارنی کے سامنے قتل کے اصل اسباب بتاتے ہوئے اس ملزم کی نشاندہی کر دی تھی جس نے مقتول البرٹ ڈیوڈسن کو بلیک میل کر کے ایک لاکھ ڈالر حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیلیفورنیا کا یہ ڈاکٹر فریڈ کا بہنوئی تھا اس نے یہ اقبال جرم گورنر کے سامنے ایک اسپتال میں کیا۔ ڈاکٹر جورڈن کو اس ذہنی صدمے نے پاگل کر دیا جو اسے سٹی سینٹرل اسپتال کے متعفن ہولناک آپریشن تھیٹر میں آدھی رات کے وقت برداشت کرنا پڑا۔ عین اس وقت جب وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اسے ایک لاکھ ڈالر کی ملکیت حاصل ہو چکی اور اس کے بلیک میل کے جرم کا واحد گواہ افشائے راز کے بغیر دنیا سے رخصت ہو چکا فریڈ کا سر وہ بات کہنے کے لیے دوبارہ زندہ ہو گیا جو اس کی زبان سے مقدمے کے دوران نہ نکلی تھی ایک ماہ تک ذہنی امراض کے اسپتال میں زیر علاج رکھنے کے بعد ماہرین نے یہ رپورٹ پیش کر دی کہ فوری طور پر اس کے ذہنی توازن کی بحالی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں چنانچہ گورنر کی درخواست پر بند کمرے میں تحقیقاتی عدالت کے سامنے اس مقدمے کی سماعت دوبارہ شروع ہوئی کیونکہ خصوصی صدارتی حکم کے ذریعے اس کی کارروائی کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی تھی پریس یا پبلک کا کوئی نمائندہ وہاں موجود نہ تھا۔

پہلے گورنر کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ اس نے کہا "رات کے دس بجے کے قریب ڈسٹرکٹ اٹارنی ڈینس مائیکل اور پرائیویٹ سراغ رساں الفریڈ نے مجھ سے پریس کلب میں رابطہ قائم کیا میں وہاں ڈنر میں شریک تھا انہوں نے کہا ایک مجرم جسے میرے حکم سے سزائے موت دی جا چکی ہے اب اقبال جرم کرنا چاہتا ہے۔ میں اسی وقت سٹی سینٹرل اسپتال پہنچا جہاں پولیس کمشنر کے حکم سے سخت حفاظتی اقدامات کیے گئے تھے ملزم نے جو بیان میرے سامنے دیا وہ ٹیپ کر لیا گیا تھا مگر وہ اس وقت زندہ نہیں تھا۔" مائیکل، ڈاکٹر برنارڈ اور میں، ہم تینوں نے جو بڑے اطمینان سے یہ بیان سن رہے تھے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گورنر نے اسپتال پہنچنے کے بعد کے واقعات لفظ بہ لفظ بیان کر دیے بیان کے آخر میں گورنر نے وہ صدارتی حکم پڑھ کر سنایا جس کے مطابق اس مقدمے سے متعلق تمام مواد، دستاویزات گواہوں کے بیان ملکی امور کی راز داری کے قانون کے تحت "سرکاری راز" قرار دے دیے گئے تھے اور اس سے متعلق کوئی بیان دینا متعلقہ قانون کے تحت افشائے راز کے مترادف تھا جس کی سزا تھی۔

جیلر نے اپنے بیان میں کہا کہ ملزم فریڈ کو سزائے موت

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

دینے کے بعد لاش وارثوں کے حوالے نہیں کی گئی تھی اور موت کے دو دن بعد گورنر نے اسے طلب کر کے کہا تھا کہ ملزم کی موت کے بارے میں جو سرکاری اعلان جاری ہوگا وہ اس کی تردید نہیں کرے گا۔ اسی شام وہ ملزم کی تدفین میں شریک ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس وقت ملزم کی لاش جیل سے لے جائی گئی جیل کا ڈاکٹر اس کی موت کے سرٹیفکیٹ پر دستخط کر چکا تھا مجھے یہ نہیں معلوم کہ اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔"

جس وقت جیلر کا بیان جاری تھا گورنر نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔

"آئی ایم سوری الفریڈ میں حلف اٹھا کر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا اور میں یہ بات صدر سے بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا چنانچہ میں نے ساری حقیقت سے مطلع کر کے ان سے یہ صدارتی حکم حاصل کر لیا تھا۔"

"میرا خیال ہے آپ نے ہم سب کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

گورنر کے بیان کے بعد میرے اور مائیکل کے کہنے کے لیے کچھ نہ رہا تھا ہم نے محض گورنر کے بیان کی تصدیق کی ڈاکٹر برنارڈ نے ذرا تفصیل سے اس آپریشن پر روشنی ڈالی سب سے آخر میں فریڈ کا ٹیپ کیا ہوا بیان شروع ہوا۔

"البرٹ ڈیوڈسن اور ڈاکٹر جورڈن نے کوریا کی جنگ میں کچھ وقت ایک ساتھ گزارا تھا البرٹ نے جو اس وقت فوج میں کیپٹن تھا ایک کوریائی لڑکی کی آبروریزی کی اور افشائے راز کے خوف سے اسے گولی مار دی۔ لڑکی شدید زخمی ہوئی اور اس کے والدین جانکنی کے عالم میں اسے ڈاکٹر جورڈن کے پاس لائے جو ریڈ کراس کے لیے خدمات انجام دے رہا تھا جورڈن لڑکی کو نہ بچا سکا لیکن اس نے لڑکی کا اور اس کے والدین کا نام لکھ لیا۔ ریڈ کراس اسپتال کے ریکارڈ میں بھی یہ بات درج کی گئی کہ ایک امریکی فوجی افسر نے آبروریزی کے بعد ایک کوریائی لڑکی کو قتل کر دیا۔ اس فوجی افسر کا نام صرف جورڈن کو معلوم تھا یا اس لڑکی کے والدین کو جن کے گھر میں جائے واردات پر البرٹ اپنا پرس اور شناختی کارڈ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا مگر اس وقت جورڈن صرف ایک امریکی تھا جس نے دوسرے امریکی کو رسوائی سے بچانے کے لیے لڑکی کے والدین کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا کہ وہ اس فوجی افسر کا نام نہ لیں ورنہ مصیبت میں پھنس جائیں گے اور ممکن ہے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ ایک ماہ بعد جورڈن نے انہیں بلا کر بتایا کہ وہ نوجوان افسر مارا گیا ہے بات ختم ہو گئی۔

امریکہ واپس آجانے کے بعد البرٹ نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی اور سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا جورڈن نے مزید تین سال ریڈ کراس کے لیے خدمات انجام دیں اور پھر وطن واپس آ کر میری بہن الزبتھ سے شادی کر لی۔ اس وقت تک البرٹ خاصی سیاسی شہرت حاصل کر چکا تھا دولت مند ہو گیا تھا اور امریکہ کا صدر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جورڈن کو پریکٹس شروع کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی اس نے البرٹ کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی اور دو لاکھ ڈالر کا مطالبہ کیا۔ ریڈ کراس میں اس کے پاس اس جرم کا ریکارڈ تھا لڑکی کے والدین زندہ تھے اور ان کے پاس البرٹ کا پرس اور شناختی کارڈ بھی ضرور ہوگا۔ جورڈن کا ایک بیان البرٹ کے بے داغ سیاسی اور ذاتی کردار کو تباہ کر سکتا تھا اور اس کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی تھی مگر البرٹ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جورڈن کا وجود اس کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے اور دو لاکھ ڈالر ادا کر دینے سے خطرہ ٹل تو جائے گا مگر باقی رہے گا اس نے جورڈن کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور ایک لاکھ ڈالر کی پیش کش کی جسے جورڈن نے قبول کر لیا۔

وقوعہ کی شب جورڈن نے مجھے اپنے ہمراہ لے لیا اور مجھے ایک بھرا ہوا پستول دے کر تاکید کی کہ میں حتی الامکان اس کا استعمال نہ کروں۔ البرٹ نے اپنے بیوی بچوں کو عمداً کینیڈا بھیج دیا تھا اور نوکروں کو چھٹی دے دی تھی مگر مجھے جورڈن کے ساتھ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی شاید اسی وقت اس نے ہم دونوں کو ختم کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا اس نے سب سے پہلے اپنا پرس اور شناختی کارڈ طلب کیا مگر جورڈن نے کہا کہ وہ پہلے ایک لاکھ ڈالر لا کر میرے حوالے کر دے مجبوراً البرٹ نے سیف سے رقم نکالی جو غالباً اس نے ہنگامی ضرورت یا کسی اور مقصد کے تحت گھر میں رکھ چھوڑی تھی مگر میں نے اسے سیف سے پستول نکالتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔ جورڈن نے مجھ سے کہا کہ میں رقم گن کر بریف کیس میں رکھ لوں۔

"البرٹ۔" جورڈن نے کہا۔

"شناختی کارڈ اور پرس میرے پاس نہیں ہیں اس کوریائی لڑکی کے والدین کے پاس ہیں یا نہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔"

البرٹ حیران رہ گیا۔ "پھر تم کس بات کے ایک لاکھ ڈالر مانگ رہے ہو؟"

"صرف اپنی زبان بند رکھنے کے ریڈ کراس کے ریکارڈ کا اس لڑکی کے والدین کو علم نہیں ہے۔" جورڈن نے کہا۔ "وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ تم مر چکے ہو میں نے انہیں بتایا تھا۔"

"جورڈن بلیک میلنگ میں انسان کی زبان بند کرنے کے لیے ایک لاکھ ڈالر کافی نہیں ہوتے اس کی زبان کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔" البرٹ نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی میں پیشہ ور بلیک میلر نہیں ہوں ڈاکٹر ہوں۔" جورڈن نے کہا۔ "تم میری زبان پر اعتماد کر سکتے ہو۔"

"سوری ڈاکٹر۔" البرٹ نے کہا۔ "یہ اعتماد کا سودا نہیں ہے رقم واپس کرو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے پستول نکال لیا۔ جورڈن کچھ دیر اسے حیرت سے دیکھتا رہا "اوکے۔" اس نے میرے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے کہا "اپنی رقم لے لو مگر بہتر ہے ہمیں جانے دو کیونکہ ہم الزبتھ کو سب کچھ بتا کر آئے تھے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اگر تم نے ہمیں قتل کر دیا تو صبح تک بہر صورت پکڑے جاؤ گے اور اس کے ساتھ ہی تمہارا مستقبل ختم ہو جائے گا اگر تم نے ہمیں جانے دیا تو یہ ایک لاکھ ڈالر بچا کر بھی اپنے سیاسی مستقبل کو نہ بچا سکو گے تمہارے لیے سب سے محفوظ راستہ ان ایک لاکھ ڈالر سے دستبردار ہو کر میری زبان پر اعتماد کرنے کا ہے۔"

البرٹ چند سیکنڈ تک پستول ہاتھ میں تھامے سوچتا رہا، اچانک جورڈن نے بریف کیس اس کے ہاتھ پر پھینک دیا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا پڑا۔ وہ اسے اٹھانے لپکا اور جورڈن نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مار مار کر ایک دوسرے کا برا حال کر دیا۔ ان کے چہرے سوج گئے اور آنکھوں کے گرد نیل پڑ گئے انہوں نے سارا فرنیچر الٹ دیا کمرے میں رکھی ہوئی شیشے کی چیزوں کو چکنا چور کر دیا مگر میں نے ہدایات کے مطابق مداخلت نہیں کی۔ آخر میں جورڈن نے سنگ مرمر کا وینس کا مجسمہ اس کے سر پر مارا جس سے وہ گر پڑا میرا بہنوئی سمجھا کہ وہ مر گیا مگر میں نے اسے گرتے ہی فرش پر پڑے ہوئے پستول کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھ لیا اور اپنے پستول سے دو فائر کر کے اسے مار ڈالا۔ اگر میں ایک سیکنڈ کی تاخیر کرتا تو وہ جورڈن کو قتل کر دیتا جورڈن اسی وقت بریف کیس لے کر نکل گیا میں صرف اس لیے

موجودگی کے نشان مٹا دوں اور کوئی سراغ نہ چھوڑوں مگر اتنی دیر میں پولیس آ گئی کسی ارادے کے بغیر میں نے انہیں بھی مار دیا۔ مگر اسی وقت ان کا تیسرا ساتھی ریوالور لیے نمودار ہو گیا۔ اس وقت میرا پستول خالی تھا میں پکڑا گیا مگر مجھے خوشی تھی کہ جورڈن بچ کر نکل گیا۔"

شاید آپ اس سناٹے کا تصور نہیں کر سکتے جو اس وقت عدالت کے اس مختصر سے کمرے پر چھایا ہوا تھا بیان ختم ہو گیا مگر خالی ٹیپ چلنے کی سرسراہٹ باقی رہی، بالآخر ڈاکٹر برنارڈ نے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا ہمارا خیال تھا اس کے ساتھ ہی کارروائی بھی ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا، خصوصی عدالت نے ایک مردہ انسان کے بیان کو قانونی گواہی تسلیم نہیں کیا۔ صدر کے اس حکم کو تسلیم نہیں کیا جس کے ذریعے مقدمے کی کارروائی کی اشاعت پر پابندی لگائی گئی تھی اور مقدمہ فیڈرل کورٹ کو بھیج دیا فیڈرل کورٹ نے صدر کے حکم کو غیر آئینی سمجھتے ہوئے کالعدم قرار دیا اور مقدمہ کی تمام روداد پریس کو اشاعت کے لیے دے دی گئی، بے شک ایک سال بعد خود جورڈن نے اقبال جرم کر لیا اور فریڈ کے بیان کی تصدیق کر دی جس کے نتیجے میں اسے خاصی لمبی مدت کی سزا ہو گئی لیکن اس کے اور بھی بہت سے نتائج نکلے ہیں مائیکل اور ڈاکٹر برنارڈ بھی اندر ہو گئے۔ گورنر کو حبس بے جا میں رکھنے کے جرم میں، جورڈن کو غیر قانونی طریقے پر اغوا کرنے اور حبس بے جا میں رکھنے کے جرم میں اور اقبال جرم کرانے کے غیر قانونی ذرائع استعمال کرنے کے جرم میں وغیرہ وغیرہ گورنر کا سیاسی مستقبل بھی اس ڈرامے میں ملوث ہونے کی وجہ سے تباہ ہو گیا جسے پریس اور پبلک نے غیر انسانی قرار دیا۔ صدر امریکا کو روسی سرجن اور حکومت سے رسمی طور پر معافی مانگنی پڑی کہ امریکی ڈاکٹر اور پولیس نے ایک اخلاقی معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔ مقدمہ کی اشاعت کو روکنے کے حکم پر دستخط کرنے کے باعث ان کے آئندہ صدارتی انتخابات میں جیتنے کے امکانات بھی معدوم ہو گئے۔ فریڈ نے میرا مطلب ہے اس کے سر نے ٹھیک کہا تھا۔ "میرے ساتھ تم سب بھی تباہ ہو جاؤ گے۔" اس نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔

ڈاکوراج

شبیر سومرو

شبیر سومرو بنیادی طور پر محقق ہیں جنہوں نے سندھی سماج کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا جیسے عام ادیبوں اور تاریخ نویسوں نے ہمیشہ نظر انداز کیا۔ انہوں نے ان طبقات پر باریک بینی سے لکھا جنہیں عوام اور خواص نے گھٹیا اور نجانے کیا کیا کہہ کر دھتکارا۔ انہی عناصر میں سندھ کی ایسی شخصیات اور ہیروز بھی ہیں جنہیں انگریز سامراج اور ان کے پروردہ جاگیرداروں، وڈیروں، پیروں نے ڈاکو قرار دیا۔ پنجاب ہو یا سندھ یا پشتون بیلٹ یہاں کے ہر حریت پسند کو خواص تو خواص عوام نے بھی ڈاکو قرار دیا اور آج بھی انہیں ڈاکو ہی کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ چاہیے وہ پنجاب کا ہیرو عبداللہ بھی (دلا بھٹی) ہو، احمد کھرل ہو یا ہندوستان کا سلطانہ ڈاکو ہو۔ انہیں آج بھی حملہ آور مغلوں، انگریزوں کی آنکھ سے دیکھا اور پڑھا جاتا ہے۔

ڈاکو راج سندھ کے ایسے ہی سپوتوں کا تذکرہ ہے اس تذکرے میں آپ کو رنگینی یا ادب کی چاسنی تو نظر نہیں ملے گی لیکن اس تحریر میں آپ کے دل میں راکھ کی ایک لہر سی ضرور اٹھے گی۔

''اے لڑکے! اِدھر آ...... کون ہے تُو؟''

میں سائیکل پر سوار سیتا روڈ قصبے سے کچے کے گوٹھ سِیتا ولیج دوستوں سے ملنے جا رہا تھا۔ رستہ کچا، اوبڑ کھابڑ اور گڈھوں والا تھا، اس لیے وہ چھوڑ کر میں نہر کے پُشتے پر بنا ''وی آئی پی'' رستہ استعمال کر رہا تھا جو علاقے کے سیّد زمیندار نے اپنی جیپ کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور بیلدار دن میں تین بار اس تنگ مگر اچھے رستے کو چھڑکاؤ کر کے، اس کی مٹی جماتے رہتے تھے۔ میری جو شامت آئی تو اس رستے کو خالی دیکھ کر اس پر سائیکل دوڑانے لگا تھا کہ سامنے سے دو جیپیں آنکلیں۔ قریب آنے پر بھی میں رستے سے نہ اُترا کیونکہ نیچے اُترنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ایک جانب کانٹے دار جھاڑیوں کی باڑھ تھی اور دوسری طرف نہر بہہ رہی تھی۔ اس لیے جیپوں کو راستہ دینے کے لیے میں سائیکل سے اُتر گیا اور ممکنہ حد تک کنارے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ پہلی جیپ جب میرے برابر آ کر رُکی اور میں نے اس میں بیٹھے لوگوں پر نظر ڈالی تو جیسے سانس رُکنے کو آ گئی۔ دونوں جیپوں میں مسلح ڈاکو سوار تھے، جن کی سربراہی اس زمانے کا نامی گرامی ڈاکو پرُو چانڈیو کر رہا تھا۔

پرُو چانڈیو اس زمانے کا وہ کردار تھا، جو اپنی دلیرانہ وارداتوں کی وجہ سے ملک بھر میں جانا پہچانا کردار بن چکا تھا۔ میں نے جو اسے ٹولے سمیت دیکھا تو میرے حواس جواب دے گئے اور سہم کر وہیں کھڑا رہا۔ ایک ڈاکو جیپ سے اُترا اور مجھے بازو سے پکڑ کر ڈرانے والے لہجے میں پوچھنے لگا۔

''اے لڑکے! کون ہے تو؟...... کس کا بیٹا ہے؟ ادھر آ، پُریل خان (پرُو) کے پاس چل۔''

میں اس کے ساتھ جیپ کی پینجر سیٹ کی طرف آ گیا، جس پر پرُو چانڈیو بیٹھا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر ایک کلاشنکوف رکھی تھی، جس کا لٹکانے والا بیلٹ موتیوں والی کڑھائی کا تھا۔ میں جب اس کے پاس کھڑا ہوا تو اس نے وہی سوال کیا کہ کون ہو؟ میں نے اپنا نام، بابا کا نام اور ذات بتائی۔ پھر پوچھا کہکھاں جا رہے ہو؟ تو بتایا کہ سِیتا ولیج میں فلاں ذات والے دوست ہیں، ان کے پاس جا رہا ہوں۔ اس پر اس نے کہا کہ پیچھے بٹھاؤ اسے۔

اس کے حکم کی دیر تھی کہ میرے ساتھ کھڑے ڈاکو نے مجھے کندھے پر دباؤ ڈال کر ڈانٹا کہ جیپ میں چڑھ جاؤ۔ میں بغیر کسی مزاحمت کے چڑھ گیا۔ میری سائیکل وہیں سڑک پر کھڑی تھی۔ جیپ چلنے لگی اور وہ میری منزل کے مخالف سمت جا رہی تھی۔ تھوڑا آگے چل کر ایک دَم میرے ذہن میں روشنی کا جھما کا سا ہوا اور ایک واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے پرُو کو مخاطب کر کے کہا۔ ''ادھا پرِیَل! میں فلانے پولیس والے کا چھوٹا بھائی ہوں جو سِیتا تھانے پر ہوتا تھا۔''

''ہاں وہ پولیس والا موٹا سا؟'' پرُو نے حیرت سے پوچھا۔

''جی، اداوہی...... میں اس کا سگا بھائی ہوں۔''

''اڑے گوہر! گاڑی روکو...... یار! کیا ظلم کیا ہے ہم نے؟...... روکو گاڑی۔''

جیسے ہی گاڑی رُکی، وہ چھلانگ مار کر نیچے اُترا اور مجھے کہنے لگا۔

''یار! نیچے آ جا۔''

میں ڈر گیا کہ اب آخری وقت آ گیا شاید، کیونکہ وہ پولیس والوں کا سخت دُشمن بنا ہوا تھا۔ میں جیسے نیچے اُترا، اس نے میرے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھے اور کہنے لگا۔

''بابلا! ہم سے بہت بڑی زیادتی ہو گئی ہے کیونکہ ہم تمہیں جانتے نہیں تھے۔ تمہارا بھائی مرد ہے اور نیک انسان ہے۔ اس کا احسان تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ تو ہمیں بخش دینا اور بھائی سے بھی کہنا کہ مجھے معاف کر دے کہ ہم نے انجانے میں یہ غلطی کر دی۔''

اس کے بعد اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے کئی نوٹ نکال کر میری جیب میں ٹھونس دیئے کہ یہ تیری خرچی ہے۔ اور ایک بار پھر معافی تلافی کے الفاظ کہہ کر مجھے اجازت دے دی کہ تم اپنی راہ لو۔ میں کافی دُور تک مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہا کہ جیپیں واپس تو نہیں آ رہیں؟ میری سائیکل

مرا جائے۔

میں نے پرُو چانڈیو جیسے بدنام ڈاکو کو اپنے پولیس اہلکار بھائی کا حوالہ اس لیے دیا تھا کہ میں ان کی واقفیت کا گواہ تھا۔ جب پرُو چانڈیو معمولی چرواہا تھا اور اپنے ایک جرم کی پاداش میں گرفتار ہو کر سِیتا روڈ پولیس چوکی آیا تھا، اس وقت جو انچارج تھا، اس نے پرُو کو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے جب پرُو کو تین دن تک کھانا نہ دیا تو اس کی حالت بہت ہی قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اس پر میرے بڑے بھائی نے اپنے افسر کی مخالفت مول لے کر پرُو کے لیے ہوٹل سے کھانا منگوایا تھا اور اسے کھلایا تھا۔ اس پر بھیا اور پولیس افسر کے مابین تکرار بھی ہوئی تھی مگر بھیا کا کہنا تھا کہ آخر یہ چرواہا جسے چوری کے الزام میں وڈیرے نے گرفتار کروایا ہے، تو یہ انسان ہے، اس پر اتنا ظلم کیوں روا رکھا جائے کہ تین دن سے بھوکا مر رہا ہے۔ اس کے بعد پرُو کو رہائی تک بھیا ہوٹل سے دونوں وقت کھانا منگوا کر کھلاتے رہے تھے۔

میں نے اسی لیے پرُو چانڈیو کے چُنگل میں پھنس کر بھیا کا حوالہ دیا تھا کہ شاید پرُو کو وہ یاد ہو کہ ابتدائی دنوں میں ایک سپاہی نے تھانے میں اس کے ساتھ نیکی کی تھی!

اور اسے سب یاد تھا، جس کے باعث اس نے ایک چھوٹے لڑکے سے بھی معافی مانگنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی اور زیادتی کی تلافی کے طور پر جیب خرچ بھی دے دیا۔ گویا یہ ایک ڈاکو کی جانب سے مغوی کو تاوان کی ادائیگی تھی!!

یہ ایک بدنام ڈاکو کی اخلاقیات کی مثال تھی، جس کے باعث وہ سندھ میں دیومالائی کردار کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اسے بجا طور پر رابن ہڈ قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس نے کبھی اپنے علاقے میں غریبوں، شریفوں کو تنگ نہیں کیا۔ عورتوں کی عزت کے ساتھ کبھی کھلواڑ نہیں کی۔ اس کی موت پر سیکڑوں لوگ یہ کہتے سُنے گئے تھے کہ پرُو چانڈیو کی جانب سے انہیں گھر کا راشن یا نقد امداد ملا کرتی تھی۔

سندھ میں رسم ہے کہ جب کوئی مرد عزیز یا جاننے والا فوت ہو جائے تو جنازے میں شرکت کے لیے جانے والے لوگ اجرک لے کر جاتے ہیں جو میت پر ڈال دی جاتی ہے۔ تدفین کے وقت یہ اجرک اُتار کر نمازِ جنازہ کو لوٹا دیے جاتے ہیں۔ دو یا تین اجرک تو گورکن کو بھی ملتے ہیں۔ جب پرُو چانڈیو جیسے ڈاکو کی موت کی خبر پھیلی تو دو تین اضلاع سے ہزاروں لوگ اس کے جنازے میں شریک ہونے اور اس کا آخری دیدار کرنے سِیتا ویلج جیسے چھوٹے گاؤں میں آ کر جمع ہوئے تھے۔ وہ سب اپنے ساتھ ایک ایک اجرک بھی لیتے آئے تھے۔ اس طرح ہر چند منٹ بعد پرُو کی میت پر سے اجرک اُتار کر سائیڈ پر رکھے جاتے رہے کیونکہ بار بار ڈھیر لگ جاتا تھا۔ تدفین کے بعد جب اجرک گنے گئے تو ان کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی۔ یہ اس ڈاکو کی عوامی مقبولیت کا عالم تھا!

سندھ میں ڈاکو راج کا پس منظر

موہن جودڑو کے زمانے یعنی دو ہزار قبل مسیح میں سندھ میں کولھی اور بھیل، باگڑی جاتیاں اکثریت میں تھیں۔ اس دور میں وسط ایشیا کے آریہ لوگ سندھ پر حملہ آور ہوئے تو یہ سب قبائل مل کر مقابلے پر اُتر آئے، مگر آریہ حملہ آوروں کے پاس اس زمانے کے جدید ہتھیار تھے اور وہ سندھ کے امن پسند لوگوں کے مقابلے میں ظالم اور قاتل تھے۔ اس جنگ میں تقریباً 50 ہزار سندھی مارے گئے اور سندھ دیس پر آریہ کا قبضہ ہو گیا۔ بچ جانے والے سندھی جنگلوں بیابانوں کو نکل گئے اور وہاں سے گوریلا جنگ لڑنے لگے۔ وہ اچانک آریہ پر حملہ کرتے اور جانی نقصان کر کے، ان کے مویشی ہنکا کر جنگل میں غائب ہو جاتے۔ آریہ حملہ آوروں نے ان کولھیوں، بھیلوں، باگڑیوں یعنی دھرتی کے اصل مالکان کو ”ڈاکو“ قرار دے دیا جبکہ ڈاکو وہ خود تھے۔

326 یا 325 قبل مسیح میں سکندر مقدونی سندھ کو فتح کرنے کے لیے حملہ آور ہوا اور اس نے 80 ہزار سندھی مار دیے اور ہزاروں کو غلام بنا کر فروخت کے لیے دوسرے دیسوں کو بھجوا دیا۔ جب سکندر مقدونی Alexander the Great فتح کے نشے میں چُور مکران اور بھنبھور سے واپس روانہ ہو رہا تھا تو اس علاقے میں بحری قزاقوں نے اُن پر حملہ کر کے سخت جانی نقصان پہنچایا۔ ان قزاقوں کو بھی سکندر مقدونی کو عظیم فاتح قرار دینے والے مؤرخوں نے ”سندھی ڈاکو“ قرار دے دیا۔

محمد بن قاسم نے 712 ہجری میں سندھ پر حملہ کیا اور راجہ ڈاہر سے مقابلہ کر کے اسے مار دیا اور سندھ پر قبضہ کر لیا۔ یہ عرب حکومت تین صدیوں تک سندھ پر برقرار رہی۔ دیبل فتح ہو جانے کے بعد سندھ کے لوگوں نے محمد بن قاسم سے درخواست کی کہ انہیں جان کی امان دی جائے کیونکہ وہ ان قزاقوں کے ساتھی یا عزیز نہیں، جن کی چیرہ دستیوں کی داستانیں سُن کر وہ عرب سے سندھ تک آئے ہیں، مگر عرب فاتحین نے درخواست پر غور نہیں کیا اور تین روز تک سندھ میں قتلِ عام جاری رکھا۔ ساتھ ہی عرب لشکر نے دیبل اور دیگر علاقوں سے سات سو سے زائد سندھی عورتیں یرغمال بنا کر اپنے ملک کو بھجوا دیں۔ جن میں راجہ ڈاہر کی دو بیٹیاں بھی شامل تھیں۔

عربوں کی اس جانب آ کر سندھ پر چڑھائی کا جواز بھی یہ تھا کہ سندھی مہاساگر میں ان کے بحری بیڑے قزاقوں نے لوٹ لیے تھے اور ان قزاقوں کی سرپرستی راجہ ڈاہر کرتے تھے۔ ان بحری قزاقوں کا تعلق نکامڑہ قبیلے سے تھا جو سندھ کے راجاؤں کی بھی نہیں سنتا تھا۔ عرب لشکر ان بحری قزاقوں یا بقول ان کے سندھی ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے سندھ پر حملہ آور ہوا تھا اور پورا سندھ فتح کر کے یہیں بیٹھ گیا۔

اسی عرب دور میں سندھ کے جت اور میر قبائل ہزاروں کی تعداد میں گروہ بنا کر عراق اور خراسان جا کر ڈاکے مارتے تھے۔ ان سے کارروانوں کی شاہراہیں تک محفوظ نہ تھیں۔ ایک حوالے کے مطابق سندھ سے تعلق رکھنے والے ان جت اور میر ڈاکوؤں کی تعداد 30 ہزار تھی۔ یہ معتصم باللہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ سندھ پر اس کے نمائندے عمران کی حکومت تھی۔ اسے بھی ان سرکش قبائل نے بہت زِچ کیا تھا۔ بالآخر خلیفہ کے حکم پر عمران نے سندھ کو ان ڈاکوؤں سے پاک کرنے کے لیے 30 ہزار کے لگ بھگ لوگ قتل کرا دیے تھے، جن میں سے اکثر میر قبیلے کے لوگ تھے۔

محمد تغلق کے دور میں سندھ شدید قحط سالی کا شکار رہا، جس کے باعث مقامی باشندوں نے بغاوت کر کے لوٹ مار کا راستہ اختیار کیا اور اس طرح پیٹ پالنے لگے۔ وہ ڈاکہ ڈالتے تھے اور لوٹ مار کرنے کے علاوہ لوگوں کو یرغمال بنا کر تاوان بھی وصول کرتے تھے۔ یہ بھوکے سندھی لوگ بھی تاریخ میں ڈاکو کہلائے۔

سومرہ اور سما دور سندھ کی خوشحالی کے زمانے تھے۔ راجہ انصاف پرور اور رعایا کا خیال رکھنے والے تھے۔ اس عرصے کے دوران لوٹ مار کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہوئے اور سندھ میں کوئی ڈاکو نہ تھا۔ سما حکمرانوں کو گجرات سے خطرات لاحق رہتے تھے۔ اس کے پیشِ نظر انہوں نے جنوب مشرق سندھ کی سرحد پر بلوچوں کو آباد کیا تا کہ وہ ممکنہ حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔ ان بلوچوں نے زمانہ امن کے دوران مقامی آبادیوں میں لوٹ مار اور قتلِ عام شروع کر دیا تو سما حکمرانوں نے ان بلوچوں کو ڈاکو قرار دے کر ان کے خلاف سخت کارروائی کی۔ جب جلال الدین کو سلطان محمود بیگڑو نے احمد آباد کا کوتوال مقرر کیا تو اس نے طویل المدت کارروائی کر کے چار سو بلوچ لٹیروں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اس کے باوجود بچے کھچے بلوچ ان علاقوں میں ڈاکہ زنی کرتے رہے تھے۔

ارغون، ترخان اور مغلوں کے انتہائی خراب طرزِ حکمرانی کے باعث سندھ میں انارکی بڑھی اور مقامی لوگ باغی ہو گئے تھے۔ ان ادوار میں غیر ملکی حکمرانوں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کیے رکھا۔ ٹھٹھہ میں شاہ بیگ ارغون اور اس کے سرداروں، سپاہیوں نے لوگوں کا قتلِ عام کیا، بچوں کو نیزوں میں پرو کر ان کی ماؤں کو پیش کیا اور حاملہ عورتوں کے بچے کھینچ کر نکال لیے اور کنواری لڑکیوں حتیٰ کہ بچیوں تک کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ ان مظالم کے خلاف مقامی افراد نے ردِعمل کے طور پر جنگل کا رُخ کیا اور وہاں سے گوریلا جنگ شروع کر دی۔ وہ دن رات حملے کرتے اور بیرونی حملہ آوروں کو نقصان پہنچا کر، لوٹ مار کر کے پھر جنگلوں میں چلے جاتے۔ ان لوگوں کو ارغون، ترخان اور مغلیہ حملہ آوروں نے ڈاکو ڈکلیئر کر دیا اور فوجی کارروائی کر کے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس زمانے میں سندھ کے زیریں علاقوں میں ڈاکے عام زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔

سولہویں صدی کے وسط میں پرُتگالی سندھ کے ساحلی شہروں ٹھٹھہ وغیرہ پر حملہ آور ہوئے اور آٹھ ہزار لوگ مار دیے۔ انہوں نے اس حملے میں جو دولت لوٹی، اسے تاریخ کی سب سے بڑی ڈکیتی (The Great

(Robery) قرار دیا گیا تھا۔ مغل حکمرانوں نے سندھ کو اپنے صوبیداروں کے حوالے کیا تو انہوں نے مقامی لوگوں کے خلاف ڈاکوؤں، راہزنوں اور ظالم سپاہیوں کے ٹولے تیار کیے جو لوٹ مار کر کے مغل صوبیداروں اور نوابوں کے خزانے بھرتے اور خود بھی کھاتے تھے۔ وہ سندھ کے دیہات پر حملے کر کے لڑکیاں اُٹھا لے جاتے تھے۔ اس زمانے میں نہ رعایا محفوظ تھی اور نہ ہی تاجر ساہوکار اپنی سرگرمیاں کر سکتے تھے۔ ان ڈاکوؤں کے خلاف مقامی آبادی نے اپنے نوجوانوں کے گروہ تیار کر کے مقابلے شروع کیے تو مغلیہ حکمرانوں نے ان مقامی نوجوانوں کو سرکاری طور پر ڈاکو قرار دیا جبکہ اصل ڈاکوان کے وہ جرائم پیشہ سپاہی بنے ہوئے تھے جو آبادیوں میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرتے تھے۔ مرزا احمد بیگ سیوھن کے صوبیدار تھے اور انہوں نے اپنے نااہل بدصورت اور مجرم بھائی مرزا یوسف کو پوری جاگیر کا حکمران بنا کر تمام جرائم پیشہ سپاہی اس کی سرکردگی میں دے دیئے تھے جو آزادانہ ڈاکے ڈالتے پھرتے تھے۔ ان کے ردِّعمل میں جو سندھی، بلوچ کارروائیاں کر رہے تھے، ان کو ''ڈاکہ زنی'' قرار دیا جاتا تھا۔

اورنگزیب نے اپنے مغل تاجروں اور ان کے قافلوں کو محفوظ بنانے کے لیے سندھ میں کلمتی قبیلے کے لوگ بھرتی کر لیے تھے تاکہ وہ لاہور تا بھوڈے سر تک شاہراہِ تجارت کے ساتھ ساتھ مغل تاجروں کی حفاظت کریں۔ اس ذمہ داری کے عوض کلمتی قبائل کو کوہستان (کراچی)، کوٹری کے علاقوں میں نہ صرف جاگیریں عطا کی گئیں بلکہ سالانہ ساڑھے سات ہزار روپے بھی دیئے جاتے تھے۔ ان دنوں میں جنوب مشرقی سندھ میں کئی ایسے ''ڈاکو'' اُبھرے جو عوام میں ہیرو کے طور پر مقبول ہوئے۔ وہ بیرونی حملہ آور حکمرانوں کے خلاف تحریک چلا رہے تھے اور انہیں نقصان بھی پہنچا رہے تھے۔ آج بھی ان میں سے کئی حریت پسند سندھ کی تاریخ و ادب میں ہیرو کے طور پر جانے جاتے ہیں، جن میں لاکھو پھلانی، وکیورام، بھوج راج، بداماں پنرو، کاراپل سموں وغیرہ شامل تھے جو مغلوں کے تئیں ''ڈاکو'' تھے مگر سندھ میں انہیں آزادی کے سپاہی مانا جاتا تھا۔

سترہویں صدی کی ابتدا میں انگریز لوگ سیاحوں کے رُوپ میں سندھ کا سفر کرتے رہے تاکہ برطانوی راج کے لیے نقشے تیار کر سکیں اور ماحول کی جاسوسی کر کے برٹش حکومت کو آگاہ کیا جاسکے۔ ایسے سیاحوں میں سے نکولس وتھنگٹن احمد آباد سے ہندوستانی تاجروں کے ساتھ انہی جیسا بہروپ بھر کر آیا تو ٹھٹھ کے علاقے میں سندھیوں نے اسے لوٹ لیا اور اس کے ماتحت انگریزوں کو قتل کر دیا تھا۔ وتھنگٹن کو زبردستی تھر کے علاقے نگرپارکر ہانک دیا گیا۔ اس سفر میں بھی سندھ کے حریت پسندوں نے اس کے گھوڑے چھین لیے اور بالکل فارغ کر کے جان بخشی کی۔ سترہویں صدی کے وسط (1639ء) میں ہنری بورڈ نے آگرہ سے ٹھٹھ تک سفر کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ سیوھن سے پُرانا ہالا تک سمیا قبیلہ راہگیروں، تاجروں اور حکمرانوں کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے اور لوٹ مار کرتا ہے۔

میاں نور محمد کلہوڑا کے دورِ حکومت (1740ء) میں نادر شاہ نے سندھ پر حملہ کر کے اسے باجگزار بنایا اور میاں کے دو بیٹے بھی بطورِ یرغمال اپنے ساتھ لے گیا۔ نادر شاہ لوٹ مار میں جو دولت لے گیا تھا، اس کا تخمینہ ایک کروڑ روپے لگایا گیا تھا اور وہ سالانہ بیس لاکھ روپے کا خراج بھی مسلط کر گیا تھا۔ اس کے بعد میاں عطر کے دورِ حکمرانی میں جو کھیا قبیلے کے جوانوں نے تحریک حریت شروع کی تھی اور وہ بیرونی مداخلت کاروں کے خلاف کارروائیوں میں ڈاکہ زنی اور رہزنی بھی کرتے تھے۔ جب غلام شاہ کلہوڑہ اور ان کے بھائی کا تاج سندھ کے معاملے پر ٹکراؤ ہوا اور سندھ میں انارکی پھیلی تو کھوسو قبیلے نے ان کے پائے حکومت خدا آباد (دادو) اور اس کے آس پاس ڈاکے مارنا شروع کیے۔ بعد میں غلام شاہ نے برسرِ اقتدار آ کر ان کا قلع قمع کیا۔

سندھ کو بیرونی حملہ آور ہمیشہ سونے کی چڑیا سمجھ کر ہتھیانے آتے تھے۔ 1780ء میں افغان مدد خان پٹھان حملہ آور ہوا جو اسحاق زئی قبیلے سے تعلق رکھنے والا لٹیرا تھا۔ اس نے سندھ میں وہ قتلِ عام اور لوٹ مار کی کہ آج تک اس کی یاد میں سندھی میں محاورہ ''گھوڑا......ڑے گھوڑا!'' مروج ہے یعنی گھوڑے والے حملہ آور آرہے ہیں، ان سے جان بچاؤ، اس کے لیے رچرڈ برٹن نے لکھا ہے کہ وہ ظالم ترین اور بدترین ڈاکو تھا، جس نے سندھ کو تباہ و برباد کیا۔

ٹالپر دورِ حکومت میں عرب ڈاکو جو امی بلوچستان کی سون میانی بندرگاہ پر حملہ آور ہوتا تھا اور سندھ کے اندر تک گھس کر کارروائیاں کرتا تھا، اس نے آخری حملے میں اس بندرگاہ کو جلا کر راکھ کر دیا تھا۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں کچھ اور کاٹھیاواڑ کے قبیلے واگھا کے لوگ سندھ کے سمندر میں لوٹ مار یعنی قزاقی کا بازار گرم کیے رکھتے تھے۔ یہ قبیلہ 1812ء تک کراچی پر وقتاً فوقتاً حملہ آور ہوتا رہا۔ 1832ء میں اسی قبیلے نے کھوسہ قبیلے کے ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر تھر کے امیر شہر راہمکی بازار پر حملہ کر کے لوٹ مار کی۔ ٹالپر ان ڈاکوؤں پر قابو پانے میں ناکام رہے تھے۔ راہمکی بازار آج کل تھر کی بھارت سے ملنے والی سرحد کا آخری گاؤں ہے۔

اسی دور میں بلوچ قبیلے شمالی سندھ میں ڈاکہ زنی کرتے اور قافلوں پر حملہ آور ہوتے رہے۔ ان قبائل میں جلھرانی، ڈومکی، بگٹی، مری، بروہی اور مگسی شامل تھے جو انگریز راج کے خلاف بھی ایک صدی تک سرگرم رہے۔ ان بلوچوں نے انگریزوں کی راہیں کھوٹی کر کے کھوجک سرنگ تک کا علاقہ اپنی عملداری میں رکھا تھا۔

ای بی ایسٹوک نے اس زمانے کا آنکھوں دیکھا احوال لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس دور میں روزانہ ڈاکہ زنی، لوٹ مار، چوری اور قتل کی کئی وارداتیں ہوتی تھیں جن سے انگریز بوکھلائے پھرتے تھے۔ وہ ہر حال میں سندھی اور بلوچ قبائل کو دوست بنا کر ان کارروائیوں کو روکنا چاہتے تھے مگر تمام تر کوششیں ناکام ہوگئی تھیں۔

انگریزوں نے خود بھی سندھ پر قابض ہو کر ڈاکوؤں کا رُوپ دھار لیا تھا۔ انہوں نے حیدرآباد میں ٹالپر حکمرانوں کے گھروں پر حملے کر کے لوٹ مار کی، عورتوں کے زیورات اُتروا لیے۔ اس دور میں وہ دس لاکھ پاؤنڈ کے برابر دولت لوٹ لے گئے تھے۔ ان کے خلاف سندھ میں بغاوت کی جو آگ بھڑکی، اس میں حرتحریک (پیر پگارہ کے حُر) سرگرم ہوئی۔ حرتحریک میں شامل سندھی لوگ انگریزوں کے حق میں ڈاکو ثابت ہوتے رہے اور ان بیرونی مداخلت کاروں کے خلاف ہر طرح کی کارروائیاں کرتے رہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں تھرپارکر کے سوڈھے (ہندو) انگریز راج کے خلاف سرگرم ہو کر کارروائیاں کرنے لگے تو برٹش سرکار نے ان کو بھی ڈاکو قرار دے دیا۔ اس دور کا سب سے معروف حریت پسند روپلو کوھی تھا، جسے سندھ کی آزادی کا امام قرار دیا جاتا ہے مگر وہ انگریزوں کے تئیں ''ڈاکو'' تھا۔

دوسری حرتحریک 1929ء سے شروع ہوئی جو آزادی کی اوّلین تحریک تھی۔ اسے کچلنے کے لیے انگریزوں نے حروں کے پیشوا پیر پگارہ (سورھیہ بادشاہ) کو گرفتار کر لیا اور پھانسی چڑھا دیا۔ اس پر حروں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا۔ انگریزوں نے سندھ کی آزادی کی اس تحریک کو دہشت گردوں اور ڈاکوؤں کی تحریک قرار دیا اور حر مجاہدین کو ڈاکو کہا گیا۔

انگریزوں کے خلاف حروں کے علاوہ انفرادی جتھے بھی ڈاکہ زنی کی کارروائیاں کرتے تھے، ان کو بھی ڈاکو ڈکلیئر کیا گیا تھا، ان میں لاڑکانہ کے امیر ورند، دادو کے میرن جمالی شامل تھے جو برطانیہ کے افسروں اور مالی اداروں پر حملے کرتے تھے۔ حرتحریک کے معروف حریت پسند، جن کو انگریز ڈاکو کہتے تھے، ان میں رحیم ہنگورو، پھوٹو چانگ، غلام حسین واڈھو، میرن، سرخیل، الھ ڈتو خاصخیلی، رحمان بروہی، مہر جمالی اور حیدرآباد والے پھُل ماچھی شامل تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پیر پگارہ شاہ مردان شاہ کے حکم پر حرتحریک ختم ہوئی مگر رحیم ہنگورو کارروائیوں میں مصروف رہے، جس پر اسے گرفتار کر کے حیدرآباد جیل میں پھانسی چڑھا دیا گیا۔ اس کے بعد سندھ میں ڈاکوؤں کا مسئلہ کبھی ختم نہ ہوا اور اب تک جاری ہے۔

دادن چانڈیو، بدنام ڈاکو جس نے کبھی ڈاکہ نہیں مارا!

''تو آپ وہ خطرناک ڈاکو دادن ہیں؟''

''صاحب جی! کیا میں آپ کو ڈاکو لگتا ہوں؟...... وہ بھی خطرناک ڈاکو!''

''نہیں، اگر سچی بات کی جائے تو وہ کہیں سے بھی ڈاکو نہیں لگتا تھا۔ ہلکے قد و قامت کا عام سا دیہاتی سندھی، اُدھیڑ عمر مرد، چھوٹی سی داڑھی، سندھی ٹوپی اور سیاہ لباس میں وہ کوئی کسان بھی ہو سکتا تھا اور کوئی مزدور بھی۔ ایک پُرانے زخم کا نشان اس کی ناک سے بائیں گال تک چلا گیا تھا اور یہی ایک نشان اسے خطرناک ثابت کر سکتا تھا اور کوئی علامت اس کے حلیے بشرے میں ایسی نہ تھی، جس سے اس پر ڈاکو ہونے کا شک کیا جاتا۔''

دادن چانڈیو ڈاکو سے یہ ملاقات ہمارے ٹریول رائٹر دوست سلمان رشید نے کھیرتھر کے پہاڑوں پر ایک خفیہ ٹھکانے پر کی تھی، جس کا احوال انہوں نے اپنی انگریزی

کتاب میں لکھا ہے۔ سندھ میں ڈاکو کلچر کے حوالے سے یہ نہایت دلچسپ قصہ ہے، اس لیے ہم نے اسے یہاں شامل کیا ہے۔ وہ ڈاکو دادن چانڈیو سے حال احوال کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ وہ ڈاکو کیسے بنے؟ دادن جو بتاتے ہیں، اس کے مطابق وہ اس قبیلے یا خاندان میں پیدا ہوئے، جس سے چانڈیو برادری کے نواب تعلق رکھتے ہیں۔ دادن کا بچپن بھی نوابی علاقے غیبی دیرو میں گذرا تھا۔

''میں وہاں تین کلاسیں اسکول میں پڑھا تھا مگر ''غربت'' اتنی تھی ہمارے کنبے میں کہ پھر میں پڑھائی چھوڑ کر باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے لگا۔ ایوب خان کے دور میں جب زمینیں بانٹی گئیں (یعنی لینڈ ری فارمز متعارف ہوئے) تو ہر ہاری یا کسان کے حصے میں بتیس ایکڑ آئے تھے۔ میرے باپ کو بھی اتنی زمین ملی تھی اور میرے حصے میں بھی اتنی آئی۔ ہماری وہ زمین جاگیر نمبر چھ میں تھی مگر ہماری برادری کے اس وقت کے نواب نے وہ زمین ہمارے حوالے کرنے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس سے نواب صاحب اور ہمارے خاندان کے درمیان تنازعہ شروع ہوا۔ اسی کے نتیجے میں دادن ڈاکو قرار دیا گیا اور وہ مفرور ہوگیا۔ وہ ڈاکو تھا یا نہیں مگر اس کی بدنامی بطورِ ڈاکو ہو گئی۔ اس تنازعے کے باعث دادن اور نواب کے کارندوں کے مابین دُشمنی تیز ہوگئی۔ ایسے ایک ٹکراؤ کے نتیجے میں دادن پر کلہاڑی سے حملہ ہوا، جس کی یادگار وہ زخم ہے جو دادن اپنے چہرے پر سجائے پھرتا ہے۔ جیسے ہی دادن زخم کھا کر گرا، اس کے ساتھی نے حملہ آور کو نشانہ بنایا اور اسے قتل کردیا۔ اس واقعے کے بعد دادن اور اس کا ساتھی روپوش ہوگئے۔ کچھ عرصے بعد دادن نے نواب سے رابطہ کیا اور اسے صلح صفائی کرنے، دُشمنی ختم کرنے کی گذارش کی۔ دادن کے بقول نواب مان گئے تھے مگر ان کے جو کارندے تھے، وہ آڑے آگئے۔ یوں صورت حال جوں کی توں رہی۔ دادن چونکہ سمجھتا تھا کہ عدالتیں اس کے حوالے سے نرم گوشہ ظاہر نہیں کریں گی، اس لیے اس نے شہری یا قصباتی زندگی ترک کردی اور پہاڑوں کا رُخ کرلیا۔ وہ لاڑکانہ ضلع کے کوہستانی علاقے میں چلا گیا۔ اس نے گاؤں لاکھے جا کونڈا میں تیرہ ایکڑ زمین خریدی اور ایک بار پھر کسان بن کر زندگی گذارنے لگا۔

1983ء میں جب فوج نے ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن شروع کیا تو فوجی افسروں کو بتایا گیا کہ دادن چونکہ ڈاکوؤں کا ساتھی ہے، اس لیے علاقے بھر کے سب جرائم پیشہ لوگ اور ان کے ٹھکانے جانتا ہے۔ فوجی قافلے کے آگے آگے نواب کے دو قریبی ساتھی آرہے تھے۔ دادن نے ان کو لاؤلشکر کے ساتھ تیجھی ندی کی قریبی پہاڑی سے اُترتے دیکھا تو اس نے سمجھا کہ ''دُشمن'' نے اس پر حملہ کردیا ہے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے دادن کے پاس جو بھی اسلحہ موجود تھا، اس نے استعمال کیا۔ چھ گھنٹے تک یہ دوطرفہ مقابلہ یا فائرنگ جاری رہی، جس کے نتیجے میں ایک فوجی جوان اور دو دیہاتی مارے گئے۔ دادن گرفتار ہو گیا، اس کا گھر جو ایک جھونپڑے کی صورت میں تھا، وہ نذرِ آتش کردیا گیا۔ دادن کا خاندان اپنے عزیزوں کے ہاں جا کر پناہ گزین ہوا۔ دادن کو سخت پہرے میں سکھر جیل منتقل کردیا گیا۔ جیل میں غریب ہاری داد محمد چانڈیو بدنام زمانہ دادن چانڈیو کے رُوپ میں دن کاٹنے لگا۔ ایک فوجی کو قتل کرنے کے جرم میں دادن کو سزائے موت سُنائی گئی۔ 1985ء میں جب سکھر جیل توڑنے کا مشہور واقعہ ہوا تو اسے بھی جان بچا کر نکل بھاگنے کا موقع ملا۔ دادن کے بقول اسے یا کسی بھگوڑے کو یہ معلوم نہ تھا کہ جیل توڑنے کا وہ واقعہ سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور اس میں اس دور کا وزیراعلیٰ بھی ملوث تھا۔ دادن کے مطابق اس واقعے سے متعلق جیل کے اندر افواہ تک نہ سُنی گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ دادو کے بدنام زمانہ ڈاکو پرُو چانڈیو اور اس کے ساتھیوں نے کروڑوں روپے بہ طور رشوت کھلائے تھے، تب ان کو بھاگنے کا موقع دیا گیا تھا، جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دوسرے جرائم پیشہ افراد بھی نکل بھاگے تھے۔

''رات کو کسی وقت شور اُٹھا کہ جیل کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، کوئی پولیس والا وہاں نہیں ہے، جس کو بھاگنا ہے، وہ بھاگ لے۔ ہم جیسے لوگوں نے پوچھا کہ تم کون لوگ ہو اور جیل کے دروازے کس نے کھولے ہیں؟ جواب ملا کہ ''اس بات کو چھوڑو اور جتنی جلدی نکل سکتے ہو، نکل بھاگو، جان بچاؤ۔'' اس پر تقریباً بیالس جرائم پیشہ لوگ، جن میں اکثر وہ ڈاکو اور قاتل تھے، جن کو موت کی سزا کا سامنا تھا، وہ سب نکل بھاگے۔ ہم لوگ جیل کے احاطے میں آئے تو دیکھا کہ گیٹ تو بند تھا مگر اُونچی اُونچی دیواروں کے ساتھ سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم ایک سیڑھی چڑھ کر جیل کی دیوار پر پہنچے تو دیکھا کہ ویسی ہی سیڑھی باہر کی جانب سے بھی دیوار کے ساتھ لگی تھی۔ ہم فوراً اس سے اُتر کر آزاد زمین پر پہنچے اور دریائے سندھ کے ''کچے'' (جنگلات) کی جانب دوڑنے لگے جو وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ اگلے دو دن ہم چلتے رہے اور اس دوران جس کے جدھر سینگ سماتے گئے، وہ ادھر کا رُخ کرتا چلا گیا۔ میں رات بھر چلتا رہتا اور دن میں جنگل میں چھپ کر سوجاتا تھا۔ بالآخر چار دن کے سفر کے بعد اپنے گھر پہنچا، مگر مجھے گھر میں سکون سے کہاں بیٹھنے دیا جاتا؟ فوج اور پولیس جیل سے بھاگنے والوں کے گھروں، گوٹھوں کا گھیراؤ کر کے چھاپے مار رہی تھی۔ نواب صاحب کے لوگ بھی میرے پیچھے پڑ گئے تھے کہ ان کو پتہ چل گیا تھا کہ میں بھی جیل سے بھاگ نکلا ہوں۔ اس کے بعد میں اور میرا کنبہ اگلے آٹھ سال تک مستقل جان بچا کر بھاگتے رہے۔ اس کے باعث میرا بیس سالہ بیٹا زیب اس بھاگ دوڑ سے تنگ آکر ڈاکو بن گیا اور وارداتیں کرنے لگا۔''

دادن اپنے بیٹے کی وارداتوں اور کرتوتوں پر پردہ نہیں ڈالتا اور صاف کہتا ہے کہ اس نے مایوسی میں غلط راستہ چنا اور وارداتیں کیں۔ بالآخر 1992ء میں فوج نے لاکھے جا کونڈا گاؤں پر چھاپہ مارا۔ دونوں جانب سے فائرنگ کا تبادلہ ہوا اور دادن کا ڈاکو بیٹا زیب مارا گیا۔ آگے چل کر دادن کے ہاں دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو اپنے پہلے بیٹے کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے اس نے نومولود کا نام زیب رکھا جو آج جوان ہے۔ آج کل دادن ڈاکو اپنی دو بیویوں، تین بیٹیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ کھیر تھر کے پہاڑوں میں روپوش جان بچاتا پھرتا ہے، جس نے زندگی میں کبھی کوئی ڈاکہ نہیں ڈالا۔

اس بھاگ دوڑ کی زندگی سے تنگ آیا ہوا دادن مسلسل کوشش میں رہتا ہے کہ نواب خاندان کے ساتھ اس کا تنازعہ ختم ہو جائے۔ اس عرصے میں وہ نواب جن کے ساتھ یہ جھگڑا شروع ہوا تھا، اس دُنیا سے گذر چکے ہیں بلکہ ان کا جانشین نواب بھی انتقال کر چکا ہے اور اب پوتا نواب بنا ہے۔ دادن سمجھتا ہے کہ نوابوں کے اردگرد رہنے والے ان کے لوگ ہی انہیں امن امان اور پُرسکون ماحول سے دُور رکھتے ہیں ورنہ نواب خود اس ذہن کے نہیں ہوتے۔ وہ حکومتوں سے بھی شاکی ہے اور کہتا ہے۔ ''پی پی پی کی حکومت یہاں رہتی ہے، مگر اس نے بھی

تعارف

نام: عامر زمان
قلمی نام: عامر زمان عامر , 0333-7617415
0300-3934115
تاریخِ پیدائش: 22 July 1986
تعلیم: گریجویٹ
ادبی اعزاز: (نائب صدر ادبی تنظیم نظمیہ بورے والا، مدیر معاون ماہنامہ صدائے دل لاہور)
آغاز شاعری: جماعت ہفتم میں پہلی نظم اخبار میں شائع ہوئی)

ماہنامہ نئے افق کراچی نالا دل، اوراق ادب، آداب عرض، دوشیزہ، سچی کہانیاں، ریشم، ساگر ڈائجسٹ، ڈر ڈائجسٹ، سلام عرض، انویسٹی گیشن رپورٹ اور ملٹری پولیس کے میگزین انضباط میں کلام شائع ہوا۔ حمد، نعت اور نظم اور غزل کے علاوہ نئے افق سمیت مختلف جرائد میں افسانے، ناولٹ، مکمل ناول منصر شہود ہو کر پزیرائی سے نوازے گئے۔ مشرق، نیا دور، جرات، امروز اور صدائے ظفر میں متعدد کالم اشاعت پزیر ہوئے۔

ادبی ایوارڈز:
1۔ آہٹ رائٹرز ایوارڈ کراچی، 2۔ ریشم رائٹرز ایوارڈ اسلام آباد، 3۔ آداب عرض ینگ رائٹرز ایوارڈ لاہور

ادبی اثاثہ:
1۔ ترے وصل کا چاند۔ غزلیں (زیرِ طبع)
2۔ طوافِ آرزو۔ افسانے (زیرِ طبع)
3۔ باتوں سے پھول جھڑتے ہیں۔ نظمیں (زیرِ طبع)
4۔ عکس و آئینہ۔ ادبی شخصیات پر مضامین (زیرِ ترتیب)
5۔ آغاز سفر۔ اخباری کالم (زیرِ ترتیب)

برائے خط و کتابت: اسکول آف ملٹری پولیس۔ ڈی۔ آئی خان کینٹ۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.urdubooksfree.pk

ہم غریبوں کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ہم جیسے لوگ جمہوری حکومت میں بھی ناکردہ گناہوں کی سزا پاتے رہتے ہیں تو پھر انصاف کی اُمید کس سے رکھی جائے۔ میں کیا ڈاکو ہوں؟ کوئی انصاف والا مجھے بتائے نا کہ میں نے کتنے ڈاکے ڈالے ہیں؟ سچ بات یہاں صرف ایک فوجی افسر کرنل باجوہ نے کی تھی جو ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن کرنے آیا تھا۔ اس نے مجھے کہلوایا تھا کہ دادن! میں جانتا ہوں کہ تم ڈاکو نہیں ہو مگر تمہیں ڈاکو قرار دے دیا گیا ہے اور یہ کام ان ڈاکوؤں نے کیا ہے جو بڑے شہروں میں بڑے بڑے بنگلوں اور کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔

’’تم اب دُنیا کو کیا پیغام دینا چاہو گے؟‘‘ ہمارے ٹریول رائٹر دوست نے دادن سے پوچھا۔ اس پر ’’ڈاکو‘‘ داد محمد چانڈیو کا جواب تھا۔

’’ان کو بتاؤ جا کر کہ تم دُنیا کے خوفناک ڈاکو دادن چانڈیو سے مل کر آ رہے ہو۔ لوگوں کو بولو کہ کچھ خدا کا خوف کرو، اتنی ’’بے انصافی‘‘ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ ایک سیدھے سادے ہاری کی زمین ہتھیا کر تم اسے ڈاکو قرار دے دیتے ہو۔ تمہارے پاس لاکھوں ایکڑ زمین ہے تو پھر میرے بتیس ایکڑ تم لوگوں کو کیا دے دیں گے، جس کی خاطر میری اور میرے بچوں کی زندگی تباہ کر دی ہے؟‘‘

سندھ کے کچے کے جنگلات اور جنگل جیسے بے امان شہروں میں آج بھی ہزاروں ڈاکو عام لوگوں کی زندگیوں، مال ملکیت اور عزتوں سے کھلواڑ کر رہے ہیں۔ پتہ نہیں ان میں سے کتنے دادن جیسے ناکردہ گناہ لوگ ہیں جن کو آج خطرناک ڈاکو مانا جاتا ہے اور جو اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیاں بچانے کے لیے پہاڑوں، جنگلوں اور بیابانوں میں دوڑتے بھاگتے پھر رہے ہیں مگر ان جسموں کو ڈاکو بنانے والے وڈیروں، سیاسی ڈاکوؤں، سرکاری اہلکاروں اور افسروں کو سمجھانے، لغام دینے والا کوئی نہیں، جن کے ظلم و ستم کے باعث سماج میں غریب، بے روزگار اور بے گناہ لوگ ڈاکو بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔

آج یہ رپورٹ پڑھی جانے کے دن بھی سندھ کے شکارپور، لاڑکانہ، دادو اور دیگر اضلاع کے کچے والے جنگلات میں پولیس فورس ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن میں مصروف ہے۔ اس ایک ہفتے کے دوران درجن بھر سے زائد ڈاکو مارے جا چکے ہیں۔ ایسی کارروائیوں میں پولیس اور دیگر فورسز کے اہلکار بھی زندگیاں داؤ پر لگا رہے ہیں اور کئی جامِ شہادت نوش کرتے ہیں مگر ڈاکوؤں کی تعداد اور اقسام میں پھر بھی کوئی کمی نہیں آتی۔ اس کا سیدھا سادہ حل یہ ہے کہ حکومت اور فورسز کو اپنی اصل توجہ ’’ڈاکو میکرز‘‘ وڈیروں، زمینداروں، پولیس افسروں اور ایسے دیگر عناصر پر دینا چاہیے جو اپنے مفادات کے تحت ڈاکو تیار کرنے کی صنعت کو چلا رہے ہیں۔

اللہ بس...... باقی ہوس

1984ء تا 1994ء: ڈاکوؤں کے عروج کا عشرہ۔

جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں ڈاکو راج سب سے زیادہ مضبوط رہا۔ پرُو چانڈیو، محبت شیدی، علی گوہر چانڈیو، بقادار شاہ، نادر جسکانی اور دیگر ڈاکوؤں کے ٹولے دن رات سرگرم رہے۔ اسی دور میں اغوا برائے تاوان کی وارداتیں باقاعدہ صنعت بن گئیں۔ سرِشام سندھ کے قصبے اور دیہات ویران ہو جاتے تھے۔ اس زمانے میں ایک سروے کے مطابق سندھ کے اندر تقریباً بیس ہزار ڈاکو سرگرمِ عمل تھے، جنہوں نے سولہ ہزار سے زائد لوگوں کو تاوان کے لیے اغوا کیا تھا، اربوں روپے کی دولت لوٹی تھی اور کروڑوں کی فصلیں جلا کر تباہ کر دی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ فوجی حکومت کے خلاف ایم آر ڈی کی تحریک میں بھی سندھ کے ڈاکو اپنا حصہ ڈالتے رہے تھے! اس سیاہ دور میں صوبہ سندھ ترقی کے لحاظ سے ایک صدی پیچھے چلا گیا اور یہ عذاب اب تک سندھ کے لوگ بھگت رہے ہیں۔

اس دور میں جو ڈاکو سرگرم تھے، ان میں بلوچ قبائل سے متعلق ڈاکوؤں کی شرح ساٹھ فیصد سے زائد تھی اور سندھی النسل ڈاکو چھتیس فیصد تھے۔ ان سب ڈاکوؤں کی اوسط عمر پچیس تا تیس سال تھی یعنی وہ جوان لڑکے تھے۔ سندھ میں پولیس کے لوگ ان ڈاکوؤں کو اسلحہ اور ایمونیشن بیچتے تھے اور اس کے حصول کا دوسرا بڑا ذریعہ افغان مہاجرین تھے۔ نہ صرف لوگ ڈاکوؤں کو تاوان کے اربوں روپے بھرتے رہے بلکہ 1986ء کے ایک برس میں سندھ حکومت نے بھی کروڑوں روپے تاوان ادا کر کے اپنے لوگ آزاد کرائے تھے!

1991ء ڈاکوؤں کا سرگرم ترین سال تھا، جس کے دوران ہزاروں افراد اغوا ہوئے، عورتیں بھی اغوا کی گئیں۔ اس سے پہلے عورتوں اور بچوں کو کچھ نہیں کہا جاتا تھا مگر اس سال یہ نئی ’’روایت‘‘ بھی سندھ کے ڈاکوؤں نے قائم کی جو تاحال برقرار ہے۔ خاص طور پر تاجروں اور امیر ہندوؤں، شیخوں اور میمن برادریوں کے بچے اغوا کر کے تاوان وصول کرنا آسان سمجھا جاتا ہے۔

پیر مرشد یا ڈاکو

کسی زمانے میں سندھ کے معروف افسانہ نگار اور کالم نویس امر جلیل کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا تھا کہ ’’سندھ میں پیری مرشدی کا دھندہ کیا جائے یا ڈاکو بن کر لوگوں کو لُوٹا جائے، دونوں ہی نہایت نفع بخش بزنس ہیں۔‘‘

اس حوالے کے ثبوت کے طور پر صرف سیاست کے میدان میں سرگرمِ عمل پیروں، سیدوں اور گدی نشینوں ہی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چل جائے گا کہ وہ ہمیشہ اقتدار، طاقت اور حکومت کا حصہ رہتے آئے ہیں اور کروڑوں کماتے آئے ہیں۔ کئی پیروں کی کمائی تو کروڑوں سے بڑھ کر اربوں روپے سالانہ ہوتی ہے۔ کچھ مشہور گدیاں ’’نولکھی‘‘ اور ’’سات لکھی‘‘ کہلاتی ہیں۔ اس سے مراد نولاکھ یا سات روپے کمائی نہیں ہے بلکہ یہ ان کے باقاعدہ مریدوں کی تعداد ہوتی ہے اور ہر مرید پر فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی روزانہ کی کمائی میں سے ایک مخصوص حصہ پیر و مرشد کے لیے نکال کر الگ رکھیں۔ عقیدت اپنی جگہ لیکن یہ بھی ایک طرح کی ڈاکہ زنی ہی قرار دی جائے گی کہ غریب مرید اپنی محنت مزدوری میں سے لکھ پتی یا کروڑ پتی پیر کو حصہ ادا کرے۔

ڈھائی سو قبائل کے ڈاکو

سندھ میں ظہور پذیر ہونے والے ڈاکوؤں کا تعلق تمام برادریوں، ذاتوں یا قبائل سے نہیں تھا بلکہ یہ ڈاکو تقریباً ڈھائی سو قبائل یا ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے، جن میں زیادہ بلوچ اور بیجن تھے، جن سے مقابلے کے لیے تمام ذات برادریوں نے اپنی اپنی ’’فورس‘‘ یا مسلح نوجوان تیار کیے تھے۔ بیشتر ڈاکو جن قبائل سے تعلق رکھتے تھے، ان میں چانڈیو، ماچھی یعنی سولنگی، جسکانی، ناریجو، جکھرانی، افغان حملہ آور پٹھان، لاکھو، ہندو، سمیجو، جوکھیو، کھوسو، نوحڑیو، نکامڑا (قزاق جنہوں نے عرب بحری بیڑے لُوٹے تھے)، جت، میر، پلی پوٹو، بُرڑو، مغیری، وکو اور دیگر سیکڑوں برادریاں شامل ہیں۔

چند ایک ڈاکو شیدی (مکرانی)، سید، سومرہ، شیخ، کلمتی، ابڑو جیسی امن پسند برادریوں میں بھی پیدا ہوئے۔

پولیس کے خلاف ڈاکوؤں کا سرعام احتجاج، دُنیا کا انوکھا واقعہ

سندھ میں ڈاکو راج یہاں تک عام ہے کہ بدنام زمانہ مسلح ڈاکو گروہ کی صورت قصبوں میں نکل آتے ہیں اور لوٹ مار کر جاتے ہیں۔ اسی سندھ میں دُنیا کی تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ڈاکوؤں کا مسلح گروہ علاقہ پولیس کی سختیوں کے خلاف سراپا احتجاج ہو کر قصبائی بازار میں نکل آیا۔ گھوٹکی ضلع کا یہ واقعہ 2014ء کے نومبر میں پیش آیا، جس میں درجن بھر سے زائد ڈاکو اسلحہ لہراتے بازار میں آئے۔ وہ پولیس کے خلاف نعرے بازی کر رہے تھے کہ جب سے نیا ضلعی افسر آیا ہے، اس نے ڈاکوؤں پر سختی بڑھا دی ہے اور بھتے کا ریٹ بھی زیادہ کر دیا ہے۔ ڈاکوؤں کا یہ احتجاجی مظاہرہ اور ریلی سندھی نیوز چینل کے ساتھ ساتھ اُردو چینلز پر بھی دکھایا گیا۔ ڈاکوؤں کا کہنا تھا کہ پولیس ان سے کم بھتہ لے اور سختی بھی کم کر دے تا کہ وہ اپنا ’’روزگار‘‘ جاری رکھ سکیں۔ اس موقع پر ان ڈاکوؤں کے سرغنہ نے خطاب میں کہا تھا۔

’’پولیس اور عوام کو ہمارے لیے سوچنا چاہیے کہ ہم بھی آخر انسان ہیں۔ ہم سانپ تو نہیں ہیں کہ زیر زمین مٹی کھا کر گزارہ کر لیں گے؟ ہمارے بھی کنبے ہیں، جن کو ہمیں پالنا ہے۔ پولیس کو ’’منتھلی‘‘ دینے سے ہم انکار نہیں کرتے مگر اس کی شرح جو بہت بڑھا دی گئی ہے، وہ کم کر دی جائے۔ آخر ہمیں اسلحہ، بارود بھی تو خریدنا پڑتا ہے۔‘‘

اس انوکھے واقعے سے متعلق میڈیا کے نمائندوں نے جب ضلعی پولیس سربراہ سے بات کی تو اس نے جواب دیا کہ یہ پولیس کی کامیابی ہے کہ ڈاکو اس کی سختی کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ مذکورہ آفیسر اس سوال کا جواب نہیں دے پائے کہ آخر ان ڈاکوؤں کے پاس اتنا جدید اسلحہ کہاں سے آتا ہے اور کون ان کی سرپرستی کرتا ہے؟

حالیہ برسوں میں سندھ کے سیاستکاروں میں پیشہ ور ڈاکوؤں کی سرپرستی کر کے، ان کے ذریعے وڈیروں اور عوام کو دباؤ میں لے کر الیکشن جیتنے کا نیا رُجحان پروان چڑھا ہے۔

ایسے الیکشن فاتح ڈاکوؤں میں قادری چاچڑ نے بہت شہرت حاصل کی، جس نے 2008ء کے انتخابات میں حکمران جماعت کے ایک اُمیدوار قومی اسمبلی کی حمایت میں گاؤں گاؤں جا کر اعلانات کیے کہ اس حلقے سے فلاں صاحب کو سو فیصد ووٹ پڑنا چاہئیں ورنہ مجھے تم لوگ جانتے ہو! اس کے نتیجے میں وہی اُمیدوار جیتا اور آج کل بھی قومی اسمبلی میں دوسری اہم ترین پوزیشن پر براجمان ہے۔

2015ء کے آخری دنوں میں بدنام ترین ڈاکو نظرو ناریجو مارا گیا۔ یہ واقعہ گڑھی یاسین ضلع شکارپور کے کچے میں پیش آیا۔ اس کے خلاف 1980ء سے پولیس اور ایجنسیاں سرگرم تھیں۔ اس کے خلاف دو سو مقدمات درج تھے، جن میں ڈاکے، قتل اور لوٹ مار شامل تھے۔ اس کے سر پر دو کروڑ روپے انعام رکھا گیا تھا۔

نظرو ناریجو کو چند برس پہلے سندھ کے ڈاکوؤں نے متفقہ طور پر اپنا سردار مقرر کیا تھا۔ اس کا باپ ربن ناریجو بھی بدنام ڈاکو تھا جبکہ دادا بھائی خان ایک معزز وڈیرہ تھا، جس کے نام سے ان کا گاؤں ”بھائی خان جی وانڈھ“ معروف ہے۔ نظرو ناریجو کا باپ ربن ناریجو یا ربو ڈاکو سندھ یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں ماسٹرز تھا۔ یہاں ایک لقمہ یہ دے دیا جائے کہ ماضی کا خوبصورت نوجوان ڈاکو نادر جسکانی بھی سندھ یونیورسٹی میں ماسٹرز کا طالب علم تھا، جب اس کے چچا نے اپنی بیٹی اور اس کی منگیتر کی شادی کہیں اور کر دی تو وہ تعلیم چھوڑ کر چچا کو قتل کر کے ڈاکو بن گیا تھا۔

نظرو ناریجو کے باپ ربو ناریجو کا سندھ کے عظیم افسانہ نگار اور وڈیرے نسیم کھرل کے ساتھ زمینوں پر تنازعہ تھا۔ جب 1973ء میں نسیم کھرل قتل ہو گیا تو اس میں ربو ناریجو کو قاتل قرار دیا گیا۔ 1976ء میں ربو ناریجو قتل ہو گیا تو کھرل اور ناریجو برادری میں دُشمنی کی بنیاد پڑ گئی۔ نظرو نوعمری ہی میں باپ کا بدلہ لینے کے لیے ڈاکو بن گیا۔ آج سے تین سال پہلے نظرو کا نوعمر لڑکا اقبال پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ نظرو لاڑکانہ، گھوٹکی، سکھر، شکارپور اور خیرپور اضلاع میں اپنے ٹولے کے ساتھ وارداتیں کرتا پھرتا تھا اور ان اضلاع میں دہشت کی علامت بنا ہوا تھا۔

ڈاکو کیوں پیدا ہوتے ہیں؟

ناانصافی، ظلم و ستم، معاشی بدحالی اور بے روزگاری اور معاشرے میں انارکی ڈاکوؤں کے ظہور پذیر ہونے کی بڑی وجوہات ہیں۔ جیسے معروف ترین ڈاکو پرُو چانڈیو ہمارے سامنے چرواہے سے قاتل ڈاکو بنا تھا۔ اس نے جنگل میں بکریاں چراتے ہوئے مقامی زمیندار کی ایک بکری دوسرے چرواہوں کے ساتھ مل کر پکڑی اور وہ اسے ذبح کر کے بھون کر کھا گئے تھے۔ یہ بات زمیندار تک پہنچی تو اس نے پرُو کو پکڑوا کر مار پیٹ کی۔ اس پر بھی پرُو نے اعتراف نہ کیا تو اسے مجمعے کے سامنے ننگا کر کے پیٹا گیا۔ پرُو چیخ چیخ کر کہتا رہا کہ اس کی بے عزتی نہ کی جائے، وہ ایک بکری کے عوض اپنا پورا ریوڑ دینے کو تیار ہے مگر زمیندار اسے نشانِ عبرت بنانا چاہتا تھا تاکہ کوئی اور آئندہ اس کی بکریوں، مویشیوں یا کھیتوں کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ پرُو یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکا اور مفرور ہو کر جنگل میں چلا گیا۔ سب سے پہلا قتل اس نے اس زمیندار کے کمدار (کارندے، منشی) کا کیا، جس نے اس کے خلاف چغلی لگائی تھی۔

اب بھی سندھ میں بیڈ گورننس، کرپشن، بے روزگاری، وڈیرا شاہی، معاشی بدحالی، ناانصافی کا دور دورہ ہے۔ اس لیے آج بھی سندھی سماج دیہی اور شہری ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ روزانہ لوگ اغوا ہوتے ہیں، عورتیں اغوا اور قتل ہو رہی ہیں۔ بچے تاوان کے لیے اُٹھائے جا رہے ہیں۔ پولیس کے اہلکار تک ڈاکوؤں کے ٹولوں کے سہولت کار بنے ہوتے ہیں اور انہیں مخبری، اسلحہ اور راستہ دیتے رہتے ہیں، جس کے بدلے میں ڈاکو بھی لُوٹ کے مال میں سے اپنے مددگاروں، سرپرست وڈیروں اور سیاستدانوں کا حصہ الگ کر کے ان کو پہنچاتے رہتے ہیں۔

جب تک انصاف، اچھی حکمرانی، تعلیم، صحت، روزگار کے وسائل برابر کی بنیاد پر اور میرٹ پر مہیا نہیں کیے جائیں گے، تب تک سماج سے ڈاکو کلچر کا خاتمہ ناممکن ہے۔

ڈاکہ یا ڈاکہ زنی کیا ہے؟

لفظ ڈاکو ہندی زبان کے لفظ ڈاکٹ سے نکلا ہے جبکہ ڈاکو سنسکرت کے دشتا سے لیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں۔ ہجوم کو یرغمال بنانا اور ہراساں کرنا۔ اس عمل کو ڈاکہ زنی کہا جائے گا، جس کا مطلب ہوا کہ اسلحے کے زور پر، تشدد کر کے لُوٹ مار کرنا۔ پاکستان پینل کوڈ کے سیکشن 391 کے تحت ڈاکہ زنی کی تعریف یہ ہے کہ پانچ یا پانچ سے زائد لوگ مشترکہ طور پر لُوٹ مار کریں تو یہ جرم ڈاکہ زنی کہلائے گا۔

ڈاکوؤں کی اقسام

سندھ میں آج تک ڈاکوؤں کی جو تاریخ ہے، اس کے مطابق ایسے گروہوں کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1-بیرونی حملہ آور لُٹیرے۔

☆بیرونی حملہ آور، لُٹیرے جو ڈاکوؤں کی فوج کی صورت میں حملہ آور ہوئے۔ سندھ میں لُوٹ مار، قتلِ عام کر کے اپنے ملکوں، علاقوں کو واپس چلے گئے۔ ایسے غیر ملکی ڈاکوؤں میں افغانی پٹھان، ارغون، تُرخان، نادرشاہی ٹولہ، عرب، گجراتی، کچھی ڈاکو شامل تھے مگر ان سے بھی قبل جب موہن جودڑو آباد شہر تھا، تب جن ڈاکوؤں کی فوج وادی سندھ پر حملہ آور ہوئی تھی، وہ آریا تھے۔ انہوں نے سندھ کے مقامی بھیل قبائل پر حملہ کر کے اس خطے پر قبضہ کیا اور 50ہزار بھیل قتل کیے۔ دیگر بھیلوں کی جائیدادوں، مویشیوں پر قابض ہو کر انہیں مار بھگایا۔ وہ اصل سندھی بھیل لوگ یہ خطہ چھوڑ گئے، جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔ وہ ایران، ترکی، یونان کے راستے یورپ چلے گئے۔ ان کی کچھ تعداد سندھ سے مصر چلی گئی اور وہاں سے یورپ میں داخل ہوئی، جنہیں مصر (Egypt) سے آنے والے یعنی (Egyptians) کہا گیا۔ یہ لفظ آگے چل کر Gypsy یعنی خانہ بدوش ہو گیا۔ یوں یورپ میں رُلتے پھرنے والے جپسی دراصل وادی سندھ کے اصل نسل لوگ ہیں جو آریا ڈاکوؤں کے باعث اپنا وطن ترک کر کے آوارہ گرد ہو گئے اور اب تک اسی حال میں پھر رہے ہیں کہ امریکہ، فرانس سمیت کسی بھی ملک کی شہریت لینا پسند نہیں کرتے۔

2-سیاسی ڈاکو

ہر دور میں ہر خطے میں آزادی اور خودمختاری کی تحاریک چلتی رہتی ہیں۔ ان تحریکوں میں شامل حریت پسندوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو تحریک کو مالی طور پر مضبوط کرنے کے لیے لُوٹ مار کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے تئیں وہ ”سامراج“ یا قابض گروہ کے حامی ساہوکاروں، جاگیرداروں، وڈیروں اور افسر شاہی طبقے کو لُوٹ کر مالِ غنیمت کا کچھ حصہ تحریک کے حوالے کرتے ہیں اور غالب حصہ اپنے ذاتی مفادات پر صرف کرتے ہیں۔ ایسے ہی لُٹیروں میں سے آگے چل کر کچھ لوگ باقاعدہ ڈاکہ زنی شروع کر دیتے ہیں اور تحریک میں بھی سرگرم رہتے ہیں۔ ایسے لُٹیروں ہی کو سیاسی ڈاکو قرار دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ تحریکوں کے نام پر بھتہ خوری اور قبضہ گیری میں بھی ملوث ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ غیر ملکی قابض حکمران ٹولوں کے خلاف سرگرم حریت پسندوں کو بھی یہ حکمران ڈاکو قرار دے کر ان کے خلاف قوت استعمال کرتے ہیں۔

3-دھندہ باز ڈاکو

یہ روایتی یا رواجی ڈاکو ہیں جو اپنے مفادات کے لیے عام لوگوں کو لُوٹتے ہیں، ان کی جائیداد مویشیوں، غلّے اور دیگر قیمتی چیزوں کو ہتھیا کر ان پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ اس لوٹ مار میں وہ لوگوں کی جان لینے سے بھی باز نہیں آتے۔ انہی جیسے ڈاکوؤں کا بڑا دھندہ اغوا برائے تاوان کی وارداتیں کرتے ہیں اور یہاں تک ظالم و سفاک ہوتے ہیں کہ بچوں تک کو اغوا کر کے ان کے والدین سے تاوان کی رقم وصول کرتے ہیں اور رقم نہ ملنے پر مغوی بچوں کو تشدد کر کے مار دیتے ہیں۔ سندھ کے دیہات اور قصبوں شہروں میں اس قسم کے ڈاکو مختلف ادوار میں سرگرم بلکہ عروج پر رہے ہیں۔ خاص طور پر جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں ایسے گروہ جیسے زمین سے اُگ آئے تھے، جن کے خلاف فورسز بھی ناکام ہو رہی تھیں اور پھر ان کو کچلنے کے لیے ”آپریشن بلیو فاکس“ کیا گیا تھا، جس سے ڈاکو کلچر کو خاصا نقصان پہنچا تھا اور عوام نے سُکھ کا سانس لیا تھا۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر بہت اہم ہے کہ سندھ کی تاریخ میں ڈاکو کلچر تب تب عروج پر پہنچا ہے جب جب اس پُرامن خطے میں آمریت مسلط ہوئی ہے یا پھر بیرونی حملہ آوروں نے مقامی حکمرانوں کو شکست دے کر اقتدار پر قبضہ کیا ہے۔

رشتے

تفسیر عباس بابر

فی زمانہ حضرت انسان احساس، خلوص اور جذبات سے عاری ہوچکا ہے اور ریڈی میڈ رشتوں کا فرض بنا رہا ہے جیسے گلے میں پڑا ڈھول بجا رہا ہو۔
رشتوں کی زنجیر میں بندھے اک زمانہ ساز کا المیہ جو آپ کی آنکھوں کو بھیگنے پر مجبور کردے گا۔

"تم آئے ہو تو میں آدھا بچ گیا ہوں"

چاچا جی نے اپنے نحیف سے ہاتھ میں میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کمزور لہجے میں کہا۔

"کہاں یہ کہ میں دوقدم چلنے سے بھی قاصر تھا اور کہاں یہ کہ میں آج بنا سہارے کے خود چل کر تین دفعہ باتھ روم بھی گیا ہوں۔ یہ کسی اپنے سے ملنے کی خوشی کی طاقت ہوتی ہے"

میں تاسف کے ساتھ جھلنگا سی چارپائی پر پڑے اس ہڈیوں کو ڈھانچے کو دیکھ رہا تھا۔ کئی سال بعد انہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے شاک لگا تھا۔ میری پلکیں بارہا نمناک ہوئیں لیکن میں نے ضبط سے کام لیا شاید میں نہیں چاہتا تھا کہ میری حالت سے انہیں اپنی حالت اور حالات کا کرب محسوس ہو۔

"اچھا تم یہاں بیٹھو، نا میرے پاس"

انہوں نے اپنی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ میں خودکارانداز میں ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"تم کافی بدل گئے ہو۔ بڑے ہوگئے ہو ناں" وہ بمشکل زیرلب مسکرائے۔

"مجھے چھوڑیں آپ بتائیں اب طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے رسماً ان کا حال پوچھا ورنہ وہ کیسے تھے۔ کس حال میں تھے۔ یہ تو میں انہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔

"طبیعت تمہارے سامنے ہے بیٹا۔" انہوں نے قدرے افسردگی سے کہا۔ "ڈاکٹروں نے تو جواب دے کر مجھے گھر بھیج دیا ہے۔ اب تو بس اس کے بلاوے کا انتظار ہے"۔

"ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں چاچو جی۔ آپ انشااللہ ٹھیک ہوجائیں گے"۔ میں نے گویا انہیں دلاسہ دیتے ہوئے کہا

"جو احوال پرسی کے لئے آتے ہیں وہ یہی کہتے ہیں پتر" وہ آہستگی سے بولے "کیونکہ یہی عیادت کی رسم ہے لیکن تم تو ایسا نہ کہو۔ تم نے تو میرا عروج بھی دیکھا ہے اور زوال بھی تمہارے سامنے ہے یہ سب قدرت کے رنگ ہیں۔ اعمال کی سزا ہے۔ یا یوں کہو کہ کرنی کی بھرنی ہے"۔

"ایسا نہ کہیں چاچو جی ابھی آپ کے بچوں کو آپ کی ضرورت ہے" میں نے ان کے مدقوق چہرے کو دریدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "سب اچھا ہوگا اللہ اپنے بندے کے لیے بہتر سوچتا ہے"۔

انہوں نے نحیف سی آواز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اتنے میں ہی اُن کی سانس پھولنے لگی۔ ان کے پاس بیٹھی ہوئی ان کی بیوی نے انہیں پانی کے دوگھونٹ پلائے۔ سانس بحال ہوئی تو وہ گویا ہوئے۔

"ارشد پتر۔ اب کسی کو میری ضرورت کیا ہوگی۔ جب تک میں اپنوں اور بچوں کی ضرورتیں پوری کرتا تھا تب تک انہیں میری ضرورت تھی۔ اب بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ میرا کاروبار اب رہا نہیں۔ میں بوجھ ہوں اور بوجھ کون برداشت کرتا ہے"

"اچھا اب کچھ دیر چپ کرجائیں ڈاکٹر نے آپ کو زیادہ بولنے سے منع کیا ہے" چاچی نے آہستگی سے کہا۔ اس کی آواز میں ضبط کی لرزش اور آنسوؤں کی نمی تھی۔ "اور ایسی باتیں نہ کیا کریں آپ کے یہ بچے بھی تو ہیں جو چھوٹے ہیں۔ انہیں آپ کی کمائی کی نہیں آپ کے سائے کی ضرورت ہے"

"لو اتنے دنوں بعد میرا بھتیجا ارشد آیا ہے اور میں ڈاکٹر کے کہنے پر چپ کرجاؤں۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے

"ڈاکٹروں کا کیا ہے یہ تو ایویں ای حکم چلاتے رہتے ہیں۔ یہ نہ کھاؤ۔ وہ نہ کھاؤ اور اب بولنا بھی منع ہے"

وہ اپنی دھن میں بولتے رہے۔ دل کا غبار نکالتے رہے۔ میں ان کے کرب کا اندازہ کرسکتا تھا۔ کیونکہ میں نے ان کا عروج جوانی اور بخت کی بلندی دیکھی تھی۔ میں نے اپنی زندگی کے گیارہ سال ان کے ساتھ گزارے تھے اور پھر وقت کی تقسیم نے ہمیں الگ الگ کردیا۔ وہ اپنے مسائل میں الجھ کررہ گئے اور میں اپنے حالات کی تلخیوں سے نبردآزما ہوگیا۔ یہاں انہیں اس حالت میں اس عسرت زدہ گھر میں دیکھ کر مجھے صدمہ ہوا تھا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے ایک کمرے کے خستہ حال گھر میں چند چارپائیاں اور کچھ گھریلو سامان میلے کچیلے چار بچے اور ایک پریشان حال بیوی ان کے زوال وزبوں اور تلخی ایام کا نوحہ گھر کے در و دیوار پہ رقم تھا۔ وہ بیک وقت کئی جان لیوا امراض میں مبتلا تھے۔ شوگر ہیپاٹائٹس سی اور گردوں کی خرابی۔ وہ اپنی جسامت سے کئی گنا کم نظر آرہے تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے ان کے بھلے وقت کے مناظر گھوم رہے تھے۔ ہنستے مسکراتے خوش مزاج صحت منداور ملنسار طبیعت کے حامل میرے چاچو احمد حسن آج موت کی دہلیز پر کھڑے حسرت زدہ نظروں سے ان اپنوں کی راہ ک رہے تھے جواب اپنے نہیں رہے تھے۔ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ رک جائے تو رگوں میں بہتا ہوا لہو بھی جیسے رک جاتا ہے۔

چاچو کی پہلی بیوی بڑی حوصلے والی عورت تھیں۔ چاچو نے ان کی زندگی میں ہی دو اور شادیاں کرلی تھیں لیکن انہوں نے اس بات کو دل پر نہیں لیا۔ یا لیا بھی تو کسی کو محسوس نہیں ہونے دیا۔

وہ اپنی دونوں سوتنوں اور ان کے بچوں کے لیے عید پر یا زندگی کے کسی بھی موقعے پر فراخدلی سے شاپنگ کرتیں اور

میں اُن کے اعلیٰ ظرف کا قائل ہو جاتا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھیں کیونکہ انہوں نے مجھے ماں جیسا پیار دیا۔ اپنے گھر میں اولاد کے برابر رکھا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ جتنا بھی ضبط کریں۔ جتنی بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کریں۔ آخر وہ ہیں تو ایک عورت ہی ان کے بھی جذبات اور احساسات ہیں۔ امنگوں اور حسرتوں بھرا دل ہے۔ ان کی شادی بھی پسند کی تھی۔ تو ایسی کیا مصلحت تھی کہ انہوں نے خاموشی کے قفل کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیا جبکہ وہ خود اندر سے ٹوٹتی جا رہی تھیں۔ شکست و ریخت کا شکار تھیں۔ مجھے اس دن یقین ہو گیا کہ عورت ایثار کا پیکر ہے۔ ماں ہے تو قربانیوں اور محبتوں کا بہتا دریا ہے۔ بہن اور بیٹی ہے تو غیرت و دستار کی امانتدار ہے۔ بیوی ہے تو وفا کا اہرامِ مصر ہے۔ یہ تمام خوبیاں ان میں بدرجہِ اتم موجود تھیں۔ میں نے کبھی انہیں افسردہ نہیں دیکھا تھا لیکن مسکرانے والوں کی آنکھیں بہت کچھ بتا دیا کرتی ہیں۔ میں ان کی آنکھوں سے درد کے سندیسے پڑھ لیا کرتا تھا۔ وہ ایک قد آور صحت منداور خوبرو عورت تھیں۔ ان کی شخصیت میں ایک وقار رکھ رکھاؤ اور ایسا رعب تھا کہ دیکھنے والا مرعوب ہو جاتا تھا۔ اس دن عید سے کچھ روز پہلے وہ بڑے بڑے کئی شاپر لے کر گھر میں داخل ہوئیں اور خوشگوار موڈ کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ان کے بچے ان کے اردگرد جمع ہوئے تو انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا۔ وہ سب بچوں کو ان کے عید کے کپڑے جوتے اور مختلف چیزیں دکھا رہی تھیں۔ بچے خوش ہو رہے تھے۔ دفعتاً انہوں نے گہری نظروں سے مجھے دیکھا زیرِ لب مسکرائیں اور ایک شاپر میری طرف بڑھایا۔

"ارشد بیٹا اس میں تمہارے لیے کپڑے اور جوتے ہیں۔" انہوں نے انتہائی خلیق لہجے میں کہا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی آنٹی" میں نے آہستگی سے کہا۔

"ارشد تمہیں ضرورت نہیں ہوگی لیکن تم سے جو میرا رشتہ ہے اسے اس کی ضرورت ہے۔ تم بالکل میرے بیٹے کی طرح ہو بلکہ میرے بیٹے ہو۔"

ان کے لہجے میں اپنائیت کی چاشنی نے مجھے مہر بہ لب کر دیا۔ ان کے بچے کھیلنے کودنے میں مصروف ہوئے تو انہوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور ایک بڑا سا شاپر اور کچھ رقم میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں۔

"ارشد یہ کپڑے وغیرہ تمہاری دوسری چاچی اور اس کے بچوں کے لیے ہیں یہ ان کے گھر دے آؤ"

میں حیرت سے گنگ یک ٹک انہیں دیکھے جا رہا تھا۔

آج ان کی اداس آنکھوں میں درد ہلکورے لے رہا تھا۔ اتنا ضبط کہ رگیں ٹوٹنے کا احتمال تھا۔ میں نے ان کی ویران آنکھوں میں نمی محسوس کی۔ وہ منہ دوسری طرف کر کے کسی غیر مرئی نکتے کو دیکھنے لگیں

"آنٹی ایسا کیوں اور کیسے کر لیتی ہیں آپ ان سے کیا رشتہ ہے آپ کا۔" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"اگر تمہارے چاچو سے ان کا رشتہ ہے تو ظاہری بات ہے میرا بھی ہے۔" ان کے لہجے میں درد کی آمیزش نے مجھے بھی افسردہ کر دیا۔

"کیونکہ سب کچھ میرے پاس ہوتا ہے تو میں ان کا حق تو نہیں رکھ سکتی ناں۔ خیر چھوڑو تم ابھی بچے ہو اور یہ باتیں بڑی ہیں"۔

میں کچھ نہیں بولا لیکن میں سمجھتا تھا کہ وہ کس قدر ایثار اور ضبط کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو اپنی خوشیاں اوروں کو دے کر ان کی خوشیوں میں خوش بھی ہوتے ہیں۔ وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ چاچو نے تیسری شادی کر لی۔ تب بھی آنٹی کی پلکوں کے بند نہیں ٹوٹے۔

شب و روز و مہ و سال کی منزلیں طے ہوتی رہیں۔ بچے بڑے ہو گئے اور بڑے۔۔۔ بوڑھے ہو گئے۔ چاچو بھی شوگر ہیپاٹائیٹس کے مریض تھے ازاں بعد گردوں نے بھی ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی صحت دن بہ دن گرتی چلی گئی۔ اپنا کاروبار اور جائیداد وہ اپنی پہلی بیوی بچوں کو دے چکے تھے۔ دوسری بیوی کے بچے جوان ہو کر برسرِ روزگار تھے اور تیسری بیوی کے ساتھ وہ رہ رہے تھے۔ ان دنوں میں ان کے ہاں نہیں تھا۔ دنیا ترقی کے راستوں پر گامزن تھی۔ ان دنوں موبائل فون عام نہیں ہوئے تھے تاہم مارکیٹ میں دستیاب تھے۔ دھیرے دھیرے یہ رجحان بڑھ رہا تھا۔ میرے پاس بھی سیل فون تھا۔ ایک دن میرے کزن عمران نے کال کر کے ایسی خبر سنائی کہ مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ چاچو کی پہلی بیوی کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ وہ نہ جانے کب سے اندر ہی اندر ختم ہو رہی تھیں اور آج بالآخر ختم ہی ہو گئی تھیں۔ اُن کی اچانک موت کا صدمہ ناقابلِ برداشت تھا لیکن تقدیر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں میں وہاں پہنچا تو وہ اپنے آخری سفر کے لیے رختِ سفر باندھ چکی تھیں۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا جو کہ جان لیوا ثابت ہوا۔

وہاں مجھے چاچو اور ان کی دوسری بیویاں اور بچے بھی ملے۔ چاچو غم کی تصویر بنے چٹائی پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ میں ان سے ملا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ اتنے حصوں میں بٹ کر وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ چہرے کی تازگی مفقود ہو چکی تھی۔ آنکھوں کی چمک لبوں کا تبسم اور طبیعت کی شگفتگی اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ آنٹی سپردِ خاک ہوئیں تو وہ کچھ دن اپنے پہلے بچوں کے پاس رہے اور پھر چلے گئے۔ وقت بہر طور گزر جاتا ہے۔ وقت گزرتا رہا میں پھر زندگی کے جھمیلوں میں کھو گیا۔ موبائل فون عام ہوئے تو خبریں بھی عام ہونے لگیں۔ عمران نے مجھے فون پر ایک دو دفعہ بتایا کہ چاچو بہت بیمار ہیں۔ شوگر نے انہیں تقریباً ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ خاندان میں ایک عزیز کی وفات پر اچانک وہ میرے سامنے آ گئے۔ لاغر اور نحیف وجود اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں پچکے ہوئے گال چند لمحے میں انہیں پہچان نہیں پایا تھا۔ وہ ہڈیوں کا تکلیف دہ مجموعہ تھے۔

بے ساختہ میری پلکیں نمناک ہو گئیں۔ میں ان سے گلے ملا تو ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ میں رویا تو وہ بھی رونے لگے۔

"ارشد پتر یہ کیا یار تم نے مجھے حوصلہ دینا تھا۔" وہ آبدیدہ ہو کر بولے۔ "یہ زندگی کے رنگ ہیں۔ تلخ تجربات ہیں۔ انہی رنگوں سے اپنوں بیگانوں کی شناخت ہوتی ہے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ وہ کڑا وقت ہے جب بڑے سے بڑا رشتہ تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ نگاہیں پھیر لیتا ہے۔"

ان کا تجربہ بہت وسیع تھا۔ لہٰذا ان کے تجزیے سے انکار ممکن نہیں تھا۔ ہم بہت دیر وہاں ایک ساتھ رہے۔ انہوں نے اپنے تلخ شب و روز کا احوال حرف بہ حرف مجھے سنا دیا تھا۔

وہ ان سے میری آخری ملاقات ثابت ہوئی اور مجھے وہ ملاقات یاد آ رہی تھی جب ہم پہلی بار ملے تھے۔

اگرچہ کہ اُن سے میرا خونی رشتہ نہیں تھا لیکن میرا ماننا ہے کہ رشتے خون کے نہیں ہوتے۔ رشتے احساس اور خلوص کے ہوتے ہیں۔ اپنائیت اور ایثار کے ہوتے ہی۔ ورنہ خون تو جانوروں اور درندوں میں بھی ہے لیکن ان میں احساس نہیں ہے۔ فی زمانہ حضرتِ انسان بھی احساس خلوص اور جذبات سے عاری ہے۔ بس ریڈی میڈ رشتوں کی فارمیلٹیز ہیں۔ یوں جیسے گلے میں پڑے ڈھول بجانے پڑتے ہیں۔ سو ہر کوئی یہ رشتوں کے ڈھول بجانے پر مجبور ہے۔ منافقت اور مجبوری کے اسی ڈھول کی ڈھم ڈھم اس گمان پر یقین کی مہر ثبت کرتی ہے کہ دور کے ڈھول ہی سہانے ہوتے ہیں۔

پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے اچھے لگے تھے کیونکہ وہ ایک ہنس مکھ اور زندہ دل انسان تھے۔ میں بسلسلہ روزگار اُن کے ہاں قیام پذیر ہو گیا۔ وہ پراپرٹی ڈیلر تھے۔ شیخوپورہ میں ان کا آفس تھا اور آفس سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہی ان کا گھر تھا۔ یہ آج سے کم و بیش پندرہ سال قبل کی بات ہے۔ انہوں نے خوبصورت دو منزلہ مکان بنایا تھا۔ جہاں وہ اپنی پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ دوسری شادی بھی انہوں نے کر رکھی تھی۔ اس بیوی سے بھی ان کے چار بچے تھے۔ رفتہ رفتہ میں ان سے گھل مل سا گیا۔ ان کا طرزِ گفتگو طنز و مزاح سے بھرپور باتیں اور دلکش ہنستا مسکراتا چہرہ میری کمزوری بن گیا تھا۔ وہ مجھے دنیا کے اتار چڑھاؤ سے متعلق بتاتے رہتے تھے۔

"دیکھو زندگی میں کسی دوست یا اپنے سے کوئی امید مت باندھنا۔" ایک دن آفس میں بیٹھے ہوئے وہ اپنی زندگی کے تجربات سنا رہے تھے "کیونکہ جب امید ٹوٹتی ہے تو تعلق اور رشتہ بھی ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی دل بھی" اس وقت ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ لیکن ان کا ہر قول قول زریں تھا یہ مجھے تب جا کر احساس ہوا جب میں زندگی کے گوناگوں مسائل میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

"یار جو باتیں تمہیں آج سے دس سال بعد ٹھوکریں کھا کھا کر اذیتیں سہہ سہہ کر پتہ چلنی ہیں وہ مجھ سے ابھی سنتے رہو اور لکھتے جاؤ۔ کیونکہ میں یہ سب سہہ چکا ہوں۔ برداشت کر چکا ہوں" ان کے لہجے میں تنبیہہ آمیز نصیحت تھی "دنیا میں صرف دو ہی خالص اور بے لوث رشتے ہیں ماں اور باپ باقی سب ضرورتوں کے سلسلے ہیں"

غیر ارادی طور پر ان کی باتیں میرے لاشعور میں پہنچتی رہیں۔ وقت اپنے سنگِ میل طے کرتا رہا۔ اس دوران وہ تیسری شادی بھی کر چکے تھے۔

اسے کال کی تو نمبر پاورڈ آف جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے تین دن بعد رابطہ ممکن ہوا۔ کال میری بیوی نے کی اور ریسیو اس کی بیوی نے کی۔

اس بار رسمی حال احوال بھی دریافت نہیں کیا گیا۔

"جی میں شاہدہ بول رہی ہوں" دوسری طرف سے قدرے درشت لہجے میں کہا گیا۔

"میں ثنا بات کر رہی ہوں" میری بیوی نے کہا۔ "کل جاوید بھائی سے بات ہوئی تھی انہوں نے آج کال کرنے کو کہا تھا۔"

"جی وہ تو سو رہے ہیں اور آپ پلیز ہمیں تنگ نہ کریں۔ ہمارے حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی"

میں سن ہوکر رہ گیا تھا۔ کال منقطع ہوچکی تھی۔ ثنا تحیر آمیز نظروں سے فون کو گھور رہی تھی اور پھر ان سے رابطہ ناممکن ہوگیا بلکہ رابطہ ہی نہ رہا۔

"یہی نفسا نفسی ہے ارشد میاں۔" چاچو کو میں نے مختصراً بتایا تو وہ بولے "ہر کسی کو اپنی پڑی ہے۔ کوئی مرے جیے جائے بھاڑ میں"

خیر یہاں مقصد چاچو کی کہانی بیان کرنا ہے۔ میں ان کی موجودہ حالت دیکھ کر بجھ سا گیا تھا۔ چاچو کے اپنے خاندان والوں سے تعلقات نہیں تھے۔ حتیٰ کہ اولاد بھی پرسانِ حال نہیں تھی۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ دم بہ دم موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

نفرت محبت احساسِ محرومی اور گھریلو تلخیاں بچوں کے ذہن میں پنپتی رہتی ہیں۔ اُن کے لاشعور میں گرہ سی پڑھ جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ ارم کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کا بچپن میرے سامنے گزرا تھا۔ بچپن سے جوانی تک اس کی آنکھوں میں اپنے باپ کے لیے اک عجیب سی اجنبیت تھی۔ ایسے شکوے تھے جن کا اظہار وہ کبھی نہیں کر پائی تھی۔ وہ چاچو کی بڑی بیٹی تھی۔ چاچو نے کبھی بچوں سے محبت اور شفقت کے سلسلے میں امتیاز نہیں برتا لیکن دیگر بچوں کی طرح لاشعوری طور پر وہ بھی ان سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ چاچو کی سب سے پہلی بیوی کی پہلی اولاد تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب وہ اچانک بیمار پڑ گئی تھی تو چاچو کو جان کے لالے پڑ گئے تھے اور جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوئی تھی وہ چین سے سوئے تھے نہ ہی کچھ رغبت سے کھایا پیا تھا۔

وہ گرمیوں کی ایک اداس شام تھی جب میں ان کے فون کرنے پر ان کے گھر گیا تھا۔ سورج مغربی افق کے پردے میں روپوش ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ حبس اتنا تھا کہ پسینہ خشک نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے گھر کے ساتھ پختہ روڈ سڑک پر گاڑیوں کا ہجوم ہارنوں کا شور اور آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے مجھے شام ہوگئی تھی۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ فوراً کھل گیا۔

میرے سامنے چاچو کھڑے تھے۔ ان کی حالت اور چہرے کی یاسیت نے مجھے تکلیف دی تھی۔

"کیا بات ہے چاچو آپ ٹھیک تو ہیں"؟

رسمی حال احوال کے بعد میں نے تشویش زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

"وقت اور حالات ٹھیک نہ ہوں تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوتا ارشد پتر" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولے۔ "یار کچھ دنوں سے زندگی بہت مشکل ہوگئی ہے"

"ہوا کیا ہے؟ کچھ بتائیں تو سہی۔" میرے لہجے میں اصرار تھا۔

"یار میں تو دعا کرتا ہوں کہ اللہ ہر اس شخص کو کچھ دنوں کے لیے زوال ضرور دکھائے جو عروج پر ہے"

"یہ کیسی دعا ہوئی چاچو" میں نے تعجب سے کہا "بلکہ یہ تو بددعا ہے"

"اس لیے کہ عروج میں ہر کوئی اپنا محسوس ہوتا ہے" حسبِ عادت وہ زندگی کا تلخ فلسفہ بیان کرنے لگے۔ "لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ جب تک وقت صحیح ہوتا ہے سب کچھ صحیح لگتا ہے"

وہ سچ کہہ رہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے زندگی کتنے رنگ بدلتی ہے۔ وہ دل کی بھڑاس نکالتے رہے اپنے دکھ سناتے رہے اس دوران کھانا بھی آگیا۔ ہم ساتھ ساتھ کھانا بھی کھاتے رہے اور باتیں بھی کرتے رہے۔ یہ ان کی پہلی بیوی کی وفات سے کچھ ماہ بعد کی بات ہے۔ صبح ہوئی تو ہم صحن میں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ارم کی شادی ہوچکی تھی۔ وہ خاصی خوش نظر آرہی تھی تاہم میں نے محسوس کیا کہ وہ چاچو سے ابھی تک گریزپا ہے۔ وہ چھوٹے بچے کو دکان سے کچھ لانے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنا پرس کھولا۔ غیرارادی طور پر میری نظر پڑ گئی۔ اس کے پرس میں نیا ٹچ اسکرین موبائل فون اور پانچ سو اور ہزار ہزار کے ان گنت نوٹ نظر آرہے تھے

میرے استفسار پر چاچو نے بتایا کہ میں نے تمہیں بس یونہی بلایا ہے۔

"یار زندگی کا بھروسہ نہیں ہے سوچا ایک بار مل ہی لیں"

وہ شاید اپنے آس پاس موت کی آہٹ محسوس کر رہے تھے۔ ان کی صحت بھی بتا رہی تھی کہ اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔

"آج تمہیں تلخیِ حیات کی ایک جھلک دکھاؤں"

اچانک انہوں نے ایک غیر متوقع سا سوال کیا۔

"جھلک؟ کیا مطلب چاچو جی"

"ابھی بتاتا ہوں۔" انہوں نے آنکھ دبا کر کہا۔

اسی لمحے ارم چائے کے دو کپ لے کر آئی۔

"ارم آج ایک کام تو کرو" وہ چائے کا کپ پکڑتے ہوئے بولے۔

"جی بتایئے۔" وہ درشت لہجے میں بولی۔

انہوں نے ذومعنی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی تلخیِ حیات کی جھلک ہے۔

"بیٹا میرے بچے بیمار ہیں" وہ اپنی دوسری بیوی کے بچوں کی بات کر رہے تھے "گھر میں سودا سلف نہیں ہے۔ میں نے اپنی دوائی بھی لینی ہے۔ پرسوں تک کے لیے مجھے ایک ہزار روپیہ دے دو۔"

انہوں نے کہا اور اسے پرامید نظروں سے دیکھنے لگے۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں ابو جی" وہ کٹیلے لہجے میں بولی۔ میرے پاس پیسے کہاں سے آئے۔ آپ تو شاید آتے ہی اس لیے ہیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں نے ان کی آنکھوں میں کرب کی نمی محسوس کی۔ وہ چند لمحے بیٹی کو تاسف سے دیکھتے رہے اور پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔

"دیکھا؟ یہ ہے تلخیِ حیات کا رنگ۔ یہ وہ اولاد ہے جسے میں نے منتوں مرادوں سے لیا۔ ناز نخرے برداشت کیے۔ ہر ممکن خواہش پوری کی۔ آج اس کے پاس میرے لیے چند روپے نہیں ہیں"

مجھے واقعی بہت دکھ ہوا۔ اب سے کچھ دیر پہلے میں اس کے پرس میں اچھی خاصی رقم دیکھ چکا تھا اور وہ اپنے باپ کو دوائی کے لیے کچھ روپے دینے سے انکار کر رہی تھی۔ تو کیا یہ بھی جدید دور کے تقاضے ہیں؟ چاچو نے بتایا کہ میرا یہاں رہنا تو درکنار انہیں یہاں میرا آنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ مجھ میں برداشت کا یارا نہیں تھا۔ میں وہاں بیٹھا رہا اور پھر واپس آگیا۔

چند ہی دنوں بعد یہ روح فرسا خبر ملی کہ چاچو جی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ دیگر اقربا کے ساتھ میں بھی بروقت پہنچ گیا تھا۔ ان کی آخری تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ خاندان کے لوگ جوق در جوق آرہے تھے۔

میری ہمت نہیں ہوئی کہ آگے بڑھ کر دیکھوں کہ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہوکر کیسے لگ رہے ہیں۔ لیکن جنازہ اٹھانے کے لیے مجھے بھی آگے جانا پڑا جہاں ان کے سب عزیز اور رشتہ دار رو رہے تھے۔ دھاڑیں مار رہے تھے۔ ایک منظر نے مجھے جھنجوڑ کے رکھ دیا۔

ارم بری طرح رو رہی تھی۔ میت اٹھانے والوں کو روک رہی تھی۔ چارپائی کو چھوڑ ہی نہیں رہی تھی۔

"نہیں۔" اس نے ایک دلخراش چیخ ماری اور چارپائی سے لپٹ گئی "میں نہیں جانے دوں گی۔ میں ابو کو اپنے پاس رکھوں گی۔"

اس کے دردناک بین لوگوں کو بھی رلا رہے تھے۔ دلوں میں چھید کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔

"جب وہ زندہ تھے تو تمہیں ان کا یہاں رہنا تو کیا آنا بھی ناگوار تھا۔ اب اس بے جان وجود کو یہاں رکھ کر کیا کروں گی؟"

لیکن میں یہ سوال اس سے یا کسی سے براہ راست نہیں کر پایا۔ تدفین کے فوراً بعد میں وہاں سے نکل آیا کیونکہ اب وہاں میرا کوئی نہیں تھا۔ جو اپنوں کے نہ ہوسکے وہ کسی کے کیا ہوں گے۔ یہی زندگی ہے۔ آنے والوں کا جانا جزوِ لازم ہے۔ کاش ہم جانے والوں کو محبتیں اور وہ احترام دے سکیں جن کی انہیں ضرورت ہوتی ہے بالآخر ہم نے بھی جانا ہے۔ یہ سب کچھ یہیں کا ہے۔ یہیں رہ جانا ہے۔ سب مایا ہے۔ ہر شے فانی ہے۔ رہے نام اللہ کا۔

روشنی

قیصر عباس

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی مسیحائی کے لیے دنیا میں لاکھوں نبی اور پیغمبر مبعوث کیے، ہر نبی نے انسانوں کو ایک دوسرے کے دکھ اور پریشانیوں کو بانٹنے اور دور کرنے کا پیغام اور تعلیم دی لیکن اس کے باوجود طب کے شعبہ سے وابستہ کچھ لوگوں نے اسے آمدنی کا ذریعہ بنا دیا۔

ایک معصوم حسینہ کی روداد، وہ مسیحاؤں کے لالچ اور نااہلی کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

"آکسیجن لگانے کے باوجود بھی اسے سانس لینے میں دقت محسوس ہو رہی ہے۔" نرس نے شعبہ ایمرجنسی کے ایک سینئر ڈاکٹر سے کہا۔ ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر مریضہ کے بیڈ کے پاس آیا اس نے مریضہ کا معائنہ کیا اور نرس سے کہا۔

"آکسیجن ماسک اتار کر اسے بھاپ دو۔" نرس نے فوراً ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل کی اور بھاپ کی مشین کا ماسک آکسیجن کی جگہ لگا دیا۔ تھوڑی دیر بھاپ دینے کے بعد مشین کا ماسک مریضہ کے منہ سے ہٹا دیا گیا کیونکہ اس کی ہچکولے لیتی سانس میں اب تھوڑا ٹھہراؤ آ گیا تھا لیکن یہ ٹھہراؤ تھوڑی دیر برقرار رہا مریضہ کی سانس دوبارہ پھولنے لگی تو ڈاکٹر نے نرس کو دوبارہ بھاپ دینے کا حکم جاری کیا مگر اب کے یہ حربہ بھی کارآمد نہ رہا بھاپ دینے کے باوجود بھی مریضہ کی حالت بدستور ویسی ہی رہی۔

"اس کے پھیپھڑوں میں پانی ہے۔" ڈاکٹر کے انکشاف پر مریضہ کے پریشان حال بھائی نے جو ڈاکٹر کو مریضہ کی بگڑتی صورت حال کے بارے میں بتانے آیا تھا پریشانی سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"اس کے پھیپھڑوں سے پانی نکالنا پڑے گا۔" ڈاکٹر نے دوبارہ کہا۔

"تو کیا اسی وجہ سے اسے سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔" مریضہ کے بھائی نے پوچھا۔

"ہاں اور اگر آپ اجازت دیں گے تو ہم آگے کا کام کریں گے۔" ڈاکٹر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب اس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے آپ ڈاکٹر ہیں اور آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔" اس نے حیرانگی سے کہا۔

"دیکھیے یہ سنگین مسئلہ ہے اور ایسے مواقع پر ہمیں مریض کے لواحقین سے تحریری اجازت نامہ لینا پڑتا ہے کہ اگر دوران علاج یا آپریشن کے دوران کسی قسم کا کوئی مسئلہ درپیش آ گیا تو ڈاکٹر پر کوئی قدغن نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب لائیں کہاں دستخط کرنے ہیں میری طرف سے اجازت ہے آپ جلد سے جلد علاج شروع کیجیے پلیز۔" اس نے جلدی سے کہا اور ڈاکٹر نے قلم اور ایک فارم اس کے آگے کر دیا۔ اس نے دستخط کر دیے تو ڈاکٹر نے فارم کاؤنٹر کی ایک سائیڈ پر رکھا اور اپنی اسسٹنٹ ڈاکٹر کو ہدایت دینے لگ گیا۔ مریضہ کا بھائی چلتا ہوا مریضہ کے بیڈ کے پاس آ گیا اس کی سانس اب بھی ہچکولے لے رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر اور اس کی اسسٹنٹ ڈاکٹر مریضہ کے بیڈ کے پاس آئے اسسٹنٹ ڈاکٹر کے ہاتھ میں دو بڑی بڑی سرنجیں اور ایک تھیلی تھی۔

"اسے آرام سے اٹھا کے بٹھا دو۔" اس نے مریضہ کے بیڈ کے پاس پریشان کھڑی مریضہ کی ماں سے کہا وہ آگے بڑھی اور بیڈ پر پڑی اپنی شکستہ حال بیٹی کو سہارے سے بٹھا دیا، ڈاکٹر نے اپنی اسسٹنٹ کے ہاتھ سے ایک سرنج لی اور مریضہ کی کمر پر ایک مخصوص جگہ پر سوئی لگائی یکے بعد دیگرے دونوں سرنجیں گاڑھے مٹیالے رنگ کے محلول سے بھر گئیں تو ڈاکٹر نے اس

جگہ پر مستقل تھیلی لگا دی۔

"میں نے اس کے پھیپھڑوں سے کچھ پانی نکال کر یہ تھیلی لگا دی ہے تھوڑی دیر تک اس کے پھیپھڑوں میں موجود سارا پانی نکل آئے گا۔"

ڈاکٹر نے کہا اور ایک طرف چلا گیا مریضہ کی ماں مریضہ کو آرام سے اپنی جگہ لٹا چکی تھی۔ جوں جوں اس کے پھیپھڑوں سے پانی نکلتا جا رہا تھا اس کی سانسیں نارمل ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر جو تھیلی لگا کر گیا تھا اب آدھے سے زیادہ اسی گاڑھے مٹیالے رنگ کے سیال سے بھر چکی تھی۔ تھوڑی دیر تک اس کی سانسیں نارمل ہو چکی تھیں کیونکہ اس کے پھیپھڑوں میں موجود سارا پانی نکل چکا تھا۔

❀ …… ❀ …… ❀

"ہم تمہاری شادی کی تمام تر تیاری مکمل کر چکے ہیں۔" جہاں آرا نے پیار بھرے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا تو اس کی بات کا محور روشنی نے شرم سے سر جھکا لیا۔

"تمہاری خالہ سے بات ہو گئی ہے ہماری ان کی طرف سے بھی تقریباً تیاری مکمل ہے بس اب تو صرف ڈیٹ فکس ہونا باقی رہ گیا ہے۔" جہاں آرا نے بات ختم کر کے ڈبڈباتی آنکھوں کو صاف کیا روشنی سارے گھر کی جان تھی اس کی جدائی کا تصور ہی سب کے لیے لرزہ خیز تھا ملک احسان اور جہاں آرا کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے بعد آنے والی روشنی گھر بھر کی روشنی بن گئی تھی۔ وہ اکلوتی تو نہ تھی مگر لاکھوں میں ایک ضرور تھی گھر میں کوئی بھی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ ہوتا۔

"روشنی ایسے نہ کر لیں؟ روشنی یہ ٹھیک نہیں ہے، روشنی کیا خیال ہے؟" اور اس کی ایک "نہ" سارے گھر کی مرضی پر حاوی ہو جاتی یوں تو وہ سارے ہی گھر کی لاڈلی تھی مگر باپ کی تو جان تھی سارے گھر سارے خاندان کے لیے سخت گیر ملک احسان روشنی کے لیے دوست کی طرح تھے اور جو بات سارا گھر مل کے

بھی ان سے نہ منوا سکتا روشنی ایک پل میں منوا لیتی۔ باپ نے جسے کندھوں پر اٹھائے جوان کیا تھا اسے گھر سے وداع کرنا بہت کٹھن لگ رہا تھا مگر جانا تو تھا ملک احسان اپنی زندگی میں ہی روشنی کے فرض سے بھی سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ اپنے دونوں بڑے بیٹوں باسط اور ثامر کی شادی ایک ساتھ کرنے کے بعد اپنی بڑی بیٹی ارم کی شادی بھی وہ اپنے ہی خاندان کے ایک اچھے گھر میں کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں اور بیٹی کی شادی بڑے دھوم دھام سے کی تھی اور اب ان کے اور جہاں آرا کے ساتھ ساتھ باسط، ثامر اور ارم بھی اپنی چھوٹی بہن کی شادی پر سارے ارمان پورے کرنا چاہتے تھے کیونکہ آخر روشنی سارے گھر کی لاڈلی جو تھی۔

* * *

یہ آزاد کشمیر کا ایک خوب صورت مگر دشوار گزار علاقہ تھا جو کہ سطح سمندر سے دس ہزار فٹ بلند تھا باسط کو یہاں آئے آج آٹھواں روز تھا۔ وہ آرمی میں تھا اور اپنی سروس کا بیشتر حصہ اس نے دشوار گزار علاقوں میں گزارا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چھٹی پر بھی بہت کم جا پاتا تھا۔ اس کا یونٹ تو مظفر آباد میں تھا مگر کسی ٹیکنیکل کام کے لیے وہ دس افراد پر مشتمل ٹیم کے ساتھ پچھلے آٹھ روز سے دس ہزار فٹ بلند پہاڑ پر موجود تھا اس کا تعلق ایک ٹیکنیکل کور سے تھا اور اس یونٹ کے ساتھ اٹیچ تھا اس علاقے میں قدرتی مناظر کی بھرمار تھی۔ خوب صورت سر سبز پہاڑوں پر گنگناتے جھرنوں کا شور فضا کی خاموشیوں کو چیر کر فطرت کی رنگینیوں کو گویائی دینے کی جہد مسلسل پر کاربند تھا دور دور تک بلند و بالا چیڑ کے درختوں کا نہ ختم ہونا والا سلسلہ اور برف سے ڈھکی بلند و بالا چوٹیاں اس علاقے کو واقعی جنت نظیر بنا رہی تھیں۔ باسط اور اس کے ساتھی یہاں نصب اس سرکاری مشینری کی مرمت کے سلسلے میں آئے تھے کام اتنا زیادہ نہیں تھا مگر یہ حساس علاقہ تھا بھارت سے منسلک بارڈر ایریا تو کافی اونچائی پر تھا مگر یہاں میلوں رقبے پر موجود جنگلات اور اس میں پائی جانے والی بے شمار جنگلی حیات سے تحفظ کیلئے انہیں دس افراد کی ایک ٹیم بنا کر بھیجا گیا تھا گو اتنے دنوں سے وہ کام کم اور انجوائے زیادہ کر رہے تھے مگر ایک انتہائی اہم اور سنگین مسئلہ تھا جو انہیں یہاں درپیش تھا۔

موبائل نیٹ ورک پرابلم کا۔ باسط نے آٹھ روز پہلے مظفر آباد اپنی یونٹ سے اپنے گھر کال کی تھی روشنی کی شادی کے سلسلے میں گھر میں کافی گہما گہمی تھی۔ ملک احسان اور جہاں آرا خریداری میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہے تھے۔ ہر چیز وہ اپنی لاڈلی بیٹی کی پسند سے لے رہے تھے۔ باسط کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ نیا نیا فوج میں بھرتی ہوا تھا اور چھٹی پر گھر گیا تھا ان دنوں روشنی ابھی چھوٹی تھی۔ اس نے اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اب کی بار وہ چھٹی آیا تو اس کے لیے چابی والی گڑیا لے کر آئے گا مگر وہ بھول گیا پر روشنی کو تو یاد تھا۔ اس نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا اور نتیجتاً باسط الٹے پاؤں وہیں سے بازار گیا اور اپنی لاڈلی بہن کیلئے گڑیا لے کر آیا اس نے ایک لمبی سانس لی اور سوچا۔

”وقت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔“ اب وہ اسے ہمیشہ کیلئے اپنے گھر سے رخصت کرنے جا رہے ہیں ایک اداسی کی لہر اس کے وجود میں دوڑ گئی۔

* * *

ملک احسان اپنی موٹر سائیکل پر جا رہے تھے وہ انتہائی محتاط انداز میں ڈرائیونگ کے عادی تھے لیکن آج ان کی رفتار میں غیر معمولی تیزی تھی وہ کچھ چیزیں لینے کیلئے بازار جا رہے تھے روز مرہ ضرورت کی اکثر اشیاء تو ان کے گاؤں سے ہی مل جایا کرتی تھیں مگر زیادہ تر چیزوں کے لیے انہیں گھر سے سات کلومیٹر دور شہر آنا پڑتا تھا ان کے گھر سے تقریباً دو کلومیٹر دور ایک چوراہا تھا جہاں گاؤں کی سڑک مین ہائی وے روڈ سے مل جاتی تھی۔ وہاں سے بائیں طرف مڑ کے پانچ کلومیٹر کی مسافت پر ایک چھوٹا سا شہر تھا جہاں سے وہ اپنی ضرورت کی اکثر اشیا لیا کرتے تھے آج بھی وہ اسی طرف جا رہے تھے۔ وہ چوراہے پر پہنچ چکے تھے اب مین روڈ پر چڑھ کر انہیں بائیں طرف جانا تھا اس چوراہے پر بھی ان کے گاؤں کے کچھ لوگوں کی چھوٹی موٹی دکانیں تھیں موٹر سائیکل کے بائیں طرف والا انڈیکیٹر لگا کر انہوں نے ایک لمبا چکر کاٹ کر بائیں طرف موٹر سائیکل موڑا، اچانک ایک دھماکہ سا ہوا اور وہ اپنے موٹر سائیکل سمیت دس فٹ دور جا گرے تیز رفتاری کی وجہ سے وہ دائیں طرف سے آتی تیز رفتار کار کو نہ دیکھ سکے۔ لوگ تیزی سے جائے وقوعہ پر آ گئے۔ وہ لوگ انہیں اچھی طرح سے جانتے تھے کہ وہ ان کے گاؤں کی ایک معزز اور ہر دل عزیز شخصیت تھے۔ لوگ انہیں اٹھا کر اسپتال لے جا رہے تھے کہ وہ راستے میں ہی دم توڑ گئے۔ ان کے گھر اطلاع جانے سے پہلے ہی خون میں لت پت ملک احسان کو لوگ ان کے گھر لے آئے۔ گھر میں ایک کہرام مچ گیا، جیتے جاگتے ملک احسان کو خون میں لت پت دیکھنا کسی انہونی سے کم تھا۔ خاص طور پر روشنی کی حالت تو غیر ہو رہی تھی۔ باپ کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے جہاں باپ کو اسے خود سے دور کرنا گوارا نہیں تھا وہیں اس کے لیے بھی باپ کے بغیر رہنے کا تصور ہی جان لیوا تھا مگر اب حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا ملک احسان چارپائی پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے جہاں آرا بیگم اور روشنی اسے کئی آوازیں دے چکی تھیں۔ کتنا جھنجوڑا تھا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا اور کیسے ہوتا کہ وہ زندگی سے بہت دور جا چکے تھے۔

* * *

ملک احسان کو دنیا سے گئے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے ایک مہینے کی چھٹی پر آیا ہوا باسط واپس اپنے یونٹ اور ارم اپنے سسرال واپس چلی گئی۔ مگر روشنی اور اس کی ماں ابھی بھی اس اندوہناک حادثے سے باہر نہیں آ سکی تھیں جہاں آرا نے تو پھر بھی اپنے رفیق حیات سے فرقت کو کسی حد تک قبول کر لیا تھا مگر روشنی کے احساسات باپ کے ساتھ ہی مر چکے تھے۔

اس کا ہنسنا بولنا، کھانا پینا بڑی حد تک کم ہو گیا تھا سبھی اس کا ذہن بٹانے کی جدوجہد میں لگے رہتے تھے باسط باپ کے مرنے کے بعد گھر کا بڑا ہونے کی ذمہ داری بخوبی نبھا رہا تھا اس نے ماں اور ثامر سے کہہ رکھا تھا کہ روشنی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ وہ سب جانتے تھے کہ وہ بہت حساس ہے اور باپ سے قربت کی وجہ سے ان کی جدائی نے سب سے زیادہ اسے ہی متاثر کیا ہے وہ سب اسی کوشش میں لگے رہتے تھے کہ روشنی کا ذہن اس صدمے کے حصار سے باہر آ جائے مگر اس کے لیے تو اب دنیا اور اس کی آسائشات کا استعمال بس زندہ رہنے تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا ان کے گھر میں اب پہلی سی فضا نہیں رہی تھی۔ البتہ گھر بھر کا اب بھی وہی معمول تھا کہ کوئی بھی کام روشنی کی مرضی کے بغیر نہ ہوتا۔

* * *

ثامر ابھی ابھی دکان سے گھر واپس آیا تھا ملک احسان نے یہ دکان ایک سرکاری ادارے سے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے ریٹائرمنٹ کے بعد ڈالی تھی گھر سے چند کوس دور واقع یہ بڑی سی دکان چلانا جب ملک احسان کے لیے مشکل ہو گیا تو ثامر نے دکان چلانے میں باپ کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ آخر کار دکان مکمل طور پر ثامر کے زیر اثر چھوڑ کر ملک احسان کم کم نظر آنے لگ گئے۔

”روشنی۔“ اس نے آتے ہی روز کی طرح آواز لگائی اس کی آواز پر روشنی کے ساتھ ساتھ ان کی ماں بھی کمرے سے باہر آ گئی روشنی کی زرد رنگت اور ماں کی خاموشی نے ثامر کو کسی خطرے کا احساس دلایا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے ان دونوں سے پوچھا اور چھ سات دنوں سے جس بات کو انہوں نے معمولی سمجھ کر خود تک محسوس رکھا تھا اب ثامر کو بتادی۔

”روشنی پیٹ کی داہنی طرف کسی درد کی شکایت کر رہی ہے اور یہ تقریباً چھ سات دنوں سے ہے۔“

”اور آپ مجھے اب بتا رہی ہیں۔“ ثامر نے درشت لہجے میں ماں سے کہا۔

”ہم نے اسے معمولی پیٹ کا درد سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا مگر درد جوں کا توں ہی ہے۔“ جہاں آرا نے بات ختم کر کے روشنی کے زرد چہرے کو دیکھا۔

”چلو ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ ثامر ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ روشنی کو لے کر گھر کے قریب واقع ایک کلینک پر آ گیا۔

”مجھے لگتا ہے انہیں اپینڈکس ہے۔“ ڈاکٹر نے علامات دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ فوراً اسپتال جا کر الٹرا ساؤنڈ کرائیں۔“ ڈاکٹر کی بات پر روشنی پریشان ہو گئی۔

”بھئی اتنی بڑی بات نہیں ہے معمولی سا تو آپریشن ہوتا ہے اپینڈکس کا۔“ ثامر اسے گھر آنے تک تسلیاں دیتا رہا۔ مگر وہ معمولی سا آپریشن بھی روشنی کے ساتھ ساتھ گھر کے سبھی افراد کیلئے بڑا تھا کیونکہ وہ تو اس کی معمولی سی تکلیف بھی نہیں دیکھ سکتے تھے مگر دوسرے دن الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ نے انہیں اور زیادہ پریشان کر دیا جسے ان کے گاؤں کا ڈاکٹر اپینڈکس سمجھ رہا تھا وہ رسولی تھی۔

الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ جہاں آرا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔

”ایسا اکثر عورتوں کے ساتھ ہو جاتا ہے کسی بہت زیادہ اسٹریس یا صدمے کی وجہ سے ان کے پیٹ میں رسولی بن گئی ہے۔ آپ جلد سے جلد ان کا آپریشن کروایے رسولی سے کینسر تک کا فاصلہ بہت تھوڑا ہوتا ہے۔“ اور کینسر کے نام پر ہی ان کے دل دہل گئے ثامر اور اس کی ماں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر روشنی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کو ایک بہت بڑے سرکاری اسپتال لے گئے یہ اسپتال ان کے گھر سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور تھا چیک اپ کے بعد انہیں دوسرے دن آنے کیلئے کہا گیا۔ دوسرے دن باسط بھی چھٹی لے کر آ گیا ثامر کو گھر میں ہی رہنے کا کہہ کر باسط خود انہیں لے کر اسپتال گیا اس دن روشنی کو ایڈمٹ کرلیا گیا ایک ہفتے کے بعد اس کا آپریشن ہوا جو کہ ڈاکٹروں کے مطابق کامیاب ترین آپریشن تھا اور آپریشن سے ٹھیک تین دن بعد اسے اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔

”آپ کو جو دوائیں لکھ کر دی ہیں وہ استعمال کرائے بس ایک ماہ بعد آپ کو ٹانکے اتروانے کے لیے آنا پڑے گا۔“ راؤنڈ پر آئی ہوئی وارڈ کی سینئر ترین ڈاکٹر سائرہ قدوسی نے باسط سے مخاطب ہوکر کہا روشنی کا آپریشن انہوں نے کیا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب اب پریشانی کی تو کوئی بات نہیں ہے ناں؟“ باسط نے سوال کیا۔

”اب کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے رسولی کے آپریشن میں اگر کوئی کمی بیشی رہ جائے تو پیچیدگی کا امکان ہوتا ہے مگر ان کا تو بہت کامیاب آپریشن ہوا ہے کسی مسئلے کا ایک فیصد بھی امکان نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے مکمل یقین دہانی کرائی وہ گھر آگئے۔ روشنی باقاعدگی سے دوائیں استعمال کرتی رہی مگر زخم کی جگہ سے تھوڑا تھوڑا خون رستا رہا۔ مگر زخم ابھی ہرا ہے سوچ کر وہ اسے نظر انداز کرتے رہے پھر جب ایک ماہ بعد وہ ٹانکے اتروانے کیلئے دوبارہ اس بڑے سرکاری اسپتال گئے تو ثامر نے ڈاکٹر سائرہ قدوسی سے پوچھا کہ ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی زخم سے خون رسنے کا معمول جاری ہے مگر اس نے اسے معمولی بات قرار دیا اور مزید کچھ دوائیں لکھ کر دے دیں وہ پھر گھر واپس آگئے مگر دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرتے رہنے کے باوجود زخم ہرے کا ہرا رہا بلکہ اب تو روشنی کو ہلکا ہلکا درد اور پیٹ کے داہنی طرف اسی جگہ دوبارہ وہی بوجھ محسوس ہونا شروع ہوگیا جو آپریشن سے پہلے ہوتا تھا یہ رسولی کے آپریشن سے ٹھیک دو مہینے بعد کی بات ہے ثامر روشنی کو لے کر اسی سرکاری اسپتال گیا جہاں سے دو ماہ پہلے انہوں نے الٹراساؤنڈ کروایا تھا دوبارہ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ ان پر بجلی بن کے گری۔ روشنی کے پیٹ میں دوبارہ رسولی بن رہی تھی اور لیڈی ڈاکٹر کے مطابق اس کی رفتار پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ بے حد حیران تھی کہ آپریشن کے بعد یہ دوبارہ کس طرح بننا شروع ہوگئی ہے۔ وہ بھی اتنے بھیانک روپ میں اس نے صاف لفظوں میں انہیں بتایا کہ یہ سب سراسر اس بڑے سرکاری اسپتال کے عملے کی بے پروائی اور نااہلی کی وجہ سے ہوا ہے اس نے خبردار کیا اور دوبارہ جلد سے جلد اسی سرکاری اسپتال میں اسے لے جانے کیلئے کہا۔

”یہ ان کا ہی بگڑا ہوا کیس ہے اور ان کے علاوہ کوئی بڑے سے بڑا اسپتال بھی آپ کا کیس لینے کیلئے تیار نہیں ہوگا۔“ انہوں نے ثامر سے کہا۔ ثامر اور جہاں آرا بیگم روشنی کو دوبارہ اسی سرکاری اسپتال میں لے گئے جو ان کے گھر سے چالیس کلومیٹر کی مسافت پر تھا مگر جب وہ اسے لے کر شعبہ ایمرجنسی گئے کہ روشنی کو ایمرجنسی میں فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی تو وہاں کوئی بھی ان کی بات سننے کیلئے تیار نہیں تھا وہاں کے تمام ڈاکٹرز یہ کہہ کر اپنی جان چھڑانے کے چکر میں تھے کہ یہ ان کا کیس نہیں ہے۔ وہ انہیں گائنی وارڈز میں لے جائیں جہاں اس کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ اسے لے کر گائنی وارڈز میں گئے مگر وہاں کے ڈاکٹرز نے اسے ایمرجنسی کیس کہہ کر شعبہ ایمرجنسی میں لے جانے کے لیے کہا وہ ڈاکٹر سائرہ قدوسی سے بھی ملے مگر اس نے بھی ان کی بات سننے سے انکار کردیا وہ بھی وہاں کے باقی ڈاکٹرز کی طرح اسے ایمرجنسی والوں کا ہی کیس کہہ رہی تھی۔ وہ عجیب و غریب صورت حال میں مبتلا ہوگئے تھے۔ ایمرجنسی کے ڈاکٹرز اسے گائنی وارڈز میں لے جانے کا کہہ رہے تھے اور گائنی وارڈز والے شعبہ ایمرجنسی میں وہ اسے لے کر دوبارہ شعبہ ایمرجنسی گئے مگر وہاں کے ڈاکٹرز سے لے کر نرسز تک انہیں یکسر نظر انداز کرتے نظر آئے۔

* * *

روشنی کی حالت ایسی تھی کہ اسے ایمرجنسی میں فوری ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ مگر یہاں تو کوئی اس کی طرف توجہ دینے کیلئے بھی تیار نہیں تھا۔ وہ سب بے حد پریشان تھے وہ ایسی حالت میں اسے گھر واپس بھی نہیں لے جاسکتے تھے انہوں نے ایک کونے میں پڑے گرد آلود پرانے سے اسٹریچر پہ اسے لٹا رکھا تھا آس پاس تیزی سے گزرتے ڈاکٹرز اور نرسز کی عدم توجہی اور روشنی کی حالت سے ثامر اور اس کی ماں کے چہرے زرد ہو رہے تھے اور ایسی صورت حال میں جب کوئی ان کی دہائی سننے کیلئے تیار نہیں تھا ایک مہربان صورت ڈاکٹر ان کی طرف متوجہ ہوا وہ اس مصیبت کی گھڑی میں انہیں کوئی فرشتہ لگ رہا تھا اس مہربان صورت ڈاکٹر کا نام شفیق تھا وہ اپنے نام کی طرح ہی شفیق انسان تھے انہوں نے توجہ سے ان کی ساری بات سنی اور شعبہ ایمرجنسی کا ایک سینئر ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے روشنی کو ایمرجنسی میں فوری ٹریٹمنٹ دلائی مگر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے جب روشنی کی حالت تھوڑی سی سنبھل گئی تو انہوں نے اسے گائنی وارڈز میں لے جانے کیلئے کہا۔ ان کے بقول یہ ان کا ہی کیس تھا اور وہ ہی اسے ہینڈل کر سکتے تھے وہ اسے لے کر دوبارہ گائنی وارڈز گئے۔ ثامر نے وارڈ کی سینئر ترین ڈاکٹر سائرہ قدوسی کو یاد دلایا کہ دو ماہ قبل اس نے کہا تھا کہ اب کسی پیچیدگی کا ایک فیصد بھی امکان نہیں ہے تو اتنے کم عرصے میں یہ رسولی دوبارہ اتنی خطرناک شکل میں کیسے ابھر آئی ہے؟ تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ گئی۔ اس نے اس سارے مسئلے میں انہیں ہی قصوروار ٹھہرا دیا کہ ان کی ہی کسی غلطی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے مگر اب وقت بحث کا نہیں تھا روشنی کی حالت کافی خراب تھی اس کا پیٹ روز بروز سوجتا جا رہا تھا ثامر ان کی منت سماجت کرنے لگا مگر وہ اسے اب بھی ایمرجنسی کا کیس کہہ کر اپنی جان چھڑانے کے چکر میں تھے۔ انہیں نہ تو روشنی کی گمبھیر حالت دکھائی دے رہی تھی اور نہ ہی ثامر اور اس کی ماں کے چہرے کی زرد رنگت، ثامر کو پھر اسی مہربان صورت ڈاکٹر کا خیال آیا وہ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر جلدی سے شعبہ ایمرجنسی کی طرف آیا ڈاکٹر شفیق کو ڈھونڈنے کے بعد اس نے گڑگڑا کر ان سے التجا کی اور کہا کہ انہیں مسیحائی کے اس جہان میں ایک وہ ہی مسیحا لگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر شفیق نے اسے تسلی دی اور ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کرائی اس نے گائنی وارڈز کی سینئر ڈاکٹر سے فون پر بات کی اور ثامر سے دوبارہ وہاں جانے کے لیے کہا۔

”میں نے ان سے بات کرلی ہے اب وہ آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔“ ثامر نے ان کا شکریہ ادا کیا اور دوبارہ گائنی وارڈز کی طرف آ گیا اب کی بار وہاں موجود ایک ڈاکٹر نے روشنی کا تفصیلی معائنہ کیا اور خون کا ایک ٹیسٹ لکھ کر دے دیا۔ ثامر نے ایک وہیل چیئر کا بندوبست کیا اور روشنی کو لے کر تھوڑے سے فاصلے پر موجود لیبارٹری کی طرف آ گیا۔ وہاں موجود عملے نے خون کے ٹیسٹ کیلئے خون کا سیمپل لیا اور کہا کہ رپورٹ دو دن کے بعد ملے گی۔ مزید دو دن کا انتظار اور اتنی مسافت کا سفر، مگر چار و ناچار وہ واپس آگئے ان کے واپسی کے سفر سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے روشنی کے پیٹ میں موجود رسولی کی بڑھوتری نے اپنا سفر جاری رکھا اور ان دو دنوں میں اس نے اپنی تخریب کاری کا دائرہ اتنا وسیع کرلیا کہ معدہ کو اپنی لپیٹ میں لے کر خوراک کا سارا نظام درہم برہم کردیا نتیجتاً کھائی اور پی جانے والی خوراک کا بیشتر حصہ معدے تک پہنچ کر واپس آنا شروع ہوگیا دو دن بمشکل گزار کر ثامر رپورٹ لینے کیلئے اسپتال گیا مگر وہ رپورٹ جب اس نے ایک ڈاکٹر کو دکھائی تو اس نے سی ٹی اسکین کے لیے روشنی کو اسپتال لانے کے لیے کہا اس دن ثامر گھر واپس آ گیا اگلے دن وہ روشنی کو لے کر دوبارہ اسپتال آیا ان کی والدہ بھی ان کے ساتھ تھی روشنی کا سی ٹی اسکین ہوا اور اب کی بار رپورٹ لینے کے لیے دس دن کا وقت دے دیا گیا۔ اس نے پریشانی کے ساتھ اپنی لاڈلی بہن کی طرف دیکھا جو آئے دن کمزور سے کمزور اور زرد پڑتی جارہی تھی اور اس کا پیٹ تھا کہ پھولتا چلا جارہا تھا مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے یہ کیس اتنا بگڑ چکا تھا کہ اس اسپتال کے علاوہ کوئی بڑے سے بڑا اسپتال بھی ان کا کیس لینے کیلئے تیار نہیں تھا وہ بے بس تھے اس لیے پھر گھر واپس آگئے روشنی کی حالت ہر گزرتے دن کے ساتھ خراب سے خراب تر ہوتی چلی جارہی تھی اس کا نظام انہضام مکمل طور پر اس بیماری کی لپیٹ میں آچکا تھا اب خوراک اس کے حلق سے بھی نیچے اترنے سے قاصر تھی اور ان دس دنوں کے گزر

آزادی

”سنو؟“

”ہاں!“ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

”تمہاری نظر میں آزادی کیا ہے اور کتنی ضروری ہے؟“

میں نے دور آسمان پر اڑتے پرندے پر نظر جمائی۔

”کیسی بات کرتے ہو یار؟“

اس نے مجھے گھورا۔

”آزادی اتنی ہی ضروری ہے جتنی سانس ہر انسان ہر جاندار کے لیے ضروری ہے۔“

اس کے جوش بھرے لہجے پر میری نظروں کے آگے کسی کے ساتھ اس کا رویہ گھوم گیا میں نے گہری سانس لی اور اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور دھیرے سے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے کان کے قریب بڑبڑایا۔

”تو کیا اس فہرست میں عورت نہیں آتی؟“

ماہ رخ علی

وہ اس قدر لاغر ہوگئی کہ بغیر سہارے کے چلنے کے قابل نہ رہی اور پھر جس دن انہوں نے اسے اسپتال لے جانا تھا اس سے ایک دن پہلے اس کی طبیعت بے حد بگڑ گئی اسے سانس لینے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ رات کو ہی اسے لے کر اسپتال آگئے۔ اسے شعبہ ایمرجنسی لے جایا گیا ڈاکٹروں کے مطابق اس کے پھیپھڑوں میں پانی تھا ثامر سے اجازت نامہ پر دستخط کرانے کے بعد انہوں نے روشنی کے پھیپھڑوں سے سارا پانی نکال لیا تھا ساری رات کرب میں گزری، صبح روشنی کی طبیعت نارمل ہو چکی تھی۔ ثامر سی ٹی اسکین کی رپورٹ لے کر دوبارہ روشنی کو چیک اپ کے لیے لے گیا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد ثامر سے کہا۔

”آپ کی مریضہ کو کینسر ہے اور اس کے علاج کے لیے جو انجکشن لگائے جائیں گے انہیں برداشت کرنے کے لیے ان میں اتنی طاقت نہیں ہے۔“

”مگر ڈاکٹر صاحب علاج میں اتنی تاخیر کی وجہ سے ہی تو ان کی حالت ایسی ہوگئی ہے۔“ ثامر نے جواباً کہا۔

”دیکھیے جب تک ہمیں مکمل تشخیص نہیں ہو جاتی تب تک ہم ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔“

”چاہے تب تک مریض مر جائے۔“ ثامر نے ڈاکٹر کی بات کے جواب میں زور سے کہا۔

”چاہے مر جائے ہم مکمل تشخیص کے بغیر علاج نہیں کر سکتے۔“

”ایک مہینے سے آپ ہمیں مختلف ٹیسٹ لکھ لکھ کر دیتے جا رہے ہیں اور ہر ٹیسٹ کی رپورٹ لینے کے لیے ہم نے دو دو دن، تین تین دن اور ہفتہ ہفتہ انتظار کیا ہے اور اب جا کر آپ کی تشخیص اس صورت میں جا کے مکمل ہوئی ہے کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ ہماری مریضہ آپ کے علاج کی بھی متحمل نہیں ہے۔“

”دیکھیے یہی طریقہ کار ہے یہاں کا، اب آپ خون کا انتظام کیجیے پہلے ان کی خون کی کمی پوری کی جائے گی اس کے بعد علاج شروع ہوگا۔“ ڈاکٹر نے ثامر کی بات سے لاجواب ہو کر کہا۔ ثامر نے ایک نظر اس سنگ دل مسیحا کی طرف دیکھا اور باہر نکل آیا اس نے سارا دن بھاگ دوڑ کے بعد مطلوبہ خون کا انتظام کر لیا۔ وہ روشنی کو وہیل چیئر پر بٹھا کر ایمرجنسی کی طرف لے آیا ان کی ماں جہاں آرا بھی ساتھ تھیں۔ روشنی کو ایک، دو اور تیسری بوتل ختم ہوئی ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ اب ان کی خون کی مطلوبہ کمی پوری ہوگئی ہے وہ اسے لے جا سکتے ہیں مگر اب شام ہو چکی تھی گائنی وارڈز کے تمام ڈاکٹر دوپہر دو بجے کے بعد چلے جاتے تھے اس کے بعد کسی مریض کا ایڈمیشن ممکن نہیں تھا، وہ گھر واپس بھی نہیں جا سکتے تھے کیونکہ یہاں سے اتنی دور واپس جانا اور پھر علی الصبح آنا بہت مشکل تھا انہوں نے اسپتال سے تھوڑی دور واقع ایک ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے کر رات وہاں بسر کی۔ صبح پھر روشنی کو لے کر وہ گائنی وارڈز کی طرف آئے ڈاکٹرز نے اس کا چیک اپ کیا اور دوبارہ خون کا ایک ٹیسٹ لکھ کر دے دیا۔ اس ٹیسٹ کی رپورٹ ملتے ملتے دوپہر دو بجے سے اوپر ہوگیا اور اس دن بھی روشنی کا ایڈمیشن نہ ہو سکا ثامر اور جہاں آرام بیگم بے بسی اور افسردگی کے ساتھ روشنی کے پژمردہ چہرے کی طرف دیکھتے جسے ایک کانٹا لگنے پر بھی سارا گھر بے چین ہو جایا کرتا تھا آج اس قدر تکلیف میں علاج تو درکنار وہ اسے وہیل چیئر پر بٹھائے اِدھر سے اُدھر اور کبھی اُدھر سے اِدھر لے جا رہے تھے مگر وہ مجبور اور یہاں کے نام نہاد مسیحاؤں کے رحم و کرم پر تھے انہوں نے رات پھر ہوٹل میں بسر کی۔ انہیں پتا تھا کہ صبح پھر جب وہ روشنی کو چیک اپ کے لیے جائیں گے تو وہاں کے ڈاکٹرز انہیں پھر کوئی ٹیسٹ لکھ کر دے دیں گے۔ وہ جان بوجھ کر وقت ضائع کر رہے تھے اسی لیے اس رات وہ اس سرکاری اسپتال کے ایم ایس ڈاکٹر کے پرائیویٹ اسپتال میں گئے ایک ہزار روپے فیس دے کر انہوں نے ان سے صرف یہ درخواست کی کہ وہ روشنی کا ایڈمیشن کرا دیں اور پھر دوسرے دن اسے اسپتال میں ایڈمٹ کر لیا گیا اور اسی دن پھر اسے خون کی ایک بوتل لگوانے کے بعد بالآخر انجکشنز لگا دیے گئے۔

❀ …… ◉ …… ❀

”مگر ہمیں پہلے دن سے پتا تھا کہ اس لڑکی کو کینسر ہے اور وہ بھی اس اسٹیج پر کہ جب علاج کارگر ثابت نہیں ہوگا اسی لیے ہم جان بوجھ کر وقت ضائع کرتے رہے۔“ ڈاکٹر سائرہ قدوسی نے ایم ایس ڈاکٹر ریحان سے کہا۔

”لیکن آپ نے یہ بات ان کے لواحقین کو پہلے کیوں نہیں بتائی؟“ ایم ایس ڈاکٹر نے کہا۔

”اس لیے کہ سارا الزام ہم پر آتا تھا ہماری ہی غفلت کی وجہ سے ایک ماہ کی رسولی، جس کا آپریشن ہوا تھا دو ماہ کے اندر اندر اتنی خطرناک شکل اختیار کر گئی۔“ ایم ایس ڈاکٹر نے ڈاکٹر سائرہ قدوسی کی بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلایا۔

”آپریشن میں کمی بیشی کی وجہ سے ہی رسولی دوبارہ کینسر کی صورت میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔“ ڈاکٹر سائرہ قدوسی لمحے بھر کے لیے رکی اور دوبارہ گویا ہوئی۔

”ہم نے اس کی فائل تیار کر لی ہے اور اس میں واضح طور پر درج کر دیا ہے کہ اس کے لواحقین کی عدم احتیاط سے یہ سب کچھ ہوا ہے اور یوں ہمارے ہاتھ بالکل صاف ہوگئے ہیں۔“ اس نے بات کے اختتام پر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اور اس کی بات سن کر ڈاکٹر ریحان بے اختیار مسکرا دیے۔

❀ …… ◉ …… ❀

انجکشنز لگنے کے بعد روشنی غنودگی کی کیفیت میں رہنے لگ گئی تھی کینسر کے طاقت ور انجکشنز نے اس کے دماغ کو ہپناٹائز کر دیا تھا اور پھر کافی دنوں سے ایک قطرہ آب بھی اس کے حلق کی باؤنڈری کراس نہیں کر پایا تھا شدید بھوک اور پیاس نے اس کے جسم سے گوشت ہضم کر لیا تھا نتیجتاً وہ ہڈیوں کے ڈھانچے کی شکل اختیار کر گئی تھی گو کہ اس کی کمزوری دور کرنے کے لیے اسے یکے بعد دیگرے چار بوتلیں خون کی لگ چکی تھیں مگر پھر بھی وہ ان طاقتور انجکشنز کو سہنے کے قابل نہ تھی کچھ دیر غنودگی میں رہنے کے بعد جب وہ ہوش میں آتی تو بے سروپا باتیں شروع کر دیتی مگر ان بے سروپا باتوں میں ایک بات ایسی بھی تھی جو بے سروپا نہ تھی وہ اک التجا تھی مگر اسے پورا کرنا ثامر اور جہاں آرا کے بس میں نہ تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنی ماں اور ثامر کو پہچان کر خشک لبوں سے ”ایک گھونٹ پانی دے دو“ کی صدا بلند کرتی، وہ باری باری ان دونوں کے چہروں کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتی اور دوبارہ غنودگی میں چلی جاتی اس اک لمحے میں انہیں اس کے چہرے پر دنیا جہاں کی حسرت سمٹتی دکھائی دیتی اور ان کی آنکھوں سے آنسو نکل کر ان کے رخساروں کو تر کرنے لگ جاتے مگر وہ بے بس تھے ڈاکٹر نے انہیں روشنی کو پانی پلانے سے سختی کے ساتھ منع کیا تھا اور پھر ویسے بھی اس کے حلق سے نیچے کا جسم اس قدر تباہ ہو چکا تھا کہ پانی اس کے حلق سے نیچے ہی کب جا پاتا تھا اور وہ جو روشنی کے ایک اشارے پر اس کے سامنے دنیا جہاں کی چیزیں ڈھیر کر دیتے اور اس کی ہر فرمائش لمحوں میں پوری کر دیا کرتے تھے آج اسے ایک گھونٹ پانی دینے کے بھی قابل نہ تھے۔ وہ دن اور ساری رات روشنی اسی کیفیت میں رہی۔ اگلی صبح ان کا بڑا بھائی باسط بھی آن پہنچا اسے بڑی مشکل سے پندرہ دنوں کی چھٹی ملی تھی۔ اتنے دن اس نے گویا سولی پر کاٹے تھے وہ سب

طرح تڑپ رہے تھے مگر اپنی لاڈلی کو تکلیف میں بے بسی سے تڑپتا دیکھتے رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس دن روشنی مکمل ہوش و حواس میں تھی۔ اس نے بڑے بھائی کی آواز پر آنکھیں کھولیں اور والہانہ انداز میں اسے پکارا مگر اس کی آواز بہت دھیمی تھی۔ باسط نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دی کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ بھائی کی بات پر اس کے لبوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں کہ جیسے وہ بہت تھک چکی تھی ایک لمبی اور تکلیف دہ مسافت پر چلتے چلتے خار زار راہ سے اس کا دامن چھلنی ہو چکا تھا اور وہ اپنے نشتر زدہ وجود کے کرب سے ہمیشہ ہمیشہ کے آرام کی متلاشی تھی۔ اس نے جیسے اپنے سفر کا ارادہ بڑے بھائی کے دیدار تک روک رکھا تھا اس نے چند لمحوں کے بعد دوبارہ آنکھیں کھولیں مگر اب کی بار اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نہیں تھی ثامر بھاگ کر ڈاکٹر کو بلانے گیا مگر جب وہ ڈاکٹر کے ساتھ واپس آیا تو ان کی روشنی ان کی زندگی میں اندھیرے چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھی۔ ان کی ماں جہاں آرا بیگم سسکیوں کے درمیان مسلسل روشنی کو پکارے جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ وہ تو اسے سرخ جوڑے میں وداع کرنے والے تھے اس نے کیوں اپنے لیے سفید کفن کا انتخاب کر لیا؟ مگر روشنی چپ تھی وہ کیا جواب دیتی کہ وہ تو اپنے پیارے باپ کے پاس جا چکی تھی کہ جس کی فرقت کے شدید غم نے ہی اس کے پیٹ میں رسولی کو جنم دیا تھا مگر ہر غم کا مداوا اور ہر کرب کا علاج ممکن نہیں۔ پر جہاں پر مسیحا ہی قاتل بن جائیں وہاں علاج سے لاعلاج ہونے تک بہت تھوڑا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے۔ خود اپنی ہی غفلت کے نتائج سے بچنے کے لیے وہ ان درد کے ماروں کے ساتھ بے اعتنائی برتتے رہے اور جان بوجھ کر وقت ضائع کرتے رہے اس بات کی پروا نہ کرتے ہوئے کہ ہر گزرتا دن ان دریدہ دلوں کی ٹیسوں میں کس قدر اضافہ کرتا چلا جا رہا ہے یہ تو صرف ایک گھر کی کہانی ہے ایسے نام نہاد مسیحاؤں کی غفلت اور بے پروائی سے ہر روز جانے کتنے گھروں کی روشنیاں یونہی بجھ جاتی ہوں گی۔

قسط نمبر1

عورت زاد

امجد جاوید

عورت زاد! کہانی ہے اس حسینہ کی جسے اِس ظالم معاشرے نے جنم دیالیکن اُس نے ظلم قبول نہ کیا اور ظالم کے خلاف بغاوت کر دی۔ آہنی ارادوں والی اس ریشم بدن نے زمانے کے بھگنٹ گھوڑے کی لگامیں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس پر سوار ہو کر وقت کو اپنا قیدی بنالیا۔ اس کا مقصد حقیقی عورت کو آزاد کرنا تھا۔ جس کے لئے وہ خودحالات کی بنائی ہوئی سنگلاخ راہوں چل پڑی۔ آبلہ پائی کے اس سفر میں آگ اورخون سے گذر کر اپنی منزل کی طرف گامزن رہنے والی برق صفت دلربا کو، صنف نازک اپنا مسیحا ماننے لگیں۔ ایک عورت زاد کی سرگذشت، جوباغی دلوں پر حکومت کرناجانتی تھی۔

قارئین کے پسندیدہ قلم کار محترم امجد جاوید کے قلم سے نئے افق کے قارئین کے لیے ہنگامہ خیز سلسلے وار کہانی۔

آسمان پر چاند روشن تھا۔ جس کی کرنیں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی لہروں پر مچل رہی تھیں۔ دور تک دریا کنارے ملگجا اندھیرا تھا۔ گھاس پھوس، سرکنڈے، جھاڑیاں اور درختوں پر پڑتی ہوئی چاندنی نے ماحول کو پراسرار بنا دیا تھا۔ ایک جگہ دریا کنارے سے ذرا ہٹ کر تھوڑے سے فاصلے پر موجود سردار مٹھن خان کا ڈیرہ تھا۔ جس پر لگی ہوئی سرچ لائٹس ساری رات روشن رہتیں۔

ڈیرے پر موجود برجیوں میں گارڈ بیٹھے رہتے۔ وہ ہیولوں کی طرح دکھائی دینے والے گارڈ اُن سرکنڈوں، درختوں اور جھاڑیوں کی نگرانی کرتے رہتے، جہاں تک روشنی پڑتی تھی۔ ویسے بھی اس پورے علاقے میں کسی کی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس ڈیرے کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ کیونکہ سردار مٹھن خان کا یہ ڈیرہ دہشت کی علامت تھا۔ جہاں ہر وقت مجرموں اور اشتہاریوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ دریا کا یہ کنارہ ڈیرے کی پشت پر پڑتا تھا۔ ڈیرے کی پشت سے دریا تک پھیلی ہوئی ریتلی زمین بھی اسی ڈیرے کا حصہ سمجھی جاتی تھی۔ وہ اسی حصے کو محفوظ بھی خیال کرتے تھے لیکن ان کی نگرانی اسی طرف اتنی ہی تھی، جتنی وہ دوسری طرف رکھتے۔

اس علاقے میں دہشت کی علامت سردار مٹھن خان کا عام عوام پر تو خوف تھا ہی، پولیس اور دوسری فورسز بھی اس پر ہاتھ ڈالنے سے کتراتی تھی۔ وہ اس علاقے کا ایم این اے تھا اور پورے علاقے میں اپنا اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اپنی حفاظت سے غافل تھا۔ اس کی مرضی کے بغیر وہاں نہ کوئی آ سکتا تھا اور نہ کوئی جا سکتا تھا۔ خطرناک مجرموں اور اشتہاریوں کے علاوہ اس کے اپنے بندے بھی وہاں موجود رہتے تھے۔ اسے مختلف نسل کے خطرناک کتے پالنے کا بھی شوق تھا۔ جو وہاں کی سب سے بڑی سیکورٹی تھے۔ وہ انسانوں پر کم اور کتوں پر زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔

رات کے اس وقت چاندنی بھرے ماحول اور ڈیرے سے چھن کر آنے والی اسی ملگجی روشنی میں دریا کنارے لکڑیوں کی آگ روشن تھی۔ جس کے اردگرد وہ چاروں لڑکے کچھ دیر پہلے ہی آ کر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں جام تھے۔ آگ کے شعلوں سے اٹھنے والی روشنی میں ان کے چہرے واضح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دریا کنارے ریت پر بیٹھے ہوئے تھے اور ساتھ میں دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ان کے پاس شراب کی بوتلیں اور کھانے کی چیزوں سے بھری پلیٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ ابھی وہ پوری طرح موج میں نہیں تھے۔ ان پر نشہ طاری نہیں ہوا تھا۔ وہ اونچی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے، کبھی زور زور سے ہنسنے لگتے، کبھی غلیظ گالیاں اور کبھی غصہ میں اول فول بکنے لگتے۔ انہی میں سردار مٹھن خان کا بیٹا فرحان خان تھا۔ باقی تینوں اس کے دوست تھے، جو ڈیرے پر عیاشی کرنے آئے ہوئے تھے۔ لیکن انہیں نہیں پتہ تھا کہ ان سے تھوڑے ہی فاصلے پر موت گھات لگائے بیٹھی ہے۔

ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا، دہشت کی علامت اس ڈیرے اور نشے میں دھت ان لڑکوں سے کافی فاصلے پر وہ اندھیرے میں سرکنڈوں کے درمیان دبکی بیٹھی تھی۔ وہ بڑے محتاط انداز سے کچھ فاصلے پر موجود لڑکوں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ اس نے ٹائیٹ جین اور ٹی شرٹ پر سلیولیس اپر نما جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کی جیبوں میں دو پسٹل اور پشت پر گن کے علاوہ کافی کچھ بھرا ہوا تھا۔ اندھیرے میں اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن جسم کی ساخت سے لگ رہا تھا کہ وہ دراز قد نوجوان لڑکی ہے۔ اس نے اپنے بال پونی میں باندھے ہوئے تھے جو اس کی ٹوپی میں سے جھلک رہے تھے۔ وہ چند لمحے وہیں دبکی ہوئی سامنے دیکھتی رہی پھر دھیمے دھیمے سرکتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی۔ چند میٹر فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک جھاڑی کی اُوٹ میں دُبک کر پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس کا انداز ایسے تھا، جیسے بلی اپنے شکار پر جھپٹنے سے پہلے شست باندھتی ہے۔ جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی، وہاں سے بہتے ہوئے دریا کا کنارہ تقریباً سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ وہ جھاڑی میں چند لمحے دبکی رہی۔ اسے ایک خاص وقت کا انتظار تھا۔

وہ خان فرحان کو پہچان چکی تھی۔ اس کی چال ڈھال اور ملگجے اندھیرے میں چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ چکی تھی۔ عیاش باپ کا بگڑا ہوا بیٹا، وہی اس کا اصل ٹارگٹ تھا۔ باقی تینوں اس کے وہ دوست تھے، جن کی ضرورت ہر امیر زادے کو ہوتی ہے کہ وہ کھانے پینے، عیاشی اور تحفظ کے عوض اس کی خدمت میں لگے رہیں۔ وہ تینوں بھی معمولی گھر کے نہیں تھے۔ فہد ایک سرکاری آفیسر کا بیٹا تھا، ریاض اور بابر شہر کے کاروباری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تینوں کا تعلق کالج سے شروع ہوا تھا۔ خان فرحان کو اپنے اردگرد وفاداروں کی ضرورت تھی اور ان تینوں کو ایک مضبوط سہارے کی، یوں یہ گروپ کالج میں دہشت کی علامت بن گیا۔ جس کی شہرت کالج کی چاردیواری سے نکلی اور شہر بھر میں پھیل گئی۔ غنڈہ گردی سے شروع ہونے والا کھیل ایک گروہ بن گیا۔ جو دن بدن پورے علاقے میں اپنی دھاک بٹھانے کے ساتھ ساتھ ہر آمدنی والی جگہ پر قبضہ جمانے میں لگ گیا۔ خان فرحان کو اپنے باپ مٹھن خان کی پوری حمایت ہی نہیں آشیرواد بھی حاصل تھی۔

زیادہ وقت نہیں گذرا تھا، ڈیرے کی پچھلی طرف کا گیٹ کھلا اور اس میں سے دو آدمی نکلے۔ انہوں نے ایک نازک سی لڑکی کو پکڑا ہوا تھا۔ وہ لڑکی ان دونوں آدمیوں کے چنگل میں ماہی بے آب کی مانند تڑپ رہی تھی۔ اس کے بدن پر بہت مختصر لباس تھا۔ ان دو آدمیوں نے وہ لڑکی ان چاروں لڑکوں کے پاس یوں پھینکی جیسے کتوں کے آگے راتب پھینکا جاتا ہے۔ وہ آدمی لڑکی کو وہیں چھوڑ کر پلٹ گئے۔ سہمی ہوئی لڑکی ان چاروں کو ہونقوں کی طرح دیکھنے لگی تھی جیسے وہ ہوش میں نہ ہو۔ وہ چاروں لڑکے اس نوجوان لڑکی کو یوں دیکھ رہے تھے، جیسے جھپٹنے سے پہلے کتے اپنے دانت کچکچاتے ہیں۔

اس کے سامنے کا منظر واضح تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے لیے اس نے بڑا جان لیوا انتظار کیا تھا۔ اس نے یہ ڈیرہ اچھی طرح دیکھا ہوا تھا۔ وہ ایک سال پہلے اسی ڈیرے پر آئی تھی۔ اس رات وہاں جو کچھ بھی ہوا، اس واقعہ نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ وہ دوبارہ اسی منظر کو دیکھنے کی تڑپ میں ایک سال سے زیادہ کا وقت گزار چکی تھی۔ جیسے ہی اس کی نگاہ اس تڑپتی ہوئی لڑکی پر پڑی، اس کا دوران خون تیز ہو گیا تھا۔ اسے خود پر قابو پانا مشکل ہونے لگا۔ لیکن وہ پھر بھی دانت پر دانت جمائے خود پر جبر کیے بیٹھی رہی۔ اسے خود پر قابو پاتے ہوئے پسینہ آ گیا تھا۔ حالانکہ اکتوبر میں رات کے دوسرے پہر کھلی جگہ میں کافی خنکی تھی۔ مگر اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔

وہ اس لڑکی کو پہچان گئی تھی۔ یہ لڑکی آج ہی شہر سے اغوا ہوئی تھی۔ بلاشبہ یہ [illegible] لے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر اسے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ ایک برس پہلے ایسا ہی کچھ اس کے سامنے تھا۔ وہ ظالم رات اس کے سامنے لہرا گئی تھی جس نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ یہ اسی سیاہ رات کا دیا ہوا زخم تھا کہ وہ سراپا انتقام بنی ان چاروں کو ختم کرنے کے لیے یہاں تک اکیلی آن پہنچی تھی۔ یہ دیوانگی تھی یا اس کے اندر کی درندگی، اسے وہ کوئی نام نہیں دے پائی تھی۔ لیکن گردش کرتے ہوئے خون سے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کا جسم پھٹ جائے گا۔

وہ ایک خاص وقت کے انتظار میں تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نشانہ اسی وقت لگایا جاتا ہے، جب شکار رینج پر ہو۔ اسے انتظار کرنا تھا۔ وہ خود پر جبر کیے وہاں دبکی ہوئی سامنے دیکھتی رہی۔ جہاں کا منظر اس کے اندر کی درندگی کو مزید بڑھاوا دے رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر سے کھول رہی تھی۔ اس وقت وہی خان فرحان اس کے نشانے پر تھا۔ وہ چاہتی تو اسے مار سکتی تھی۔ بس ٹرائیگر کو انگلی کا اشارہ درکار تھا۔ اسے اپنے نشانے پر بھرپور اعتماد تھا۔ مگر وہ اسے یونہی نہیں مارنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک برس کانٹوں پر لوٹ کر اسی حسرت میں گزارا تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے مارے گی۔

اس نے دیکھا، خان فرحان اس لڑکی کے پاس جا کر کھڑا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل پکڑی ہوئی تھی اور دوسرے میں کانچ کا گلاس تھا۔ وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا کہ بوتل سے گلاس میں شراب ڈال کر دے۔ مگر لڑکی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تبھی خان فرحان نے ایک زناٹے کا تھپڑ اس لڑکی کے گال پر مارا، لڑکی گھوم کر ریت پر جا گری۔ تبھی اس کے تینوں ساتھی قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔ وہ پھر اس کی طرف بڑھا اور کانپتی ہوئی لڑکی کو اٹھایا۔ اس بار اس نے لڑکی کو گلاس نہیں تھمایا بلکہ بوتل سے شراب اس پر انڈیلنے لگا۔ بوتل خالی کر چکا تو دوسری اٹھالی۔

”ارے ٹھہر ٹھہر! اس کے کپڑوں کو کیوں بھگو رہا ہے، اس کا بدن بھگو نا یار۔“ ایک دوست نے انتہائی سوقیانہ لہجے میں ہنستے ہوئے کہا۔

”ارے صبر کر، کون سا شراب ختم ہو رہی ہے۔“ خان

فرحان نے ہتک آمیز انداز میں کہا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر آگے بڑھ کر اس لڑکی کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر زور کا جھٹکا دیا۔ لڑکی کی قمیص پھٹ گئی۔ لڑکی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ چھپانا چاہا تو خان فرحان نے اس لڑکی کے گال پر زور سے تھپڑ مارا اور کھینچ کر پرے پھینک دیا۔ وہ لڑکی منتیں کرنے لگی۔ گھٹے گھٹے انداز میں واویلا کرتے ہوئے واسطے دے رہی تھی۔ لیکن خان فرحان نے اس کی نہیں سنی۔ اس نے پھر لڑکی کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور پھٹی ہوئی قمیص کو کھینچا تو وہ تار تار ہو گئی۔ لڑکی کا سینہ عریاں ہو گیا تو اس نے دوبارہ اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ تبھی ایک قہقہہ لگا۔ اس کا دوست فہد اٹھا اور لڑکی کی شلوار پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ شلوار اتارنا چاہتا تھا۔ وہ لڑکی ریت پر جا گری۔ وہ بوتل سے شراب اس پر لنڈھانے لگا۔ باقی دونوں بھی پیچھے رہنے والے نہیں تھے۔ وہ بھی تیزی سے آگے بڑھے اور اس لڑکی کو بھنبھوڑنے لگے۔

یہ وہ وقت تھا، جس کے انتظار میں وہ شست لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ پنجوں کے بل تیزی سے آگے بڑھی۔ وہ سرکنڈوں میں یوں تیزی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی چیتا اپنی نگاہ شکار پر رکھے بڑھتا چلا جائے۔ جب وہ چاروں اس سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر رہ گئے تو اس نے انتہائی سرعت کے ساتھ دوڑ لگاتے ہوئے قریب جا کر چھلانگ لگائی اور خان فرحان کو جھپٹ لیا۔ وہ اسے لیتے ہوئے ریت پر جا گری۔ چند لمحے کے لیے خان فرحان کو اس افتاد کا پتہ ہی نہ چلا۔ جیسے ہی دونوں ریت پر گرے، اسی دوران اس نے خان فرحان کے سر پر پوری قوت سے پسٹل کا دستہ دے مارا تھا۔ وہ بوکھلا گیا اور اس کے منہ سے مغلظات نکلنے لگیں۔ اس نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر پسٹل اس کی ٹانگوں کے درمیان رکھا اور ٹرائیگر دبا دیا، ہلکی سی ٹھک کی آواز آئی لیکن خان فرحان کی چیخ نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس نے خان فرحان کی طرف توجہ نہیں دی، بلکہ ہونقوں کی طرح کھڑے تینوں لڑکوں کو دیکھا، پھر بغیر کسی تردد کے ان پر فائر کھول دیا۔ ان تینوں کی کھوپڑیوں میں سوراخ ہو چکے تھے۔ وہ لہرا کر ایک بعد ایک کرکے گرتے چلے گئے۔ تبھی اس نے اونچی آواز میں تیزی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اے لڑکی کپڑے پہنو، جلدی۔''

ساکت پڑی لڑکی میں جیسے جان آ گئی۔ اس نے فوراً اپنی شلوار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جس وقت وہ لڑکی سے کہہ رہی تھی، اسی دوران وہ خان فرحان تک جا پہنچی تھی۔ اس نے وہاں پڑی شراب کی بوتلیں اٹھائیں اور انہیں خان فرحان پر لے جا کر ایک دوسری میں مار کر توڑ دیں، ساری شراب اس پر گر گئی۔ اس نے مزید دو بوتلیں اٹھائیں، وہ بھی ویسے ہی اس پر توڑ دیں۔ اسی لمحے ڈیرے کی طرف سے فائر ہونے لگے۔ اس نے جلدی سے خان فرحان کو گھسیٹا اور لا کر جلتی ہوئی آگ پر پھینک دیا۔ لمحے سے بھی کم وقت میں اُسے آگ لگ گئی۔ اس کی ہولناک چیخیں کان پھاڑ رہی تھیں۔

اسی وقت ڈیرے کا بڑا گیٹ کھلا اور اس میں سے کتوں کے ساتھ کئی آدمی باہر نکلے۔ وہ بھاگتے ہوئے اسی کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے ایک نگاہ، چیختے ہوئے خان فرحان کو دیکھا، ایک دم سے نفرت پھر عود کر آئی، وہ اذیت میں تھا، مگر زندہ تھا، وہ یہ رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ سو اس نے، فرحان کے سر پر پسٹل رکھ کر فائر کر دیا۔ پھر ایڑیوں پر گھومی لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور پوری قوت سے بھاگی۔ اس کا رُخ دریا کی طرف تھا، جو اس سے بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ کتے اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھے، دریا کنارے وہ ایک لمحے سے بھی کم وقت کے لیے رکی، ہاتھ فضا میں اچھالا اد لڑکی سمیت دریا میں چھلانگ لگا دی۔ جیسے ہی چھپاک کی تیز آواز کے ساتھ اس نے خود کو ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے سپرد کیا۔ اسی لمحے ایک ہینڈ گرنیڈ فضا میں اچھلتا ہوا ان لوگوں کے درمیان گرا جو اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ ایک خوف ناک دھماکے کے ساتھ کئی کربناک چیخیں ایک ساتھ فضا میں ابھریں۔ اس نے یہ دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ اس میں کتنے آدمیوں اور کتنے کتوں کی آوازیں تھیں۔

چند لمحوں کے لیے وہ پانی کی تہہ میں گئی تھی، پھر تیزی سے اُبھرتی چلی آئی۔ اس دوران اس نے لڑکی کو اپنے کاندھوں پر سوار کر لیا۔ اس کے پیچھے فائرنگ اور تیز باتوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ آوازیں لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی چلی جا رہی تھیں، کیونکہ وہ انتہائی جانفشانی سے تیرتی چلی

جا رہی تھی۔ دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ چاندنی میں وہ دیکھ سکتی تھی کہ دوسرا کنارہ کہاں تک ہے۔ وہ کئی بار دریا کے اس پاٹ کو تیر کر عبور کر چکی تھی۔ اسے امید تھی کی دوسرے کنارے تک پہنچنے کے لیے اسے آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگ سکتا ہے، یہی وہ وقت تھا، جس میں اگر ڈیرے والے اس کا پیچھا کرتے تو اسے ختم کر سکتے تھے۔ اس کی ساری پلاننگ میں یہی ایک ایسی جگہ تھی، جو اس کی کمزوری بن سکتی تھی۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر خرخراہٹ ہو رہی ہے۔ اسے خطرے کا احساس ہو گیا۔ وہ اسی وقت گھومی تو اس کے قریب ایک خونخوار کتا تیرتا ہوا آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خود پر قابو پاتی، وہ کتا اس پر جھپٹا۔ اگر چہ وہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکا لیکن اس کا توازن خراب ہو گیا۔ وہ ڈول گئی تو لڑکی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ایک طرف غوطے کھاتی ہوئی وہ لڑکی تھی اور دوسری طرف کتا۔ کتے نے دوبارہ اس کے کاندھے پر منہ مارا تو گوشت ادھیڑ گیا۔ اس کے منہ سے سسکاری نکلی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے پسٹل والا ہاتھ بلند کیا اور فائر کر دیا۔ کتے کے منہ سے کراہ نکلی جو دور ہوتی چلی گئی۔ وہ گھومی تو قریب ہی لڑکی چھپکے مار رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس تک پہنچ۔ دوبارہ اسے خود پر سوار کرتے ہوئے، اسے انتہائی مشکل ہو رہی تھی۔ اس کا شانہ بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ دوسری طرف وہ لڑکی بدہوش ہو رہی تھی۔ اس کے اپنے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس نے اپنے بدن کی قوت کو یکجا کیا اور تیرنے لگی۔ وہ زیادہ دور تک نہیں جا پائی تھی کہ اسے لگا کہ اس میں قوت ختم ہو رہی ہے۔ اسے پوری طرح احساس ہو رہا تھا کہ اس کے شانے کا درد پوری جسم میں پھیل گیا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ لڑکی ہوش میں تھی یا بے ہوش۔ زندہ بھی ہے یا مر گئی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی قوت جواب دینے لگی۔ اسے لگا کہ وہ لڑکی سمیت بہہ جائے گی۔ چاندنی میں اسے دوسرا کنارا ابھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے لگا اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو رہے ہیں۔ ایسے ہی وقت میں اس کے سامنے سے تیز روشنی اُبھری۔ وہ لمحہ بھر رہی اور پھر غائب ہو گئی۔ کیا اس کے دشمن کا کوئی بندہ اس تک پہنچ گیا ہے؟ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے لگا کوئی موٹر بوٹ اس کی طرف اپنے حواس کھو رہی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ موٹر بوٹ اس کے قریب آ رہی تھی۔ روشنی پھر لپکی۔ اس نے اپنے حواس کو پوری قوت لگا کر بیدار کیا۔ اس کے ساتھ ہی خاموشی کو چیرتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''گولی! ہمت کرو میں آ گیا ہوں۔''

یہ آواز سنتے ہی اس میں زندگی سرسرانے لگی۔ وہ شعیب کی آواز تھی۔ تب اسے لگا کہ وہ کم از کم ڈوب کر نہیں مرے گی۔ موٹر بوٹ جیسے ہی اس کے قریب آئی۔ وہ تقریباً بے ہوش ہو چکی تھی۔ اسے اتنا تو احساس تھا کہ اس پر سے لڑکی کا بوجھ کم ہو گیا ہے، لیکن وہ بوٹ میں کیسے گئی؟ اس کا اسے قطعاً احساس نہیں رہا تھا۔ وہ ہوش وحواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

* * *

وہ نجی اسپتال کے ایک کمرے میں پڑی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں بند تھیں۔ تیکھی کمان چتون، چوڑا ماتھا، سیاہ گھنے گیسو، تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان گلابی گول چہرہ دمک رہا تھا تیکھا الف ناک، پتلے پتلے سرخ ہونٹ، بھر بھرے گال، ہلکی سی خم دار ٹھوڑی، لمبی گردن، بھاری سینے تک کمبل اوڑھا ہوا تھا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھی۔ اس کے قریب ہی شعیب ایک کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ گاہے بگاہے، اسے دیکھ لیتا اور پھر اخبار کے صفحات میں گم ہو جاتا۔ پوری رات اسی طرح گذر گئی تھی۔ اس وقت صبح ظاہر ہونے کو تھی۔ تبھی شعیب کی نگاہ اس پر پڑی، وہ ذرا ذرا سی کسمسا رہی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کے حسین چہرے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھا کہ اس کے پپوٹے ہلے اور پھر چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے اس نے اجنبی سے انداز میں ماحول کو دیکھا، پھر شعیب کے چہرے کو دیکھتے ہی ہلکے سے مسکرا دی، جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئی ہو۔ تبھی شعیب نے اس کے کان کے پاس ہلکے سے کہا۔

''شکر ہے، تمہیں ہوش آ گیا۔''

''ہوش تو آنا تھا، تم جو میرے پاس ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے دھیمے سے بولی۔

''میڈم نینا صاحبہ، میں وقت پر نہ پہنچتا، تو تم بھی اور وہ بے چاری لڑکی بھی، دونوں ہی سوہنی کی طرح دریا برد ہو

جاتیں۔" اس نے انتہائی طنزیہ لہجے میں غصہ بھرے انداز میں کہا تو وہ دھیما سا زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوئے نہیں شعیب سوہنے نہیں۔ سوہنی تو یار کے لیے مری تھی اور میرے یار نے مجھے بچایا، اتنا فرق تو ہے نا؟"

"تو ذرا ٹھیک ہو لے، پھر میں تمہیں بتاؤں گا، کسی کی بات کیسے نہیں مانتے ہیں۔ مجھے پتہ تھا کہ تم نے یہ بے وقوفی کرنی ہے اور تمہیں بچانے کے لیے مجھے ہی جانا پڑے گا، مجھے دو گاڑیوں اور ایک بوٹ کا بندوبست کرنا پڑا۔" وہ مصنوعی خفگی میں بولا تو وہ ہلکا سا مسکرائی، پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا کر شعیب کے سینے پر رکھتے ہوئے بولی۔

"خدا شاہد ہے شعیب، اک تو ہی میرا دوست ہے اس دنیا میں، ورنہ کون ہے میرا اور تیرے ہی مان پر یہ سب کرتی ہوں۔ تو نہیں ہے تو میں بھی نہیں ہوں۔ میں جانتی تھی کہ تم مجھے بچا لوگے۔"

"اچھا چل یہ جذباتی بلیک میلنگ چھوڑ اور اٹھ سکتی ہے تو اٹھ، کچھ کھا لے، پھر دوا بھی لینی ہے۔" شعیب نے اس موضوع سے توجہ ہٹا کر کہا۔

"ابھی کچھ دیر ٹھہر جا، پھر جیسے تم کہو گے، آؤ، ادھر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" اس نے بیڈ پر اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس کے بال سنوارتے ہوئے بولا۔

"اب بس جلدی سے ہمت پکڑو۔"

"شعیب! میں نے بس چمکتی روشنی دیکھی تھی، پھر کیا ہوا تھا؟" اس نے اپنے لہجے میں محبت سمیٹتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے تمہارے پلان کا تو پتہ تھا اور میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم جاؤ گی ضرور، میں نے تمہیں ڈرائیور کے ساتھ بھیج تو دیا اور خود سارا بندوبست کر لیا تھا۔ میں تو اسی وقت تمہاری طرف بڑھ آیا تھا، جب دوسرے کنارے پر ہینڈ گرنیڈ پھٹا تھا۔ میں تم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"پھر، یہ کہ میں تمہیں اور اس لڑکی کو لے کر دوسرے کنارے آگیا۔ وہ بھی بے ہوش تھی۔ میں نے تم دونوں کو گاڑی میں ڈالا اور یہاں لے آیا۔ خدا ڈاکٹر وسیم کا بھلا کرے میرے ہر آڑے وقت میں کام آتا ہے۔ تمہیں تو آپریشن روم میں بھیج دیا اور اس لڑکی کو ہوش دلایا۔"

"اس لڑکی کو ہمارے بارے پتہ تو نہیں چلا؟" وہ ایک دم سے تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

"نہیں، میں نے اس لڑکی کو بھی پتہ نہیں لگنے دیا کہ وہ کہاں پر ہے، بس اسے شہر میں ایک جگہ لے جا کر چھوڑ دیا، پھر اس کے باپ کو فون کر دیا، جو اسی لڑکی نے بتایا تھا۔" شعیب نے سکون سے بتایا۔

"کیا کہا تھا۔" وہ تجسس سے بولی۔

"یہی کہ کوئی بے ہوشی کی حالت میں اس لڑکی کو چھوڑ گیا ہے۔ وہ سڑک پر پڑی ہے۔ بہر حال وہ اُسے گھر لے گئے ہیں۔" شعیب نے بتایا تو اس نے تیزی سے پوچھا۔

"پولیس اور مٹھن خان کے کارندے ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے، کہرام مچا ہوگا مٹھن خان کے گھر؟"

"مٹھن خان ......" یہ کہتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور بیزاری سے بولا۔

"کہرام مچا ہے یا نہیں، پولیس تلاش کر رہی ہے یا نہیں، مجھے اس کا نہیں پتہ۔ تھانے میں موجود اپنے کسی دوست سے پوچھ لے، یا پھر اس سے جو تمہارا کوئی عاشق ہو۔"

"شعیب بری بات، ایسے تو نہ کہو اگر کوئی مجھ پر عاشق ہو جاتا ہے تو بھلا اس میں کسی عاشق کا قصور؟ میں ہوں ہی ایسی۔" وہ پیار سے بولی تو شعیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یار، میں کون سا تمہارا عاشق ہوں، جو میں کسی سے جیلسی محسوس کروں گا۔ اب تمہیں تو پتہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ یہاں پر ہوں، مجھے کیا پتہ؟"

"اوکے۔ میں سمجھ گئی۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی، "لیکن پھر بھی......"

"شکر کر زیادہ گہرا زخم نہیں ہے، تم محض آج کی رات ہو یہاں پر، سورج نکلنے سے پہلے تم یہاں سے شفٹ ہو جاؤ گی، اس لیے سو جاؤ۔" شعیب نے اسے بتایا

"چلو ٹھیک ہے جیسے تم کہو۔" وہ ہولے سے بولی

"اچھا، اب کچھ کھا پی لو، پھر میں گھر کا چکر لگا آؤں پھر نکلتے ہیں۔" شعیب نے کہا تو وہ مزہ لینے والے لہجے میں نقاہت سے بولی۔

"تھوڑا اور قریب ہو کر بیٹھ نا، اتنی دور کہاں ہو۔ تیرے پاس ہونے کا احساس تو ہو۔"

"بس آگئی ہوش میں اور شروع کر دی یہ بکواس، ٹھرکی کہیں کی۔ میں کیا تم سے دس فٹ کے فاصلے پر بیٹھا ہوں۔" اس بار شعیب نے سچ مچ غصے میں کہا اور اٹھ گیا۔ وہ باوجود تکلیف کے ہنس دی پھر بولی۔

"ہائے، تیرے یہی نخرے تو مجھے مار دیتے ہیں، جان نکال لیتا ہے تو نا۔ لاؤ مجھے کچھ کھانے کو دو۔"

شعیب اسے جوس دے کر پھل کاٹنے لگا۔ وہ کھا پی چکی تو ذرا ہی دیر میں نرس اس کے پاس آگئی۔ اس نے دوا کے ساتھ انجکشن دیا تو وہ سکون سے پھر لیٹ گئی۔ اس کی نگاہیں شعیب پر جمی ہوئی تھیں۔

"شعیب! آؤ، ادھر میرے پاس لیٹ جاؤ۔" اس نے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، میں گھر جا رہا ہوں، صبح ہونے سے پہلے آجاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اسے خدا حافظ کہہ کر باہر چلا گیا۔

نینا کو پوری امید تھی کہ وہ گھر کا چکر لگا کر آجائے گا۔ ایک وہی تو اس کا مخلص دوست تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس وقت وہ کس نازک وقت سے گذر رہا ہوگا۔ وہ جانتی تھی کہ مٹھن خان کتوں کی طرح اس کی بُو سونگھتا پھر رہا ہوگا، صرف وہی نہیں اس کے سارے گماشتے صرف اسے ہی تلاش کر رہے ہوں۔ اس نے مٹھن خان کا بیٹا اس نے انتہائی بے دردی سے مار دیا تھا۔ یہ ایسے لمحات تھے، جس میں جتنا محتاط ہوا جاتا، اتنا ہی کم تھا۔ نینا کے دماغ میں آگ بھرنے لگی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ابھی تو اس نے مٹھن خان کا بیٹا ہی مارا ہے، دشمنی تو اب شروع ہوئی ہے، جس کا آغاز مٹھن خان نے کیا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ ماضی کے ان راستوں پر جا نکلی، جنہوں نے اُسے "گولی" بنا دیا تھا۔ اور جس کی دہشت پورے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ماضی میں کھو گئی۔

* * *

جس گھر میں اس نے آنکھ کھولی تھی، اس کی دیواریں کچی تھیں۔ ان کچی دیواروں میں غربت نے جہاں رشتوں ناتوں میں بے حسی بھر دی تھی، وہاں حالات نے سبھی افراد کو ایک دوسرے سے نگاہیں چرانے پر مجبور کر دیا ہوا تھا۔ وہ ایک بہن اور تین بھائیوں کے بعد سب سے آخر میں پیدا ہوئی تھی۔ شاید اس کی قسمت شروع ہی سے ایسی تھی کہ وہ اپنے باپ کا چہرہ بھی نہ دیکھ پائی۔ اس کے پیدا ہونے سے تین ماہ پہلے اس کا باپ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس وقت تک بڑی بہن اور بڑے بھائی کی شادی ہوچکی تھی۔ وقت ساری ذمہ داری اس کے بھائی کے کاندھوں پر پڑی تو گھر کا ماحول زیادہ کشیدہ ہوگیا۔ زمین کا کوئی ٹکڑا اپنا نہیں تھا، جو مستقل آمدنی کا وسیلہ بنتا، لے دے کہ مزدوری تھی یا پھر مزارع بن کر کاشتکاری کرنا تھی۔ دو بھائی اس کام میں لگ گئے، جس سے روزی روٹی پوری ہونے لگی۔ وہ چھوٹی تھی، محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گاؤں کے واحد پرائمری اسکول میں جانے لگی۔ اس وقت وہ اتنا بوجھ محسوس نہ ہوئی، اس پر کوئی خرچ نہیں تھا، سو کسی نے دھیان ہی نہیں دیا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اسکول میں وہ سب سے زیادہ ذہین طالبہ تھی۔ اس کا اسکول ہی میں دل لگتا تھا۔ جب تک اسکول کا وقت رہتا، وہ ہنستی کھیلتی، شرارتیں کرتی وقت گذار دیتی۔ لیکن جیسے ہی گھر میں آتی اس کی بھابی اسے اپنے ساتھ کاموں پر لگا لیتی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکتی تھی۔ پھر گھر کا ماحول بھی ہر وقت کشیدہ رہتا۔ جس میں اس کی بھابی ہی تھی جو چڑ چڑی رہتی، اسے یہ زعم بھی تھا کہ اس کا شوہر سب کا کفیل ہے۔ اس دوران اس کے بھی دو بچے ہو چکے تھے۔ اسے ان کا بھی خیال تھا۔ اس کی ماں خاموشی سے سب دیکھتی رہتی لیکن کسی سے کوئی گلہ نہیں کرتی تھی۔ اس نے تو جیسے اپنے لب ہی سی لیے ہوں۔ یہی خاموشی اس کی ماں کے اندر کا روگ بن گیا۔ وہ دن بدن کمزور پڑنے لگی لیکن نہ اس نے کہا اور نہ کسی نے دھیان دیا، یوں دن گذرے چلے گئے۔

ان کے گاؤں کے قریب ہی ایک ہائی اسکول تھا۔ وہاں پڑھنے جاتی رہی۔ اسی کے اسکول کی ایک ٹیچر کا تبادلہ وہاں ہوا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ یوں اس کا جو بھی چھوٹا موٹا خرچ ہوتا، وہ استانی برداشت کرتی تھی۔ دوسرا وہ ایک ذہین طالبہ تھی۔ وہ اسے ضائع نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ یوں وہ میٹرک بھی کر گئی۔

جس وقت اس نے میٹرک کیا، اس وقت تک وہ ایک بھرپور اور جوان لڑکی کا روپ دھار چکی تھی۔ ہرن کے نافے میں کستوری ہو اور اس کی خوشبو نہ پھیلے، ایسا ہو نہیں سکتا، گاؤں میں ایک حسین لڑکی ہو، اور اس کا چرچا نہ ہو، یہ بھی ممکن نہیں ہوتا۔ بظاہر لاابالی دکھائی دینے والی لڑکی پر حسن ٹوٹ کر آیا تھا۔ موٹی موٹی آنکھ، سیاہ بھنورا ایسی،

جسے نگاہ بھر کے دیکھتی، اس پر جادو کر دیتی، تیکھا الف تلوار ناک، پتلے پتلے تراشیدہ ہونٹ، اوپری لب کے دائیں جانب ہلکا سا تل، گول چہرہ، بھرے بھرے رخسار، چوڑی پیشانی اور دراز گیسو، چوڑے شانوں کے ساتھ، اس کا بھرا بھرا بدن، بھاری سینہ، پتلی کمر، لمبے قد کے ساتھ جب چلتی تو راستے بھی ہلکورا لیتے ہوئے محسوس ہوتے۔ کستوری کی مہک ہو یا لڑکی کا حسن جب پھیلتا ہے تو اس کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ جہاں جوانی کی اپنی مہک ہوتی ہے، وہاں کشش بھی سر چڑھ کر بولتی ہے۔ گاؤں کے لڑکے، ڈیروں پر، رات کی تنہائیوں میں اس کی باتیں کرنے لگے۔ جس کی سرگوشیوں بہت دور تک پھیل گئی تھیں۔

گھر میں طوفان اس وقت اٹھا جب اس نے شہر کے کالج میں داخلہ لینے کی بات کی۔ سبھی حیران تھے کہ اس گھر میں کسی لڑکے نے اسکول پاس نہیں کیا، اور یہ لڑکی ہو کر کالج پڑھنے جائے گی اور وہ بھی شہر، ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ ہفتہ دس دن یہی چخ چخ چلتی رہی۔ اس دوران بھابی نے سب سے زیادہ ناک بھوں چڑھائی تھی۔ بھائی الگ چیخے، لیکن ایک ماں تھی جو اب تک خاموش تھی۔ اس نے ہاں اور ناں میں جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بھی اسی کشمکش میں رہی تھی کہ اس کی ماں کیا کہتی ہے۔ اگر ماں نے ہاں کر دی تو وہ کسی کا کہنا نہیں مانے گی اور اگر انکار کر دیا تو وہ خاموشی سے گھر بیٹھ جائے گی۔

اس مسئلے کا حل گاؤں کی اسی استانی نے آ کر حل کیا، جو اب تک اس کی مدد کرتی چلی آئی تھی۔ اس نے اخراجات کی ذمہ داری خود پر لی۔ تب اس کی ماں نے کالج جانے کی اجازت دے دی۔ اصل میں معاشی مسئلہ ہی تھا جس کے سبب وہ خاموش تھی۔ اسے اجازت مل گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ برقعے اوڑھا کرے گی۔ اس نے یہ شرط مان لی۔

اس نے کالج میں داخلہ لے لیا، گویا ایک نئی دنیا میں آگئی۔ وہاں بھانت بھانت کی لڑکیاں تھیں۔ مختلف عمر اور طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ طرح طرح کی لڑکیوں میں اس نے بہت جلد اپنی شناخت بنا لی۔ وہ کالج میں ہر دلعزیز، شرارتی اور ذہین طالبہ کے طور پر مشہور ہو گئی۔ دراصل وہ خود کو کالج کی اس دنیا میں پا کر اپنا سب کچھ بھول جانا چاہتی تھی۔ وہ جب گھر سے نکلتی تو سکھ کا سانس لیتی۔ وہ بھول جاتی کہ گھر کی تنگی، پریشانیاں، طعنے، گھٹن جو سب غربت کی وجہ سے تھا، کچھ دیر یہی سکون میں رہتی۔ اسے یہ قطعاً یقین نہیں تھا کہ وہ یہاں کالج کے دو سال پورے بھی کر پائے گی یا نہیں۔ کیونکہ اسے ایک نئی افتاد کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا۔ اسے کالج میں کوئی مسئلہ نہیں تھا، مگر جب وہ گھر سے نکلتی اور اسٹاپ تک جاتی تو کئی بھنورے اس کے ارد گرد منڈلانے لگتے۔ وہ برقعے کی اوٹ سے سب کو دیکھا کرتی لیکن اپنے کسی بھی عمل سے کسی کو بھی یہ محسوس نہ ہونے دیتی کہ اس کی کوئی ذرا سی بھی دلچسپی ہے۔ اس لیے کسی کی ہمت نہ پڑتی کہ اس سے بات کر سکے۔ وہ کالج سے واپس آتی تو یہی سلسلہ لگا رہتا۔ سو وہ بہت محتاط رہی۔

اگر چہ اس کا تعلیمی سلسلہ اس استانی کی وجہ سے چل رہا تھا، لیکن وہ ماں بیٹی خود بھی محنت کرتی تھیں۔ کسی کے کپڑے کاڑھ دیئے۔ چنگیریں بنا دیں، یا ایسے ہی وہ کام جو عموماً گاؤں کی گھر بیٹھنے والی عورتیں کرتی ہیں۔ اس سے جو ملتا اسی سے وہ اپنا خرچ چلا لیتی تھی۔ دن گذرتے گئے اور دو برس پلک جھپکتے بیت گئے۔ اس نے امتحان دیا اور اعلی درجے کے نمبروں میں پاس ہو گئی۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ اسے پورا یقین تھا کہ اس کے بھائی اسے ایسا کرنے نہیں دیں گے لیکن وہ مطمئن تھی کہ وہ ایسا کر کے ہی چھوڑے گی، وہ ضرور پڑھے گی۔

کالج کے داخلے شروع ہوئے تو پھر گھر میں طوفان اٹھ گیا۔ لیکن اس بار اس کا موقف مضبوط تھا۔ اب اس کی وہ استانی نہیں رہی تھی، جو اس کی معاشی مدد کرتی تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہاں سے اس کا تبادلہ ہو گیا تھا، جہاں اس کے سسرال تھے۔ لیکن پھر اب وہ اپنے بھائیوں پر معاشی بوجھ نہیں تھی۔ اس کے کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا، وہ دو برس کالج جاتی رہی تھی لیکن ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے اس کے کردار پر شک کیا جا سکتا تھا۔ اس کی ضد تھی کہ وہ مزید پڑھے گی سو اس نے کالج میں داخلہ لے لیا۔

شہر کا وہی کالج تھا، وہی آنا جانا، وہی دور دور سے تاڑتے ہوئے لڑکے تھے مگر اس میں اعتماد کہیں زیادہ آ گیا تھا۔ وہ پہلے اندر سے دبّو قسم کی لڑکی تھی۔ لیکن خود پر

اعتماد کی وجہ اس کا اپنا بوجھ آپ اٹھانا تھا۔ کالج جاتے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ انہی دنوں شہر میں ایک ایف ایم ریڈیو آ گیا۔ اسے شہر بھر کا تو نہیں پتہ لیکن کالج کی لڑکیوں میں ایک دم سے کریز آ گیا۔ ایف ایم ریڈیو پر چلنے والے گیت اور نغمے وہی ہوا کرتے تھے جو ویسے بھی سنے جا سکتے تھے لیکن لڑکیوں میں وہاں ایک پروگوام کے ڈی جے فواد کا بڑا چرچا ہونے لگا تھا۔ ملا جلا کر جو اس کی تعریف بنتی تھی وہ یہی تھی کہ اس کی آواز اتنی موہ لینے والی ہے کہ سیدھی دل میں اُتر جاتی ہے، اس کا لہجہ یوں ہے کہ جذبات اور احساسات کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس کی باتیں ایک نئے جہان کا در کھول دیتی ہیں۔ وہ بھی یہی باتیں سنا کرتی تھی لیکن اس کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا کہ وہ بھی اس کی آواز، لہجہ اور باتیں سن سکے۔ ایک سیل فون خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اس کا یہ احساس شدت اختیار کر گیا۔ وہ کیوں اتنی مجبور ہے کہ چھوٹی چھوٹی حسرتوں کے لیے تڑپتی رہتی ہے؟ وہ بھی اسی دنیا کی رہنے والی ہے جہاں اتنے پیسے ایک کھانے پر خرچ کر دیتے ہیں۔ وہ کیوں اور وہ ہی کیوں؟ دماغ میں بہت سارے خیال آتے چلے گئے۔ یہی سوچتے ہوئے اسے ایک دم سے اپنی ٹیچر سمیرا کا خیال آیا۔ وہ بیوہ تھی، شہر میں اس کا اپنا گھر تھا۔ اس کی ایک ہی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ گھر میں لڑکیوں کو ٹیوشن دیتی تھی۔ وہ ان کے پاس گئی اور کہا۔

”میڈم! کیا مجھے آپ کے ٹیوشن سینٹر پر جاب مل سکتی ہے؟“

ایسا پہلے کبھی کسی نہیں کہا تھا۔ وہ اس کی بات سن کر چند لمحے خاموش رہیں، پھر پوچھا۔

”بیٹا! میں کوئی اکیڈمی نہیں چلاتی یا وہ کوئی اسکول نہیں ہے، کچھ والدین کے اصرار پر میں ان کی بچیوں کو ٹیوشن دے دیتی ہوں، باقی میں سمجھتی ہوں کہ تمہارا کوئی معاشی مسئلہ ہوگا اسی لیے تم کہہ رہی ہو۔“

”جی، میری چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بھی رہ جاتی ہیں۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں کوئی شے خریدوں، پھر میرے تعلیمی اخراجات......“ اس نے کہنا چاہا تو ٹیچر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہارے تعلیمی کیریئر کا پتہ ہے، تم ایک ذہین لڑکی ہو، میری مددگار ثابت ہو سکتی ہو۔ خاص طور پر تمہارا انگریزی میں کافی حد تک مضبوط ہونا۔ تم کل سے آ جانا، باقی ہم دیکھ لیں گے۔“

اپنے بارے میں یہ باتیں سن کر اسے لگا کہ جیسے وہ ترقی کی بلندیوں پر ہے۔ یہ سب اسی گاؤں والی استانی کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ اسی نے بچپن ہی سے اس کے ذہن میں یہ ڈال دی تھی کہ اگر ترقی کرنی ہے تو انگریزی زبان پر عبور حاصل کرو۔ وہ اسے خوب انگریزی پڑھاتی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے روزگار کی سہولت میسر آ گئی تھی۔ اسے انگریزی کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی دن اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ وہ شہر میں ٹیوشن دیا کرے گی، اس لیے اب لیٹ آیا کرے گی۔ بھائیوں نے پھر جز بز کی، لیکن بات کمانے کی تھی، سو زیادہ نہیں بولے۔ وہ اگلے دن سے وہاں پڑھانے لگی، زندگی نے ایک نئی کروٹ لے لی۔ اسے مہینے بعد اچھی خاصی رقم ملنے لگی تھی۔ اس نے سیل فون نجانے کب کا خرید لیا ہوا تھا۔ وہ گیت اور نغمے سننے کے علاوہ فواد کی آواز اور باتیں بھی سنا کرتی تھی۔ وہ ایک نشہ تھا، جو اسے لگ چکا تھا۔ جب بھی اس کا پرگرام آتا، وہ سننے بیٹھ جاتی اور پھر دنیا مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔ وہ کپڑے بھی تھوڑے اچھے پہننے لگی تھی۔ ماں کے لیے پھل بھی لے جاتی۔ میڈم کی بیٹی فاخرہ اس کی بہت اچھی سہیلی بن چکی تھی۔ کبھی دیر ہو جاتی تو انہیں کے ہاں رہ جاتی، دھیرے دھیرے وہ اس فیملی کا ہی حصہ بن گئی۔ یوں ایک برس پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ اس دوران فواد خان اس کے حواس پر چھا گیا تھا۔ وہ اسی کے خیالوں میں رہنے لگی تھی۔

وہ گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے بہار کے دن تھے۔ ایک دن فواد خان نے ایف ایم ریڈیو پر باتیں ہی کچھ ایسی کیں کہ اس کا من مچل اٹھا کہ وہ فواد سے بات کرے۔ پورا ایک دن اس نے خود پر جبر کیا لیکن پھر وہ خود کو نہ روک سکی اور اس نے کال ملا لی۔ چند ثانیے بعد ہی اس کی کال ریسیو ہو گئی۔

”جی فرمایئے۔ میں فواد خان بات کرر ہا ہوں۔“

”مجھے...... آپ ہی ...... سے بات کرنی ہے۔“ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے بہ مشکل کہا۔

”واؤ، آپ کی آواز تو بہت خوبصورت ہے، کہئے میں

ود لہجے میں لہجا جو یدھا اس کے دل میں اُتر گیا۔ پھر اس سے بات نہیں ہوسکی اس نے فون بند کر دیا۔ ابھی اس کی سانسیں ہی درست نہیں ہو پائی تھیں کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر فواد کے نمبر جگمگا رہے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ کال ریسیو کر لی۔

"فون کیوں بند کر دیا آپ نے؟" وہ خمار آلود پیار بھرا لہجہ جو من کی دنیا کو گدگدا رہا تھا۔

"بس ایسے ہی۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کا وہ سارا اعتماد کہیں غائب ہو گیا تھا۔

"یہ تو کوئی ایسی بات نہ ہوئی، کہیے آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔" اس نے نشیلے لہجے میں کہا تو اس وقت تک اپنا اعتماد بحال کر چکی تھی۔ اس لیے بولی۔

"آپ کی آواز بہت اچھی ہے اور آپ باتیں بھی بہت خوبصورت کرتے ہیں۔"

اس پر فواد خان نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"یہ تو مجھے معلوم ہے، کوئی نئی بات ہو تو بتائیں۔"

"جی کوئی نہیں ہے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

یہ تھی ابتدا، اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ کبھی یہ فون کر لیتی اور کبھی وہ۔ شروع شروع میں وہ کچھ جھجکتی تھی، اتنا کھل کر بات نہیں کرتی تھی، لیکن فواد خان کی حوصلہ افزائی سے، کچھ اپنے اوپر اعتماد نے اس کی جھجک ختم کر دی۔ وہ اس کے پروگرام سے لے کر اس کی باتوں پر تنقید کرنے لگی۔ یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

ہر نئی ایجاد بذات خود اچھی بری نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال اچھا یا برا ہوتا ہے۔ سیل فون کی ایجاد کے ساتھ ہی ہر سیل فون رکھنے والے نے اسے اپنی سمجھ اور عقل کے مطابق استعمال کیا۔ انہی دنوں اس پر انکشاف ہوا کہ سیل فون کی بھی اپنی دنیا ہے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی لڑکی ایک نئی کہانی سناتی تھی۔ کوئی کسی کے پیار پاگل میں ہو رہی تھی اور آہیں بھر بھر کے رات ہونے والی باتوں کے قصے سناتی۔ کوئی کسی لڑکے کو بے وقوف بنا کر اسے کس طرح پاگل کر رہی تھی یہ کہانی سناتی۔ کوئی یہ داستان کہتی کہ سچی محبت بھی کتنی ظالم ہوتی ہے۔ کسی نے رابطے کے لیے اور کسی نے کھیل کے لیے اسے کھلونا سمجھ کر کھیلنا شروع کر دیا۔ ایسی کھٹی میٹھی باتوں کا ایک الگ ہی چسکا تھا۔

کالج میں دوسری لڑکیوں کی طرح اس کا بھی اپنا ہی ایک گروپ تھا، جس میں وہ چھ لڑکیاں تھیں۔ ان میں رابعہ بہت زیادہ چالاک تھی۔ اس نے ایک شغل پکڑا ہوا تھا کہ وہ چند دن کسی لڑکے سے بات کرتی اور پھر اس سے فرمائشیں شروع کر دیتی۔ بات سیل فون کارڈ سے شروع ہوتی اور مہنگی چیزوں تک جا پہنچتی۔ جب تک وہ یہ فرمائشیں پوری کرتا وہ باتیں کرتی رہتی، جیسے ہی وہ فرمائش پوری نہ کر پاتا، یہ نگاہیں پھیر لیتی۔ کوئی زیادہ ہی تنگ کرتا تو اپنے بھائیوں سے کہہ کر اس کی پٹائی کروا دیتی۔ اور یہ کہانی وہ بڑے ذوق و شوق سے سناتی۔ ایک عجیب ماحول تھا، جس کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ہر کوئی اپنی دنیا میں گم تھی۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ ان میں شرارت کا عنصر زیادہ تھا، لڑکوں کو تنگ کرنا، انہیں بے وقوف بناتا اور پھر اگلے دن تبصرے کر کے خوش ہونا، یہ ان کا مشغلہ بن گیا تھا۔ ایسے ہی ایک دن رابعہ نے اس سے کہا۔

"یار! ایک لڑکا بڑے دنوں سے تنگ کر رہا ہے، اسے ٹھیک کرنا ہے؟"

"پہلے تو مجھے یہ بتا کہ تم اسے کب سے تنگ کر رہی ہے؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"او یار، وہ مجھ سے بھی کہیں گھاگ نکلا ہے، میں نے جب دیکھا کہ یہ میرے مطلب کا نہیں تو میں نے بات کرنا بند کر دی، اب وہ......"

"سم بدل لو، یا پیار سے سمجھا دو۔" اس نے اپنی رُو میں کہا تو وہ تیزی سے بولی

"مجھے مت سمجھاؤ تم، میری امی بن کر۔" رابعہ کے یوں کہنے پر وہ ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ رابعہ نے ایسے ہی نہیں کہا تھا۔ اسے نینا کی اس صلاحیت کا پتہ تھا۔ وہ اس طرح آواز بدل کے بات کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی کہ ایک آواز دوسری سے نہیں ملتی تھی۔ اس کی اس خوبی کے بارے میں سب کو پتہ تھا۔ کالج میں ہونے والے ڈراموں میں وہ کئی کردار کر چکی تھی۔ ہر کردار کے ساتھ اس کی اپنی آواز ہوتی۔ وہ بہت اچھی پیروڈی کر لیتی تھی۔ اس کی گانے والی آواز بہت خوبصورت تھی۔ اسی وجہ سے ایک ٹیچر نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ایسی آوازیں نہ نکالا کرے

ورنہ اس کے گانے والی آواز خراب ہو جائے گی۔ رابعہ کے کہنے پر اس نے یہ تجربہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے رابعہ کا سیل فون لیا اور اس لڑکے کو کال ملا لی۔ اس کے گروپ کی لڑکیاں بھی سامنے تھیں۔ اس نے ایسی ایسی باتیں کیں کہ پھر دوبارہ اس لڑکے کی ہمت نہیں پڑی۔ رابعہ اور اس کی سہلیوں کو ایک نیا کھیل مل گیا۔

نینا کا فواد خان کے ساتھ رابطہ تھا۔ بات تکلفات سے بھی آگے نکل چکی تھی۔ فواد خان کا یہ تقاضا تھا کہ وہ اس سے کہیں ملے۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اسے ہر بار طرح دے جاتی تھی۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتی۔ یہاں تک کہ معاملہ ناراضگی تک آ گیا۔ فواد خان اس سے ناراض ہو گیا۔ اس کے مان جانے کی یہی شرط تھی کہ وہ اس سے تنہائی میں ملے۔

انہیں دنوں ایف ایم ریڈیو والوں نے گانے کا ایک مقابلہ رکھ دیا۔ جس میں لڑکے اور لڑکیوں کی انٹری ہوئی اور الگ الگ دن ان کا مقابلہ ہونا تھا۔ نینا نے اپنی انٹری کسی دوسرے نام سے کروا دی۔ اصل میں وہ یہ چاہتی تھی کہ اس کے گھر والوں کو پتہ نہ چلے۔ اس کا نام اگر ریڈیو پر گونج جاتا تو پورے علاقے میں دھوم مچ جاتی تھی۔ دوسرا فواد خان اُسے پہچان نہ لے، وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے باور کرانا چاہتی تھی کہ وہ اسے دیکھ سکتی ہے لیکن وہ اسے خود کو نہیں دکھائے گی۔ اسے پتہ ہی تب چلے جب وہ ریڈیو سے آ جائے۔ مقابلے والے دن وہ وہاں جا پہنچی۔ اس نے حجاب لیا ہوا تھا۔ جس میں سے اس کی صرف آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اسے خود نہیں پتہ تھا کہ وہاں پر موجود لوگوں میں فواد خان کون ہے؟ دونوں میں یہی ایک آواز کا تعلق تھا۔

وہ ریڈیو کی عمارت میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ سہمی سہمی سی داخل ہو گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس نے اپنا اعتماد بحال کر لیا۔ چند لڑکیاں تھیں جنہوں نے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ چونکہ نتیجے کا اعلان بعد میں ہونا تھا، اس لیے وہ اپنا گانا ریکارڈ کراتے ہی وہاں سے آ گئی۔

اسی شام جب وہ اپنی ٹیچر سمیرا کے گھر میں تھی۔ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اجنبی نمبر دیکھ کر اس نے فون نہیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد پھر فون بجا تو اس نے کال ریسیو کر لی۔ اس کی ہیلو کے جواب میں ایک شائستہ مردانہ آواز ابھری۔

"مس نینا، میرا نام شعیب ہے۔ میں پہلی بار آپ سے مخاطب ہوں۔ میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی بولیں، آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔" اس نے بھی انتہائی شائستگی سے جواب دیا

"میں پہلے اپنا تعارف کرا دوں، میں انجینئرنگ کا طالب علم ہوں۔ میرا یونیورسٹی میں آخری سال ہے۔ میں فواد خان کا دوست ہوں۔ اور......"

فواد خان کا نام سن کر اسے کچھ اچھا نہیں لگا، اس لیے بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"آپ نے جو کہنا ہے پلیز وہ کہیں۔"

"جی، وہی کہہ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا، پھر بولا۔

"میں آج ریڈیو ہی تھا، جب آپ نے اپنا گانا ریکارڈ کروایا۔ میں آپ کو پہچان گیا تھا کہ آپ کون ہیں۔ اس لیے......"

"آپ نے کیسے پہچانا؟" اس نے تیزی سے پوچھا تو شعیب نے کہا۔

"آپ کی آواز سے، آپ نے مجھ سے باتیں بھی کیں۔ میں نے آپ کا گانا ریکارڈ کیا تھا۔"

"اوہ، تو وہ آپ تھے۔" یہ کہتے ہوئے نینا کی آنکھوں کے سامنے ایک وجیہہ، اسمارٹ اور گہری آنکھوں والا نوجوان آ گیا، جسے دیکھتے ہی اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ وہ اسے اتنا اچھا لگا تھا کہ سیدھا دل میں اتر گیا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر وہ اس کی وجہ سے بھاگ کر وہاں سے آئی تھی۔ وہ جو اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ سیدھا دل میں اترتا جا رہا تھا۔

"جی میں وہی تھا، یہاں میرا مقصد اپنے بارے میں کچھ کہنا نہیں، میں نے آپ کی بھلائی کے لیے کچھ کہنا چاہا تھا، اگر آپ مجھ پر یقین کریں تو......؟" اس نے اپنے تلے لفظوں میں اپنا مدعا کہہ دیا۔

"میری بھلائی؟ میں سمجھی نہیں؟" اس نے تیزی سے کہا تو وہ سکون سے بولا۔

"دیکھیں، میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ فواد خان کی دوست ہیں۔ میں نے کانفرنس کال میں آپ کو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbookstree.pk

ب وہ میری باتیں کسی دوسرے کو بھی سناتا رہا ہے؟'' اس نے دکھ اور حیرت میں تیزی سے پوچھا تو اس نے بڑے سکون سے جواب دیا

''کسی دوسرے کو نہیں، صرف مجھے، وہ میرا بہت اچھا دوست، لیکن کافی حد تک کمینہ بھی ہے، وہ ایسا کیوں ہے، اس کی اپنی منطق ہے۔''

''تو آپ میری بھلائی کیوں چاہ رہے ہیں؟'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ اگر آپ بھی عام لڑکیوں کی طرح ہوتیں تو شاید میں آپ کی بھلائی کے بارے میں سوچتا بھی نہ لیکن آپ حجاب میں تھیں، وہاں آ کر آپ نے کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی اور سب سے بڑی بات کہ آپ نے خود کو فواد خان سے چھپایا، اسی بات نے مجھے متاثر کیا۔'' اس نے تفصیل سے کہا تو اس نے پوچھا۔

''اچھا، آپ میری کیا بھلائی چاہتے ہیں؟''

''جیسے کہ میں نے کہا فواد خان میرا بہت اچھا دوست ہے لیکن ہے کمینہ، وہ لڑکیوں سے صرف اپنے ایک ہی مقصد کے لیے دوستی کرتا ہے اور وہ ہے ان کے جسم کا حصول، یہ مطلب نکل گیا تو وہ پہچانتا بھی نہیں۔ جب تک وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر لیتا، وہ بہت سارے سبز باغ دکھاتا ہے، لچھے دار باتیں کرتا ہے اور وہ سب کچھ جو وہ کر سکتا ہے، جس سے لڑکی اس کے لیے پاگل ہو جائے۔ وہ تنہائی میں بلاتا ہے۔ آپ کو بھی یہ آفر کر چکا ہے لیکن آپ نہیں گئیں، اس لیے وہ آپ سے ناراض بھی ہے۔ سو میرا آپ سے صرف یہی کہنا ہے کہ آپ یہ سب چھوڑ کر اپنی پڑھائی پر توجہ دیں۔ آپ ایک اچھی لڑکی ہیں، خدانخواستہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔''

''آپ نے بالکل درست کہا، میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں، لیکن آپ ایسا کیوں......'' اس نے پوچھنا چاہا تو شعیب نے دکھ اور اکتائے ہوئے لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''مجھے یہی امید تھی کہ آپ کوئی ایسا ہی شک بھرا فضول سا سوال کریں گی۔ میں نے آپ کو انفارم کر دیا۔ اب آپ جو چاہیں سو کریں۔ مجھے کوئی غرض نہیں۔ خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ نینا دیر تک اس فون کے اثر میں رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ خلوص ہے یا کوئی سازش ہے؟

اس دن کے بعد شعیب کا فون تو نہیں آیا لیکن وہ اس ٹرانس سے نہ نکل سکی۔ کیونکہ دو دن بعد ہی فواد خان کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ نینا کا گایا ہوا گانا پہلے نمبر پر آ گیا ہے۔ اس نے یہ نہیں پوچھا اور نہ کوئی بحث کی کہ تمہیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ میں وہاں گئی بھی تھی یا نہیں، میں نے تو فرضی نام سے انٹری کروائی تھی۔ تاہم فواد خان نے خود ہی بتا دیا کہ اس نے گانا سنا اور اس کی آواز پہچان گیا۔ وہی سوال اس کے ذہن میں گونجتا رہا کہ یہ خلوص تھا یا کہ سازش؟ فواد خان کے لیے اس کا دل ہمک اٹھتا تھا۔ اس سے بات کرنے کو دل چاہتا۔ اس نے چند دن بات نہیں کی تو پر سکون سی ہو گئی تھی۔ اب اس نے پھر بات کی تو دل مچلنے لگا تھا، مگر شعیب کی باتوں سے اٹھنے والا سوال اب اس کی راہ میں حائل تھا، وہ اسے روک لیتا تھا۔ ایک دن اس نے بیٹھ کر فیصلہ کر لیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ اس کی تان یہیں پر ٹوٹی کہ شعیب کی بات کو آزمایا جائے۔ اگر فواد ویسا ہی ہوا، جیسا اس نے بتایا ہے تو پھر وہ پوری زندگی کے لیے فواد خان کو چھوڑ دے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو فواد خان پر اس کا اعتماد بڑھ جائے گا۔ اب فواد خان کو آزمایا کیسے جائے؟ وہ اس پر سوچتی رہی۔ اچانک ایک دن اس کے دماغ میں آ ہی گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

ان دنوں بازار سے نئی سم خرید لینا کوئی اتنا مشکل نہیں تھا۔ اسے ایکٹو کرنے میں بھی اتنا مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے ایک نئی سم لے لی اور آواز بدل کر فواد خان کو فون کر دیا۔ بنائی ہوئی آواز کچھ زیادہ ہی پرکشش ہو گئی تھی۔ وہی ہوا دونوں طرف سے بات آواز کی تعریف سے شروع ہوئی اور تقریباً دس دنوں میں ملاقات تک آن پہنچی۔ اتنا تو وہ پہلے ہی نینا سے کہتا رہتا تھا۔ آزمائش تو اب تھی۔ سو اس نے کھل کر پوچھ لیا۔

''آپ مجھے تنہائی میں بلا رہے ہیں، ممکن ہے آپ میری تنہائی کا فائدہ اٹھائیں؟''

''میں پکا تو نہیں کہہ سکتا اگر آپ چاہیں تو؟'' اس نے شاطرانہ انداز میں کہہ دیا۔ یہیں سے ان کے تعلق نے نیا موڑ لے لیا۔ اس نے کہہ دیا کہ وہ آ رہی ہے۔ لیکن کہاں پر؟ سارا پروگرام طے پا گیا لیکن یہ طے نہیں ہوا۔ دو دن کے بعد کے وقت کا تعین ہو گیا۔

وہ پورے وقت پر وہاں جا پہنچی جہاں سے فواد نے اسے پک کرنا تھا۔ اگرچہ وہ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی لیکن اسے خود پر اعتماد تھا۔ دیئے گئے وقت پر وہ بائیک پر آ گیا۔ وہ ایک نئے طرح کے برقعے میں تھی۔ اس نے نینا کو بائیک پر پیچھے بٹھایا اور چل دیا۔ وہ اسے ایک گھر میں لے گیا۔ جہاں سوائے ایک ملازم کے دوسرا کوئی نہیں تھا۔ وہ جا کر بیٹھی تو فواد خان نے اس سے دست درازی شروع کر دی۔ وہ چاہتی بھی یہی تھی کہ وہ اُس پر کھل جائے۔ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ فواد خان نے اس سے اپنی خواہش کے بارے میں کہہ دیا۔ تب اس نے اپنی اصل آواز چھپاتے ہوئے کہا۔

''پتہ ہے میں کون ہوں، کیا وعدے کیے ہیں تم نے مجھ سے؟'' اس پر فواد خان چونک گیا۔ کافی دیر تک وہ بول نہ سکا۔ پھر اس نے بھی ڈھیٹ بن کر کہا۔

''دیکھو، تم کوئی ستی ساوتری تو ہو نہیں، جو لڑکی ایک انجان لڑکے سے بات کرتی ہے تو وہ کس لیے؟ اس کا بھی تو یہی مقصد ہوتا ہے نا، میں نے بھی تم پر اسی لیے محنت کی۔ تم قابو نہیں آئی تو کوئی بات نہیں تیرے جیسی کئی اور ہیں جو لائین میں لگی ہوئی ہیں۔''

''یہ جو تم لوگ لڑکیوں کو محبت کے جھوٹے جال میں پھنساتے ہو، کیا یہ......'' اس نے کہنا چاہا تو وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''تو وہ نہ پھنسیں، میں کسی کو فون نہیں کرتا، خود کرتی ہیں، تم نے بھی تو خود فون کیا تھا، یاد ہے؟''

''یہ انتہائی......'' اس نے غصے میں گالی دینا چاہی تو فواد نے اسے انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔

''اے سُن! جو میں چاہتا ہوں، اس پر راضی ہو تو رُکو، ورنہ میرا وقت خراب نہ کرو، نکلو یہاں سے، فوراً۔''

''وہ تو میں جا ہی رہی ہوں، لیکن تم بہت پچھتاؤ گے۔ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو فواد خان ہنستے ہوئے بولا۔

''ایسا بہت کہتی ہیں، جاؤ، نکلو یہاں سے کسی دوسری کو آنے دو، سارا موڈ خراب کر دیا۔'' اس نے کہا اور بے نیازی سے صوفے پر جا بیٹھا۔ پھر اپنا فون نکال کر کسی لڑکی سے بات کرنے لگا۔ جیسے وہ اسے جتانا چاہتا ہو کہ اسے کوئی پروا نہیں ہے۔ نینا کو غصہ تو بہت آ رہا تھا لیکن وہ پی گئی۔ اسے شعیب کی بات سچ ماننا ہی پڑی۔ سو وہ خاموشی سے نکلی اور واپس کالج آ گئی۔ یہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ تھا۔ جسے وہ چاہتی بھی تو بھلا نہیں سکتی تھی۔

اس سارے واقعے میں نینا کو فائدہ یہ حاصل تھا کہ اس کی اصل شناخت کے بارے میں فواد خان کو بھی معلوم نہیں ہوا۔ وہ جس فرضی نام سے اس کے ساتھ ملی تھی، فواد کو وہی معلوم تھا۔ وہ کبھی بھی نینا سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس سے ملی ہے اور وہ اس کے ساتھ کس حد تک جا چکا ہے۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ نینا اس سے مل چکی ہے۔ یہ سوچ اسے ایک نئی راہ دکھانے لگی تھی۔ اس نے فواد خان کو سبق سکھانے کا سوچا، لیکن پھر رُک گئی۔ لیکن اس کے اندر بیٹھی ہوئی ضدی لڑکی مسلسل اسے اُکسا رہی تھی کہ فواد خان کے ساتھ ایک بار ایسا ہونا چاہیے کہ پتہ چل جائے کہ لڑکیاں یوں فالتو چیزیں نہیں ہوتیں کہ انہیں استعمال کیا اور پھینک دیا۔ اگر وہ انتقام لینے پر آئیں تو بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کرے کیا؟

ایک دن اچانک اس کے ذہن میں خیال آ گیا۔ اس نے وہ سم ایک جانب ڈال دی ہوئی تھی، جس سے وہ فواد خان سے باتیں کرتی تھی۔ اس نے چند دن بعد ہی اسے کال کی اور انتہائی جذباتی ہو جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''میں خودکشی کر رہی ہوں۔''

''شوق سے کرو، لیکن مجھے کیوں فون کیا، کیا خودکشی کرنے کا آسان طریقہ پوچھنا ہے۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر انتہائی طنزیہ انداز میں کہا۔

''نہیں، میں نے اس لیے کیا ہے کہ میں نے ایک طویل خط لکھ دیا ہے کہ جس میں لکھا ہے کہ میں نے خودکشی کیوں کی۔ میری خودکشی کی وجہ تم ہو۔'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''میں کیوں؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''تم نے میری محبت کا مذاق اڑایا، میں نے اپنی ملاقات کا وہ سارا واقعہ لکھ دیا ہے۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ہماری باتیں ہوتی تھیں فون پر اور تم لڑکیوں کو کس طرح پھانستے ہو۔ سب لکھ دیا۔ میں آج رات خودکشی کر

م نکال کر محفوظ کر دی۔ ایک طرح سے اس نے اس فرضی نام کو مار دیا تھا۔ وہی سم واپس لگالی، جو وہ معمول کے مطابق چلا رہی تھی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اس کے فون پر شعیب کی کال آ گئی۔ اس نے انتہائی معصوم بن کر بات کی۔ شعیب نے تھوڑی ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد جھجکتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے تم سے ایک بہت ضروری کام ہے، اگر تم کر سکو، میں تمہارا بہت احسان مند ہوں گا۔"

"بولو، میں اگر کر سکی تو۔" اس نے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ تم جانتی ہو، فواد خان ایک کمینہ قسم کا بندہ ہے۔ ایک لڑکی جو تمہارے کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کا نام......" یہ کہتے ہوئے اس نے وہ ساری روداد سنا دی، جس کے بارے میں وہ خود واقف تھی۔ تفصیل سنانے کے بعد بولا۔

"تم چاہو تو دونوں کو بچا سکتی ہو، پلیز انہیں بچا لو، یہ تمہارا مجھ پر......"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن فواد خان ایک غلط آدمی ہے، تم اس کی مدد کیوں کر رہے ہو، اسے سزا تو ملنی چاہئے۔ اس نے غلط کام کیا ہے۔" اس نے دلیل دیتے ہوئے کہا تو شعیب نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"چاہے وہ کمینہ ہے لیکن ہے تو دوست۔ ایک بار تو اسے بچانا ہے نا، پھر دیکھتے ہیں۔"

"اوکے، میں کوشش کرتی ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ کون ہے۔" اس نے ایک دم سے شعیب کا مان رکھتے ہوئے کہا

"کل تک کا وقت نہیں ہے، تم جیسے بھی ہو آج ہی نکلو، اسے کسی طرح مناؤ پلیز۔" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی جاتی ہوں، اس سے بات کرتی ہوں، اسے منانے کی پوری کوشش کروں گی۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

دو گھنٹے گذر گئے۔ اس نے ایک خط نما تحریر لکھ لی۔ تبھی اس نے شعیب کو فون کیا۔ وہ اسی کے انتظار میں تھا۔ اس نے کہا۔

"یہ میرے سامنے بیٹھی ہے۔ میں اسی کے گھر میں ہوں اور اسے منایا ہے۔ منایا کیا، اسے سمجھایا ہے۔ وہ کافی حد تک مان گئی ہے۔ اس کا خط میرے پاس ہے۔ لو اس سے بات کرو، تم بھی اسے سمجھاؤ۔" یہ کہہ کر ایک نے چند لمحے خاموشی اختیار کی، پھر اسی فرضی آواز میں روتے ہوئے بولی۔ "جی بولیں۔"

"دیکھیں، اس نے جو بھی کیا، غلط کیا میں مانتا ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تم خود بھی بدنام ہو، اپنے والدین کو بھی رسوا کروا اور اس نے تو پھنس ہی جانا ہے۔ زندگی اس طرح نہیں گنواتے میں......"

"آپ جو بھی کہیں، وہ سب ٹھیک ہے، لیکن اسے سزا تو ملنی چاہئے نا؟" اس نے روتی ہوئی آواز میں کہا تو وہ فوراً بولا

"بالکل! ملنی چاہئے، لیکن اتنی بھیانک صورت میں نہیں۔ ہم کچھ دوسرا سوچ سکتے ہیں۔"

"تو پھر، اس کی آواز ریڈیو پر نہیں گونجنی چاہئے۔ میں اس کی آواز نہ سنوں۔ وہ کسی دوسری لڑکی کو اپنے جال میں نہ پھنسائے۔"

"ٹھیک ہے، اب وہ کبھی ریڈیو پر نہیں بولے گا۔" شعیب نے ایک دم سے اس کی بات مان لی

"یہ مت سمجھنا کہ آپ نے کہہ دیا اور میں نے مان لی، جس دن میں نے اس کی آواز سنی، اسے وہیں جا کر گولی مار دوں گی۔ جو اپنی زندگی ختم کر سکتی ہے، وہ اسے بھی مار سکتی ہے۔ وہ کسی لڑکی کو خراب کرنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا، یہ میری وارننگ ہے۔"

"اب اس کی آواز کم از کم آپ کو کبھی سنائی نہیں دے گی نہ ریڈیو پر اور نہ سیل فون پر، یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔" اس نے کہا تو وہ بولی۔

"ٹھیک ہے، میں یہ خط نینا کو دے رہی ہوں، وہی اسے جلا دے گی۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ چند ثانیے رُکی اور پھر اپنی اصل آواز میں بولی۔ "میں نے خط لے لیا ہے شعیب، اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، وہ ایسا ویسا کچھ نہیں کرے گی۔ میں اب گھر جا رہی ہوں۔ چاہو تو راستے میں مجھ سے خط لے سکتے ہو۔ اس نے یہ مجھے دے دیا ہے۔"

"نہیں، تم اسے ضائع کر دو۔ ابھی تم گھر پہنچو پھر بات کرتے ہیں۔" اس نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ بہت دیر تک ہنستی رہی۔ وہ خود پر حیران ہوتی رہی تھی کہ شعیب بھی اس کی آواز نہیں پہچان پایا تھا۔ وہ بہت مسرور ہوئی کہ اس نے ایک بہت اچھا کام کر دیا، جو اس کی صلاحیت کی وجہ سے ممکن ہو گیا۔ اس دن اسے پتہ چلا یہ صلاحیت اس میں ہے۔

اس دن کے بعد فواد خان کی آواز ریڈیو پر سنائی نہ دی۔ دن گذرتے گئے۔ لڑکیوں میں وہ نام ایک قصہ پارینہ بن گیا۔ اب وہی لوگ زیر بحث آنے لگے جو سنائی دیتے تھے۔ وہ اپنے کام میں لگ گئی۔ کالج سے آنے کے بعد وہ میڈم سمیرا کے گھر چلی جاتی، جہاں پڑھنے والی لڑکیاں آئی ہوئی ہوتیں۔ وہ انہیں پڑھاتی، شام ہونے سے قبل وہ اسٹاپ پر آ جاتی اور وہیں سے اپنے گھر چلی جاتی۔ دن اسی طرح گذرتے چلے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ بی اے کے فائنل امتحان کا وقت آ گیا۔ امتحان اس نے میڈم سمیرا کے گھر رہ کر دیئے۔

ان دنوں اس کی میڈم کی بیٹی سائرہ سے بہت زیادہ دوستی ہو گئی۔ ایک ہی چھت تلے رہنا، اور ہر وقت کا ساتھ ہونے کہ وجہ تو تھی ہی، دوسرا سائرہ کی کوئی بہن نہیں تھی۔ اس لیے نینا میں اس کا پیار کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی اپنی ماں کی طرح لیکچرار بنے لیکن یونیورسٹی کی۔ اسے یونیورسٹی میں پڑھنے اور پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی اور یہ خواب پورا ہونے میں کچھ ہی ماہ باقی تھے، امتحانوں کے بعد رزلٹ آنے تک ہی تو انتظار کرنا تھا۔ میڈم سمیرا نے نینا سے کہا کہ وہ اس کی بیٹی کے ساتھ پڑھنے چلی جائے، سارا خرچ وہ برداشت کر لے گی۔ سائرہ اس پر نہ صرف راضی تھی بلکہ بہت خوش کہ اس کا ساتھ مل جائے گا۔ اسے وہاں اکیلا نہیں رہنا پڑے گا۔ لیکن نینا نے مزید بوجھ بننا گوارا نہیں کیا۔ اس لیے انکار کر دیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ پرائیوٹ طور پر ایم اے کا امتحان پاس کر لے گی۔ وہاں رہنے کا یہ فائدہ ہوا کہ ایک تو اسے وقتی طور پر اتنی رقم مل جاتی تھی کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے، دوسرا، سائرہ کو انگریزی ناول اور کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا، وہ نہ صرف وہاں پڑھتی رہی بلکہ سائرہ کے ساتھ اس کی باتیں بھی چلتی رہتی۔ تیسرا یہ دن بہت اچھے گذرے تھے، جنہیں وہ یاد کر سکتی تھی۔

امتحان ختم ہو گئے اور وہ واپس اپنے گاؤں آ گئی۔ وہ کالج کے دنوں کو بڑا یاد کیا کرتی تھی۔ گھر میں وہی افراتفری رہتی تھی کہ برتن دھو لو، جھاڑو دے دو۔ اسے اپنے گاؤں گئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ انہی کے گاؤں کے پاس ایک پرائیویٹ اسکول کھل گیا۔ انہوں نے بطور ٹیچر اسے آفر کی۔ نینا نے یہ سوچا کہ گھر میں فارغ بیٹھنے سے اچھا ہے کہ وہ اسکول میں پڑھا لیا کرے اور اس سے آمدنی ہو جائے۔ اس نے اسکول جوائن کر لیا۔ اسکول چونکہ نیا تھا، اس لیے وہاں تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی، اس لیے وہاں ٹیچرز پڑھاتی کم اور گپیں زیادہ لگاتی تھیں۔ جس طرح علاقے میں اسکول بننے کی شہرت ہوئی، اسی طرح وہاں پر موجود ٹیچرز کا حوالہ بھی زبان زد عام ہو گیا۔ ہر کسی کو معلوم تھا کہ وہاں کون پڑھا رہا ہے۔ کون سی ٹیچر کیسی ہے۔

نینا کے حسن کا شہرہ تو پہلے ہی تھا۔ اس پر جن نوجوانوں کے من میں اس کے "عشق" کی دبی ہوئی چنگاری پھر سے دھواں دینے لگی۔ نینا گھر کے قریب ہی ایک اسٹاپ سے ایک وین میں سوار ہوتی اور دوسرے گاؤں اسکول چلی جاتی تھی۔ لڑکوں کا یہ تماشا وہ اس وقت سے دیکھتی آئی تھی، جب سے وہ شہر کالج پڑھنے جایا کرتی تھی۔ اس دوران اس کا رابطہ شعیب سے رہا۔ وہ کبھی کبھار فون کر لیا کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے بات بڑھتی گئی۔ ان کا رابطہ فون پر تو رہا، لیکن وہ کبھی ملے نہیں۔ نینا کے ذہن میں شعیب وہی تھا جو ایف ایم ریڈیو میں ریکارڈنگ کر رہا تھا۔ وہی تصویر اس کے حافظے پر نقش تھی۔ ان کے درمیان تعلق کچھ اتنا گہرا ہو گیا کہ اس نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اس نے یہ بات قطعاً نہیں بتائی کہ وہ فرضی طور پر فواد خان کو کیا جھٹکا دے چکی ہے۔ انہی دنوں شعیب نے اپنے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا۔ وہ شہر کے ایک امیر ترین بزنس مین کا بیٹا تھا۔ وہ ایک بڑے بھائی اور دو بہنوں کے بعد تھا۔ بڑا بھائی اپنے باپ کے ساتھ بزنس میں تھا، بہنیں امریکا بیاہ دی گئی تھیں، وہ انجینئر بننے کے بعد مزید تعلیم کے لیے امریکا چلا جائے گا۔ شعیب نے اسے آفر دی کہ وہ یہ سب چھوڑ دے اور سی ایس ایس کی تیاری کرے۔ اس پر جتنا بھی خرچ آئے گا وہ اسے مالی طور پر سپورٹ کرے گا۔ لیکن نینا کو اپنے بارے میں زیادہ بہتر پتہ تھا۔ اس لیے وہ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اس کا اصرار رہا کہ جو وہ کہہ رہا ہے وہ کرے۔ ایک دن جب وہ شہر گئی تو شعیب سے ملی۔ یہ اس کی دوسری ملاقات تھی۔ وہ حجاب میں رہی۔ شعیب نے تب بھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے لیے بہت ساری چیزیں، کپڑے، اور کتابیں لے کر آیا تھا۔ یہ ساری وہ کتابیں تھیں جو سی ایس ایس میں اسے مدد دے سکتی تھیں۔ اس نے وہ ساری چیزیں ایک دوست کی حیثیت سے قبول کرلیں۔ یوں دن گذرتے گئے۔ ان کے درمیان ایک انجانا سا تعلق رہا پھر ایک دن شعیب بھی باہر چلا گیا۔ وہ ایسا گیا کہ پھر اس کی خبر نہ ملی۔ پہلے پہل ایک دو بار فون آیا، اس کے بعد وہ جیسے گم ہی ہو گیا۔ پھر یوں غائب ہوگیا، جیسے وہ اس سے کبھی ملا ہی نہیں تھا۔

نینا اسی اسکول میں پڑھاتی رہی۔ ان دنوں اس کا بی اے کا رزلٹ آنے والا تھا۔ وہ یونیورسٹی جانے کے سہانے خواب دیکھ رہی تھی کہ انہی دنوں ساتھ ہی کے گاؤں کا چوہدری پرویز اس کے بارے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگا۔ جس وقت وہ اسکول جاتی، وہ اس کے اسٹاپ پر اپنی بائیک لیے کھڑا ہوتا۔ وہ اس وقت تک کھڑا رہتا، جب تک وہ وین میں نہ بیٹھ جاتی۔ پھر وہ وہاں دکھائی دیتا، جہاں اس نے وین سے اترنا ہوتا تھا۔ ایک ادائے خاص سے اس کی طرف دیکھتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں نجانے کتنے پیغام دے کر وہاں سے غائب ہو جاتا۔ پہلے پہل نینا نے اسے اتنا محسوس نہیں کیا۔ اس نے یہی سمجھا کہ وہ بھی چند دن اسی طرح کوشش کرنے کے بعد خود ہی دفعان ہو جائے گا لیکن اس کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس کی خاموشی نے اسے مزید شہہ دی۔ وہ اسے فون کرنے لگا۔ نینا نے اسے بڑے پیار سے فون پر سمجھایا کہ وہ باز آ جائے۔ اس کا کچھ نہیں جاتا، کسی بھی لڑکی کی عزت ایک پانی کے بلبلے کی مانند ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس لگتی ہے تو پھر لڑکی کہیں کی نہیں رہتی۔ مگر وہ باز نہیں آیا۔ وہ اس کے لیے دن بدن مسئلہ بنتا چلا جا رہا تھا۔ پھر ایک دن اس نے سوچ لیا کہ وہ اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دے۔ کب تک وہ راہوں میں کھڑا رہے گا؟ دراصل چوہدری پرویز کوئی اتنا بڑا جاگیردار نہیں تھا اور نہ بڑا زمیندار تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس کا شمار چھوٹے زمینداروں میں ہوتا تھا۔ ایسے کئی خاندان تھے لیکن لوگ اُن سے اس لیے خوف زدہ رہتے تھے کہ وہ بدقماش اور بدمعاش تھے۔ جرائم پیشہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان سے کنی کتراتے تھے۔ ان کا تعلق کیسے لوگوں سے تھا، یہ ایک کھلا راز تھا، اسی بل بوتے پر وہ سیاست کے میدان میں بھی تھے۔ یہ صرف اسی وجہ سے تھا کہ ان کے جرم چھپ جائیں اور جو کچھ کرتے پھریں انہیں کوئی نہ پوچھے۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہی ہوگیا جس سے وہ خود خوف زدہ تھی۔ وہ چند لڑکیوں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ وین آنے والی تھی۔ وہ سڑک کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ اچانک وہ بائیک پر اس کے پاس آ کر بڑے دھڑلے سے بولا۔

''آؤ بیٹھو، تمہیں اسکول چھوڑ دوں۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تقریباً سبھی لوگوں نے اس کی نہ صرف یہ حرکت دیکھی بلکہ اس کی یہ آفر بھی سنی۔ وہ خاموش رہی تو اس نے دوبارہ کہا تب نینا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جاؤ چلے جاؤ اور دوبارہ میری راہ میں نہ آنا، ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔''

یہ سن کر وہ ہلکا سا مسکرایا اور پھر خوشگوار لہجے میں بولا

''اوئے خیر! حضور بولے تو، میرے ساتھ بیٹھو، راستے میں سمجھاتا ہوں۔''

''چلے جاؤ یہاں سے، میرے منہ مت لگو، ہر بندے کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔'' اس نے غصے میں کہا لیکن اس کی آواز دبی ہوئی تھی۔

''شکر کر تو مجھے پسند آ گئی ہے۔ تیری تو قسمت کھل جائے گی۔ ایک بار اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر دیکھ، رانی بنا کر رکھوں گا۔'' اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تو نینا کا غصہ قابو سے باہر ہونے لگا۔ اس لیے دانت پیستے ہوئے بولی۔

''چلا جا کتے، ورنہ سر پھاڑ دوں گی۔''

''اے! زبان سنبھال کے بات کر، ورنہ ادھر ہی چیر کر رکھ دوں گا، اپنی اوقات دیکھ پہلے۔'' اس نے غصے میں بھنا کر کہا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے

پوری قوت سے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا اور چوہدری پرویز کی گال پر دے مارا۔ چٹاخ کی آواز نے وہاں پر موجود ہر شخص کو ان کی جانب متوجہ کر دیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ایسا کر گزرے گی۔ اس نے انتہائی حیرت سے نینا کو دیکھا۔ تب تک وہاں ایک شور مچ گیا۔ وہ غصے میں آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑنا چاہتی تھی کہ چوہدری پرویز کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ بروقت سنبھل گیا اس لیے مزید کچھ کہے بنا اس نے اپنی بائیک کو گیئر لگایا اور وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ کئی سارے لوگ تو ویسے ہی اِدھر اُدھر ہو گئے۔ وہ اس پھڈے میں پڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ انہیں گواہی ہی دینا پڑ جائے۔ کئی تماشا دیکھنے کو وہیں کھڑے رہے۔ اس نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی اور اپنے اسکول چلی گئی۔

شام ہونے کو آ گئی۔ چوہدری پرویز کی طرف سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ یہ خاموشی بہت خوفناک تھی۔ چوہدری پرویز کے حامیوں کو دکھ ہوا یا نہیں یہ الگ بات تھی مگر ان کے دشمنوں کو یہ بات مل گئی اور انہوں نے پورے علاقے میں یہ بات پھیلا دی۔ سیل فون ایک ایسی ایجاد تھی جس نے یہ خبر دُور دُور تک پھیلا دی۔ اس کے بھائی بھی یہ بات سن چکے تھے۔ انہوں نے گھر میں کوئی تبصرہ نہیں کیا اور خاموش رہے۔ گھر کی فضا یوں ہو گئی جیسے اس میں خوف گھل گیا ہو۔ وہ ساری رات نہ سو سکی۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہا کہ اب کچھ ہوا کہ اب کچھ ہوا۔

صبح وہ اسکول جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس کی ماں نے دبے لفظوں میں کہا ابھی مت جاؤ، کہیں کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔ اس نے یہی جواب دیا کہ ماں اگر میں آج ڈر گئی تو پوری زندگی ڈرتی رہوں گی۔ اس نے ماں کی بات نہ مانی اور گھر سے چل پڑی

وہ اسٹاپ پر آ کر رکی اور وین کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد وین آ گئی۔ وہ روزانہ کی طرح اپنے دھیان وین میں سوار ہو گئی۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ وین چل پڑی۔ مگر وہ دیکھ اور سمجھ چکی تھی کہ دھوکا ہو گیا۔ اس وین میں چوہدری پرویز کے ساتھ چند غنڈے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ کوئی ایسا مسافر نہیں تھا جو روزانہ آنے جانے والا ہو۔ وہ بیٹھی نہیں بلکہ پلٹ کر دروازے کی جانب لپکی۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا [illegible] بی اس گئی۔ پکڑو پکڑو کی آوازیں آنے لگیں۔ ڈرائیور سے کہا۔

''ویگن روک دو، ورنہ میں چلتی ویگن سے چھلانگ مار دوں گی۔''

''چل چل تو بھگا، یہ تو اب ڈیرے پر ہی جا کر رُکے گی، وہیں تیری اکڑ نکالتے ہیں یہ سب۔'' چوہدری نے ایک ہی وقت میں دونوں سے کہا مگر نینا نے اس کی بات نہیں سنی اس نے چیخ کر ڈرائیور سے کہا کہ روک دو اور دروازے کی جانب بڑھی۔ اسی وقت دو غنڈوں نے اٹھ کر اسے قابو میں کرنا چاہا تب تک وہ وین کا دروازہ کھول چکی تھی۔ ڈرائیور سمجھ دار بندہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسی رفتار میں اگر اس لڑکی نے چھلانگ لگا دی تو قتل اس کے ذمے پڑ سکتا ہے۔ اس نے ایک دم سے بریک لگا دیے۔ وہ اپنے پاؤں پر بھی نہ رہ سکی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، رفتار کم تھی اس نے چھلانگ لگا دی۔ وہ پکی سڑک کے کنارے کچی جگہ پر گری اور وہاں سے لڑھکتی ہوئی جھاڑیوں میں جا پڑی۔ اس کے سر اور بازو میں سخت چوٹیں آئیں تھیں۔ وہ گرنے کے چند لمحے بعد بے ہوش ہو گئی تھی۔

اسے جب ہوش آیا تو وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی ایک کار میں تھی۔ کچھ دیر تک اسے سمجھ میں نہیں آیا، پھر اسے ہوش نہ آیا۔ سڑک پر سے گزرنے والی کار کو لوگوں نے روکا تھا۔ اور اس میں اسپتال کی جانب چل پڑے تھے۔ وہ اسپتال جا پہنچے۔ تو کار والا انہیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔ جب نینا کے حواس بحال ہوئے تو اس نے اپنے بھائی کا چہرہ دیکھا۔ تب اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ چار پانچ گھنٹے تک اسپتال میں رہی۔ مختلف چیک اپ کے بعد اسے اسپتال سے جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ گاؤں جانے کے لیے اسپتال سے نکلی ہی تھی کہ پولیس کے چند لوگوں نے انہیں گھیر لیا۔ ان کے ساتھ ایک لیڈی کانسٹیبل بھی تھی۔ وہ انہیں تھانے لے جانا چاہتے تھے۔

''ہمارا قصور کیا ہے بھائی؟'' اس کے ایک بھائی نے پوچھا تو پولیس والے نے کہا۔

''یہ تو تھانے جانے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔ آرام سے چلو تو ٹھیک ورنہ......''

وہ ان کے ساتھ تھانے چلے گئے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ڈرائیور کی طرف سے درخواست دی گئی ہے کہ لڑکی نے اس کے سر پر ضرب لگائی اور اس کا پرس چھین کر بھاگ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ وین سے گری۔ اس پر ڈکیتی اور راہزنی کا الزام تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔

"ظلم تو ہمارے ساتھ ہوا ہے، ہم اپنی بدنامی کے خوف سے تھانے نہیں آئے الٹا انہوں نے ہم پر یہ الزام لگا دیا؟"

اس کے بھائی نے واویلا کیا تو منشی نے اسے ڈانٹ دیا

"اوئے چپ کر، ظلم ہوا، بہن کو ڈکیتی پر لگایا ہوا ہے اور تھانے میں مظلوم بنتا ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو منشی جی، ہم جھوٹ نہیں کہہ رہے ہیں، ہم سچ......" اس کے چھوٹے بھائی نے کہا تو منشی نے انتہائی حقارت سے کہا۔

"اوئے بھونک نہ مار، دفعہ ہو جا، یہ رونا صاحب کے آگے رونا، جاؤ ادھر جا کر بیٹھ جاؤ۔"

وہ دونوں کسی ملزم کی طرح ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے، نینا ایک دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد اس کے بڑے بھائی نے کہا۔

"میں کچھ کرتا ہوں، کسی بندے کی منّت کرتا ہوں جا کر، میں جلدی آ جاؤں گا، تم لوگ فکر مت کرنا۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور تھانے سے باہر چلا گیا۔ ہر آنے جانے والا انہیں دیکھ رہا تھا۔ کسی کی نگاہ میں کیا تھا اور کوئی کیسے دیکھ رہا تھا۔ دوسرا برداشت نہ کر سکا۔ وہ بھی کچھ دیر نینا کے پاس بیٹھا اور پھر اٹھ گیا۔ وہ اکیلی وہاں بیٹھی رہ گئی۔ اسے یہی سوچ کر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ اپنے کو بچایا ہے، وہ کام کیا جو پولیس کو کرنا چاہیے تھا، لیکن انہیں ہی مجرم بنا کر تھانے میں رکھا ہوا ہے۔ کیا ایسا صرف اسی لیے ہے کہ وہ غریب ہیں اور ایک دولت مند کی بات اس نے نہیں مانی۔ کیا انصاف کا معیار صرف دولت ہے؟ کیا غریب یہاں جھوٹا ہے؟ وہ چاہے مظلوم بھی ہو؟ کیا طاقتور کی حکومت ہے؟ کیا وہ سب لوگ بکواس کہتے ہیں کہ یہ ایک جمہوری ملک ہے اور یہاں سب کے حقوق برابر ہیں؟ کیا عام آدمی کو جینے کا کوئی حق نہیں؟ وہ یہی سوچتی چلی جا رہی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ لڑکی جس نے کبھی تھانہ نہیں دیکھا تھا، وہاں جانے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا، وہ ایک ملزم کی حیثیت سے وہاں زمین پر بیٹھی ہوئی ہے۔ صبح سے سہ پہر کا وقت ہو گیا تھا۔ اس کا بھائی نہیں لوٹا تھا۔ وہ نجانے کن خیالوں میں گم تھی کہ ایک لیڈی کانسٹیبل اس کے پاس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔

"لو یہ پی لو۔"

اس نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا، اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ وہ چند لمحے ہونقوں کی طرح دیکھتی رہی پھر گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں پانی پی گئی۔

"کوئی نہیں آیا تیرے پیچھے؟"

"کون آئے گا، دو بھائی تھے، وہ بھی بے چارے باہر چلے گئے ہیں۔" اس نے دکھ سے کہا۔

"میں یہ نہیں پوچھتی کہ تم نے کوئی جرم کیا ہے یا نہیں، لیکن ایک بات پر مجھے حیرت ہو رہی ہے وہ پوچھنا چاہتی ہوں۔" لیڈی کانسٹیبل نے پوچھا۔

"پوچھو۔" اس نے فرش پر نگاہیں گاڑے کہا تو لیڈی کانسٹیبل نے پوچھا۔

"تیرے جیسی لڑکیاں یہاں آئیں تو چاہے جھوٹ چاہے سچ میں، روتی ضرور ہیں مگر تمہاری آنکھ سے ایک بھی آنسو نہیں نکلا، یہ کیا بات ہوئی بھلا؟"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" اس نے ایک دم لیڈی کانسٹیبل کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پتہ نہیں کیوں روئی، میں نہیں جانتی۔" وہ بولی

"لیکن میں سمجھتی ہوں۔ مجھے بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے اس محکمے میں، تم مجھے کچھ الگ سی لگی ہو۔ میں نے تم سا کوئی دوسرا دیکھا نہیں کہ اس پر وار ہو اور وہ نہ روئے، ایسا بس وہی کرتا ہے جو درندہ ہو۔"

"میں سمجھی نہیں؟" نینا نے تیزی سے سر اٹھا کر کہا تو لیڈی کانسٹیبل بولی۔

"کبھی کسی درندے کو روتے ہوئے دیکھا ہے، نہیں نا، کیونکہ درندے کی درندگی اسی وقت تک رہتی ہے، جب تک اس کا آنسو نہیں بہتا۔"

"جب مجھے رونے کی جگہ غصہ آ رہا ہے تو میں کیا کروں۔" اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھتی ہوں اور میرا اندازہ بالکل ٹھیک نکلا، اور سنو! میری بیٹی کی عمر بھی تمہارے جتنی ہے۔ مجھے تم میں اپنی بیٹی دکھائی دے رہی ہے۔ ایک بات یاد رکھنا، تلوار اور بندوق دونوں ہی ہتھیار ہیں۔ لیکن تلوار بندوق کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یاد رکھنا۔ میں کرتی ہوں تیرے لیے کچھ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور باہر کی جانب چل دی۔

تقریباً دو گھنٹے ابھی پورے نہیں ہوئے ہوں گے۔ ایک درمیانے قد کا ادھیڑ عمر شخص تھانے میں آیا تو ایک دم سے ہلچل مچ گئی۔ تھانے کا وہ منشی جو کسی کی بات نہیں سن رہا تھا اور فرعون بنا بیٹھا تھا یوں لپک کر اٹھا جیسے کوئی عزرائیل آ گیا ہو۔ جیسے ہی وہ تپاک سے ملا تو اسی ادھیڑ عمر بندے نے سکون سے پوچھا۔

"کہاں ہے تمہارا صاحب؟"

"شاہ جی وہ تو گشت پر ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔ آپ بیٹھیں، مجھے بتائیں کیا خدمت ہے۔" منشی نے اپنے لہجے میں مٹھاس بھرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ایس ایچ او ابھی آئے گا یا نہیں؟" شاہ جی نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ اس دوران اس کی نگاہ نینا پر پڑی۔ وہ اسے چند لمحے تک دیکھتا رہا پھر نگاہیں منشی پر ٹکا دیں۔

"جی، وہ آج شاید ہی......" وہ منمناتے ہوئے کہنے لگا تو شاہ جی نے کہا۔

"اس لڑکی پر ظلم کرنے کے لیے تم لوگوں نے کتنے پیسے لیے ہیں۔" اس اچانک سوال پر منشی ایک دم سے گھبرا گیا۔ پھر تیزی سے بولا

"آپ بیٹھیں، میں آپ کو بتاتا ہوں۔"

"مجھے بیٹھنا نہیں ہے میری بات کا جواب دو۔"

"وہ جی، صاحب کو......"

"بکواس بند کرو اور اس بے غیرت کو بتا دینا کہ لڑائی مردوں سے لڑتے ہیں، عورتوں سے نہیں، اس لڑکی کو جانے دو اور اس کی طرف کوئی نگاہ بھی نہ کرے، میں دیکھتا ہوں اُسے۔" شاہ جی نے غصے میں کہا تو منشی نے ایک لمحہ سوچے بغیر نینا کو جانے کا اشارہ کیا۔ نینا اٹھ کر تھانے کے باہر چلی گئی۔ اسے یہ ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ شاہ جی کا شکریہ ادا کر سکے۔ اس کے دماغ میں تو یہی چلنے لگا تھا کہ انصاف نہیں، تلوار کے سامنے بندوق نہ ٹھہر سکی۔

تھانے کے باہر دیوار کے ساتھ اس کا بھائی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کا انتظار لوٹ کر واپس نہیں آیا تھا۔ اسے یوں دیکھ کر وہ جلدی سے اُٹھا۔ اس کے قریب آ کر بولا

"کیا ہوا، چھوڑ دیا انہوں نے؟"

"ہاں، آؤ چلیں۔" یہ کہہ کر وہ یوں چل دی جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی ہو۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ اسے اس نظام پر ہی نہیں اپنے آپ پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ کیوں اس قدر اپنے آپ کو سنبھالنے والی بن گئی؟ کیوں اس نے پڑھا لکھا اور تعلیم حاصل کی؟ اس کی اوقات ہے؟ کیا قدر ہے اس معاشرے میں، وہ معاشرہ جو خود کو اسلامی کہتا ہے لیکن جہاں عورت کا تقدس تو کیا اس کی عزت تک نہیں کی جاتی؟ یہ کس کا قصور ہے؟ اس کا اپنا ہے۔ وہ کیوں اس معاشرے میں پیدا ہو گئی۔ اگر عورت کی عزت نہیں کرنی تو اسے بچپن میں ہی زندہ درگور کر دیا جانا چاہیے تھا؟ کیا عورت کو اپنی عزت سمجھنے والے، غیرت میں آ کر قتل کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ عورت کی عزت بھی کی جاتی ہے؟ کیا یہ معاشرہ صرف طاقتوروں کا ہے؟ کیا یہ جنگل ہے اور یہاں کا قانون بھی جنگلوں جیسا ہے کہ جو طاقت ور ہے وہ جو مرضی کر سکتا ہے؟ سوالوں کا ایک سلسلہ تھا جو اسے پاگل کیے دے رہا تھا، اس کے دماغ میں یہ سوال نجانے کہاں سے آ رہے تھے، اس کا جواب اسے کیا خاک ملتا؟

وہ اپنے گھر پہنچ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بھابی کیا کہے گی۔ اس کا رویہ کیسا ہوگا؟ سو اس نے ٹھان لی کہ وہ جو کہے گی، وہ خاموشی کے ساتھ سن لے گی۔ اس نے اپنی ماں کو ساری بات من و عن بتا دی۔

"پتر! ہم غریب لوگ ہیں، ہم کسی سے مقابلہ نہیں کر سکتے، ہمارا جینا اسی طرح سے ہے، یونہی جینا ہوگا۔" اس کی ماں نے روتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔ وہ ماں کے آنسوؤں کو دیکھ کر بھی نہیں روئی۔ اس کے دماغ میں یہ چلنے لگا کہ نصاب کی ان کتابوں کو آگ لگا دی جائے جس میں انصاف، بھائی چارہ اور رواداری کا سبق دیا جاتا ہے۔ وہاں تو یہ پڑھانا چاہیے کہ یہ معاشرہ جس میں ہم رہ رہے ہیں یہ ایک جنگل ہے، یہاں انسان کی قدر نہیں، یہاں طاقت کی حکومت ہے۔ اس میں کس طرح رہنا ہے، یہ

طریقہ سکھایا جائے کہ طاقتور کے آگے کس طرح جھکے رہنا ہے اور کمزور پر کس طرح ظلم کرنا ہے۔ ان طاقت ور لوگوں نے ایسے اصول اور ضابطے بنا لیے ہیں، جو اچھے انداز میں غریبوں کو پھنسانے اور انہیں ذلیل کرنے کا ہتھکنڈہ ہیں۔ ان میں ایک پنچائت بھی ہے۔ ممکن ہے کبھی پنچائت میں فیصلہ ہوتا ہوگا۔ لیکن جب فیصلہ کرنے والا ہی ڈنڈی مار جانے والا ہو، ملزم ہی کا ساتھی ہو تو اس سے انصاف کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ وہاں بے انصافی ہی ہوگی۔

چوہدری پرویز یہیں تک محدود رہتا تو شاید بات آگے نہ بڑھتی۔ نینا نے تو اسکول جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مگر وہ اسے فون پر دھمکیاں دینے لگا۔ اس نے علاقے ہی کے ایک معتبر بندے کے پاس اس ڈرائیور کو بھیجا تاکہ پنچائت بلا کر اس لڑکی نینا سے اپنی رقم لے سکے۔ علاقے کے اس معتبر بندے کی طرف سے پیغام آنے لگے کہ فلاں دن پنچائت ہے۔ اس لیے پنچائت میں حاضر ہو کر اپنی صفائی بیان کریں، ورنہ باقاعدہ ایف آئی آر درج کرا دی جائے گی۔ اس کا بھائی پیغام لے کر آنے والے بندے کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ علاقے کے اس معتبر بندے کو ہمارے بارے میں بتائے۔ ہم پر جھوٹا الزام ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس پنچائت سے بچنا چاہتے تھے۔ ایک بار تو وہ سن کر چلا گیا لیکن اگلے دن وہ پھر پیغام لے کر آ گیا کہ اگر پنچائت میں نہیں آنا تو اس کی رقم چپ چاپ واپس کر دی جائے۔ یہ معاملہ حل نہیں ہو رہا تھا۔ نینا کو اُس پر بے تحاشا غصہ بھی آ رہا تھا۔ مگر وہ مجبور تھی۔ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ تبھی اس نے اسی لیڈی کانسٹیبل سے مدد لینے کا سوچا، اس نے فون کر کے اسے ساری روداد بتائی تو اس نے چند مشورے دیئے۔ تیسرے دن پھر وہی بندہ پیغام لے کر آ گیا کہ کل شام کو پنچائت ہے، اگر نہ آئے تو اٹھا کر لے جائیں گے۔ اس پر نینا نے آ کر غصے میں کہا۔

''اوئے، چپ کر کے یہاں سے چلا جا اور جا کر اپنے اس پنچایتی سے کہہ، اگر دوبارہ اس دروازے پر آیا تو پھر وہی ذمے دار ہوگا۔ جا دفعہ ہو جا، دوبارہ مت آنا۔''

اس دن وہ بندہ ان کے گھر سے چلا گیا مگر اس کے بعد کوئی ان کے دروازے پر نہیں آیا۔ اصل میں اسی لیڈی [illegible] بندے کو بتا دیا، پھر ان کی جرات نہ ہوئی کہ دوبارہ ان کی طرف کوئی منہ کرتا۔ سو دن سکون سے گذرنے لگے۔

انہیں دنوں نینا کو احساس ہوا کہ طاقت کس حد تک ضروری ہے۔ یہ جو نام نہاد معاشرے کے اصول وضوابط ہیں، یہ بھی طاقت وروں کے لیے ہیں۔ وہ انہی اصولوں کی وجہ ہی سے کمزوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ وہ باغی ہو گئی۔ شرافت، ہمدردی، حق، فرض، قانون اس کے لیے بے معنی لفظ بن گئے۔ اس کی سوچ بدل گئی۔ شاید وہ کچھ دنوں بعد معمول پر آ جاتی، اگر چوہدری پرویز اس کا پیچھا چھوڑ جاتا۔ اس نے نینا کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ فون کرنے سے، اسے دھمکیاں اور گالیاں دینے سے اب بھی باز نہیں آتا تھا۔ وہ اپنا فون بند رکھنے لگی تھی

یہ واقعہ ان کی گھریلو زندگی پر بھی اثر انداز ہوا۔ اس کا بڑا بھائی تو اس کے خلاف پہلے ہی تھا، بھابی نے جو شور مچایا تو ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ چند دنوں میں ہی وہ اپنے بال بچوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ اس کا اثر اس کی ماں پر بھی پڑا، وہ وقت بے وقت رونے لگتی۔ ایک ذریعہ معاش تو تھا ہی وہ ختم ہو گیا، دوسرا ان کا کون سا لمبا چوڑا خاندان تھا، بیٹا الگ ہوا تو ماں صدمے سے نڈھال ہو گئی۔

اس کی ماں یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائی تھی کہ ایک دن اس کا منجھلا بیٹا اپنے کام پر جا رہا تھا۔ وہ راستے ہی میں تھا کہ ایک موٹر سائیکل والا اس میں آ لگا۔ موٹر سائیکل پر تین لوگ سوار تھے۔ انہوں نے بغیر کوئی بات کیے اسے مارنا شروع کر دیا۔ اسے اتنا مارا کہ وہ وہیں سڑک پر بے ہوش ہو گیا۔ وہاں پر موجود لوگوں نے بتایا کہ اس کا کوئی قصور نہیں تھا، پھر بھی انہوں نے یوں مارا جیسے اُسے جان بوجھ کر مار رہے ہو۔ اسے لوگ اٹھا کر اسپتال لے کر گئے۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ اس کے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ اور جو چوٹیں آئی ہیں، وہ اسے دو تین ماہ سے پہلے نہیں اٹھنے دیں گیں۔ وہ بے چارہ گھر آن پڑا۔ چند دن بعد ہی پتہ چل گیا کہ وہ لوگ چوہدری پرویز کے تھے۔ اس نے جان بوجھ کر انہیں بھیجا تھا۔

ان کے گھر پر خوف کی فضا نے ڈیرا جما لیا۔ بھائی چارپائی سے لگ گیا۔ اس کے دوا اور علاج کے لیے گھر کی چیزیں بکنے لگیں۔ بڑا بھائی الگ ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی مدد نہ کی۔ چھوٹا

بھائی جو پڑھ رہا تھا، اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور مزدوری کرنے لگا۔ ایک مزدور کی آمدنی کیا ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے بھائی کا علاج کرواتا یا گھر کی روٹی پوری کرتا، وہ جو لاتا اپنی ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ نینا نے ایک بار دبے لفظوں میں کہا بھی کہ وہ دوبارہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے لیکن اس کی ماں نے سختی سے منع کر دیا۔ حالات دن بدن سخت ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس نے ایک دن اپنے پرانے اسکول میں رابطہ کیا تاکہ پھر سے جا سکے، اس کا خیال یہ تھا کہ وہ اپنی ماں کو منا لے گی۔ اسکول سے جو جواب ملا، اس نے نہ صرف اسے چکرا دیا، بلکہ خود اسے اپنی ہی نگاہوں میں گرا کر رکھ دیا۔ انہیں نے کہا تھا کہ ایسی لڑکی جو تھانوں میں پھر آئی ہو، جس پر ڈکیتی کا الزام ہو اور بدمعاشوں سے سر پھٹول کرتی پھر رہی ہو، ہم اسے اسکول میں کیسے جگہ دے سکتے ہیں، وہ سوچ بھی نہیں۔ اس کی ہمت جواب دے گئی، اس کا کیا قصور؟ یہ بات اس کی سمجھ نہیں آئی۔

ایک دن وہ اپنی ماں والے کمرے میں کھری بان کی چارپائی پر لیٹی سوچ رہی تھی کہ کیا ہے یہ زندگی؟ میں اتنی مجبور کیوں ہوں؟ یہ چوہدری پرویز جیسا شخص مجھے تنگ کر رہا ہے اور میں اس کا کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ یہی سوچتے ہوئے اچانک اسے لیڈی کانسٹیبل کی بات یاد آ گئی۔ ''ایک بات یاد رکھنا، تلوار اور بندوق دونوں ہی ہتھیار ہیں۔ لیکن تلوار بندوق کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یاد رکھنا۔'' یہ سوچتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے ساری مجبوریوں کو ایک طرف رکھ دیا اور اس زمانے سے لڑنے کو تیار ہو گئی۔

وہ اٹھی اس نے اپنا وہ بہترین سوٹ نکالا، جو ان دنوں اُس کے پاس تھا۔ جسے اس نے استری کیا، خوب نہائی، فریش ہو کر اس نے خود کو سنوارا اور اپنا فون اور پرانی سمیں لے کر بیٹھ گئی۔ اس نے وہ سارے میسج دیکھے جو ہوتے رہے تھے۔ ان میں سے اس نے ایک ایسے لڑکے کو منتخب کیا جو چوہدری پرویز کا دوست تھا۔ اس نے ایک پرانی سم اس میں ڈالی اور آواز بدل کر اسے فون کر دیا۔ وہ بھی اُسے ''پٹانے'' کے چکر میں تھا اور اِس بار وہ ایک نئی لڑکی بن کر اس سے باتیں کرنے لگی۔

صرف تین ہفتوں میں اس نے علی اکبر کو یہ باور کرا دیا ہے۔ اس نے یونہی [illegible] نے اپنی امارات کے بارے میں ایسا [illegible] کر کے رکھ دیا۔ ایک بات نے تو اسے خود حیران [illegible] رہ گیا۔ انگریزی میں بات کرنا، یا ایک فقرے میں ایک آدھ لفظ جڑ دینا، ایسے ہی تھا، جیسے خود کو امیر، اور عقل مند ہونے کی تصدیق کروا دے۔ وہ جانتی تھی کہ علی اکبر انگریزی نہیں جانتا لیکن وہ بے حد مرعوب ہوا تھا۔ وہ اسے احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ وہ کوئی کم پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ یہ سارا زبان کا کھیل تھا۔ نینا نے فقط علی اکبر پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس دوران اس نے کئی دوسرے لڑکوں سے بھی دوستی کر لی۔ اس نے اپنے طور پر ایک معیار اور حد بنا لی ہوئی تھی کہ کسے کہاں تک رکھنا ہے۔ تقریباً تین مہینوں میں اس نے چوہدری پرویز کے بارے میں جان لیا کہ اس کی مصروفیات کیا ہوتی ہیں۔ کون اس کا دشمن ہے اور کون اس کا دوست۔ اسے احساس دلائے بغیر اس نے تمام تر معمولات کے بارے میں جان لیا۔ یہاں تک کہ اس نے پوری طرح تصدیق بھی کر لی۔

جن لڑکوں کو اس نے دوست بنایا تھا، ان میں ایک ملک زاہد تھا، جن کے ساتھ چوہدری پرویز کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح چوہدری پرویز کو مزا چکھا سکے۔ نینا نے اس پر سب سے زیادہ توجہ دی اور باقیوں کو فی الحال نظر انداز کر دیا۔ یہ تین مہینے اُس نے پوری توجہ سے یہ کھیل کھیلا، ایک بالکل نئی لڑکی بن کر اس نے پوری طرح ملک زاہد کو شیشے میں اتار لیا۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا، جب اس نے اس کھیل کو منطقی انجام تک لے کر جانا تھا۔ ملک زاہد اس سے ملاقات کا مطالبہ کرتا تھا اور وہ اُسے طرح دے جاتی تھی۔ آخر ایک دن اس نے ملک زاہد کو ملنے کا عندیہ دے دیا۔ ایک ریستوران میں ملاقات کا اہتمام ہوا، اور طے کیے وقت پر وہاں پہنچ گئی۔ وہ اسے ایک ایسی لڑکی کے روپ میں ملی کہ جس کے والدین ہیں تو بہت امیر لیکن اسے باہر نہیں نکلنے دیتے۔ وہ چوری آئی ہے اور جلد واپس پلٹ جائے گی۔ اس نے اپنا نقاب نہیں اٹھایا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر پلٹ گئی۔

اس کے خیال میں یہ ضروری تھا۔ ملک زاہد نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا اور نجانے کیا کیا، جس سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ چند دن بعد ہی اس نے ملک زاہد کو یہ بتایا کہ کوئی چوہدری پرویز اسے تنگ کرتا ہے؟ وہ کہہ رہا ہے ملک زاہد سے ملنا بند کر دو، کیا تم نے اُسے بتایا ہے؟ کیا وہ تمہارا دوست ہے؟ اُسے کیسے پتہ چلا؟ نینا نے کچھ اس انداز سے بتایا کہ ملک زاہد کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے انتہائی غصے میں بس اتنا ہی کہا۔

''اسے کہنا اگر وہ اپنے باپ کا بیٹا ہے تو میرے سامنے آئے، میں اسے بتاؤں گا، میں تمہیں کوئی صفائی نہیں دوں گا۔''

''لیکن میرے سوالوں کے جواب تو دو اس نے میرے کسی عزیز کو بتا دیا، میرے والدین کو پتہ چل گیا تب میں تو خودکشی کر لوں گی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں، کوئی اور کرے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے پہلی بار خود فون بند کیا تھا۔ نینا کو احساس ہو گیا کہ اب کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوگا۔ اس لیے وہ پوری طرح علی اکبر کے ساتھ رابطے میں تھی۔ اسے پتہ چلا کہ وہ کل دن کے وقت عدالت میں ایک پیشی پر جانے والے ہیں۔ پوری طرح تسلی کرنے کے بعد اس نے یہ بات ملک زاہد کو بتا دی۔ نینا نے اسے پوری کہانی بنا کر بتایا۔

''آج اس کا فون آیا تھا اور پھر سے فضول باتیں کر رہا تھا، میں نے آپ کا پیغام اسے دے دیا۔''

''پھر کیا بولا وہ؟'' اس نے پوچھا۔

''یہی کہ میں کل پیشی پر جا رہا ہوں، اگر اس میں ہمت ہے تو مجھ سے اتنا ہی آ کر پوچھ لے، میں خاموش ہو گئی۔''

''اچھا، ایسے کہا اس نے؟'' وہ غصے میں بے قابو ہونے لگا تو وہ تیزی سے بولی۔

''اب آپ اس کے منہ نہ لگنے چلے جائیں، ایسے ہی فضول آدمی ہے، اس کا کیا بھروسہ۔''

''یہ تو کل ہی پتہ چلے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ وہ یہ سوچنے لگی کہ اگلے دن کیا ہوگا۔

اگلے دن شہر سے باہر جانے والی سڑک پر تصادم ہو گیا۔ واقعہ کچھ یوں بتایا گیا تھا کہ چوہدری پرویز اور اس کے ساتھی کار پر شہر جا رہے تھے۔ راستے میں ملک زاہد نے ناکہ لگایا ہوا تھا۔ انہوں نے بغیر کوئی بات کیے، ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس فائرنگ میں علی اکبر مارا گیا۔ چوہدری پرویز شدید زخمی ہو گیا۔ اسے زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ اس کے بچنے کی بالکل بھی امید نہیں رہی تھی۔ نینا اس وقت کا انتظار کر رہی تھی کہ کب اسے ہوش آتا ہے اور وہ کب اسے بتائے گی کہ میں نے تم سے انتقام لے لیا ہے۔ مگر اس کی حسرت دل میں رہی، وہ ہوش ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ ملک زاہد پکڑا گیا اور اسے جیل ہو گئی۔ اس سے بات ہونا بھی بند ہو گئی۔ لوگوں کو یہی پتہ چلا کہ دونوں کے درمیان خاندانی لڑائی تھی۔

دوسرے ہفتے اسے ملک زاہد کی کال ملی۔ وہ جیل میں سے کسی کے سیل فون سے کال کر رہا تھا۔

''دیکھ لیا تم نے، میں نے صرف تمہاری خاطر اسے ایسی حالت میں کر دیا ہے، کہ اب وہ دوبارہ تجھے فون کرنے کے لائق نہیں رہے گا۔'' اس نے فتح مندی کے احساس سے کہا۔

''میں نے ایسا کب چاہا تھا۔ اب تم بھی......'' یہ کہتے ہوئے اس نے رونے کی اداکاری کی

''گھبراؤ نہیں، میں بس کچھ دنوں میں باہر آ جاؤں گا، بس تم میرا انتظار کرنا۔'' اس نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو وہ پیار بھرے لہجے میں بولی

''اب تمہارا ہی تو انتظار ہے۔''

''دیکھ، میں اب پتہ نہیں کب فون کر پاؤں گا، تم بس اپنا خیال رکھنا۔'' اس نے پیار میں بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بس تمہارا ہی خیال ہوگا، بس تم جلد لوٹ آنا۔'' وہ بولی۔

اس طرح کی چند دوسری باتوں کے بعد فون بند ہو گیا۔ اس نے وہ سم نکالی اور اسے توڑ دیا۔ ایک باب ختم ہو گیا۔

نینا نے بدلہ تو لے لیا تھا لیکن معیشت کا عفریت منہ کھولے انہیں نگلنے کو تیار تھا۔ گھر میں معاشی بدحالی نے انہیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس کا چھوٹا بھائی انتہائی صبر سے صبح کام پر نکل جاتا، اگر کہیں مزدوری مل جاتی تو کر لیتا، نہ ملتی تو واپس گھر آ کر چارپائی پر گر جاتا۔ اس کی ماں کی حالت بھی دن بدن خراب رہنے لگی تھی۔ اسے یہ اچھی طرح پتہ تھا کہ اگر اس نے اپنی ماں کا علاج بروقت نہ کرایا تو وہ اسے بھی کھو دے گی۔ اسے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ پورے علا

تے میں اس کی ذات کے بارے میں کوئی اچھا تصور نہیں ہے۔ اسکول والوں کی رائے سن کر اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ کہیں نوکری کا سوچے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

ایک دن اسی لیڈی کانسٹیبل کا فون آ گیا۔ اس نے حال احوال پوچھنے کے بعد کہا۔

''تمہارے پاس نوکری کرنے کا ایک بہترین چانس ہے اگر تم کرنا چاہو؟''

''کہاں پر؟'' یہ پوچھنے کے بعد وہ اگلے ہی لمحے تیزی سے بولی، ''لیکن جہاں بھی ہو، میں نوکری ضرور کروں گی، ہمارے گھر کی حالت......'' اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی

''نوکری پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہے، لڑکیوں کو بھرتی کیا جا رہا ہے، اگر تم نوکری کرنا چاہو تو کل صبح اپنے کاغذات لے کر تھانے آ جانا، مجھے امید ہے کہ تمہیں نوکری ضرور مل جائے گی۔'' لیڈی کانسٹیبل نے کہا تو وہ حتمی لہجے میں بولی۔

''میں پہنچ جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' لیڈی کانسٹیبل نے کہا اور کچھ دیر بعد فون بند کر دیا۔

اگلے دن اپنے گھر میں کسی کو بتائے بغیر وہ صبح کے وقت ہی پولیس لائن پہنچ گئی۔ دوڑ وغیرہ لگانے کے بعد ان کا تحریری امتحان لیا گیا۔ ان کے قد ناپے گئے اور انہیں جانے کا کہہ دیا۔ سو وہ گھر آ گئی۔

ان دنوں فون کھلا رکھنا اس کی مجبوری تھی، وہ جو ٹسٹ دے کر آئی تھی، اس کے بارے اسے دوسرے کسی ذریعے سے پتہ نہیں مل سکتا تھا۔

دو ہفتے بعد اسی لیڈی کانسٹیبل کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ لسٹ لگ گئی ہے اور اس میں تمہارا نام سب سے اوپر ہے۔ تمہیں نوکری مل گئی ہے کل صبح آ کر نوکری جوائن کرو۔

❋ ...... ❋ ...... ❋

سہ پہر کا وقت تھا۔ ڈھلتے سورج کی روشنی انگریزوں کے زمانے کے بنے ہوئے اس پیلے کوارٹر پر پڑ رہی تھی، جس کے سامنے وہ کھڑی تھی۔ ارد گرد کا ماحول سنسان تھا۔ حالانکہ کوارٹروں کی ایک لمبی قطار تھی، ان میں پولیس والے ہی رہتے تھے۔ اس نے باہر لکھا ہوا پڑھا، ''بارک نمبر تین''

''یہ تمہارا کوارٹر ہے اور تم اسی میں رہو گی۔''

یں یہاں

گھبراتے ہوئے پوچھا تو اسے وہاں لانے والا پوچھنا چاہتی ہے۔ اس لیے تحمل سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''تم اندر جاؤ، وہاں تم سے سینئر ہیں، وہ تمہیں خود ہی ایڈجسٹ کر لیں گی۔''

اس پر نینا نے گہری سانس لیا اور کوارٹر کے اندر قدم رکھ دیا۔ سامنے ہی برآمدے میں ایک فربہ مائل خاتون چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں نینا پر جم کر رہ گئیں۔ پھر چند لمحوں کے بعد اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔ وہ اس کے قریب گئی تو وہ لیٹے لیٹے ہی بولی۔

''نئی بھرتی ہو؟'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا نام بتایا تو وہ بولی۔ ''جاؤ اندر، آپی فوزیہ ہے، اے ایس آئی ہے، یہاں ہم سب میں سینئر، وہ سب سمجھا دے گی۔''

وہ اندر کمرے میں گئی تو کمرے کے ایک کونے میں ایک پتلی سی مگر مضبوط خاتون اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جب تک وہ اس کے قریب نہیں گئی اور ہاتھ نہیں ملا لیا وہ اسے سر سے پیر تک دیکھ کر اس کا جائزہ لیتی رہی۔

''خوش آمدید، ڈیپارٹمنٹ میں اور یہاں ہماری ساتھی بننے پر بھی۔'' آپی فوزیہ نے کہا۔

''جی بہت شکریہ۔'' وہ منمنائی۔ دراصل اسے الجھن ہو رہی تھی۔ آپی فوزیہ مسلسل اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ جیسے ایکسرے کر رہی ہو۔

''اچھا جاؤ، یہ ساتھ والا کمرہ ہے، وہاں چارپائی پڑی ہے، شاید بستر بھی ہوگا۔ تم جا کر وہیں آرام کرو، باقی باتیں رات کھانے پر ہوں گی۔'' ہیڈ کانسٹیبل فوزیہ نے کہا تو وہ جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اس کمرے میں تین چارپائیاں پڑی تھیں، ایک پرانا میز اور دو کرسیاں، یہی اس کمرے کی کل کائنات تھی۔ ایک کونے میں ٹرنک اور بیگ دھرے ہوئے تھے۔ وہیں اس نے اپنا بیگ بھی رکھ دیا اور ایک چارپائی پر لیٹ گئی۔ جس پر بستر نہیں تھا۔

انہیں لمحات میں اسے اپنی ماں کا چہرہ یاد آ گیا، خاص طور پر وہ ڈبڈبائی آنکھیں، جن میں نجانے کتنی باتیں پوشیدہ تھیں۔ وہ ان ساری باتوں کو سمجھتی تھی۔ ماں نے ایک لفظ نہیں کہا لیکن وہ ہر بات سمجھ گئی کہ ماں آخر کہنا کیا چاہتی

ہے۔ اسے پتہ تھا کہ آنے والے دنوں میں اسے فقط ماں کا ہی احساس ہوگا۔ اس نے اپنا جی کڑا کر لیا۔ وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھ لگ گئی۔

رات کے کھانے پر اسے کوارٹر میں رہنے والی سبھی خواتین ملیں۔ اسے یہ دیکھ کر بہت خوشی محسوس ہوئی کہ وہاں دو مزید لڑکیاں آگئی تھیں، جو اس کی ہم عمر اور اس کے ساتھ ہی بھرتی ہوئیں تھیں۔ کھانے کے بعد گپ شپ میں آپی فوزیہ نے بہت ساری باتیں کیں، اسے سب بھول گئیں سوائے ایک بات کے کہ، یہ دنیا جنگل ہے اور یہاں نجانے کیسے کیسے درندوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہاں ہر وقت آنکھیں کھول کر رکھنا پڑتی ہیں۔ جب تک تم اپنا خیال نہیں رکھوگی، تب تک کوئی دوسرا تمہارا خیال نہیں رکھے گا۔ وہ رات تعارف اور باتوں میں گزر گئی۔ اس رات سے اس کی ملازمت کا آغاز ہوگیا۔

وہ چند کپڑے لے کر آئی تھی۔ اگلی بار جب گھر سے وہ بستر اٹھانے لگی تو اسے اپنی کتابوں اور ناول کا خیال آیا، جو اس کی چار پائی کے نیچے اور الماریوں میں بھرے پڑے تھے۔ وہ یہ سب پڑھ چکی تھی۔ اس نے اپنے چند پسندیدہ ناول اٹھانے چاہے تو ایک دم سے اسے خیال آیا کہ اس کا مذاق اُڑایا جائے گا۔ انگریزی ناول پڑھنے والی ایک معمولی کانسٹیبل؟ اس نے ان میں سے کوئی نہ اٹھایا۔ اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ اب کوئی ردی والا آئے تو اسے یہ سارے بیچ دے۔ وہ شہر آگئی۔

ملازمت کے شروع دنوں میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ یہ حال اس کی دوسری نئی بھرتی ہونے والی لڑکیوں کا تھا۔ وہ ڈیوٹی کرتی، جو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ کسی ملزم عورت کو عدالت لے جاتی اور واپس تھانے یا جیل لے جاتی۔ یا پھر کسی تھانے میں کسی ملزمہ کے پاس بیٹھنا پڑتا۔ اس کے علاوہ وہ یا تو سوتی رہتی تھی، یا دوسری لڑکیوں کے ساتھ گپیں لگاتی رہتی۔

وہ ایک عام سی لڑکی کی مانند نوکری کرتی رہی، جیسے دوسری لڑکیاں کر رہی تھیں۔ انہیں کہا گیا کہ ابھی ان کی ٹریننگ ہونی ہے۔ اس وقت ان سے پہلے والا بیج چل رہا ہے۔ جیسے ہی وہ پاس آؤٹ ہوگا انہیں ٹریننگ کے لیے جانا ہوگا۔ اس دوران وہ اپنی محسن لیڈی کانسٹیبل سے ملتی رہی۔ وہ اسے نوکری کرنے کے گُر اور طریقے بتاتی رہی۔ اس نے اس بندے کے بارے میں بھی بتا دیا کہ وہ کون تھا۔ ایسے لوگوں سے کس طرح بنا کر رکھنی چاہیے، وہ کیسے کیسے مقام پر کس طرح کام آتے ہیں۔ یوں چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا۔

اُس دن وہ تھانے میں تھی۔ جب اس کی ٹیچر سمیرا کا فون آیا۔ اس سے نینا کا رابطہ رہتا تھا۔ وہ اکثر ان کے ہاں چلی جاتی، جب سائرہ آئی ہوتی۔ لیکن وہ اس کے پاس زیادہ نہ بیٹھا کرتی تھی۔ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا تھا۔ ٹیچر سمیرا نے اسے فوراً اپنے ہاں بلایا تھا۔ وہ آپی فوزیہ کو بتا کر ان کے گھر چلی گئی۔ سائرہ آئی ہوئی تھی۔ وہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھی تو میڈم نے سائرہ کو چائے بنانے بھیج دیا پھر اس سے بولی۔

”یہ جو بات میں تمہیں بتانے لگی ہوں، اس کا سائرہ سے ذکر نہیں کرنا، وہ خوامخواہ پریشان ہوگی۔“

”ایسی کیا بات ہے؟“ نینا نے تجسس اور حیرت سے پوچھا، کیونکہ ان دو ماں بیٹی کے درمیان کچھ بھی چھپا ہوا نہیں تھا۔

”بات یہ ہے کہ میں ایک اکیلی بیوہ عورت ہوں۔ بیٹی پرایا دھن ہے، اس کا ماسٹرز مکمل ہو جائے تو میں اس کی شادی کردوں گی۔ اور میرے پاس بچے گا، میرا یہی گھر، جہاں میں اپنی زندگی کے باقی دن گزارنا چاہتی ہوں۔ لیکن......“

”لیکن کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”تقریباً دو مہینے ہو گئے ہیں، چند لوگ فون کر کے اور دو بار عورتیں بھیج کر مجھے اس بات پر راضی کرنا چاہتے ہیں کہ میں یہ گھر انہیں فروخت کردوں۔ اور جو قیمت بتاتے ہیں وہ انتہائی معمولی سی ہے۔ ظاہر ہے میں نے انکار ہی کرنا ہے۔ میں کہاں جاؤں؟ میں کیوں فروخت کروں؟“ میڈم نے کافی حد تک غصے میں کہا۔

”تو پھر، وہ کیوں؟“ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا تو میڈم بولیں

”دراصل جو لوگ یہاں پلازہ بنانا چاہ رہے ہیں، انہوں نے کچھ غلط قسم کے لوگوں کا تعاون لیا ہوا ہے اور مجھے ہر وقت دھمکاتے رہتے ہیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیا کروں۔ میرا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں بنے گا۔“

”دیکھیں میڈم! یہ بہت ظالم دنیا ہے۔ آپ شاید ان کا مقابلہ نہ کر پائیں، میرے خیال میں آپ کو یہاں سے شفٹ ہو جانا چاہیے، وہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ اس نے اپنی دانست میں درست کہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شہر میں ایک ہی لینڈ مافیا ہے اور وہ لوگ بہت ظالم تھے

”لیکن جو قیمت دے رہے ہیں، میں تو اس سے گھر نہیں خرید سکتی۔ میں یہاں سکون سے ہوں، کیوں ڈسٹرب کرتے ہیں یہ لوگ؟“ میڈم نے غصے میں کہا۔ وہ خاموش ہوگئی پھر چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا۔

”تو کیا کریں؟“

”میں یہی چاہ رہی ہوں کہ پولیس کی مدد لی جائے، ممکن ہے وہ پولیس ہی کے ڈر سے یہ خیال چھوڑ دیں۔“ میڈم نے ایک اُمید پر کہا تو وہ بولی۔

”میں اس علاقے کے انسپکٹر سے آپ کو ملوا دوں گی، کوشش کروں گی کہ ڈی ایس پی صاحب سے ملوا دوں۔ باقی دیکھیں کیا ہوتا ہے۔“

وہ اسی شام واپس پولیس لائین چلی گئی۔ رات گئے تک سوچتی رہی کہ اس مسئلے کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ وہ ہر حال میں اپنی میڈم کا ساتھ دینا چاہتی تھی۔ میڈم اس کی محسن تھی اور وہ احسان فراموش نہیں تھی۔ اسے یہ اچھی طرح خبر تھی کہ وہ لینڈ مافیا خطرناک لوگوں کا ہے، لیکن وہ پولیس کے بغیر نہیں چل سکتے تھے۔ اسے بہت حد تک یقین تھا کہ یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ سو اس نے دو دن میں ہی میڈم سمیرا کی ملاقات ڈی ایس پی سے کروادی۔

میڈم نے پوری تفصیل کے ساتھ ڈی ایس پی کو ساری بات سمجھائی۔ پھر اس سے مدد کی درخواست کی۔ ڈی ایس پی نے وعدہ کیا کہ کوئی انہیں کچھ نہیں کہے گا، سکون سے رہیں۔ وہ مطمئن ہو کر آگئی۔ نینا کو خوشی ہوئی کہ وہ اپنی محسن کے کام آئی۔ پہلی بار اسے پولیس کی نوکری کرنا اچھا لگا تھا۔ وہ رات خوب جی بھر کے سوئی تھی۔

اگلے دن کی سہ پہر تھی۔ وہ عدالت سے ڈیوٹی کر کے آئی تھی۔ ابھی اس نے یونی فارم بھی نہیں اترا تھا کہ اسے میڈم سمیرا کی کال آئی، اس نے کال ریسیو کی تو میڈم سمیرا ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔

”خدا کے لیے کچھ کرو، وہ لوگ سائرہ کو اُٹھا کر لے گئے ہیں۔“ یہ سنتے ہی نینا کے پاؤں سے [illegible] ہوگیا۔ میڈم کی چیخیں اس کے کان میں پڑ رہی تھیں اور اس پر سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ معصوم سی سائرہ، جس نے دنیا داری تو کیا اس کی خوبو سے بھی واقف نہیں تھی۔ فاختہ کی طرح چھوٹے دل والی سائرہ تو یہ خوفناک حالات برداشت ہی نہیں کر پائے گی۔ وہ تو مر جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ بولی

”جی جی میڈم، میں کچھ کرتی ہوں۔“

”جلدی کرو۔ اللہ کے لیے جلدی کرو۔“ وہ چیخ رہی تھی، دھاڑیں مار رہی تھی۔ اس نے تیزی سے سیل فون بند کیا اور اسی طرح پلٹ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ آپی فوزیہ تھانے میں تھی۔ وہ انتہائی تیزی سے اس کے پاس پہنچی اور اسے ایک ہی سانس میں سب بتا دیا۔ وہ بھی حیرت زدہ رہ گئی۔

”یہ کیا ہوا؟“

”پتہ نہیں آپی، وہ میری بہنوں کی طرح ہے، خدا کے لیے اسے بچالیں۔“ اس نے منت کرنے والے انداز میں کہا تو آپی فوزیہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”آؤ! چلتے ہیں۔“

وہ سیدھی ڈی ایس پی کے پاس گئی۔ وہ اس وقت گھر پر تھا۔ اس نے جاتے ہی کہا۔

”سر جی! کیا اس میڈم کا یہی قصور تھا کہ وہ آپ کے پاس آگئی تھی۔ اس نے پولیس سے مدد چاہی تھی؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی معصوم بیٹی کو اٹھا لیا گیا؟“ اس پر ڈی ایس پی خاموش رہا، پھر غصے میں کانپتے ہوئے بولا۔

”ایک منٹ ٹھہرو۔“ یہ کہہ کر اس نے سیل فون نکالا اور انسپکٹر سے ساری بات کہہ کر بولا۔ ”ایک تو یہ پتہ کرو کہ دفتر میں ان کا مخبر کون ہے؟ دوسرا فوراً وہ لڑکی بازیاب کرو، کوئی سمجھوتہ نہیں، جانتے ہو وہ یہاں کے کالج کی لیکچرار ہے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سیل فون بند کر دیا۔ پھر انہیں انسپکٹر رفاقت سے ملنے کو کہا۔ وہ فوراً تھانے آئی تو پولیس پارٹی تیار تھی۔ وہ ان کے ساتھ میڈم سمیرا کے گھر چلے گئی۔ کچھ دیر تفصیل سننے کے بعد انسپکٹر رفاقت وہاں سے نکلا تب تک اس کے پاس کافی نفری آ گئی تھی۔ وہ لوگ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

چھوڑ آئے تھے۔

اس وقت سورج ڈوب رہا تھا، جب انہیں معلوم ہوا کہ لڑکی کہاں ہوسکتی ہے۔ جیسے ہی انسپکٹر رفاقت کو پتہ چلا، اس نے ڈی ایس پی کو فون کیا۔ پھر وہ سیدھا سردار مٹھن خان کے ڈیرے پر جا پہنچا۔ نینا اس کے ساتھ ہی تھی۔ گیٹ پر انہیں روک لیا گیا۔

''سردار سائیں کی اجازت کے بغیر تم لوگ اندر نہیں جا سکتے ہو؟'' گیٹ پر موجود ایک لحیم شحیم بندے نے کہا تو وہ بولا

''جاؤ پھر کہو سردار کو، بتاؤ انسپکٹر رفاقت آیا ہے۔''

اس نے انٹرکام کا رسیور اٹھایا اور اندر کسی کو بتایا۔ پھر تھوڑی دیر بعد سن کر بولا۔ ''جاؤ، لیکن ہتھیار ادھر رکھ کر جاؤ۔''

انسپکٹر رفاقت نے سنا اور ڈی ایس پی کو کال کر دی۔ اسے ساری صورت حال بتائی تو ہدایات لے کر گیٹ پر کھڑے بندے سے بولا ''سردار سے کہہ دینا میں واپس جا رہا ہوں لیکن جلدی آؤں گا۔'' یہ کہتے ہی وہ مڑ گیا اور تھوڑے فاصلے پر جا کر مختلف لوگوں کو فون کرنے لگا۔

نینا یہ سب دیکھتے ہوئے تڑپ رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسا کیا کرے کہ اُڑ کر ڈیرے کے اندر چلی جائے اور سائرہ کو نکال کر لے آئے۔ وہ مضطرب سی انسپکٹر رفاقت کے پاس گئی اور بڑی لجالت سے پوچھا۔

''سر جی یہ کیا ہے ہم ایسے ہی......''

''یہ وہ بڑے لوگ ہیں جو ہم پر حکومت کرتے ہیں، ہم عوام بے غیرت ہیں جو ایسے حرام زادوں کو اپنے اوپر مسلط کرتے ہیں۔ یہ عوام کے گھروں سے ان کی بیٹیاں اٹھا لیں اور ہم ان کے ڈیرے کے اندر نہیں جا سکتے۔ لعنت ہے اس سسٹم پر۔'' اس نے بے ساختہ کہا تو وہ تڑپ کر بولی۔

''سر کیا ہم ناکام ہو جائیں گے۔''

''نہیں، میں ان بہن...... کو انہی کے بل سے نکالتا ہوں۔ شہر میں ان کے گماشتے تھانے پہنچ چکے ہیں اور وہاں ان کی چھترول ہو رہی ہے۔ وہ بک رہے ہیں، کتنی دیر چھپیں گے یہ؟'' اس نے غصے میں بے ساختہ مغلظات بکتے ہوئے کہا۔

وہ تھانے کے ساتھ رابطے میں تھا، اسے پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ دس سے زیادہ لوگ تھانے میں لا کر لٹا لیے تھے اور ان کے ورثاء انہیں بچانے کی کوشش میں تھے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ اندر سے چار پانچ بندے تیزی سے باہر آئے۔ ان میں سے ایک بڑی عمر کا تھا، وہ آتے ہی ایک سانس میں کہتا چلا گیا

''او سر جی، ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا کہ آپ ہیں۔ انسپکٹر رفاقت آئے تو اس کے لیے ڈیرے کا دروازہ نہ کھلے یہ ناممکن ہے سر آئیں۔''

''لڑکی کہاں ہے؟'' اس نے کوئی تاثر لیے بغیر پوچھا تو وہی ادھیڑ عمر آدمی بولا۔

''اندر ہے، آؤنا۔''

''دیکھ لو......؟'' انسپکٹر رفاقت نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو وہ بولا۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

اس نے کہا ہی تھا کہ انسپکٹر رفاقت نے وائرلیس پر پیغام دے دیا کہ وہ سردار مٹھن خان کے ڈیرے کے اندر جا رہا ہے۔ اس نے ادھیڑ عمر آدمی کو باور کرا دیا کہ وہ ڈیوٹی پر ہے اور اس کا محکمہ جانتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے لوگوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔

اندر کا منظر وحشت ناک تھا۔ بڑا سارا صحن جہاں ختم ہوتا تھا، وہیں سے دالان شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد کہیں کمرے تھے۔ اس دالان کے پاس ایک لڑکی فرش پر ڈھیر تھی۔ نینا کی نگاہ جیسے ہی اس پر پڑی، وہ پہچان گئی یہ تو سائرہ ہے۔ اس کی حالت اس قدر خستہ تھی کہ پہلی نگاہ میں پہچانی ہی نہیں جا رہی تھی۔ وہ تیر کی مانند اس تک پہنچی۔ اس نے جا کر سائرہ کا چہرہ اٹھایا۔ وہ ہونقوں کی مانند اسے دیکھ رہی تھی، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کا چہرہ ناخنوں سے چھدا ہوا تھا۔ گردن پر سرخ دھبے تھے، جیسے کسی کتے نے اپنی خباثت دکھائی ہو۔ اس کے کپڑے گریبان سے پھٹے ہوئے تھے۔ وہ اپنا جسم ڈھانپنے کی کوشش میں سمٹی ہوئی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کچھ بھی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔

''تم ٹھیک ہو سائرہ بولو پلیز۔'' نینا نے لرزتے ہوئی آواز میں پوچھا تو سائرہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر پاگلوں کی طرح بولی۔

''نہیں، ان کتوں نے مجھے چیر پھاڑ کر کھا لیا ہے۔ میں

کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ میں گندی ہو گئی ہوں، تم پرے ہٹ جاؤ۔'' اس نے ہذیانی انداز میں کہا۔

ایسے میں اسی کے پیچھے دالان میں ایک نوجوان ظاہر ہوا، اس کے ساتھ تین لڑکے مزید بھی تھے۔ وہ نوجوان زیادہ تروتازہ اور امیر دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے انتہائی سختی سے کہا۔

''تم اپنی ماں کو سمجھاتی نا کہ تھانے جانے سے کچھ نہیں ہوتا، اب جاؤ یہاں سے، شکر کرو میں نے تمہیں مارا نہیں، ورنہ میں زندہ نہیں رکھتا کسی کو۔''

نینا نے سنا تو اس کے دماغ میں ایک الاؤ اٹھ گیا۔ غصے سے ماؤف ہوتے دماغ میں وہ بے ساختہ بولی۔

''تم کون ہو بے غیرت؟''

''زبان سنبھال اُو دو ٹکے کی پولیس والی۔'' اس نوجوان کی بجائے اس کے قریب کھڑے ایک شخص نے کہا جو شکل سے ہی نوکر دکھائی دے رہا تھا۔

''تم تو دو ٹکے کے بھی نہیں ہو کتے۔'' نینا نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''واہ! سلامت خان واہ، پہلی بار کسی پولیس والی کی جرات دیکھی ہے کہ وہ خان فرحان کے سامنے بولے۔'' اس نوجوان نے تالی بجاتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا اور دو قدم آگے بڑھ آیا۔ پھر اپنے گن مین سے گن لے کر بولا۔ ''شکر کرو، میں نے اسے مارا نہیں تھا، ایویں بس اپنا بستر گرم کیا تھا، اور چھوڑ دیا کہ پولیس والوں کو اس کی ضرورت ہے، لیکن اب نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے چشم زدن میں گن سیدھی کی اور فرش پر پڑی مدہوش سائرہ پر فائر کر دیا۔ بلاشبہ وہ گولی اسے لگ جاتی تھی، لیکن نینا اپنی جگہ سے یوں اچھلی تھی کہ اُڑتی ہوئی اس کے ہاتھ پر جا پڑی، جس سے نشانہ خطا گیا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مدہوش سائرہ کا ردعمل یوں تھا کہ جیسے اسے کوئی خبر ہی نہ ہو کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ وہ ہوش وحواس سے بے گانہ پڑی ہوئی تھی۔ خان فرحان کی گن گر چکی تھی۔ اسی لمحے انسپکٹر رفاقت نے اونچی آواز میں کہا۔

''بہت ہو چکا، بند کرو یہ ڈرامہ چھوٹے خان۔''

''ہوں، میں بند کروں یہ ڈرامہ، ارے ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اب دیکھو۔''

''میں اب بھی سمجھا رہا ہوں چھوٹے خان۔'' انسپکٹر رفاقت نے کہا تو خان فرحان سے سلامت خان نے کہا۔

''خان جی آپ اندر چلیں، میں دیکھتا ہوں۔''

''نہیں، یوں نہیں۔'' اس نے غصے میں یوں کہا جیسے خود پر قابو نہ ہو۔ تبھی سلامت خان نے ان تینوں نوجوانوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ ہی لے جائیں خان جی کو اندر۔''

ان تینوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور پھر ایک نے کاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''یہ تو خان کا فیصلہ ہے، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''

''دیکھ، یہ پولیس والی بھی کیا کم خوبصورت ہے، اس کے ابھی کپڑے اُتار اور اِدھر ہی اُتار، اسے دیکھتے ہیں، جتنی یہ خوبصورت ہے اس کا جسم بھی اتنا ہی خوبصورت ہوگا۔'' اس نے مڑ کر اپنے دوستوں سے پوچھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دیئے، تبھی ایک نے کہا۔

''ہاں خان، ہے تو خوبصورت، یہ اس سے زیادہ رسیلی لگ رہی ہے۔ کیوں نا آج یہی سہی۔''

''ہاں، ذرا نہلا دھلا کر چمکا لیں گے۔'' اس نے کہا تو اس کے حواری دوستوں نے زوردار قہقہہ لگا دیا۔ اس پر انسپکٹر رفاقت آگے بڑھا اور اس نے سائرہ کو اٹھانے کا اشارہ کیا۔ تبھی خان فرحان نے اونچی آواز میں کہا۔

''نہیں انسپکٹر، ان دونوں میں سے ایک کو چھوڑ کر جانا ہوگا تمہیں، اب یہ میری ضد ہے۔''

''خان جی چلیں نا اندر میں بتاتا ہوں نا آپ کو۔'' سلامت خان نے التجا سے کہا تو وہ بولا۔

''اور یہ میرا حکم ہے کہ اس پولیس والی کے کپڑے اُتارو، ابھی اسی وقت، ورنہ تم میں سے کوئی نہیں رہے گا، جلدی۔''

اس کے حکم پر چند گن مین نینا کی جانب آگے بڑھے۔ پولیس والے اسے بچانے کے لیے لپکے تو وہاں پر موجود سیکورٹی والوں نے اپنی گنیں ان پر تان لیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے گھبرا گئی۔ پولیس والے اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر انسپکٹر رفاقت نے آگے بڑھتے ہوئے مصالحانہ انداز میں کہا۔

''دیکھ! چھوٹے خان، میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں، میں اس لڑکی کو بازیاب کرنے آیا ہوں، اندر جاؤ، اور مجھے

میرا کام کرنے دو۔"

"تم مجھے نہیں جانتے ہو، اور نہ میری ضد سے واقف ہو، جاؤ، اور اس پولیس والی کو چھوڑ جاؤ۔" اس نے حقارت سے کہا پھر گھور کر رُک کے ہوئے سیکورٹی والوں کو دیکھا، وہ آگے بڑھ کر نینا کو پکڑنے لگے، نینا بے بس ہو چکی تھی۔ سلامت خان آگے بڑھا اور اس کے پاس گیا۔ اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالا، اور اس کا گریبان چاک کر دیا۔ اسی لمحے اس کے پیچھے کھڑے ایک گن مین نے اسے گردن سے پکڑ کر دھکا دیا۔ وہ فرش پر جا پڑی۔ اس کے سر کی ٹوپی وہیں کہیں گر گئی۔

"اس کی قمیض پھاڑو سلامت خان۔" خان فرحان کا حکم گونجا۔ اس نے آگے بڑھ کر نینا کی قمیض پکڑ کر پھاڑ دی۔ نینا کا اوپری سفید اُجلا بدن، گہری نیلی وردی کی دھجیوں میں سے جھانک رہا تھا۔ "اب اس کی شلوار بھی۔" اس کا حکم پھر گونجا ہی تھا کہ ایک ٹھنڈی سی آواز گونجی۔

"کیا کرتے ہو بیٹے، ایسے خواہ مخواہ ضد نہیں کرتے، یہ انسپکٹر اپنا کام کر رہا ہے، اسے کرنے دو۔"

اس ٹھنڈی آواز کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر شخص نمودار ہوا۔ وہ سردار مٹھن خان تھا، جو اسی وقت وہاں آ گیا تھا۔ درمیانے قد کا، سرخ سپید چہرہ، اس کے چہرے پر خاص بات اس کی اوپر کو اٹھی ہوئیں نوک دار گھنی مونچھیں تھیں۔ سفید کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کاندھے پر لنگی نما چادر تھی۔ اس کے یوں کہنے پر سیکورٹی والے ایک دم پیچھے ہٹ گئے۔ وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا چند قدم آگے آیا اور انسپکٹر رفاقت سے مخاطب ہو کر بولا، "لے جاؤ، اس بے چاری لڑکی کو لے جاؤ۔ ادھر رستے میں بے ہوش پڑی تھی۔ میرے آدمی اسے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ ورنہ یہ بے چاری وہیں مر جاتی۔

"سردار جی! آپ کے بیٹے نے بہت....."

"وہی سنو، جو میں کہہ رہا ہوں۔ یہی بات تم نے ایف آئی آر میں بھی لکھنی ہے نا، میں اسی لیے تمہیں بتا رہا ہوں۔ اب ایسا کر جلدی سے چلا جا، اس بے چاری لڑکی کو کسی اسپتال میں داخل کروا۔ تم بھی تلاش کرو، ہم بھی وہ مجرم ڈھونڈتے ہیں، جنہوں نے اس بے چاری پر ظلم کیا، میں نے ڈی ایس پی سے بات کر لی ہے۔" اس نے یہ کہا،

چند لمحے انسپکٹر رفاقت کے چہرے پر دیکھا پھر مڑ کر واپس چلا گیا۔ خان فرحان اپنے دوستوں کے ساتھ، اس کی باتوں کے دوران ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ انسپکٹر رفاقت نے کوئی بات نہیں کی۔ نینا نے خود کو سمیٹا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے دماغ میں جو بے بسی کا دکھ تھا، وہ سلگنے لگا۔ وہ سائرہ کے پاس گئی اور اسے اٹھا کر ڈیرے سے چل دی۔ آگ کا شعلہ اس کے دماغ میں بھڑک اٹھا تھا۔ اس نے اپنا آپ اپنے آنچل میں چھپا لیا تھا۔

انسپکٹر رفاقت غصے سے زیادہ دکھ سے بھرا ہوا تھا۔ ڈی ایس پی وہیں موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"سر! میں ایف آئی آر نہیں، اپنا استعفیٰ لکھوں گا، مجھے یہ نوکری نہیں کرنی۔"

"نہیں، تم ابھی اپنا غصہ ان پر نکال لو جو اس میڈم کو تنگ کرتے رہے ہیں، انہیں لے آئے ہیں۔ پہلے تم ایف آئی آر درج کراؤ پھر جاؤ اور اس بچی کو اسپتال داخل کرا آؤ۔" ڈی ایس پی نے کافی حد تک نرم لہجے میں کہا۔

"نہیں سر، میں....."

"جو کہہ رہا ہوں نا وہ کرو، بعد میں تم جو کہو گے وہی گا، تھوڑی سی عقل برتو۔ ان کے جسم پر نشان چھوڑو، میں بیٹھا ہوں ادھر۔" ڈی ایس پی نے کہا۔ نینا کو معلوم تھا کہ ایف آئی آر کے بعد وہ سائرہ کا میڈیکل کروانا چاہتے ہیں۔ وہ بھی ساتھ جانے کو تیار تھی۔ ایف آئی آر درج ہو گئی۔ اتنے میں میڈم سمیرا آ گئی۔ اس کی حالت پاگلوں کی طرح تھی۔ اس کی ایسی حالت کیوں نہ ہوتی، جس کی ایک اکلوتی بیٹی کو بھیڑیوں نے چیر پھاڑ کر رکھ دیا ہو۔

کیسی یہ زمین ہے اور کیسا اس کا قانون ہے، ایک بے غیرت شخص نے بڑے آرام سے ان پولیس والوں کو سمجھا دیا تھا کہ ایف آئی آر کیسے درج کرنی ہے۔ قانون کی دھجیاں یوں اڑائی جاتی ہیں؟ اس میں ایک استاد کی یوں توہین ہی نہیں اس پر ظلم بھی کیا جائے گا، نینا سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ میڈم سمیرا آئی اور کچھ کہے بنا اپنی بیٹی کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے یوں تکنے لگی، جیسے وہ پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ وہ اس کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگی یوں جیسے اس کے زخموں کو اپنے بدن پر محسوس کر رہی ہو۔ پھر اس نے

بڑی نرمی سے سائرہ کو اٹھاتے ہوئے بولی۔

"آؤ چلیں، اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔" یہ لفظ کسی تیر کی طرح نینا کے سینے میں پیوست ہو گئے۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھی تو میڈم سمیرا نے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روکتے ہوئے کہا۔

"وہیں رُک جاؤ، آگے مت بڑھنا، میں نے سوچا تھا، پولیس تحفظ دیتی ہے، جب پولیس ہی ناکارہ ہے تو کسی کا کیا دوش۔ ہم پہ ظلم ہوا کوئی بات نہیں، تم بھی کبھی اپنی صورت نہ دکھانا۔" میڈم کا لہجہ اس کا جگر چھلنی کر گیا۔ وہ ساکت ہو گئی تھی۔ ڈی ایس پی نے جب اسے جاتے ہوئے دیکھا تو کہا۔

"میڈم، ایف آئی آر درج کرنی ہے اور......"

"جو حفاظت نہ کر سکے، وہ انصاف کیا دلا سکتا ہے۔ یہ زمین اب انسانوں کے لیے نہیں رہی۔" یہ کہہ کر وہ سائرہ کو لے چل دی۔ باوجود شدید خواہش کے وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکی۔ سبھی بے دست و پا، وہیں کھڑے رہ گئے۔

ڈی ایس پی چلا گیا تو انسپکٹر رفاقت اپنا غصہ وہاں پکڑے ہوئے ملزموں پر اتارنے لگا۔ جبکہ نینا وہاں سے نکلی اور پولیس لائین میں اپنی بارک جا پہنچی۔ اس نے کپڑے بدلے تو وہاں موجود ہر لڑکی کو پتہ چل گیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔ آپی فوزیہ نے زبردستی اسے کھلانا پلانا چاہا مگر اس کا جی نہیں چاہا۔ وہ ایک کونے میں جا بیٹھی۔ وہ رونا چاہتی تھی، مگر رو نہیں پا رہی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں پر خشک ہو چکے تھے۔ اسے بار بار خان فرحان کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ کس قدر غرور اور رعونت کے ساتھ اس نے سائرہ پر گولی چلائی تھی۔ اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی اٹھے اور اس بے غیرت سانپ کا سر اپنے ہاتھوں سے کچل دے۔ لیکن وہ بے بس تھی۔

ساری رات بیت گئی۔ وہ اسی طرح چارپائی کے ساتھ لگی فرش پر بیٹھی خود سے سوال کرتی رہی۔ کیا ظلم کے لیے کمزور ہی ہوتے ہیں؟ ہاں کمزوروں پر ہی ظلم ہوتا ہے۔ ان کا جرم یہ ہے کہ وہ طاقت ور کیوں نہیں؟ یہ مظلوم ہی ہے جو ظالم کو جنم دیتا ہے۔ ظالم کے ظلم ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس قدر بے غیرت، کمینہ اور ننگِ انسانیت ہے۔ وقت کا احساس ہی نہ ہوا۔ ابھی ملگجا اندھیرا تھا۔ اس کا فون بج اٹھا۔ انسپکٹر رفاقت کی کال تھی۔ اس نے فوری طور پر اسے تھانے بلایا تھا۔

جس وقت وہ تھانے پہنچی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے دو چارپائیوں پر سفید چادر سے ڈھکے دو جسم پڑے تھے۔ انسپکٹر رفاقت نے اشارے سے کہا کہ اس لاش کا منہ دیکھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کپڑا اہٹایا تو وہ تاب نہ لا سکی۔ جلے ہوئے چہرے، مسخ ہو چکے تھے۔ اگر وہ ان کے ساتھ نہ رہی ہوتی تو شاید وہ انہیں پہچان بھی نہ پاتی۔ وہ میڈم سمیرا کی لاش تھی۔ وہ میٹھی نیند سو چکی تھی۔ وہ میڈم کا چہرہ دیکھتے ہوئے جم کر رہ گئی۔ اس کے کانوں میں میڈم کے کہے یہ لفظ گونج گئے کہ "آؤ چلیں، اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔" اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ سائرہ کی لاش دیکھے۔ اس کے قریب کھڑی ایک اہلکار نے سائرہ کے چہرے سے بھی کپڑا اہٹا دیا۔ وہ معصوم بھی اس دنیا کے ظلم کا شکار ہو کر یہاں سے جا چکی تھی۔ نینا سے دیکھا نہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کا سر گھوما اور وہ وہیں گر گئی۔ وہ ہونقوں کی طرح یہ سب دیکھتی رہی جیسے بندہ سامنے دیکھ رہا ہوتا ہے، لیکن اس کی عقل سمجھ ماؤف ہو جاتی ہے۔ وہیں اسے پتہ چلا کہ ان دونوں ماں بیٹی کو کچھ لوگوں نے قتل کیا ہے؟ یہ ساری کارروائی وہاں موجود ایک چوکیدار نے دیکھی تھی۔ دو لوگ تھے جو ایک کار میں سے نکلے تھے۔ وہ گھر کی چار دیواری پھلانگ کر اندر کود گئے۔ چند منٹ بعد ہی ایک دم اندر سے فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ چوکیدار اکیلا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے واویلا کیا، لوگوں کو بلانے کے لیے بھاگا، اس کے واویلے پر لوگ اپنے گھروں سے نکل بھی آئے لیکن اس وقت تک وہ حملہ آور باہر آ چکے تھے۔ وہ اطمینان سے کار میں بیٹھے اور وہاں سے چل پڑے۔ وہ گلی سے نکلے نہیں تھے کہ گھر کو آگ لگ گئی۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے ان دونوں کو باہر نکالا، لیکن یہ کوشش انہیں بچا نہ سکی۔ اس وقت تک وہ دونوں ماں بیٹی اس جہاں سے جا چکی تھیں۔ اس قدر بھیانک موت؟ کیا قصور تھا ان کا۔ یہی قصور تھا کہ وہ اس جنگل میں رہ رہی تھیں۔ جہاں نہ کوئی قانون ہے اور نہ قانون کے رکھوالے؟ بے غیرتی انسانی آبادی میں دندناتی پھر رہی ہے؟

میڈم سمیرا اور سائرہ کی تدفین کے دو دن بعد تک وہ

پوری طرح ہوش میں نہیں آئی۔ انسپکٹر رفاقت اس کی حالت سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے نینا کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ اپنے گھر گاؤں آ گئی۔ جہاں اس کے پاس سوائے سوچوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ اسے سب سے زیادہ غصہ مٹھن خان کے بیٹے فرحان پر آ رہا تھا۔ کس قدر رعونت سے وہ اس کے کپڑے اتار دینے کی بات کر رہا تھا۔ عام حالات میں ایک پولیس والا کسی بندے کو بات نہیں کرنے دیتا، گالیاں بک دے، تھپڑ مار دے، غریب آدمی سہہ جاتا ہے۔ لیکن مٹھن خان جیسے لوگوں کے سامنے یہی پولیس والے بھیگی بلی کی مانند خاموش رہتے ہوئے ان کی تابعداری کرتے ہیں۔

یہ اس معاشرے کی منافقت ہے یا کہ حکمران طبقوں کی بے غیرتی کہ عوام کو انسان نہیں سمجھتے اور خواص کے بے دام غلام ہوتے ہیں۔ وہ جتنا سوچتی، اتنا ہی اس کا دماغ خراب ہوتا، دوسری طرف سائرہ کا معصوم چہرہ جب بھی اسے یاد آتا تو ڈیرے پر ہونے والا ظلم اسے جھنجوڑ کے رکھ دیتا۔ وہ ایک دم سے انتقام لینے کا سوچتی۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ ان سب کو شوٹ کر دے، انہیں بھی اسی طرح اذیت دے کر مارے، جیسے انہوں نے سائرہ اور میڈم سمیرا کو قتل کیا تھا۔ لیکن وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔ ایک غریب مجبور لڑکی، جسے اپنی روٹی پوری کرنے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ وہ نوکری کرے تو اسے یونہی جینا تھا، سر جھکا کر ہر طرح کی بے عزتی کا سامنا کرنا تھا، انسپکٹر رفاقت میں تھوڑی غیرت تھی، اس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ وہ ایک معمولی کانسٹیبل، جس کی کوئی شنوائی ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی بے عزتی کروائے یا پھر ہر قسم کی اذیت ختم کرنے کے لیے سوائے خودکشی کے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ وہ مر جائے گی تو کوئی جھنجٹ نہیں رہے۔ ہر نیا دن اس کے اندر یہی سوچ مضبوط کرتا چلا گیا۔ وہ بہت اذیت ناک دن تھا۔ اس کے اندر کی وہ لڑکی غیرت سے مر رہی تھی۔ یہ سوچ روز بروز اس قدر پختہ ہو رہی تھی کہ اسے خود لگتا تھا کہ بس کسی ایک دن اس نے خودکشی کر لینی ہے۔

وہ دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے نہا کر نیا جوڑا پہنا اور اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ ماں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"بیٹی، یہ تم تیار ہو کر کہاں جا رہی ہو؟"

"ماں، اب تو دل کرتا ہے، بہت دُور کہیں چلی جاؤں، جہاں سے پھر کبھی واپس نہ آؤں۔"

ماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر منہ دوسری طرف کر کے بولی۔

"جب بیٹوں کا بوجھ بیٹیاں اٹھا لیں، تو انہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں، انہیں مر ہی جانا چاہیے۔"

ماں کی بات اور اس کے حسرت بھرے لہجے پر وہ چونک گئی۔ اسے ایک دم سے خیال آیا کہ اس بوڑھی ماں، بیمار بھائی کا کون ہے؟ یہ تو مجبور ہیں۔ چھوٹا بھائی جو مزدوری کر رہا ہے، وہ تو خود کو سنبھال لے گا، وہ ان کی مجبوری کا بوجھ برداشت نہیں کر پائے گا۔ وہ بھی اگر انہیں چھوڑ گیا تو؟ وہ اس سے آگے سوچ نہ سکی۔ وہ گڑبڑا گئی۔ تبھی اس نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"میرا تبادلہ بھی تو ہو سکتا ہے، چوبیس گھنٹے کی نوکری کہیں بھی کرنا پڑ سکتی ہے، مجھے گولی بھی لگ سکتی ہے، ہمارا واسطہ مجرموں سے ہوتا ہے۔"

"بیٹا! موت موت کا فرق ہوتا ہے، موت برحق ہے، اسے ناحق نہ بناؤ، اس خدا کے پاس جاؤ، تو سرخرو ہو کر، وہ بڑا بے نیاز ہے۔" ماں نے دھیمے لہجے میں ایسی حوصلہ افزا بات کی کہ وہ باقی سارا دن یہی سوچتی رہی۔ اسی شام اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس پولیس لائن چلی جائے گی۔

بارک نمبر تین میں موجود لڑکیاں اس سے یوں ملیں جیسے وہ اسی کی منتظر ہوں۔ آپی فوزیہ نے جہاں اسے بہت حوصلہ دیا۔ وہاں نئے راستے بھی دکھائے۔ اس نے بہت ساری معلومات بھی دیں۔ اُس رات نینا کو بہت دیر بعد نیند آئی تھی۔ وہ بستر سے اٹھی اور اپنے کوارٹر کے باہر آ کر بیٹھ گئی۔ چاندنی رات میں آنگن میں دھری چارپائی پر وہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ کوئی بھی سرا ہاتھ نہیں آیا سوائے خیال کے۔ وہ بے بس ہے، مجبور ہے اور کمزور ہے۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

◆ ◆ ◆

اس دن وہ عدالت میں تھی۔ ایک ملزم عورت کا بیان کروانے کے لیے اس کے ساتھ میں ڈیوٹی لگی ہوئی تھی۔ وہ ایک بینچ پر ملزم عورت کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک کانسٹیبل بھی کھڑا تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ اچانک اسے زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ اس نے لاشعوری طور پر ادھر دیکھا۔ ملک زاہد عدالت سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کئی پولیس والے تھے۔ وہ قہقہہ وہی لگا رہا تھا۔ وہ لوگ کسی خوشی کی خبر پر خوش تھے۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ وہ خوشی کیا ہو سکتی ہے۔ اچانک ہی اسے اپنی گزری ہوئی زندگی وہ لمحات سارے کے سارے یاد آ گئے۔ وہ آنکھیں بھر کر اسے دیکھتی رہی۔ ایک لمحے کے لیے اس کے اندر یہ خواہش اٹھی کے وہ اس کے پاس جا پہنچے، اسے بتائے کہ میرے ساتھ کیا ظلم ہو چکا ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ ٹھٹک گئی۔ وہ تو اسے بھلا چکی ہے۔ ملک زاہد نے تو اسے یاد کیا ہوگا، شاید کالز بھی کی ہوں گی۔ اب وہ قصہ پارینہ ہے۔ وہ جا کر بھی بتائے کہ میں کون ہوں تو وہ یقین نہ کرے۔ اس کے ساتھ کھڑا کانسٹیبل آگے بڑھ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ملک زاہد کو پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا، وہاں موجود لوگ بھی ادھر اُدھر ہو گئے۔ اس کا ساتھی کانسٹیبل بھی واپس آ گیا۔ اس نے یونہی تجسس میں پوچھا کہ کون تھا اور کیا بات تھی تو اس کے ساتھی کانسٹیبل نے جواب دیا۔

"یہ ملک زاہد ہے، اس نے اپنے ایک دشمن کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ مرا نہیں زخمی ہو گیا تھا لیکن کل وہ مر گیا ہے۔ یہ لوگ اسی کی خوشی منا رہے تھے۔"

"کیا نام تھا زخمی کا؟"

"چوہدری پرویز، بڑا نامی بندہ تھا۔" اس نے تو یونہی سرسری سے انداز میں کہا تھا لیکن اس کے اندر سے خوشی کی لہر پھوٹی، جس نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک حسرت سی اس کے دل میں اٹھی تھی۔ وہ دل مسوس کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی خوشی بھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے ملزمہ کے بیان کروائے، عدالت سے تھانے آئی اور پھر بارک چلی گئی۔ اس کے ذہن سے ملک زاہد نہیں نکلا۔ وہ شام بھی یونہی سوچوں میں گزرتی چلی جا رہی تھی کہ اچانک وہ ایک خیال سے ٹھٹک گئی۔ پھر وہ سوچتی چلی گئی۔

ایک وقت تھا، جب اس نے ملک زاہد کو استعمال کر کے اپنا مقصد پورا کر لیا تھا۔ مرنے والا اور مارنے والا دونوں ہی کوئی انسانیت کی خدمت نہیں کر رہے تھے کہ افسوس کیا جاتا۔ اسے پھر اسی لیڈی کانسٹیبل کی بات یاد آ گئی کہ "ایک بات یاد رکھنا، تلوار اور بندوق دونوں ہی ہتھیار ہیں۔ لیکن تلوار بندوق کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یاد رکھنا۔" وہ اس بات کو سمجھ گئی تھی۔

اس معاشرے میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ بہت سارے اچھوں میں بظاہر اچھے، بڑے بڑے کریہہ وجود سانڈ مارتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سارے بروں میں کہیں کہیں اچھے لوگ بھی پڑے ہیں۔ اسی طرح کوئی صرف چھری جیسا ہے، کوئی خالی بڑھکیں مار کر بدمعاشی قائم رکھے ہوئے ہیں، کئی بہن بدمعاش ہیں جو عورتوں کو آگے کر کے ان کے پیچھے بدمعاشی کرتے ہیں، کئی تلوار جیسے ہیں، کوئی خنجر ہے اور کوئی گن جیسے۔ مقابلہ ایک جیسے کا ہی ہوتا ہے اور جو بھاری ہوتا ہے، وہ جیت جاتا ہے وہ طاقت ور ہوتا ہے، یہ طاقت جیسی بھی ہو، چوہدری پرویز اپنے انجام کو پہنچ سکتا ہے تو کوئی دوسرا کیوں نہیں؟ یہ خیال پھیلتا چلا گیا۔ رات گئے تک اس نے سوچ لیا کہ اسے لوگوں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کر لڑوانا نہیں، چند لوگوں کو اپنا دوست بنانا ہے، جو کہیں بھی اس کے کام آ سکیں، پھر دیکھا جائے گا۔ اب یہ کھیل صرف زبان کا تھا، جس کی بنیاد میں یادداشت اور ذہانت ہی کا کام تھا۔ وہ یہ سب سوچ کر مسکرا دی۔ نجانے کتنے دنوں بعد وہ مسکرائی تھی۔

◆ ◆ ◆

وہ ایک الجھی ہوئی شام تھی۔ وہ سارا دن عدالت میں ڈیوٹی کر کے تھانے پہنچی۔ وہ تھکی ہاری ہوئی ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی۔ ساتھی کانسٹیبل نے چائے کا کہا تھا، وہ اسی انتظار میں تھی۔ ساتھ والے کمرے سے انسپکٹر کی باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ چند دن پہلے ہی نیا آیا تھا۔ اس کے بارے میں گمان یہی کیا جا رہا تھا کہ اسے سردار مٹھن خان نے ذاتی دلچسپی لے کر یہاں لگوایا ہے۔ ظاہر ہے اس انسپکٹر نے اسی کی جی حضوری کرنا تھی۔ مگر اب تک کوئی ایسا کیس یا معاملہ سامنے نہیں آیا تھا، جس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ سردار مٹھن خان کا بندہ ہے۔ یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے سامنے چائے آ گئی، اور اس کے ساتھ ہی ایک انتہائی کرب ناک خبر بھی سننے کو ملی۔

"یہ جو بندہ صاحب کے پاس بیٹھا ہے، پتہ ہے کون

PVL PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

''کون ہے؟'' اس نے کپ اٹھاتے بے پروائی سے پوچھا۔

''یہ شہر کا مشہور جوئے باز ہے۔ سب سے زیادہ بھتہ یہیں سے آتا ہے۔'' پھر اس کے بعد جو اس نے بتایا وہ نینا کے لیے روح فرسا تھا۔ میڈم سمیرا کا گھر، جو کبھی علم کی آماجگاہ تھا، وہ شہر کے سب سے بڑے جواری نے خرید کر اس میں کرکٹ جوئے کی ابتدا کر دی تھی۔ خریدا کس سے، کس نے بیچا؟ کچھ پتہ نہیں؟ تھانے میں نئے آنے والے انسپکٹر کو بھاری رقم پہنچا دی گئی تھی۔ انسانیت ہار گئی اور ظلم جیت گیا تھا۔ نینا کو لگا کہ اُس دن وہ خود ہار گئی ہے۔ اسے وہ چائے زہر لگنے لگی۔ وہ وہاں بیٹھ نہ سکی۔ وہ تیزی سے اٹھی اور بارک نمبر تین میں آگئی۔

* * *

وہ مایوسی کی انتہاؤں پر تھی۔ خودکشی کا خیال مزید پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس نے میڈم سمیرا اور سائرہ کا انتقام اور اپنی بے عزتی کا بدلہ تو کیا لینا تھا، اس کے دشمن زیادہ طاقت ور ہو کر اس کے سامنے آگئے تھے۔ وہ سوچ کی جس راہ پر بھی چلتی، اسے کچھ بھی ایسا دکھائی نہیں دے رہا تھا، جس سے وہ اپنے دشمنوں کو نیچا دکھا سکتی۔ یہ سوچتے ہوئے آدھی رات سے زیادہ وقت کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گیا تھا۔ پھر نجانے کب وہ گہری نیند سو گئی تھی۔ اچانک اسے لگا جیسے وہ شکنجے میں آگئی ہے۔ وہ چیخ مار کر اٹھ گئی۔ وہ ہونقوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ایک دم سے روشنی ہو گئی۔ آپی فوزیہ نے بلب روشن کر دیا تھا۔ نینا خواب میں ڈر گئی تھی۔

''کیا ہوا؟'' آپی فوزیہ نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے گھبراہٹ سے پوچھا۔ وہ چند لمحے ہونقوں کی طرح سب کو دیکھتی رہی۔ تب تک اسے خود ہی احساس ہو گیا کہ وہ خواب میں ڈر گئی ہے۔ اور جو کچھ خواب میں اس نے دیکھا تھا، وہ انہیں بتا نہیں سکتی تھی۔ اس لیے وہ آپی فوزیہ کی طرف ممنونیت سے دیکھتے ہوئے بولی

''کچھ نہیں۔'' یہ کہہ کر دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ تو گئی مگر اندر سے لرز رہی تھی۔ اسے یوں لیٹا ہوا دیکھ کر آپی فوزیہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر وہ بھی پلٹ کر سو گئیں۔

وہ خواب کا ایک ایک لمحہ یاد کرنے لگی۔

اس کے خواب میں سائرہ تھی۔ اس نے سفید براق لباس پہنا ہوا تھا، لیکن اس پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس کے چہرے پر لہو بہہ رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ نینا بھاگ کر اس کے پاس گئی تو اس نے اسے دور ہی سے روکتے ہوئے تڑپ کر بولی۔

''مت آنا میرے پاس، تم بھی گندی ہو جاؤ گی۔ نہ میرے قریب نہ آنا۔''

''تم تو مظلوم تھی۔ تمہیں تو جنت میں جانا تھا، یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے پیار سے پوچھا۔

''جنت گندے لوگوں کے لیے نہیں ہے، وہاں پاک صاف لوگ جاتے ہیں، میں نہیں جا رہی ہوں، میں گندی ہوں نا۔'' وہ حسرت آمیز لہجے میں بولی۔

''نہیں تم پاک ہو، تم جاؤ جنت میں۔'' نینا نے سمجھایا

''نہیں، میں گندی ہوں۔'' وہ بولی۔

''میں تمہیں صاف کر دیتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''جب تک مجھے گندہ کرنے والے اس دنیا میں موجود ہیں، میں پاک نہیں ہو سکتی۔ میں جنت میں نہیں جا سکتی۔ کیا تم ان کا گند دنیا سے صاف کر سکو گی؟'' سائرہ نے پوچھا تو ایک لمحہ کے وہ سوچ میں پڑ گئی پھر پوری ہمت سے کہا۔

''ہاں ان کے گند سے دنیا کو صاف کر دوں گی۔''

''تو پھر میں جنت میں ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑی اور سامنے پھیلے ہوئے دھوئیں میں غائب ہو گئی۔ وہ اس کے پیچھے لپکی تھی لیکن اسی لمحے ایک اژدہا اس کے سامنے آگیا۔ جس کی لپلپاتی ہوئی زبان، اس کے بدن کو چھوئی۔ اسے لگا جیسے اس کے بدن پر دہکتے ہوئے کوئلے رکھ دیے ہوں۔ وہ اژدہا اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ تبھی اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس رات اسے نیند نہیں آئی تھی۔ وہ خواب کے زیر اثر رہی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ اسے ایسا خواب کیوں دکھائی دیا ہے۔ وہ پوری طرح سمجھ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہے۔ اس نے اتنے اردو، انگریزی ناول پڑھے تھے، اس لٹریچر نے اسے شعوری پختگی تو دی ہوئی تھی لیکن وہ صرف فکشن کی حد تک مزہ لینے کے لیے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا عملی زندگی میں بھی کرنا پڑ جائے گا، یا اسے ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اب اس کے سر پر پڑی تھی، کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسی کے شعور نے اسے جو راستہ سمجھایا۔ اس نے سمجھ لیا تھا لیکن بے بس تھی۔ اس کے پاس زندگی گزارنے کا مقصد نہیں تھا۔ یہ خواب اسے زندگی گزارنے کا مقصد تو دے گیا۔ مگر یہ کیسے ہوگا؟ کس طرح ہوگا، اس بارے میں وہ نہیں جانتی تھی۔ یہ طے تھا کہ اب اسے اس دنیا سے گند صاف کرنا تھا۔

اس صبح وہ وقت پر تیار ہو کر تھانے چلی گئی۔ وہاں اس سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ وہاں سے چلی جائے۔ نئے انسپکٹر کی موجودگی کا احساس ایسے ہی تھا کہ وہ بھی اس کا دشمن ہے۔ دشمن کا دوست تو دشمن ہی ہوتا ہے نا۔ نئے انسپکٹر کی آواز اور قہقہے اسے تیر کی مانند لگ رہے تھے۔ وہ حد درجہ مضطرب تھی۔ وہ تھانے کی عمارت سے نکل کر چار دیواری کے ساتھ آ کر ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ ابھی اسے وہاں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہی لیڈی کانسٹیبل اسے سادہ لباس میں آتے ہوئے دکھائی دی۔ اس نے چلتے ہوئے اسے دیکھا، پھر مڑ کر اس کی جانب آگئی۔ نینا کا دل چاہا کہ وہ اس کے سامنے رو دے، اپنی شکست کا اعتراف کر لے، اسے کہہ دے کہ وہ اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ وہ لیڈی کانسٹیبل اس کے قریب آگئی، وہ نینا کے چہرے پر دیکھتے ہوئے بولی

''پریشان ہو؟''

''ہاں۔ بہت زیادہ پریشان ہوں۔'' نینا نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ چونک گئی۔

''نہ نینا بیٹی نہ، ایک آنسو بھی نہیں ضائع کرنا، اگر تمہارا ایک آنسو بھی ضائع ہو گیا تو تمہارے اندر کی ساری قوت ختم ہو کر رہ جائے گی۔''

''کیا کروں میں پھر؟'' اس نے تیزی سے کہا۔

''میں نے ایک کاغذ پر صاحب سے سائن کروانے ہیں، تم یہیں ٹھہرنا، میں واپس آتی ہوں، پھر سکون سے بات کرتے ہیں۔'' وہ لیڈی کانسٹیبل انتہائی سکون سے بولی یہ کہہ کر وہ اسے وہیں چھوڑ کر اندر کی جانب بڑھ گئی اور وہیں دوبارہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ وہ لیڈی کانسٹیبل چند منٹ بعد ہی واپس آگئی۔ اس نے دور ہی سے اشارے کے ساتھ کہا۔

''آؤ، میرے ساتھ۔''

وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چل دی۔ تھانے کے باہر ایک چھوٹی سفید رنگ کی کار کھڑی تھی۔ وہ اس میں جا کر بیٹھ گئی۔ نینا بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ڈرائیور کار لے کر چل پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ بالکل نئے علاقے میں ایک نئے تعمیر شدہ گھر میں جا پہنچے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد اس نے اپنی بہو سے ملواتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے ڈاکٹر بیٹے کی بہو ہے۔'' وہ مل کر پلٹ گئی تو لیڈی کانسٹیبل نے کہا۔

''میں کل پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکی ہوں۔ اچھا ہوا تم آج مل گئی ہو۔ میں نے اس ملازمت میں کیا کھویا، کیا پایا، یہ سب ایک طرف، گھر اولاد کی تربیت ایک طرف، مگر میں کچھ باتیں بتا دوں، اسے غور سے سننا۔''

''جی میں سن رہی ہوں۔'' نینا نے کہا تو وہ لیڈی کانسٹیبل کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی

''اس وقت اگر کوئی تمہیں پسٹل تھما دے اور تمہارے سامنے کھڑے تمہارے دشمن کو مارنے کا اختیار بھی مل جائے تو کیا تم دشمن کو مار سکو گی؟''

''شاید ہاں یا شاید نہیں۔'' اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا تو لیڈی کانسٹیبل بولی

''تمہارا جواب نفی میں ہے۔ سنو! کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پہلے مضبوط ہونا پڑتا ہے۔ پسٹل چلاتے وقت جس کا ہاتھ کانپ جائے، وہ کبھی اپنا نشانہ پختہ نہیں کر سکتا۔ بہترین نشانہ لگانے کے لیے مضبوط ہاتھ کی ضرورت ہے۔ تمہیں مضبوط ہونا ہے۔ پسٹل پکڑنے والے ہاتھ کو طاقت ور ہونا چاہئے، اور پختہ نشانہ لگانے کے لیے مہارت، اور یہ بنا ریاضت کے نہیں ملتی۔''

''یہی تو بات ہے، میں مجبور اور بے بس ہوں۔'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ صرف تمہاری سوچ ہے۔ سب سے پہلے اپنی سوچ کو پختہ کرو۔ فیصلہ کرو، تم نے اپنے دشمن سے انتقام لینا ہے۔ یہی پہلا قدم ہے۔ اور اگر تم نے آنسو بہا دیا، اور ایک آنسو کے ساتھ تمہاری ذات بھی ضائع ہو جائے گی۔ جب تک تمہاری آنکھ میں سے آنسو نہیں نکلتا، تمہارے اندر کی درندگی قائم رہے گی۔ جس نے انتقام کو زندہ رکھنا ہے۔''

''یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟'' اس نے اپنی سوچ کی لگا

تو سب ملن ہو جائے گا۔ اور ہاں، میں شاید ہی آج کے بعد تمہیں ملوں، کیونکہ میں یہاں سے اپنے دوسرے بیٹے کے پاس جا رہی ہوں۔ میں تمہیں ایک نمبر دیتی ہوں، وہاں سے ایک خاتون بات کرے گی۔ میں آج انہیں تمہارے بارے میں بتا دوں گی۔ اگر تم فیصلہ کر لو تو انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا، پھر انہیں سے رابطہ رکھنا، یہ تجسس نہیں کرنا کہ وہ کون ہے؟ جب تک وہ خود نہ کہیں، پھر دیکھنا کیا ہوتا ہے۔'' لیڈی کانسٹیبل نے حتمی انداز میں کہا۔ اتنے میں اس کی بہو چائے لے کر آ گئی تو باتوں کا رخ ہی بدل گیا۔ بلاشبہ اس نے جان بوجھ کر اپنی بہو کے سامنے بات نہیں کی تھی۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور اسے واپس تھانے چھوڑ کر گیا تو اس کے اندر کی بے بسی کہیں گم ہو چکی تھی۔ وہاں ایک نئی نینا کا وجود میں آ گیا تھا۔

اسی رات اس نے ریاضت سے گذرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور فیصلہ بھی اس پختگی کے ساتھ کیا کہ ابھی اور اسی وقت سے۔ اس وقت ابھی اندھیرا ہی تھا۔ مگر اس نے پروا نہیں تھی۔ خود سے کی ہوئی کمٹمنٹ کو پورا کرنا تھا، اس لیے اُس نے ٹریک سوٹ پہنا اپنے کوارٹر سے نکلی اور بارک نمبر تین کے سامنے وسیع و عریض میدان میں پہنچ گئی، جہاں پریڈ ہوتی تھی۔

وہ جس وقت واپس کوارٹر آئی تو ہلکی خنکی والے دنوں میں بھی اس کا ٹریک سوٹ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اس کے رخسار سرخ تھے۔ آنکھوں میں ایک نئی چمک تھی۔ اس کا لہجہ بھی بدل گیا۔ اس نے اپنے اندر سے مظلوم عورت نکال باہر پھینکی تھی۔

چند دن بعد ہی وہ پولیس کی لازمی ٹریننگ کے لیے اپنی دوسری بھرتی ہونے والی کانسٹیبل لڑکیوں کے ساتھ پولیس کے ٹریننگ سنٹر آ گئی۔ جہاں اس نے ٹریننگ کرنا تھی۔ پہلے ہی دن کے لیکچر نے اسے سکھا دیا کہ اس نے جو سوچا تھا، وہ درست تھا۔ اسے ہر طرح سے مضبوط ہونا تھا۔ یہی مضبوطی اسے دشمن کو زیر کرنے کے لیے ایک بڑا ہتھیار تھی۔

چند ہفتوں بعد ہی اس کے انسٹرکٹر حیران رہ گئے۔ دوسری لڑکیاں تو ڈرل مشکل سے کرتی تھیں اور نینا صبح منہ اندھیرے میدان میں ہوتی، نومبر کی ٹھنڈ میں بھی اس کا ٹریک سوٹ پسینے میں بھیگا ہوا ہوتا۔ شام کو وہ جم چلی جاتی۔ وہاں لوگ حیران تھے کہ یہ ایک کھسکی ہوئی جنونی ہے، جسے کسی سے کوئی غرض نہیں سوائے اپنے بارے میں سوچنے کے۔ نینا نے یہ راز افشا ہی نہیں کیا تھا کہ وہ یہ سب کیوں کر رہی ہے۔ سبھی نے اس کا شوق سمجھا۔ اس کے انسٹرکٹر اسے گائیڈ کرنے لگے اسے بہترین مشورے ملے۔ کئی رہنمائی کرنے والے مل گئے۔ وہ اپنے آپ کو مضبوط کرنے کی دھن میں سب کچھ بھلا چکی تھی۔ اسے یاد تھا تو صرف یہ کہ اس نے سائرہ اور میڈم سمیرا کا انتقام لینا ہے۔ اور جس نے اسے منہ بھر کے ننگا کر دینے کی بات کی تھی، اسے بتانا کہ جب کمزور اپنے انتقام کی ٹھان لیتا ہے تو کس قدر خطرناک ہو جاتا ہے۔

اس کی دوسری توجہ سیل فون دوستوں پر تھی۔ وہ ان سے رابطے میں رہتی تھی۔ وہ لوگ کون تھے، کیسے تھے، اس بارے میں کبھی اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ ایک راز تھا، جسے وہ خود سے بھی چھپا کر رکھتی تھی۔

ایک برس یوں گزر گیا۔ ان کی پاسنگ آؤٹ پریڈ ہو گئی۔ اس نے کئی انعام جیتے۔ سب سے اہم نشانہ بازی کا انعام تھا۔ شوٹنگ کلب میں نشانہ بازی سے اس کا نشانہ اتنا پختہ ہو گیا تھا۔ وہ کوئی بھی شے اچھال کر اس کا نشانہ لگانے میں ماہر ہو چکی تھی۔ دو بدو فائٹنگ میں کوئی لڑکی اس کے سامنے نہیں آتی تھی۔ جس حد تک جوڈو کراٹے کی تربیت سینٹر میں دی جاتی تھی وہ اس میں تاک ہو گئی۔ جب وہ ٹریننگ سے واپس آئی تو وہ پہلے والی نینا نہیں رہی تھی۔ وہ بالکل بدل چکی تھی۔ اس کی سوچ یکسر تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ اپنی ٹریننگ کر کے واپس آ گئی تھی۔

اس پورے دورانیے میں اس کا سب سے بڑا ہتھیار، اس کا سیل فون تھا۔ اس نے بہت سارے لوگوں کی چھان پھٹک کے بعد محض چند لوگوں کے ساتھ دوستی بنائی تھی۔ جن میں دو لڑکیاں اور کچھ مرد حضرات تھے۔ وہ انہی سے بہت سارا کام لینے والی تھی۔ وہ سبھی اپنی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی ''شے'' تھے۔

* * *

اس دوپہر وہ اپنے کوارٹر میں بیٹھی ہوئی اپنی آئندہ کی پلاننگ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ نمبر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اسی لمحے اس کے

اندر سے جو خوشی کا طوفان اٹھا، اس طوفان سے وہ یک لخت ٹھٹک گئی۔ کیا وہ اس قدر شعیب کا انتظار کر رہی تھی۔ کیا وہ لاشعوری طور پر اس کی منتظر تھی؟ اس نے کال ریسیو کی تو اسے اپنی آواز کی لرزش واضح محسوس ہوئی۔ اس نے ہیلو کہا۔

''شکر ہے تمہارا نمبر نہیں بدلا، ورنہ شاید میں تمہیں کھو چکا ہوتا۔'' شعیب کی چہکتی آواز میں بولا

''مگر میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے جب یہ لفظ کہے تو نجانے ان لفظوں کے ساتھ کیسے کیسے احساس گندھے ہوئے تھے کہ شعیب نے پوچھا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں؟'' اس نے خود پر قابو پا کر کہا۔

''ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے واپس آئے ہوئے۔ تب سے سوچ رہا تھا کہ تمہیں فون کروں۔'' اس نے خوشی سے کہا۔

''تو پھر کیا نہیں؟'' اس بار وہ خود پر قابو پا چکی تھی

''ڈر رہا تھا، کہیں تمہارا نمبر نہ بدل گیا ہو، یا پھر تم مجھے پہچاننے سے انکار کر دو۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا تو وہ ہنس دی پھر بولی۔

''نہیں، ایسا تو نہیں ہے۔''

''سناؤ، سی ایس ایس کی تیاری کہاں تک پہنچی؟'' اس نے بڑے پیار سے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ لمحوں تک اُسے کوئی جواب نہ دے پائی تو شعیب نے پوچھا۔

''خیریت ہے، تم بول نہیں رہی ہو؟''

''جب حالات ہی کسی دوسری راہ پر ڈال دیں تو پھر اپنی خواہشوں کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔ چھوڑو، کوئی دوسری بات کرو۔'' اس نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔

''نینا! کیا بات ہے، تیرا لہجہ کتنا کرب ناک ہے، کیا ہوا، بتاؤ پلیز۔'' اس نے تیزی سے پوچھا۔

''چھوڑو شعیب، کیوں زخم کریدتے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھیگ گئی۔ جس پر شعیب نے تڑپتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''بولو، مجھے بتاؤ، کیا ہوا، میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''جب ملے تو بتا دوں گی۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تو شعیب غصے میں بولا۔

''تمہاری یہ عادت مجھے انتہائی گندی لگتی ہے جو تم پہیلیاں ڈالتی ہو۔ میں تو تم سے ابھی اور اسی وقت مل سکتا ہوں، تو کیا مل لو گی؟ تم تو کئی......''

''بتاؤ کہاں ملنا ہے، میں ابھی آ جاتی ہوں۔'' اس نے شعیب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بولو کہاں سے پک کروں؟'' اس نے بھی کہہ دیا تو نینا نے ایک پوائنٹ بتایا۔ اس پر شعیب نے کہا۔

''میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' شعیب نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ دیے گئے وقت پر وہاں پہنچ گئی۔ اسے وہاں ایک کلین شیو، سرخ و سپید رنگت والا، جوان نئے ماڈل کی کار میں بیٹھا دکھائی دیا۔ وہ بہت حد تک بدل گیا تھا۔ یہاں تو وہ پتلا سا تھا، لیکن سامنے موجود شعیب اس قدر پرکشش ہوگا یہ اس نے تصور بھی نہیں تھا۔ سیاہ ریبین لگائے وہ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ اس کے اندر کی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔ اس کے اندر کی عورت نے آنکھ کھول لی، نسوانیت نے زور سے ہلچل محسوس کی۔ وہی کشش جو ایک عورت مرد میں محسوس کرتی ہے۔

شعیب نے اسے حجاب ہی میں دیکھا تھا۔ اس نے صرف آنکھیں دیکھی تھیں، وہ تو اس کے بدن کے نشیب و فراز سے بھی واقف نہیں تھا۔ وہ جو خود اسے پہچان نہیں پائی تھی، تو وہ اسے کیا پہچان سکتا تھا۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ چلتے ہوئے اس کی کار کے پاس گئی، پسنجر سیٹ والا دروازہ کھولا اور بیٹھتے ہوئے ہولے سے بولی۔

''چلو، کہاں لے جاتے ہو؟''

شعیب دیدے پھاڑے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے نینا کی طرف یوں دیکھا جیسے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ اس نے سر سے پاؤں تک دیکھتے رہنے کے بعد سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

''امیزنگ! اگر تم نہ بولتی تو میں تمہیں کبھی نہ پہچان پاتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گیئر لگا دیا۔

''نہ بولتی تب تم کیا کرتے؟'' اس نے شوخی سے پوچھا تو اسی حیرت میں بولا

''فوراً اتر جانے کو کہتا۔''

''یار میں اتنی بھی 'ماٹھی' نہیں ہوں۔'' اس نے مصنوعی

"ماٹھی؟ تم خود کو ماٹھی کہتی ہو، او یار تم نے تو میرا دماغ ہلا کر رکھ دیا ہے۔ کہاں وہ دیہاتی لڑکی اور کہاں یہ تراشیدہ بدن والا بت، جو نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے، پاگل کر رہا ہے۔" اس نے کہا تو پہلی بار اسے اپنی تعریف اچھی لگی تھی۔ چند لمحے سرور میں رہنے کے بعد اس نے خود پر قابو پا لیا اور مصنوعی غصے میں بولی۔

"امریکا جا کر تم کچھ زیادہ ہی اسمارٹ نہیں ہو گئے، مطلب منہ پھٹ، بے حیا اور......"

"حسن پرست۔" یہ کہہ کر اس نے زوردار قہقہہ لگا دیا، پھر بولا، "یقین جانو گولی کی طرح سینے پر لگی ہو۔"

"گولی؟ یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا تو شعیب ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا

"کیا تم مجھ پر اعتماد کرو گی؟"

"بالکل، کیوں نہیں ایک تم ہی تو ہو جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔" اس نے یہ بات دل سے کہی تھی

"تو پھر سنو! میرے ذہن میں تمہارا جو تصور تھا، وہ بس ایویں سی ایک لڑکی کا تھا، جو ذہین تو ہے لیکن خود کو اس لیے چھپا کر رکھتی ہے کہ وہ اتنی زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ لیکن اس وقت تمہیں دیکھا تو یقین نہیں آ رہا، میں تو اب بھی یہ گمان کر رہا ہوں کہ تم وہ نہیں ہو، جسے میں جانتا ہوں۔" شعیب نے پورے جوش اور حیرت ملے انداز میں کہا۔

"یہی حسن تو مجھے برباد کر رہا ہے۔ کیا کروں؟" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ پوچھا۔

"میں سمجھا نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔" اس نے ہولے سے کہا اور سامنے سڑک کو دیکھنے لگی پھر ایک دم سے اسے خیال آیا کہ وہ اسے لے جا کہاں رہا ہے؟ اسے یہ خیال تو آیا لیکن اس نے یہ سوال نہیں کیا۔ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ تبھی شعیب نے یوں کہا جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا ہو۔

"تم نے پوچھا نہیں، ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"تم میرے بہت اچھے اور قابل اعتماد دوست ہو، جہاں بھی لے جاؤ، چلی جاؤں گی۔" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس پر شعیب چند لمحے یوں خاموش رہا جیسے سوچ رہا ہو، پھر بولا

"بہت بدل گئی ہو۔"

"ہاں وقت اور حالات نے بدل دیا۔" یہ کہہ کر اس نے لمبی سانس لی۔

ان کے سفر کا اختتام شہر سے باہر ایک فارم ہاؤس پر ہوا۔ ایک طرف خوبصورت سا رہائشی پورشن بنا ہوا تھا۔ جس کے پورچ میں اس نے کار روکی تو وہ دونوں باہر آ گئے۔

"یہ فارم ہاؤس میرے بھائی کا شوق تھا۔ اب اس کی دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ یہاں وہ بہت کم آتا ہے۔ اب میں آ گیا ہوں تو میں نے یہاں اپنی ایک چھوٹی سی لیب بنائی ہے۔"

"لیب، وہ کس لیے؟" نینا نے پوچھا۔

"مختلف تجربات کے لیے، یار میں الیکٹرونکس انجینئر ہوں، دنیا کے ٹاپ کے ادارے سے پڑھ کر آ رہا ہوں۔

کمال ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دی۔

دونوں ہولے ہولے چلتے ہوئے لاؤنج میں آ گئے۔ وہاں شعیب نے نینا کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا، پھر ایک دم سے نگاہیں چرا لیں، جیسے وہ کوئی چوری کر رہا ہو۔ وہ اس کی ادا دیکھ کر ایک دم سے ہنس دی، مگر نے احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ دیکھ چکی ہے۔ اگرچہ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی لیکن نینا کو یہ احساس ہو گیا کہ وہ اس سے بے حد متاثر ہو چکا ہے۔ شاید اس سے، اس کے حسن سے؟

"آؤ، تمہیں لیب دکھاؤں۔" یہ کہہ کر وہ اندر کی جانب چلا گیا۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی عمارت تھی۔ اس نے جا کر دروازے میں لگا تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے اندر پہنچ گئی۔ وہاں پر کافی ساری چھوٹی بڑی مشینیں، کمپیوٹر، مختلف قسم کے برقی آلات اور بہت کچھ تھا، جس کی اُسے سمجھ نہ آ سکی۔ تبھی اس نے پوچھا۔

"یہ سب کیا ہیں، ان پر کیا تجربے کرتے ہو؟"

"کوئی بھی نئی چیز بنانے کے لیے۔ جیسے دنیا میں نئی سے نئی چیزیں بن رہی ہیں، کیا تم نہیں جانتی کہ آئے دن کوئی نہ کوئی نئی چیز آ جاتی ہے یا پہلی میں کچھ نئی تبدیلی آ جاتی ہے۔" اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی سامنے بیٹھتے ہوئے بولی

"ہاں یہ تو ہے۔ جیسے کوئی سیل فون سے واقف نہیں تھا، لیکن اب ہر کوئی اپنے پاس رکھتا ہے۔"

"بالکل، ابھی جو کچھ سیل فون میں ہے، اس میں ایسی

تبدیلی جو دنیا کو حیران کر دے، یہی تجربات کرتا ہوں۔"

"تو کچھ کیا؟" اس نے ایک دم پوچھا۔

"ہاں، کافی کچھ کیا۔ مطلب یہ سیل فون ہی لے لو، میرے پاس ایسا فون ہے، جسے کوئی چاہے بھی تو ٹریس نہیں کر سکتا۔ یہ ہم نے وہاں بنایا تھا، میں اس پر مزید کام کر رہا ہوں۔"

"واؤ۔ یہ تو کمال کی چیز ہے۔" اس نے دلچسپی سے کہتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔

"یہاں اس کا کوئی تجربہ کیا، مطلب کسی کو کال کی۔"

"ہاں، میں کئی بار آزمایا۔ کسی کو پتہ نہیں چلتا۔" وہ بولا

واہ۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولی

"خیر تم سناؤ، اتنی تبدیلی کیسے آ گئی، ایک ایسی لڑکی جو کبھی حجاب میں رہتی تھی اور آج ایسے دکھائی دے رہی ہے جو بہت ماڈرن ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تو نینا نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے شعیب، کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں، چھوڑو، پھر کسی وقت سہی۔"

"اگر تم بتانا نہ چاہو تو الگ بات ہے لیکن میں سننا چاہتا ہوں، جتنی بھی لمبی کہانی ہو۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا تو نینا نے اس کی طرف دیکھا اور یاسیت بھرے لہجے میں بولی۔

"کیوں سننا چاہتے ہو؟ سن لینے سے کیا ہوگا؟"

"تم شاید اسے جو بھی سمجھو لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں تمہارے بارے جاننا چاہتا ہوں۔" اس نے ضد کرنے والے انداز میں کہا تو وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"کیوں، کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"اس لیے کہ میں تم سے قربت محسوس کرتا ہوں۔ دل سے چاہتا تھا کہ تم جیسی باصلاحیت لڑکی کسی اچھی پوسٹ پر ہو، میں نے تمہیں مدد کی آفر بھی کی مگر تم نے نجانے کیوں قبول نہیں کی، اور پھر اتنی بڑی تبدیلی یونہی نہیں آ سکتی۔ کہیں جاب تو نہیں کر لی یا تمہاری شادی تو نہیں ہو گئی، بتاؤ نا یار۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا تو وہ ہنس دی۔ اسے شعیب کا یہ انداز بہت اچھا لگا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر بولی

"میں نے پولیس کی نوکری کر لی ہوئی ہے۔ ایک معمولی کانسٹیبل کی نوکری۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں حسرت بھری تلخی اُتر آئی تھی۔

"وہاٹ! کیا کہہ رہی ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"سچ یہی ہے۔" وہ بولی۔

یہ سن کر شعیب چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔

"یہ پولیس کی نوکری، یہ کیوں کی؟ ظاہر ہے کوئی مجبوری رہی ہو گی، دراصل میں وہ مجبوری جاننا چاہتا ہوں۔" وہ ایک دم سے کہتا چلا گیا۔

"پھر کیا ہوگا؟" اس نے عجیب لہجے میں پوچھا۔

"میں کوشش کروں گا کہ......" اس نے کہنا چاہا تو نینا نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے شعیب، مجھے کوئی خواب مت دکھانا، میں اب کوئی بھی خواب نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے میری مجبوریوں کے ساتھ زندہ رہنے دو۔ تم نے واپس چلے جانا ہے۔ میں جیسی ہوں، مجھے ویسی ہی رہنے دو۔ میں ایسے ہی خوش ہوں۔"

"بہت زہر ہے تمہارے لہجے میں؟" اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جب وہ خاموش رہی تو اس نے کہا۔

"او کے، کچھ بھی مت بتاؤ، لیکن ہم یہاں جتنی دیر تک ہیں، اتنی دیر تک تو ہم اپنی باتیں کر سکتے ہیں نا، وہ سوال جو پرانی یادوں کے حوالے سے اب بھی ذہن میں ہیں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" نینا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا تو ان کے درمیان کافی دیر تک خاموشی آن ٹھہری۔ جیسے ان کے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہ رہا ہو۔ تبھی شعیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آؤ باہر چلتے ہیں۔"

وہ اٹھ گئی اور اس کے پیچھے پیچھے لیب سے نکلتی چلی گئی۔ وہ دونوں کھلی فضا میں آ گئے۔ اچانک نینا کو خیال آیا تو وہ چند لمحے سوچتی رہی، پھر اس نے پوچھا۔

"یہاں کوئی ملازم دکھائی نہیں دے رہا ہے، جیسے ہمارے علاوہ یہاں کوئی بھی نہ ہو۔"

"پہلے یہاں کافی ملازم ہوتے تھے، چونکہ بھائی کی دلچسپی کم ہو گئی ہے اور یہاں کام کرنے والے مزارعے ساتھ گاؤں میں رہتے ہیں، اس لیے یہاں کی دیکھ

بھال کے لیے ایک جوڑا رہتا ہے، وہ بھی دو تین دن کے لیے اپنی کسی عزیز کی شادی میں گئے ہیں۔"

"مطلب ہمارے سوا کوئی نہیں ہے۔" نینا نے شوخی سے پوچھا تو شعیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"فکر مت کرو، میں کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤں گا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم ایسا کرو گے نہیں، دوسری بات اگر فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو گے تو بہت پچھتاؤ گے، اور تیسرا یہ کہ......" وہ کہتے کہتے رُک گئی۔

"تیسرا کیا؟"

"تیسرا یہ کہ جس دن میرا دل کیا، میں خود تمہارا جائز فائدہ اٹھالوں گی۔"

"تم بھی نا۔" شعیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ رہائشی عمارت کے لان میں بیٹھے یونہی باتیں کرتے رہے۔ ان کے درمیان ماحول خوشگوار ہو گیا تھا۔ شعیب اپنے بارے میں بتاتا رہا کہ اس نے امریکا میں رہتے ہوئے کیسے وقت گزرا۔ کس طرح تعلیم حاصل کی۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ اس نے اپنے بارے کچھ نہ بتایا۔

اس وقت سورج ڈوب رہا تھا، جب وہ دونوں کار میں بیٹھے اور واپس شہر کی جانب چل دیئے۔ ان کے درمیان خاموشی تھی۔ وہ فارم ہاؤس سے نکل کر اندازاً دو کلومیٹر تک گئے ہوں گے کہ ایک سیاہ کار نے انہیں تیزی سے کراس کیا۔ وہ کار پہلے آہستہ ہوئی پھر کافی آگے جا کر یوں رک گئی کہ اس کی وجہ سے شعیب کو زوردار بریک لگانا پڑے۔ جیسے ہی ان کی کار رُکی سامنے والی کار سے چار آدمی نکل کر باہر آ گئے۔ پسنجر سیٹ سے جو بندہ نکلا اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا، اس نے نکلتے ہی ان کی کار پر فائرنگ کرنا شروع کر دی۔ شعیب کا رنگ ایک دم سے پیلا پڑ گیا۔ بلاشبہ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے۔

نینا انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ وہی شخص ڈرائیور سائیڈ پر آ گیا۔ اس نے شعیب کی طرف والا دروازہ کھولنا چاہا۔ وہ بند تھا۔ اس نے اشارے سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ شعیب نے ایک بار نینا کی جانب دیکھا اور پھر باہر نکل گیا۔ اس نو وارد نے پہلے شعیب کو گردن سے پکڑا اور اسے قریب کھڑے بندے کے حوالے کیا، پھر کار کے اندر جھانک کر دیکھا تو بڑے گھٹیا سے انداز میں دوسروں کو سناتے ہوئے کہا۔

"اوئے واہ اوئے! فل عیاشیاں، اوئے اندر نرم مال بھی ہے، کمال ہے یار۔"

اس دوران وہ دوسرا بندہ شعیب کو گریبان سے پکڑ کر ہیڈ لائیٹس کی روشنی میں لے گیا۔ اسی لمحے پیچھے کھڑے تیسرے بندے نے کہا۔

"اوئے ٹھہر! رُک جا۔"

"کیا ہوا؟" جس نے گریبان پکڑا تھا اس نے پوچھا تو پیچھے والا بولا۔

"یہ وہ نہیں جسے ہم نے مارنا ہے، یہ اس کا چھوٹا بھائی ہے، جو ابھی امریکا سے آیا۔"

"یہ تو پھر اطلاع دینے والے کی غلطی ہے نا، اب تو اسے مارنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر اس نے پسٹل کی نال اس کے سر پر رکھی تو پیچھے کھڑے بندے نے کہا۔

"ایک منٹ رک جا، مجھے پوچھ لینے دے، جلدی نہ کر۔" اس کے کہنے پر اس نے پسٹل کی نال ہٹا لی۔ پیچھے والا شخص کار تک گیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بندے سے بات کی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب نینا کی نگاہ سامنے کار میں بیٹھے شخص پر پڑی۔

یہ وہی شخص تھا جسے اس نے مٹھن خان کے ڈیرے پر دیکھا تھا۔ اسی نے بڑی بے دردی کے ساتھ سائرہ کو اٹھا کر پھینکا تھا اور اُس کے کپڑے پھاڑے تھے۔ وہی تھا جو خود کو مٹھن خان کا سب سے بڑا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہی کہہ رہا تھا کہ میں سب دیکھ لوں گا۔ اسی نے سب سے پہلے اس پر ہاتھ ڈالا تھا، جب فرحان خان نے اسے ننگا کرنے کو کہا تھا۔ اسے پہچانتے ہی نینا کا دماغ ایک دم سے گھوم گیا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی اس کے دماغ میں آگ بھڑک اٹھی۔ نجانے وہ کون سی قوت تھی جو اس کے بدن میں سرائیت کرنے لگی۔ اس نے ایک ہی لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

نینا نے طویل سانس لے کر خود پر قابو پاتے ہوئے اپنی کمر کی بائیں طرف لگے ہولسٹر میں سے پسٹل نکال کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور کار سے باہر نکل آئی۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی یوں آگے بڑھی جیسے ڈر رہی ہو۔ اس نے دور ہی سے کہنا شروع کر دیا۔

"خدا کے لیے ہمیں معاف کر دیں۔ ہم سے ایسا کیا قصور ہو گیا، ہمیں جانے دیں پلیز۔"

"اوئے پٹولے! تم سے کیا قصور ہونا ہے۔ یہ تو اس امریکا پلٹ کا بھائی ہے جو مٹھن خان کے خلاف بولتا ہے۔ اسے بڑا معاف کیا، سمجھایا بھی بہت تھا لیکن باز نہیں آتا۔ تم چلو ہمارے ساتھ عیش کروا دیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آنکھ مار دی۔

نینا نے دیکھا۔ وہ سیل فون بات کرنے والے کی کال نہیں مل رہی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا، جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ اس نے انتہائی سرعت سے اپنا پسٹل نکالا اور کوئی مہلت دیئے بغیر اس کے سر پر فائر کر دیا، جس نے شعیب کا گریبان پکڑا ہوا تھا۔ اس کی چیخ بلند ہوئی۔ وہ یوں پیچھے گرا جیسے لکڑی کا لٹھ گرتا ہے، نینا نے کوئی مہلت نہیں دی، اس نے سامنے کھڑے فون کال کرنے والے پر فائر کر دیا۔ اس کے ہاتھ سے فون دور جا گرا، اس کے ساتھ ہی تیسرا بھی سڑک پر تڑپنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کار میں بیٹھا ہوا بندہ تیزی سے کار بھگا لے جائے گا۔ اس نے ٹائروں پر فائرنگ کر دی۔ ٹائر پھٹ گئے مگر پھر بھی اس نے کار سٹارٹ کر کے بھگا لی تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ سڑک سے نیچے اتر کر الٹ گئی۔ وہ شخص اس میں پھنس گیا۔ کار الٹتے ہی پیٹرول کی بو پھیلنے لگی۔ نینا کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے چند ثانیے انتظار کیا اور کار کی طرف فائر کر دیا۔ ایک دم سے شعلہ بھڑکا اور کار کو آگ لگ گئی۔ وہ لمحہ بھر جلتی ہوئی کار کو دیکھتی رہی پھر پلٹ آئی۔ شعیب ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"اب کھڑے کیا دیکھ رہے ہو، چلو نکلو۔" نینا نے تیزی سے کہا تو شعیب کو ہوش آیا۔ وہ کار کی طرف مڑ گیا۔ تبھی نینا کی نگاہ سڑک پر گرے سیل فون پر پڑی، وہ بجائے کار میں بیٹھنے کے اس فون کی جانب بڑھی جو چند قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔ اس نے وہ سیل فون اٹھایا اور تیزی سے آ کر کار میں بیٹھ گئی

"چلو اب نکل چلو۔"

"اوکے۔" شعیب نے کاندھے اُچکا کر گیئر لگایا اور کار بھگا دی۔ ذرا سا آگے جا کر اس نے پوچھا "اب بتاؤ، کیا کرنا ہے، پولیس کو اطلاع......"

"پاگل ہو گئے ہو۔ بھول جاؤ کہ کچھ ہوا تھا۔ تم نے وہ لوگ دیکھے ہی نہیں۔" نینا نے تیزی سے کہا۔

"وہ لوگ......" وہ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سڑک سے اٹھایا ہوا سیل فون بج اٹھا۔ نینا نے وہ فون اٹھایا اور کال رسیو کر کے اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے کوئی بولا

"اوئے ہاں، کیا بات ہے۔ کام ہو گیا؟"

"ہاں ہو گیا۔" اس نے گمبھیر لہجے میں آواز بدل کر کہا

"یہ تمہاری آواز کو کیا ہوا؟" دوسری طرف سے حیرت بھری آواز میں پوچھا گیا۔

"وہ آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دی ہے میں نے، جسے تم سننا چاہتے ہو۔ صرف وہی نہیں باقی تینوں بھی مار دیئے ہیں، جیسے آوارہ کتے مارتے ہیں، بالکل ویسے۔" اس نے نفرت سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کیا؟ کون ہو تم؟" گھبراہٹ میں پوچھا گیا تو نینا نے کہا۔

"میں...... گولی...... جو بہت جلدی مٹھن خان کے بھیجے میں اُتر جانے والی ہے۔ کہہ دینا اس بے غیرت سے۔"

"گولی......؟" حیرت سے پوچھا گیا۔

"ہاں گولی، بتا دینا مٹھن خان کو آج کے بعد وہ سکون کی نیند نہ سوئے، تم بھی اُس کے کتے ہو، اور میں تم سب کی موت ہوں۔" اس نے نفرت سے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے سڑک کو گھور رہی تھی جبکہ شعیب پاگلوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اب اس فون کا کیا کرنا ہے؟ پتہ ہے، اس فون سے ہم ٹریس بھی ہو سکتے ہیں۔" شعیب نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"جانتی ہوں، تم نہیں، جس کے پاس یہ فون ہو گا، ٹریس وہ ہو گا، میں مٹھن خان سے رابطہ چاہتی ہوں، وہ اسی پر کال کرے گا۔" وہ سرد سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو شعیب کی آنکھوں میں خوف اتر آیا اس نے سر جھٹکتے ہوئے تیزی سے کہا۔

"یہ تو نری خودکشی ہے نینا، میں......"

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

احساس

سید وجاہت علی

وہ ایک ایسے معاشرہ میں یک و تنہا تھا جہاں اسلام کے بارے میں لوفی خیالات اور احساس رکھتے تھے جہاں طاقت اور دولت ہی سب کچھ تھی۔

جاہلیت کی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشن چراغ بن جانے والے نوجوان کی روداد۔

وہ تینوں خاصے لحیم شحیم تھے اور ان میں سے دو کے ہاتھ میں ریوالور تھے، جو علی کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔

وہ مارکیٹ سے واپس آ رہا تھا کہ ایک گلی میں اس کا سامنا ان سے ہو گیا۔ تینوں اچانک ہی کہیں سے نکل آئے تھے۔ یہ مشرقی سمت میں لندن سے متصل علاقہ ٹاور ہیم لیٹس تھا۔ اس کے جنوب میں دریائے ٹیمز بہتا تھا۔ ٹاور ہیم لیٹس میں مسلمانوں کی خاصی آبادی رہائش پذیر تھی۔ اگرچہ مارکیٹ اور علی کے گھر کا درمیانی راستہ بڑا محفوظ تھا لیکن پھر بھی کبھی کبھی چھینا جھپٹی کی وارداتیں ہو جاتی تھیں۔ بگڑے ہوئے نوجوانوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے گینگ بنا رکھے تھے۔ وہ اپنا جیب خرچ نکالنے یا اپنی عیاشیوں کو پورا کرنے کے لیے لوگوں کو لوٹتے تھے۔ لٹ جانے والے شخص کو کچھ نہ کہتے تھے۔ انھیں صرف پاؤنڈز سے یا ایسی چیزیں جن کو بیچ کر پاؤنڈز ہاتھ آ سکیں، سروکار تھا، تاہم اگر مزاحمت پر انھیں طیش آ جاتا تھا تو جھنجلا کر فائر کھولنے میں انھیں کوئی جھجک نہیں تھی۔ قتل کی ایسی ایک دو وارداتیں ہو بھی چکی تھیں اس لیے لوگ چپ چاپ لٹ جایا کرتے تھے۔ چند سو پاؤنڈ کے لیے کون اپنی زندگی خطرے میں ڈالتا؟

اسی طرح کے کچھ گینگز ٹاور ہیم لیٹس کے آس پاس بھی پائے جاتے تھے۔ ایسے ہی کسی گروہ کے ان تین لڑکوں نے علی کو گھیرا ہوا تھا۔ عمریں بائیس چوبیس سال کے درمیان میں رہی ہوں گی لیکن تینوں اتنے کسرتی جسم کے تھے کہ کوئی ان میں کسی ایک سے بھی نبرد آزمائی کرنے سے قبل سوچ میں ضرور پڑ جاتا، کجا یہ کہ ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ ایک لڑکے کے گلے میں موٹی سی چین پڑی ہوئی تھی۔ وہ ریوالور نکال کر علی کے دائیں طرف آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ دوسرے فرد نے اپنے ہاتھ میں بغیر انگلیوں کے سیاہ رنگ کے دستانے چڑھائے ہوئے تھے لیکن اس کے پاس موت اگلنے والی وہ چھوٹی سی مشین نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے علی کو بائیں طرف سے گھیر لیا۔ تیسرے نے جو اپنے سر پر کیپ ترچھا کر کے لگایا ہوا تھا، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ہاتھ میں اعشاریہ بائیس بور کا پستول چمک رہا تھا۔

چین پہنے ہوئے شخص نے ریوالور علی کے پہلو سے لگا دیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ”اپنی جیبیں خالی کر دو ورنہ یہ گولیاں تمھیں چاٹ جائیں گی۔“ درشتی کے ساتھ اس کے لہجے میں اکھڑ پن بھی نمایاں تھا۔ علی خود بھی تن سازی کرتا تھا اور کراٹے میں بھی مہارت تھی لیکن وہ چند پاؤنڈز کی خاطر رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

اس کی جیب میں تین سو پاؤنڈز اور سیل فون تھا۔ تلاشی لینے والے نے دونوں چیزیں نکال کر ترچھی کیپ والے کے حوالے کر دیں۔ وہ شاید ان کا سرغنہ تھا۔ اسی لیے پاؤنڈز اور سیل اس کو دیے گئے تھے۔

”لڑکا سیدھا سادا ہے ٹونی... مجھے بہت ترس آ رہا ہے اس کو لوٹتے ہوئے ý ...“ تلاشی لینے والے نے سامنے کھڑے ٹونی سے کہا۔ اس کا لہجہ مذاق اڑاتا ہوا معلوم دے رہا تھا۔ ”اس کو جانے دے یار... اس کی چیزیں واپس کر دے۔“

ٹونی نے جواب دینے کی بہ جائے علی کو دستی گھڑی اتارنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کچھ کہے بغیر گھڑی اتار دی۔ ٹونی نے دوبارہ اپنی انگلی سے واپس مڑ جانے کا کنایہ دیا۔

وہ ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ اس کو ٹونی کا قہقہہ سنائی دیا جس میں نفرت اور حقارت محسوس کی جا سکتی تھی۔

”نہیں کارلائل... یہ مسلمان بھولے بھالے نہیں ہوتے۔“ وہ شاید علی کی گھنی داڑھی، جو اس پر بڑی خوب صورت معلوم ہوتی تھی اور ٹخنوں سے اوپر جینز دیکھ کر اس کے مسلمان ہونے کا اندازہ لگا چکا تھا۔ ”اندر سے یہ پکے دہشت گرد ہوتے ہیں۔ انھیں جب موقع ملتا ہے، دہشت گردی کر جاتے ہیں۔ پوری دنیا کو انھوں نے پریشان کر رکھا ہے مگر ابھی تو الٹا اس پر ہماری دہشت طاری ہو چکی ہے... ہاہاہاہا ý ...“ جملے کے اختتام پر اس نے پھر قہقہہ لگایا تھا اور اب اس کی ہنسی میں کارلائل اور اس کا ساتھی بھی شریک ہو گئے تھے۔ یہ طنز علی کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ معاملہ صرف مال کرنسی تک محدود تھا، تو یہ اتنی قابل اعتراض اور قابل مزاحمت حرکت نہیں تھی لیکن اب انھوں نے پوری قوم، پوری ملت کو ٹارگٹ کیا تھا۔ اس طنز کو پی جانا علی کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔ یک دم وہ ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس طرح رکتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے وہ بھی چونک گئے۔ شاید انھیں یہ توقع نہیں تھی۔ وہ ان کی طرف مڑ گیا اور واپس اسی جگہ آ کے اس نے کہا۔

”اس حقیقت سے سب ہی واقف ہیں کہ اصلی دہشت گرد کون ہے؟ جن کی آنکھوں پر تعصب کی موٹی چربی چڑھی ہوئی ہے، صرف انھیں ظالم اور مظلوم میں فرق نظر نہیں آتا۔“

”واپس مڑ جاؤ“ ٹونی نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”ورنہ کبھی واپس نہیں جا سکو گے۔“ ”تم مسلمانوں سے مجھے نفرت ہے۔ دنیا کا امن و سکون تم لوگوں نے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔“

”ہم تو خود مظلوم ہیں۔ دنیا کا امن ہم نے نہیں بلکہ ان عالمی قزاقوں نے تباہ کیا ہے جو عدل و انصاف کا نظام قائم ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ جن کے لیے دنیا میں امن کا پنپ جانا ایک بھیانک خواب ہے۔ جن کو روشنیوں سے نفرت اور اندھیروں سے محبت ہے۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی تیزی سے چل رہا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، سیکنڈوں میں کرنا تھا اور بہت کاری

گری سے کرنا تھا۔ وقت اور مہارت کی ذرا سی بھی خطا کی قیمت اس کی زندگی ہو سکتی تھی کیوں کہ گینگو کے لٹیرے مزاحمت کی صورت میں بے رحم ثابت ہوتے تھے۔ سفاکی اور درندگی پر اتر آتے تھے۔ ان سے بھڑ جانا بہت پر خطر تھا لیکن علی یہ آفت مول لینے پر تیار ہو چکا تھا۔ ٹونی کے الزام کا جواب دیتے ہوئے اس نے تینوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تھی اور جملے کے آخری لفظ پر آیا تو ان سے نبٹ لینے کی ترتیب بنا چکا تھا۔ اسے رکتا اور واپس آتا دیکھ کر وہ پہلے ہی ہوشیار ہو رہے تھے اور اب مزید ایک لمحے کی تاخیر کا مطلب یہ تھا کہ اچانک اور سرعت سے ان پر حملہ کرنے کے امکانات کم ہو جاتے۔ اسے ان سے مقابلہ کیے بغیر واپس جانا پڑتا یا شکست کھانے کے لیے تیار ہونا پڑتا۔ دیر سے حملہ کرنے کی صورت میں وہ انھیں بے خبری میں نہیں چھاپ سکتا تھا۔ جیسے ہی علی نے اپنا جملہ پورا کیا' اس نے بائیں طرف کھڑے اس لڑکے کی کلائی پر اپنا ہاتھ رکھا' جس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا اور کارلائل کی طرف ایک زوردار جھٹکا دیا۔ وہ خاصا جان دار تھا لیکن علی نے مخصوص تیکنیک سے دھکا دیا تھا۔ وہ کارلائل سے جا ٹکرایا اور دونوں گلے ملتے ہوئے زمیں بوس ہو گئے۔ اس کا ایک ہاتھ کارلائل کے گرد لپٹ گیا تھا۔ اس اثناء میں ٹونی کو کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وہ اگر فائر کرتا تو گولی سے اس کا اپنا ساتھی شکار ہو سکتا تھا۔ علی کی جیب میں ایک ناخن تراش تھا جس کو تلاشی کے دوران میں کار لائل نے بے قیمت سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ ٹونی کے فائر کرنے سے قبل ہی علی نے وہ ناخن تراش پوری قوت سے اس کی پیشانی پر کھینچ مارا۔ کراٹے کے فن میں کسی معمولی چیز سے ایک جان لیوا ہتھیار کا کام لیا جا سکتا ہے۔ ضرورت رفتار اور طاقت کے درست استعمال کی ہوتی ہے۔ اگر لڑنے والا اپنے پورے جسم کی قوت کو ایک نکتے پر جمع کر سکتا ہے تو پھر ایک ہلکی سی چیز بھی ایک خوف ناک ہتھیار میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ اس وقت اسی گر کو کام میں لایا تھا۔ ناخن تراش سر سے ٹکراتے ہی ٹونی کے منہ سے سسکی نکلی۔ اس کے اٹھائیس طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ بھول ہی گیا کہ اس کے ہاتھ میں پستول ہے اور اب وہ اس پوزیشن میں ہے کہ علی پر فائر کھول سکے کیوں کہ گولی اس کے ساتھی کو لگنے کا اندیشہ نہیں تھا مگر ناخن تراش کی چوٹ نے اس کو بوکھلا کے رکھ دیا۔ ٹونی کے دونوں ہاتھ لاشعوری طور پر اپنے سر پر گئے۔ اس لمحے کا علی نے فائدہ اٹھایا اور اس پر عقاب کی مانند جھپٹا۔ اس نے ٹونی کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور بائیں ہاتھ اور بازو سے اس کی گردن کے گرد حلقہ بنا لیا۔ ادھر کارلائل اور اس کا دوست سنبھل چکے تھے۔ کارلائل نے اپنا ریوالور اٹھایا تھا لیکن جب اس نے موت کے کھلونے کا رخ علی کی جانب کیا تو ٹونی کو اس کی گرفت میں دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ علی نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ ان کو اسی صورت میں بے بس کر سکتا ہے کہ ٹونی کو قابو کر لے۔ اس کی زندگی پر موت کے سائے دیکھ کر وہ لاچار ہو جاتے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ کارلائل کا ریوالور علی کی جانب اٹھا ہوا تھا لیکن ٹونی کی گردن کو اس نے الٹے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا جس کی گرفت تنگ سے تنگ ہوتی جا رہی تھی اور ٹونی کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ علی نے دائیں ہاتھ سے پستول اس کی کنپٹی سے لگا رکھا تھا۔

"آگے بڑھنے یا مجھ پر فائر کرنے کی غلطی مت کرنا۔" علی نے سرد لہجے میں کہا۔ "ورنہ میرے ساتھ جو ہو سو ہو' اس پستول کی گولی ٹونی کی کھوپڑی کو چٹخا دے گی۔"

کارلائل شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے اپنے برابر میں کھڑے ساتھی اور پھر ٹونی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے۔ ٹونی نے اس کو اشارہ کیا کہ علی کی بات مان لے۔

"کیا چاہتے ہو تم.... ؟؟" کارلائل نے اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اب بھی اکڑ باقی تھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ٹونی کو خطرے میں دیکھ کر رک گیا ہے۔ بہ صورت دیگر وہ

پے در پے علی پر فائر کرتا چلا جاتا۔

"میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ تمھاری ہدایت پر عمل کیا تھا۔" علی نے پر سکون مگر بہ دستور برفیلے لہجے میں کہا۔ "لیکن ٹونی نے میری قوم اور اجتماعی وجود پر طعنہ زنی کی جس کو پی جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اب یہ میرے قابو میں ہے۔ میں چاہوں' اس کے دماغ میں گولیاں اتار سکتا ہوں۔ مجھے یہ پروا نہیں ہوگی کہ جواباً تم مجھ پر فائر کھولتے ہو یا نہیں؟ لیکن کسی کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فعل ہمارے دین میں پسندیدہ نہیں ہے۔ تم اپنا ریوالور گرا دو' میں خاموشی سے چلا جاؤں گا۔ تم لوگ شکست کھا گئے' یہ ہی میرے لیے بہت ہے۔ یہ ہی تمہارے طنز کا جواب ہے۔ اور اگر تم مجھ پر اپنا ریوالور خالی کرنا چاہتے ہو تو ساتھ ہی اپنے دوست کو دوسری دنیا کے سفر کے لیے

الوداع کہہ دو۔"

کارلائل دوبارہ تفکر میں پڑ گیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کو مشورہ طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"اس کی بات مان لو کار" ٹونی نے بہت دقت سے اسے تاکید کی۔ "بازی ہمارے ہاتھ میں نہیں رہی۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ انگز تم جیتے" کارلائل نے ایک گہرا سانس لیا" لیکن آئندہ کبھی تمھارا ہم سے ٹکراؤ ہوا تو اس دن کو یوم آخر تصور کرنا۔" اس کے ساتھ ہی اس نے ریوالور دور پھینک دیا۔

"گڈ۔" علی مسکرایا۔ اب ایک طرف ہو جاؤ۔" میں کچھ دور جا کے ٹونی کو چھوڑ دوں گا۔"

وہ ایک طرف ہو گئے۔ علی ٹونی کو لے کر دھیرے دھیرے محتاط انداز میں آگے سرکنے لگا۔ اس کا دھیان ٹونی پر بھی تھا کہ وہ کوئی حرکت نہ کر بیٹھے۔

یکایک غیر متوقع طور پر سائرن کی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ چاروں ہی حیرت زدہ رہ گئے۔ جو کچھ ہوا' منٹوں میں ہوا اور پھر ٹونی اینڈ کو کے خیال کے مطابق انھوں نے علی کو لوٹنے کے لیے ایک ویران جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ وہاں سے لوگوں کا گزر ہوتا تھا' نہ پولیس عموماً ادھر گشت کرتی تھی۔ پولیس کو کیسے خبر ہو گئی؟ اور اتنی جلدی وہ آ بھی گئی؟ معاً ان کی نظر گلی کے کونے پر پڑی۔ وہاں کچھ لوگ جمع تھے اور ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یقیناً ان میں سے ہی کسی نے ان کی زور آزمائی دیکھ کر پولیس کو اطلاع کر دی تھی اور غالباً کسی وجہ سے موبائل کار آس پاس ہی گھوم رہی ہوگی چناں چہ... اب وہ سائرن کا شور سن رہے تھے۔ ٹونی علی کی گرفت میں تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ بھی مجبور تھے۔ وہاں سے بھاگ نہیں سکتے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد گلی میں موبائل کار آ پہنچی۔ گلی کے اختتام پر کھڑے تماش بین بھی قریب آنے لگے۔ موبائل کار میں ڈرائیور کے علاوہ ایک سارجنٹ اور دو کانسٹیبل تھے۔ وہ کار سے اتر پڑے۔

"کیا ہو رہا ہے یہ... ؟؟" سارجنٹ نے ان چاروں کو باری باری گھورتے ہوئے تیز آواز میں پوچھا۔

"یہ شخص ہمیں لوٹنا چاہتا تھا۔" کارلائل نے علی طرف اشارہ کیا۔ "اس نے پستول کے زور پر ہمارے ساتھی کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ یہ ہمیں دھمکی دے رہا تھا کہ اپنی جیبیں الٹ دو ورنہ تمھارے دوست کے سر میں گولیاں اتار دوں گا۔"

"ہاہاہاہاہا علی نے ٹونی کو چھوڑتے ہوئے قہقہہ لگایا۔" مجھے امید نہیں تھی کارلائل کہ تم اپنے آپ کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے اتنا بودا بیان دو گے۔ کوئی شخص کتنا ہی دلیر ہو' محض لوٹ مار کے لیے اکیلا تین افراد سے' اور وہ بھی تم جیسے بلڈرز' ہرگز مقابلہ نہیں کرے گا۔"

"سر.. اس کے پاس دو ریوالور تھے.." کارلائل اسی طرح اعتماد کے ساتھ اپنے جھوٹے موقف پر قائم تھا۔ "شاید وہ یہ امید کر رہا تھا کہ علی مسلمان ہے لہذا پولیس کا عملہ کمزور دلیلوں کے باوجود ان کی حمایت کرے گا۔" "ہم نے مزاحمت کی اور ایک ریوالور چھین کر دور اچھال دیا لیکن دوسرے ریوالور کی وجہ سے یہ ٹونی کو یرغمال بنانے میں کامیاب ہو گیا۔"

"ہوں۔" سارجنٹ نے پر خیال انداز میں اس کی تائید کی۔ "تمہاری بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا فیصلہ بہر حال انسپکٹر ڈینیل کریں گے۔"

"سارجنٹ صاحب... وہ رہا مسٹر کارلائل کا ریوالور... آپ فنگر پرنٹس نکلوا کر میچ کر سکتے ہیں۔ اس پر آپ کو کارلائل کی انگلیوں کے نشانات ملیں گے۔ اگر یہ میرا ریوالور ہوتا تو اس پر میرے نشانات ہوتے۔ لیکن آپ کو اس پر میرا ایک بھی پرنٹ نہیں ملے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کارلائل یہ کہے کہ جب اس نے مجھ سے ریوالور لے کر دور پھینکا تو اس پر سے میری انگلیوں کے نشانات مٹ گئے اور کارلائل کے پرنٹس آ گئے۔ چلیں اگر یہ دعویٰ درست تسلیم کر لیا جائے تو میرے تین سو پاؤنڈز' سیل فون اور گھڑی ٹونی کی جیب میں ہے۔ اگر میں لٹیرا ہوتا' ان کی چیزیں میرے پاس ہونی چاہیے تھیں لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔"

علی کے دلائل مضبوط تھے۔ سارجنٹ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ ثانیے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"تم لوگ اپنے اپنے سٹانسز اسٹیشن پر پیش کرنا۔ فیصلہ انسپکٹر ڈینیل کریں گے... اور اس کار میں ویسے ہی جگہ نہیں ہے۔ ایک اور موبائل کار منگوانی پڑے گی۔" پھر اس نے اسٹیشن سے رابطہ کیا اور دوسری کار بھیجنے کی درخواست کی۔ اس کے بعد ایک کانسٹیبل کو دور پڑا ریوالور اٹھانے کی ہدایت کی۔ کانسٹیبل نے تعمیل کی اور ریوالور پر رومال ڈال کر اپنی تحویل میں لے لیا۔

وہ لوگ اسٹیشن پہنچے۔ انہیں انسپکٹر ڈینیل کے سامنے پیش کیا گیا۔ انسپکٹر ایک جاذب اور پر متانت شخصیت تھی۔ اس کی

عمر تیس اور پینتیس کے درمیان تھی۔ قد لمبا تھا اور رنگت خاصی سفید تھی اور لندن پولیس کی وردی اس پر جچتی تھی۔ سارجنٹ نے اسے واقعے سے آگاہ کیا۔ پھر اس نے علی اور ان تینوں کے منہ سے اس قضیے کو سنا۔ دونوں طرف سے تفصیل سننے کے بعد وہ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اس نے ایک طویل سانس لیا اور لب کھولے۔

"علی کے جملے کافی وزنی نظر آتے ہیں۔" علی واقعہ دہراتے وقت اس کو اپنا نام بتا چکا تھا۔ "تم لوگ ہی قصوروار ہو۔ تم نے اس کو لوٹا اور طنز بازی کی۔ تمہارے متعلق پہلے ہی شکایتیں آ رہی تھی۔ لٹ جانے والے لٹیروں کے جو حلیے لکھواتے تھے، تم اس پر فٹ آتے ہو لیکن تم لوگ ہاتھ آ کے نہیں دے رہے تھے۔ اب تم لوگ پھنس چکے ہو۔ تاہم مجھے شدید حیرت ہے کہ اس نوجوان نے اکیلے کیسے زیر کر لیا تمھیں؟ اس نے جو خطرہ مول لیا، اس کے لیے پہاڑ جیسا حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ میں داد دیتا ہوں۔" اس کے بعد وہ سارجنٹ سے مخاطب ہوا۔

"گریگ... تم ان تینوں کو لاک اپ میں لے جاؤ۔ یہ اب عدالت میں ہی جائیں گے لیکن پہلے میں چیف انسپکٹر کو رپورٹ کر دوں۔ یہ لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہیں اور چیف انسپکٹر ان کے ساتھ کوئی رعایت کرنے کی بہ جائے انھیں عدالت پہنچانا ہی پسند کریں گے۔" انسپکٹر ڈینیل کے ان الفاظ پر ان کے چہرے رات کے آخری پہر کے چراغ کی طرح بجھ گئے لیکن اس سے پہلے کہ سارجنٹ گریگ انھیں باہر لے جاتا، علی نے لب کھولے۔

"سر... اگر اس سے قبل یہ کسی بہت بڑے جرم میں ملوث نہیں رہے تو انھیں چھوڑ دیں۔ معاملہ اگر عدالت میں چلا جائے، پھر چھوٹے سے چھوٹا جرم بھی معاف نہیں ہونا چاہیے تاکہ معاشرے کے باقی افراد بے خوف نہ ہو جائیں لیکن اگر عدالت تک معاملہ نہ گیا ہو، مجرم شرمندہ ہو اور جس کے ساتھ زیادتی ہوئی، وہ دل سے معاف کرنے پر تیار ہو تو پھر معاف کر دینے میں حرج نہیں۔ انھوں نے مجھے لوٹنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں میرا دل صاف ہے۔ یہ میرے بھائیوں کی طرح ہیں۔ انھیں چھوڑ دیں انسپکٹر صاحب۔"

ٹونی اور اس کے ساتھیوں کے دل و دماغ میں نفرت اور غصے کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں مگر علی کے الفاظ کہ 'یہ میرے بھائیوں کی طرح ہیں' ایک نشتر کی طرح ان کے دلوں پر لگے جس نے طیش اور عداوت کے دبیز پردوں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ ایکا ایکی ہی ان کی سوچوں کا دھارا مخالف سمت میں بہنے لگا۔ قدرے ساکت ہو کے علی کو تکنے لگے لیکن انسپکٹر ڈینیل نے سارجنٹ گریگ کو دوبارہ حکم دیا کہ انھیں لاک اپ میں لے جائے۔ یہ آرڈر انسپکٹر نے دوبارہ دیا تھا۔ اب سارجنٹ اپنے افسر کی ہدایت پر عمل کرنے میں مزید تاخیر نہیں کر سکتا تھا چناں چہ علی کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر وہ انھیں باہر لے گیا۔

ان کے جانے کے بعد انسپکٹر ڈینیل گویا ہوا۔

"میں شرمندہ ہوں کہ ان لڑکوں نے تمھارے ساتھ راہزنی اور طعنہ زنی کی۔ میں واقعی دل سے معذرت خواہ ہوں۔"

"ہر قوم اور مذہب میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں۔ آپ معذرت کرنے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔"

"شکریہ۔" پھر اس نے استفسار کیا۔ "چائے چلے گی؟"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں انسپکٹر صاحب..."

"یہ تکلف نہیں۔ میری عادت ہے کہ اپنے آفس آنے والے ہر شخص کو چائے ضرور پلواتا ہوں بہ شرط یہ کہ وہ مجرم نہ ہو۔"

اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کے آرڈر دیا۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے آفس کی دیواروں کے ساتھ لگے شیلفس کی طرف اشارہ کیا جس میں کافی ساری کتابیں سلیقہ مندی سے سجی ہوئی تھیں۔

"مجھے مطالعے کا شوق ہے۔ میں نے اسلام کے متعلق پڑھا ہے اور بہت گہرائی میں جا کے پڑھا ہے۔ مجھ پر اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ اسلام ایک خوب صورت ہی نہیں بلکہ برحق اور پوری زندگی کا دین ہے۔ میں نے بائبل کی وہ پیش گوئیاں بھی پڑھی ہیں جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہیں۔ مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی وہ آخری نبی اور آخری رسول ہیں جن کے آنے کی نوید ہمارے مسیح علیہ السلام اور دوسرے تمام نبیوں نے دی تھی۔ دل کے اس اطمینان کے باوجود اسلام قبول نہ کرنے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک یہ کہ اپنا آبائی مذہب چھوڑنا آسان نہیں۔" یہاں تک کہہ کر وہ رک گیا۔

"دوسرا سبب...؟؟" علی نے قدرے تجسس، بے تابی اور فکر سے استفسار کیا۔

"دوسرا سبب مسلمانوں کے اخلاق ہیں۔ میں نے مسلمانوں کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کیا ہے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے واقعات پڑھ کر اکثر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ کہتے ہوئے مجھے بہت صدمہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کی جھلک بھی نہیں ہے۔ امتی کے اخلاق نبی جیسے ہونا ناممکنات میں سے ہے لیکن امتی کو اپنے نبی کے اخلاق اپنانے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے مگر مسلمانوں نے کوشش بھی نہیں کی۔" انسپکٹر ڈینیل خاموش ہو گیا۔

علی اس کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا تھا۔ پہلے پہل اسے حیرت اور خوشی ہوئی تھی کہ انسپکٹر ڈینیل نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کا مطالعہ کیا ہوا ہے مگر مسلمانوں کے اخلاق کے متعلق انسپکٹر کے تبصرے نے اسے رنجیدہ کر دیا تھا۔ بیان غلط تو نہیں تھا۔ اس کا کہنا صد فی صد درست تھا۔ جو اس نے کہا، وہ ناقابل انکار اور ناقابل تردید تھا۔ یہ مسلمانوں کا اخلاقی زوال ہی ہے جس نے غیر مسلموں پر اسلام کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔

"آپ کی رائے سے مجھے اتفاق ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ آپ نے مسلمانوں کی اخلاقی حالت بیان کرتے ہوئے بہت نرم الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ویسے تو مسلمان دین کے ہر شعبے میں ہی بے عمل ہو چکے ہیں لیکن اخلاقیات میں وہ پست ترین سطح پر آ گئے ہیں۔ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی حیات، گھریلو معاملات ہوں یا معاشرتی مسائل، سیاست ہو یا معاش و تجارت، ہر جگہ ان کا طرز عمل اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے برعکس ہے۔ جھوٹ، بددیانتی، چوری اور چور بازاری، دھوکا دہی، خیانت اور کرپشن، سود اور زنا و بے حیائی، لہجے کی تلخیاں اور بے پروائی... کون سی ایسی برائی ہے جو مسلمانوں میں نہیں پائی جاتی؟؟ آج اگر کوئی شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، اس لیے نہیں کہ وہ کسی مسلمان سے متاثر ہوا اور اس نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا بلکہ شاید اللہ کو اس کی کوئی نیکی پسند آ جاتی ہے اور اللہ اسے کسی ذریعے سے ہدایت کے راستے پر چلا دیتا ہے۔ آج بھی لوگوں کی ایک بڑی تعداد سرعت سے اسلام کی طرف آ رہی ہے اور اس تناسب میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن جس طرح اسلام کا ایک ایک پہلو روشن، فطری اور اتنا برحق ہے کہ دل بے ساختہ اس کے سچے ہونے کی گواہی دینے لگتا ہے تو اس پیمانے پر یہ تناسب بہت کم ہے اور اس نقصان کے ذمے دار وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے ہیں۔ انسپکٹر صاحب... مجھے بہت زیادہ حیرت اور اس حیرت سے کہیں زیادہ خوشی ہے کہ آپ نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے بارے میں پڑھا ہے اور آپ پر اسلام کا حق ہونا واضح ہو گیا ہے لیکن اگر آپ مسلمانوں کی اخلاقی حالت کی وجہ سے تذبذب میں ہیں تو یہ آپ کی ہی نہیں ہماری بھی بدقسمتی ہے کہ ہماری وجہ سے ایک فرد کل کے بڑے دن کی تباہی سے نہیں بچ سکا۔" اتنا کہہ کر وہ ایک سیکنڈ کے لیے رکا۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہوا۔ اس نے چائے ٹیبل پر لا کے رکھ دی اور باہر نکل گیا۔ انسپکٹر نے علی کو چائے اٹھا کر دی۔ علی نے 'شکریہ' کہہ کر کپ لے لیا اور ایک سپ لینے کے بعد دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔

"ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے متعلق ہر مذہب میں خوش خبریاں موجود ہیں۔ پرانا عہد نامہ، انجیل برناباس، انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل یوحنا، کتاب استثناء، کتاب

سو لفظی کہانی

بے اولاد

میں نے اپنے والدین کی قبر پر پھول ڈالے، فاتحہ پڑھی۔ جاتے وقت نظر ایک قبر پر پڑی جس پر اکثر گورکن کو پانی چھڑکاتے دیکھا تھا تجسس کے مارے گورکن سے پوچھا۔

"اس قبر پر کیا کوئی آتا نہیں؟"

گورکن بولا۔ "نہیں اس کے مرنے کے بعد شوہر نے دوسری شادی کر لی، والدین پہلے ہی مر گئے، اولاد کوئی تھی نہیں، چھ ماہ ہو گئے ہیں میں نے کسی کو آتے نہیں دیکھا۔"

میں نے قبر پر فاتحہ پڑھی رخسار پر آئے آنسو جلدی سے اپنے ہاتھ کی پشت سے صاف کیے کہ......

"یہ کہانی تو مجھے اپنی لگتی ہے۔"

ام حبیبہ

پیدائش، عیسائیت کی تقریباً ہر کتاب میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر موجود ہے۔ اہل کتاب کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے یہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

آپ بھی اہل کتاب میں سے ہیں تو آپ کو حق قبول کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جہاں تک آبائی مذہب کی بات ہے تو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسی ابن مریم علیہ السلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہر نبی اور رسول کا دین ایک ہی دین اسلام تھا۔ اب قیامت تک کوئی نبی، کوئی رسول نہیں آئے گا اور حشر قائم ہونے تک سب کے لیے ایک ہی دین، دین اسلام ہے۔ اگر آپ اس دین کو اختیار کرنے میں تامل کریں گے تو کل آپ کو روح اللہ سیدنا عیسی ابن مریم علیہ السلام کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑ جائے۔

انسپکٹر ڈینیل اس کی گفت گو سن کے دھیرے دھیرے سر ہلا رہا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی پرچ میں رکھ دی اور ایک لمبا سانس لیتا ہوا بولا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں تمھاری باتوں پر غور کروں گا۔"

چائے ختم ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد علی نے اجازت طلب کی۔

"اس عزت افزائی کا شکریہ۔ اگر آپ کے قیمتی وقت اور اپنے گھر والوں کے انتظار کا احساس نہ ہوتا، مجھے آپ کے ساتھ مزید وقت گزارنے میں خوشی ہوتی۔" وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ انسپکٹر ڈینیل نے بھی کرسی چھوڑ دی اور ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ اگر کبھی ملنا چاہو تو میرے آفس اور یہیں قریبی رہائش گاہ... دونوں کے دروازے کھلے ہیں۔"

پھر جب وہ دونوں باہر نکل رہے تھے، علی نے ٹونی اور اس کے ساتھیوں سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انسپکٹر ڈینیل اسے لاک اپ تک لے گیا۔ اس نے سارجنٹ گریگ کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ تینوں انھیں وہاں دوبارہ دیکھ کے کچھ حیرت زدہ ہوئے۔

"اگر آپ انھیں چھوڑ دیں انسپکٹر صاحب تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔"

انسپکٹر ڈینیل نے ایک نظر ان تینوں پر ڈالی۔

"علی نے دوبارہ اس خواہش کا اظہار کیا ہے چناں چہ اب اس گزارش کو رد کرنا میرے لیے مشکل ہے۔" پھر اس نے سارجنٹ گریگ کو لاک اپ کا دروازہ کھولنے کو کہا۔ سارجنٹ نے دروازہ کھول دیا۔ وہ لاک اپ سے نکل آئے۔ تینوں علی کے نزدیک آ گئے۔

"ہمیں بہت شرمندگی ہے کہ ہم نے تمھیں لوٹنے کی کوشش کی۔ ہمیں معاف کر دو۔" کارلائل کے لہجے سے ندامت ٹپک رہی تھی۔

"نہیں۔ افسوس مجھے ہے کہ ٹونی کو میرے ہاتھ سے چوٹ کھانی پڑی۔" علی نے ٹونی کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ "لیکن میری مجبوری تھی۔"

"غلطی ہماری تھی اور سب سے زیادہ قصور میرا ہے کہ میں نے تمھارے جذبات کو بھی زخمی کیا۔" ٹونی نے علی کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہم تینوں اور خاص طور میں معافی چاہتا ہوں... پلیز۔"

"ہم نہ صرف تمھاری بہادری بلکہ اعلی ظرفی کے بھی قائل ہو گئے ہیں۔" تیسرے ساتھی نے بھی اعتراف کیا۔ "یقیناً مسلمانوں کے بارے میں ہمارے خیالات درست نہیں ہیں۔"

"اگر تم لوگوں کی سوچ میں اتنی تبدیلی بھی آ گئی ہے تو میرا جان پر کھیل جانا رائیگاں نہیں گیا۔" پھر اس نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالا۔

"یہ تین سو پاؤنڈ تم رکھو ٹونی۔ سیل فون کارلائل کے لیے اور یہ گھڑی میرے اس ساتھی کے لیے۔" اس نے گھڑی اتارتے ہوئے کہا۔

"ہمیں مزید شرمندہ نہ کرو۔ ہمیں اب ضرورت نہیں ان چیزوں کی۔"

"نہیں۔ یہ تمھیں رکھنا ہی پڑیں گی۔" اس نے زبردستی انھیں پاؤنڈز، سیل اور گھڑی تھما دی۔ اس کے بعد علی نے دوبارہ لباس میں ہاتھ ڈالا۔ ہاتھ باہر نکالا، اس میں کچھ پاؤنڈز نظر آئے۔

"یہ ڈیڑھ ہزار پاؤنڈز ہیں۔ میں عموماً اتنی رقم لے کر باہر نہیں نکلتا لیکن آج ایک ضرورت کے تحت ساتھ رکھنی پڑی مگر یہ پاؤنڈز ایک خفیہ جیب میں تھے۔ کارلائل ڈھونڈ نہیں پایا تھا مگر اب ان کو تم تینوں آپس میں تقسیم کر لو۔" وہ دوبارہ ششدر رہ گئے۔ پہلے اس نے انھیں لاک اپ سے نکلوایا۔ پھر لوٹ کا مال بھی ان کو واپس کر دیا۔ اور اب وہ ایک بڑی رقم ان کو دے رہا تھا۔ انھیں علی کے اس فعل پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"ہمیں تعجب ہے کہ ہم نے تمھیں لوٹنے کی کوشش کی اور تم ان چیزوں کے علاوہ مزید پاؤنڈز ہمیں دے رہے ہو۔ ہمیں سخت حیرت اور ندامت ہے۔"

"ہمارے دین میں سخاوت کی بہت تحسین اور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ جو لوگ ہم سے قبل گزرے ہیں، تم ان کی فیاضی کے واقعات سن لو تو انھیں ناقابل یقین تصور کرو گے۔ یہاں میری اچھی جاب ہے۔ یہ میری اس ماہ کی تنخواہ ہے لیکن مجھے خوشی ہوگی اگر تم اس کو قبول کر لو۔"

"ہمیں یہ واقعہ بھی خواب محسوس ہوتا ہے۔ یہ تمھاری رواں مہینے کی سیلری ہے۔ اس کو اپنے پاس رکھو۔" کارلائل نے اصرار کیا۔ "اگلا مہینہ ابھی دور ہے لیکن اگر پہلی تاریخ کل بھی ہوتی، ہم اسے نہیں لیتے۔ ہمیں مزید شرمندہ نہ کرو۔ جیب میں ڈالو ان پاؤنڈز کو۔ تم اٹھائیس دن بغیر تن خواہ کے کس طرح گزارا کرو گے؟"

"ہم اللہ کو صرف اپنا خالق ہی نہیں بلکہ اپنا رب بھی مانتے ہیں۔" علی کہنے لگا۔ "وہ اللہ جس نے ہمیں صرف پیدا ہی نہیں فرمایا بلکہ پیدائش سے لے کر موت تک ہمیں کھلاتا پلاتا ہے۔ وہ اللہ جو آسمان کی ہر مخلوق کو، زمین کی ہر مخلوق کو، خشکی والوں کو سمندر والوں کو سب کو ان کی ضروریات کے مطابق رزق دیتا ہے۔ وہ اللہ جس کا کوئی وزیر مشیر نہیں اور وہ تن تنہا اس پوری کائنات کا شہنشاہ ہے۔ وہ اللہ، جس کے خزانے لامحدود ہیں۔ ہم سمندر میں سوئی ڈال کر نکالیں تو سمندر کے پانی میں اتنی کمی آ جاتی ہے کہ اس کا کچھ پانی سوئی پر لگنے کی وجہ سے کم ہو جاتا ہے لیکن اللہ کے خزانے اتنے لامحدود ہیں کہ وہ ہر ہر جان دار کو اس کی خواہش کے مطابق نواز دے، پھر بھی اس کے خزانوں میں اتنی کمی بھی نہیں آئے گی جتنی سوئی ڈالنے سے سمندر کے پانی میں کمی آ جاتی ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو ہوتا ہے، اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے غیر سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ پانی پیاس بجھانے میں اللہ کے حکم کا محتاج ہے، اللہ پیاس بجھانے میں پانی کا محتاج نہیں۔ کھانا بھوک مٹانے میں اللہ کے حکم کا محتاج ہے۔ اللہ بھوک مٹانے میں کھانے کا محتاج نہیں۔۔ ہر اچھی بری چیز فائدہ نقصان پہنچانے میں اللہ کی محتاج ہے۔ اللہ کسی کو فائدہ نقصان پہنچانے میں چیزوں اور اسباب کا محتاج نہیں۔ مجھے ان پاؤنڈز پر بھروسہ نہیں ہے۔ اگر اللہ چاہے

جائیں گے۔ اگر اللہ چاہے تو بغیر پاؤنڈز کے پورا مہینہ میرا گھر چل سکتا ہے۔ پلیز... تم یہ رکھ لو۔"

وہ تینوں، انسپکٹر ڈینیل اور سارجنٹ گریگ گم صم ہوئے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"خدا کی قدرت کے متعلق ایسی گفت گو ہم نے اب تک نہیں سنی۔ شاید ہماری دل چسپی نہیں تھی یا پہنچانے والوں کی کوتاہی تھی۔" ٹونی نے قدرے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے دوبارہ علی کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ "ہم اندھیروں کے مسافر ہیں۔ ہم نے تمھارے ساتھ جو کیا، اس پر ہمیں معاف کر دو علی۔"

"نہیں ٹونی... معافی کس بات کی؟؟ بلکہ معافی مجھے مانگنی چاہیے کہ میرے ہاتھ سے تمھیں زخم اٹھانا پڑا۔ اچھا چلو اگر تم میری دو شرطیں مان لو تو پھر حساب برابر سمجھ لوں گا۔"

"کیا...؟" تینوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

"پہلی، تم لوگ یہ ساری چیزیں اپنے پاس رکھو۔ دوسرے تم سب مع انسپکٹر ڈینیل اور سارجنٹ گریگ کسی روز میرے گھر لنچ یا ڈنر پر آؤ۔ میرا ایک دوست ہے زبیر... پاکستان سے آ رہا ہے۔ وہ عالم دین ہے۔ اس کے ساتھ ایک نشست رکھ لیں گے۔ اسلام سے متعلق جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، آپ زبیر سے ان کے متعلق سوالات کیجیے گا۔ ٹھیک ہے...؟؟"

"ہمیں دوسری شرط منظور ہے۔" ٹونی نے فوراً کہا۔

"جی نہیں۔ یہ دو شرطوں کا پورا پیکج ہے۔ آپ کو دونوں شرطیں ماننی پڑیں گی۔"

علی کے لہجے کی پختگی اور خلوص کی وجہ سے تینوں مجبور ہو گئے۔ انھوں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ادھر انسپکٹر ڈینیل جو اس ساری گفت گو میں خاموش رہا تھا، دل میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے اسلام قبول کر لینا چاہیے ورنہ کہیں کل حضرت عیسی ابن مریم علیہ السلام کے حضور شرمندہ نہ ہونا پڑ جائے۔

دیوار

کشف اقبال

حسد اور محبت کے جذبوں سے گندھی ایک خوب صورت کہانی
ایک دوشیزہ کا قصہ جس نے اپنی محبت حاصل کرنے کے لیے ایک
انوکھا راستہ اپنایا تھا

دسمبر کی [illegible] رات تھی [illegible] کا وقت تھا سکوت [illegible]

[illegible]

منت جواب دیے بغیر ڈھول بجا بجا کر جب سب لڑکیوں کی [illegible] گانوں کی [illegible] محفل ختم [illegible] گیت تھم گئے رقص ختم ہوئے ڈھول بند ہو گئے تو سب [illegible]

نیہاد کی شادی [illegible] گفتگو کرنا شروع ہو گئے۔

"بیٹا دیکھو اب [illegible] ہو گیا ہو گا اس لیے تمہارے حق میں بہتر یہی ہو گا کہ اب تم منت سے ملنا اس سے باتیں کرنا بند کر دو ایک مہینے کی ہی تو بات ہے میری جان پھر تو تم دونوں نے ایک ہی ہو جانا ہے تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟" نسیم بیگم اپنے بیٹے کے پاس بیٹھ کر جو مرکزی صوفے پر کشتی کرتا بیٹھا تھا۔ رواجوں سے آگاہ کرنے لگیں۔

"امی میں ان روایتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ چلیں میں آپ کی بات رکھ لیتا ہوں پر صرف ایک دو بار ملنے کی اجازت دے دیجیے گا پلیز۔" نیہاد اپنی ماں کو منانے کی بھرپور کوشش میں لگا ہوا تھا وہ جانتا تھا اس کی ماں ماڈرن سوچ کی حامل ہیں تھوڑا بہت اصرار پر مان جائیں گی پر ایسا ہو نہ ہو سکا۔

"ہرگز نہیں میں دسمبر کی ستائیس تاریخ تک تمہیں اس سے ملنے یا بات کرنے نہیں دوں گی فون پر بات کرنے کی اجازت تو دے دیتی ہوں پر ملنے کی اجازت، ہرگز نہیں تمہاری پسند کو میں نے تسلیم کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہاری ہر غلط بات مانوں، اماں آپ ہی سمجھائیں نا اسے۔" ماں بیٹے کی گفتگو نیہاد کی اماں (دادی) کے ساتھ ساتھ پورا خاندان بڑی رغبت کے ساتھ سن رہا تھا۔

"تم اسے چھوڑو، یہ تو ہے ہی باؤلی، ایسی کوئی رسم نہیں اور ویسے بھی تو تم تو مجھے جانتے ہو میں کہاں ان دقیانوسی رسموں کی پابند ہوں تم فکر مت کرو، تمہاری جوان دادی ابھی زندہ ہیں۔"

اماں پوتے کے کانوں میں کھسر پھسر کر رہی تھیں کہ نسیم بیگم نے اماں کو مصنوعی چالاکی سے گھورا۔

"م۔۔۔ م۔۔۔۔ میں تو گلطو کو بس اتنی سی بات بتا رہی تھی کہ تمہاری اماں دقیانوسی رسموں کے بالکل خلاف ہوں پر خیر ہے، تم ملے نہ ملے میں تو ضرور ملنے جاؤں گی اس سے۔" اماں چپکے سے نیہاد کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں اور اماں کے اس رویے نے نیہاد کو اس حقیقت سے آشنا کر دیا کہ اس کی اماں کائنات کی سب سے اچھی دادی ہیں۔

……☆☆☆……

لڑکی والوں کے گھر ڈھولکی ختم ہوئی تو آدھا خاندان تو منت کے گھر ہی ٹھہر گیا منت کی جگری دوست زبرج بھی اپنی امی سے اجازت لینے کے بعد رات وہیں ٹھہر گئی۔

"کیا واقعی نیہاد کی دادی نے تم سے تنہائی میں ملاقات کرنے کے بارے میں کہا ہے؟" زبرج اور منت کمرے میں بیٹھی ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو میں محو تھیں۔

"ہاں ناں یار امی جان کے پاس فون آیا تھا، امی نے میرے حوالے فون کیا تو انہوں نے مجھ سے ملنے کے بارے میں کہا، زبرج تمہیں کیا لگتا ہے کہ انہوں نے مجھے اکیلے میں ملنے کا کیوں کہا؟ ان کے تو رویے سے بھی یہ

صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ غصے میں ہیں اور غصہ تو آنا بھی چاہیے انہیں، تمہیں یاد ہے آخری بار جب وہ ہمارے گھر شرارے کا ناپ لینے آئی تھیں تو غلطی سے میرے ہاتھ سے ان کے کپڑوں پر چائے گر گئی تھی، مجھے ڈر لگ رہا ہے یار۔ دادیاں تو ہوتی بھی پرانے خیالات کی ہیں انہیں اپنے پوتوں کے لیے پرفیکٹ اور سگھڑ بہو چاہیے ہوتی ہے اور میں نے ان پر چائے گرا دی؟" منت الجھی ہوئی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا کیا اس چائے والی حرکت کی وجہ سے نیہاد کی دادی یہ رشتہ ختم کر دیں گی؟ کیا منگنی کی انگوٹھی اسے واپس کر دیں گی، وہ اپنے آپ میں ہزاروں سوالات کرنے لگی کہ زبرج نے اسے جھنجوڑ کر بولا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا، اتنی سی بات پر بھلا کوئی رشتہ ختم کرتا ہے باؤلی ہو گئی ہو تم ویسے کب ہے ملاقات؟" زبرج اس کا ساتھ تو دے رہی تھی۔ مگر اندر سے وہ کیا تھی لیکن اسے وہ ظاہر نہیں کر رہی تھی۔

"کل ہے ملاقات۔" منت نے رونے والی شکل بناتے ہوئے کہا۔

"تمہیں تو میں نیہاد کا ہونے نہیں دوں گی میری جان، کتنی محبت کرتی تھی میں اس سے پر تم درمیان میں آ گئی یک طرفہ محبت تھی تو کیا ہوا، تھوڑا وقت لگتا وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگتا پر...... پر ایسا نہیں ہوا کیونکہ تم ہمارے بیچ دیوار بن گئی اور دیوار کو بلڈوزر کے ذریعے گرانا مجھے اچھی طرح آتا ہے منت، اب تمہاری شادی نہیں، رسوائی کے دن شروع ہونے والے ہیں۔" زبرج نے بظاہر اپنی جگری دوست کو دلاسہ دیتے ہوئے دل میں اسے برباد کرنے کے بارے میں سوچا۔

……☆☆☆……

"اماں کیا ضرورت تھی بے چاری سے یہ کہنے کی کہ آپ

اس سے اکیلے ملنے والی ہیں جبکہ آپ بھی یہ بات اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں بھی آپ کے ہمراہ جاؤں گا، کتنا ڈر رہی ہوگی وہ اس وقت نیہاد اور اماں نیہاد کے کمرے میں اکیلے تھے، جب نیہاد نے اماں پر خفگی ظاہر کی۔

''جا بات نہ کر مجھ سے ایک تو تمہاری مدد کر لی اور تم ہو کہ مجھ سے اس طرح سے بات کر رہے ہو، گھلو بیٹا میں نے یہ سب صرف خود کو محظوظ کرنے کے لیے کیا ہے آخر میرا بھی حق بنتا ہے اپنی ہونے والی بہو سے مذاق کرنے کا، ویسے میری ایکٹنگ کیسی تھی فون پر؟'' اماں کی یہ بات سن کر دونوں بے ساختہ ہنس پڑے۔

''اماں آپ ہمیشہ میرے پاس رہیے گا، آپ نہ ہوتیں تو میری شادی آج منت کے ساتھ نہ ہو رہی ہوتی، آپ نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے امی کو منانے میں، میں آپ کا بہت مشکور ہوں میری زندگی میں آگے کوئی بھی مسئلہ ہوا تو میں سب سے پہلے آپ کے پاس ہی آؤں گا کیونکہ میری اماں کے پاس ہر مرض کا علاج ہے؟'' نیہاد نے اماں کے گال دباتے ہوئے کہا تو اماں بھی اپنی تعریفیں سن کر لال پڑ گئیں۔

''لگا لیا مسکا، اب سو جا کل جانا ہے منت سے ملنے اور ہاں بدلے میں مجھے اسنیکرز کھلانا مت بھولنا تمہارے ماں باپ نے تو پابندی لگائی ہوئی ہے ویسے بھی میٹھے پر۔'' اماں نے منہ بسورتے ہوئے بولا۔

''جی اماں کھلا دوں گا، پر زیادہ مت کھایئے گا آپ کی صحت مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔'' دونوں دادی پوتا سو گئے، تھوڑی ہی دیر بعد اماں نے نیہاد کو جو واٹس ایپ پر منت سے باتیں کرتے دیکھا تو ہاتھ مارتے ہوئے بولیں۔

''خبردار جو اسے بتایا کہ تم بھی اس سے ملنے جاؤ گے۔'' نیہاد نے اماں کے فرمان کی پوری طرح تقلید کی۔

……☆☆☆……

اگلی صبح منت کے گھر خاندان بھر کا ناشتہ منگوایا گیا۔

''کیا ہوا بیٹا؟ اتنی کھوئی کھوئی سی کیوں لگ رہی ہو؟ کہیں رخصتی کا غم ابھی سے تو نہیں لگ گیا؟'' عائشہ خالہ نے صبح صبح منت کو چھیڑنا شروع کر دیا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں خالہ میں تو بس ایسے ہی……!'' منت کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زبرج نے بولنا شروع کر دیا۔

''اصل میں یہ اپنی رنگت کو لے کر پریشان ہو رہی ہے ابھی تو اسے روز شاپنگ کرنے بھی جانا ہے اس لیے ڈر رہی ہے کہ کہیں رخصتی سے پہلے ہی رنگ نہ اڑ جائے۔''

''آج کل کی لڑکیوں کو رنگ کی کہاں پروا ہے اب تو سب کچھ بنا بنایا آگیا ہے کریمز، انجیکشنز وغیرہ ویسے حیات، شادی کے لیے کوئی بینکوئیٹ تلاش کیا تم نے۔'' ماڈرن لڑکیوں پر ایک طنز چھوڑتے ہوئے وہ منت کی ماں سے بولیں۔

''جی عائشہ باجی تین چار بینکوئیٹ دیکھے ہیں آج ان کے ساتھ فائنل کرنے جانا ہے۔'' دونوں بہنیں محو گفتگو ہوئیں تو اچانک منت کے موبائل کی چمکتی اسکرین پر اماں کالنگ کے الفاظ جگمگانے لگے۔

''السلام علیکم کیسی ہیں آپ؟'' منت شور و غل سے تھوڑا دور آ کر بات کرنے لگی۔

''وعلیکم اسلام جیتی رہو میں بالکل ویسی ہی ہوں۔'' اماں نے ایک بار پھر اپنی ایکٹنگ کرنا شروع کر دی۔

''تو پھر آ رہی ہوں نہ آج، بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے ٹھیک پانچ بجے گلوریا جینز؟'' ان کے رویے نے منت کو ایک بار پھر مشکوک بنا دیا۔

''ج…… ج…… جی ضرور آؤں گی۔'' منت ہچکچانے لگی، منہ سے آواز نکلنا بند ہو گئی۔

''تمہاری امی سے میں نے کل ہی اجازت لے لی تھی وہ منع نہیں کریں گی تمہیں آنے سے آنا ضرور ویسے بھی تمہارے ہاتھوں کی بنی چائے جو مجھے نصیب بھی نہیں ہوئی تھی میں بھولی نہیں ہوں۔

''خدا حافظ۔'' فون رکھتے ہی وہ اور نیہاد گلا پھاڑ کر ہنسنے لگے۔

''کیا ہوا منت، سب خیریت تو ہے ناں، کہاں بلایا ہے تمہیں اور کتنے بجے؟'' زبرج سوالات پوچھنے لگی پر منت سکتے کی حالت میں تھی۔

''وہ…… گلوریا جینز کیفے پر بلایا ہے آج شام پانچ بجے۔'' زبرج نے اس کے کندھوں کو جھنجوڑا تو منت کے ہوش ٹھکانے آئے۔

''گلوریا جینز پانچ بجے تو تیار ہو جاؤ منت، آج تمہاری موت ہے اگر موت نہ آئی تو کوئی بات نہیں، یہ حادثہ تمہیں اپاہج تو بنا کر ہی چھوڑے گا۔''

''اب تم کہاں کھو گئیں زبرج چلو میری مدد کرو کپڑوں کی سلیکشن میں آج کیا پہن کر جاؤں، تیار ہو کر جاؤں یا بس ہلکا پھلکا؟'' دونوں دوست باتیں کرتے کرتے اوپر منت کے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

زبرج منت کا ہاتھ بٹانے کے بعد اپنے گھر کی جانب نکل پڑی، پر گھر جانے سے پہلے اسے ایک بہت ناگزیر کام کرنا تھا۔

……☆☆☆……

''تنیم بیٹا برا مت منانا ایک بات کہوں تم سے؟'' تنیم بیگم نے جب اماں کی شاپنگ کی بات چھیڑی تو بھری محفل میں اماں نے اپنا منہ کھولا تنیم بیگم نے ہامی بھری تو اماں نے اپنی بات جاری رکھی۔

''جب باری میرے کپڑوں کی آتی ہے تو تمہاری چوائس بڑی بدذوق ہو جاتی ہے۔ اب میں اتنی بھی بوڑھی نہیں ہوئی کہ تم مجھے میرے پوتے کی شادی میں بھی مریضوں کے لباس والے رنگ کی ساڑھیاں پہنانے لگو، بھئی میں تو اپنے پوتے کی پسند کی ساڑھی پہنوں گی وہ بھی ڈیزائنر والی، بھاری ساڑھی نہ سہی پر کم از کم مریضوں والا پرنٹ ہرگز نہیں پہنوں گی، اسی لیے آج شام ہی میں نیہاد کے ساتھ زمزمہ جاؤں گی اور یہ ڈیسیژن فائنل ہے۔''

اماں کی باتیں سن کر سارا خاندان ہنس پڑا پورے خاندان کی رونق صرف اور صرف اماں تھیں اماں کا وجود مرکزی فانوس کا کام کرتا تھا جبکہ باقی لوگ تو صرف ٹیوب لائٹس کی حدوں تک محدود تھے۔

''اچھا اچھا چلی جایئے گا نیہاد کے ساتھ اور جو پسند آئے وہ اپنے لیے خرید لیجیے گا۔'' تنیم بیگم نے ہامی بھری تو اماں بھی جیسے کھلکھلا اٹھیں۔ انہوں نے ایک تیر سے دو نشانے لگائے تھے پہلا ڈیزائنر ساڑھی پہننا اور دوسرا نیہاد اور منت کی ملاقات کرانا۔

''واہ اماں آپ تو اب بھی اتنی، چالاک ہیں جوانی میں دادا نے آپ کو پھنسانے میں زیادہ محنت نہیں کی ہوگی۔'' اماں پوتے کی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔

''یہ میری تعریف کر رہا ہے یا بے عزتی، ایک بات سن لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اس سے ملاقات کر لو اور میری ڈیزائنر ساڑھی ہی بھول جاؤ۔'' اماں نے نیہاد نے ان کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

''نہیں بھولوں گا میری پیاری سی اماں۔'' نیہاد نے اپنی چالاک اماں کو تسکین دی۔

……☆☆☆……

''بھائی یہ تصویر دیکھ رہے ہیں ناں، شام چھ سات بجے کے قریب آپ نے اس لڑکی کے اوپر سے ٹرک گزارنا ہے آپ کی منہ مانگی رقم آپ کو مل جائے گی۔'' زبرج اپنے گھر سے تھوڑے فاصلے پر واقع ٹرک اسٹینڈ پر ایک ٹرک ڈرائیور سے گفتگو کر رہی تھی جسے منہ مانگی قیمت پر یہ غلط کام کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ ایڈریس اور تمام ضروری تفصیلات سے اسے آگاہ کرنے کے بعد وہ اپنے گھر چلی گئی پر گھر کے باہر کوئی تھا جو اس کا منتظر تھا۔

''کیا بات ہے میرا انتظار کر رہے تھے؟'' گاڑی سے اترتے وقت زبرج کی نظر ریشان پر پڑی جو بلیک جیکٹ پہنے اپنی ہیوی بائیک کے ساتھ زبرج کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔

''تمہارا انتظار تو برسوں سے کر رہا ہوں تم ہاں تو کرو، کیا خامی ہے مجھ سے آخر مجھے بتاؤ تو سہی تمہارے گھر والوں کو بھی اس رشتے سے کوئی مسئلہ نہیں پھر تمہیں کیوں ہے؟ زبرج پلیز مان جاؤ میں تمہیں بہت محبت دوں گا، بہت خوش رکھوں گا تمہیں۔'' ریشان نے اپنے دلی جذبات کا اظہار ایک بار پھر کیا پہلے بھی کافی مرتبہ کیا تھا پر زبرج اس کی کسی بھی بات میں دلچسپی نہیں لیتی تھی سوائے اس حقیقت کے کہ وہ نیہاد کا قریبی دوست ہے۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر والوں سے ہمارے رشتے کے بارے میں بات کرنے کی، تم کیوں نہیں سمجھتے کہ ہم صرف دوست ہیں، ریشان دیکھو پلیز اپنے دل و دماغ سے اس یک طرفہ محبت کا جنون نکال پھینک دو۔ ورنہ ہجر کے لمحوں کے سوا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔'' زبرج اب ریشان کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

''زبرج اپنے انکار کی وجہ تو بتاؤ یار۔'' ریشان کا دل رنجیدہ تھا پر وہ ناامید نہیں ہوا تھا۔

''میرے پاس کوئی وجہ نہیں۔'' زبرج ریشان پر چلا کر اپنے گھر کے اندر چلی گئی۔

''تم میرے پاس ضرور آؤ گی زبرج تمہیں دعاؤں میں مانگا ہے میں نے میری کوئی بھی عبادت تمہارے حصول کی دعا کیے بغیر مکمل نہیں ہوئی پھر تم مجھے کیوں نہیں ملو گی، تم مجھے ضرور ملو گی کیونکہ میری محبت پاک ہے بے غرض ہے۔'' اپنی آنکھوں کے گوشے سے آنسو صاف کرتا وہ اپنی بائیک پر بیٹھا واپس لوٹ گیا۔

......☆☆☆......

ٹھیک شام پانچ بجے منت گلوریا جینز کیفے پہنچ گئی جبکہ نہیاد اور اماں کو پہنچتے پہنچتے سوا پانچ بج گئے۔

''جاؤ مل آؤ اس سے میں یہاں گاڑی میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

گاڑی جیسے ہی اپنی منزل پر رکی تو اماں نے نہیاد سے دریافت کیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ، آپ نہیں ملیں گی اس سے؟ نہیں آپ کو بھی ملنا ہوگا اس سے، میں یہاں آپ کو اس لیے تھوڑی لایا کہ آپ صرف میری ملاقات کرائیں آپ نے بھی چلنا ہوگا میں آپ کے سامنے کروں گا اس سے ملاقات۔'' اماں کو دھمکی دیتا نہیاد گاڑی سے اتر کر اماں کی طرف کا دروازہ کھولنے لگا۔

''میں تو صرف اپنے گلو کا امتحان لے رہی تھی کہ آخر وہ اپنی بوڑھی اماں کو اہمیت دیتا ہے یا ہونے والی بیگم کو پر مجھے غلط ثابت کر کے ایک بار پھر تم نے میرا دل جیت لیا گلو۔'' اماں نہیاد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے ساتھ کیفے میں داخل ہونے لگیں۔

بے بی پنک کرتی اور سر پر سیاہ اسکارف لپیٹے منت ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی، اس نے جب نظریں اٹھا کر دیکھا کہ اماں کے ساتھ ساتھ اڈگو رنگ کی شرٹ میں ملبوس ان کا پوتا بھی اس کے پاس چل کر آ رہا ہے تو وہ ایک پل کے لیے ساکت ہوگئی، اماں کی تمام عیاری منت آہستہ آہستہ سمجھنے لگی۔

''السلام علیکم کیسی ہیں آپ؟ بیٹھیں ناں پلیز۔'' اماں کا استقبال کرنے منت اپنی نشست پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سر خم کیے ان کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''جیتی رہو، خوش رہو، بیٹھنے ہی آئی ہوں، اب کھڑے کھڑے تو تم سے ملنے سے رہی۔'' وہ مذاق کرتے کرتے منت کی برابر والی کرسی پر براجمان ہوگئیں اور نہیاد منت کی کرسی کے بالکل مقابل کرسی پر۔

''فون پر کافی ڈرا دیا تھا ناں تمہیں، مجھے معاف کر دو بیٹا فون پر میں نے صرف ایکٹنگ کی تھی ورنہ میں اس طرح کی دادی نہیں ہوں۔'' اماں نہیاد کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''معافی کیوں مانگ رہی ہیں آپ، آپ کا حق بنتا ہے مجھ پر آپ جس طرح نہیاد کی اماں ہیں اس طرح میرے بھی اماں ہیں۔'' منت کی نظریں صرف اماں پر تھیں وہ نہیاد کی طرف سرسری سی نگاہ ڈالنے کی کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔

''بیٹا تم اپنی نظر نہیں اترواتی، تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم پر کسی کی بری نظر ہے دیکھو بیٹا مجھے پرانے خیالات کا مت سمجھنا پر دیکھو میں نظر بندی، سفلی جادو پر بہت یقین رکھتی ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ نظر لگ جاتی ہے، سفلی کیا جاتا ہے اور تم پر کسی کی بری نظر ہے میرے پاس ابھی مرچیں ہوتیں تو ابھی تمہاری نظر اتار لیتی پر کوئی بات نہیں، گھر جا کر یاد سے اپنی نظر اتروا لینا اتنی خوب صورت ہو تم نظر لگانے والے بہت ہیں اس دنیا میں۔'' اماں کو منت کی آنکھوں میں کچھ عجیب سا دکھا تھا اس لیے وہ بولے بنا رہ نہ پائیں۔

''منت ہم زمزمہ جائیں گے ابھی اماں کی ساڑھی لینے اگر ہو سکے تو تم بھی ساتھ چل لو، اپنے لیے کچھ تم بھی پسند کر لینا۔'' اماں کی باتیں سن کر منت دہشت کے عالم میں آ گئی تھی اس لیے نہیاد نے اس کا دھیان کہیں اور بٹانا چاہا۔

''ارے ہاں میں تو بھول ہی گئی، منت میں اپنے پوتے کی شادی میں اپنی بہو کی پسند کی ساڑھی پہننا چاہوں گی، ساتھ چلو گی نہ میرے؟'' منت نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ تینوں چائے کافی لینے کے بعد وہاں سے رخصت ہونے لگے۔

''آیئے، آپ آگے بیٹھیں گی منت صاحبہ یہ جگہ ویسے بھی کچھ ہی دنوں میں آپ کی ہونے والی ہے۔'' اماں آگے کا دروازہ کھولے منت سے مخاطب ہوئیں۔

''کتنی اچھی ہیں آپ کتنا معصوم اور محنت کرنے والا دل ہے آپ کا اماں۔'' منت دل ہی دل میں اماں کی ہزاروں توصیف کرتی نہیاد کے برابر والی سیٹ پر آ بیٹھی۔

......☆☆☆......

''ایک کام ٹھیک سے نہیں ہوتا تم سے اگر وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تھی تو پیچھا کرتے اس کا میں نے تمہیں منہ مانگا معاوضہ دینے کا کہا ہے اور ایڈوانس بھی دیا ہے، جاؤ پیچھا کرو اس کا۔'' زبرج کو جب پتا چلا کہ ٹرک نے منت کو اب تک نہیں کچلا تو وہ ڈرائیور پر بھڑک پڑی۔

''باجی آپ چاہیں تو اپنا ایڈوانس واپس لے لیں پر میں یہ کام نہیں کر سکتا وہ بچی بہت معصوم ہے میں اس کی جان لینے کی کوشش بھی نہیں کر سکتا اللہ نے مجھے بھی بیٹیاں دی ہیں معذرت۔'' ڈرائیور نے کہتے کہتے فون رکھ دیا اور زبرج کی گت وحشت انگیز ہوگئی۔

نہیاد کے حصول کی خواہش زبرج کے لیے اب دیوانگی بن گئی تھی۔ وہ کچھ بھی کر کے منت کو نہیاد سے دور کر دینا چاہتی تھی وہ بھی شادی سے پہلے لحاظ اب وہ کچھ اور ہی سوچنے لگی اس کے دماغ میں اب شیطانی وسوسے آنا شروع ہوگئے۔

''نہیں منت تم نہیاد کی نہیں ہو سکتی۔ میں تم دونوں کی شادی ہوتے نہیں دیکھ سکتی، تمہاری شادی کی پہلی رات میری بربادی کی رات ہوگی۔ میں یہ سوچ سوچ کر خود کو ختم کردوں گی کہ نہیاد اس رات تمہارے پاس ہوگا۔ نہیں میں ایسا ہونے نہیں دوں گی ہرگز نہیں۔'' اور جب دماغ شیطان کا ٹھکانہ بن جائے تو گناہ بھی ثواب لگنے لگتا ہے کسی کو پانے کی خواہش جب جنون بن جائے تو بندہ پھر انسان نہیں ابلیس بن جاتا ہے، گناہ کی ایسی راہوں پر نکل پڑتا ہے جہاں سے واپسی کا راستہ ناممکن بن جاتا۔

......☆☆☆......

''یہ اسکائی بلیو والی ساڑھی دکھایئے گا۔'' اماں اپنی ساڑھی کا انتخاب کرنے میں مگن تھیں جبکہ نہیاد اپنی ہونے والی بیگم کا دیدار کرنے میں۔

''ہاتھ چھوڑیں نہیاد لوگ دیکھ رہے ہیں۔'' نہیاد نے منت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں محفوظ کر لیا وہ حواس باختہ ہوگئی۔

''بیوی ہو میری لوگ دیکھ لیں اگر دیکھنا ہے تو۔'' نہیاد نے منت کا ہاتھ اور زیادہ مضبوطی سے تھام لیا۔

''بیوی نہیں ہونے والی بیوی ہوں سمجھے آپ اور کیا ضرورت تھی مجھ سے ملنے کی انتظار نہیں ہو رہا ستائیس دسمبر کا۔'' اماں سے نظریں بچاتی منت نے نہیاد کے ساتھ گفتگو شروع کر دی۔

''نہیں ہوتا [illegible] واٹس ایپ پر تم کچھ پوچھا تھا میں نے پر جواب نہیں دیا دیکھو مجھے ابھی جواب دے دو پھر مجھے اس سے متعلق انتظامات بھی دیکھنے ہوں گے۔'' نہیاد اپنے جواب کا منتظر تھا۔

''بھور بن، ہم بھور بن جائیں گے ہنی مون پر ٹھیک ہے نا؟'' منت نے نہیاد کے اصرار کرنے پر اپنی من پسند جگہ کے بارے میں اظہار خیال آشکار کیا۔

''نائس یہ جگہ تو مجھے بھی بہت پسند ہے میں وہاں گیا بھی تھا آفس کی میٹنگ کے لیے ہم وہاں پی سی میں رکیں گے۔'' دلہے راجا کی شادی تو ہوئی نہ تھی۔ پر ان کی سوچ ہنی مون تک جا پہنچی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گفتگو میں اتنا محو ہوگئے تھے کہ سامنے سے آتی اماں کو بھی نہ دیکھ پائے۔

''اونہہ...... میں غلط وقت پر آ گئی شاید۔'' اماں کے بولتے ہی منت نے فوراً سے اپنا ہاتھ نہیاد کے ہاتھوں کی گرفت سے چھڑا لیا۔

''ن...... نہیں اماں ایسی کوئی بات نہیں، وہ تو بس میں......!'' نہیاد صفائی پیش کرنے ہی لگا تھا کہ منت بول اٹھی۔

''اماں مجھے وہ فون ساڑھی بہت پسند آ رہی ہے آپ کے لیے آپ پر بہت اچھی لگے گی۔'' منت نے اپنی من پسند ساڑھی کی طرف اشارہ کیا جو اسے بہت دیر پہلے سے ہی اماں کے لیے پسند آ گئی تھی۔ بہو کی فرمائش پر اماں نے وہ ساڑھی خرید لی اور وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب روانہ ہوگئے۔

''یہ ملاقات واقعی بہت یادگار تھی، مجھے تمہارے ساتھ بہت مزہ آیا منت تم واقعی ایک اچھی بہو ثابت ہوگی۔'' منت کو اس کے گھر کے باہر چھوڑتے ہوئے اماں نے منت کے ماتھے کو چوما۔

''میں اس ملاقات کو ایک یادگار کی طرح سنبھال کر رکھنا چاہتی ہوں، کیوں نہ ہم تینوں ایک سیلفی لے لیں؟'' اماں ماڈرن زمانے کی نہ تھیں پر نئی نسل کے تمام ٹرینڈز سے پوری طرح واقفیت رکھتی تھیں۔

ان تینوں نے دو چار سیلفی بنائیں اور منت اپنے گھر چلی گئی منت کو چھوڑتے ہی دونوں اماں پوتا اپنے گھر آ گئے۔

……☆☆☆……

''کیا آپ اپنی بیوی سے پریشان ہیں کیا آپ کا شوہر آپ پر توجہ نہیں دیتا کیا آپ کو اپنے محبوب کی قربت حاصل کرنی ہے، کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا محبوب آپ کے عشق میں دیوانہ ہوجائے یا آپ اور آپ کے محبوب کے بیچ میں آنے والا تیسرا شخص بیچ سے ہٹ جائے تو پھر آج ہی رابطہ کیجیے، آپ کے ہر مسائل کا حل تیس سال تجربہ رکھنے والا سفلی عامل ہاشم جلیل گر فائدہ نہ پہنچا تو پیسے واپس۔'' زبرج ٹریفک میں پھنسی ہوئی تھی کہ اچانک اس کی نظر پل کی دیوار پر لکھی ہوئی ان سرخیوں پر پڑی، وہ ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتی رہ گئی۔

''نہیں یہ سب صرف پیسہ بنانے کے لیے کرتے ہیں اگر ایسا ہونے لگے تب تو ہر کوئی ان کے پاس ہی پہنچ جائے۔'' ٹریفک سگنل پر اب ہری لائٹ جگمگا رہی تھی، اپنے آپ میں باتیں کرتی زبرج وہاں سے آگے نکل گئی پر کچھ تھا ان الفاظ میں جس نے زبرج کو اپنی طرف بار بار متوجہ کرنا چاہا پر اس نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ یہ کام نہیں کرے گی کیونکہ اس کام کے چکر میں اس کے صرف پیسے ضائع ہونے ہیں البتہ کوئی فائدہ نہیں پہنچنے والا۔

……☆☆☆……

''آپ نے تھیم ویڈنگ کے حساب سے انتظامات کرانے ہوں گے۔ ہمارا تھیم وہائٹ ویڈنگ ہوگا تو پلیز آپ اسی طرز کی سجاوٹ کروایئے گا باقی آپ لوگ اس بارے میں ہم سے بہتر جانتے ہیں۔'' منت اپنے والدین کے ہمراہ کورٹ یارڈ بینکوئٹ آئی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی اپنی ویڈنگ تھیم وہائٹ رکھنا چاہتی تھی اپنی شادی کی ہر چیز، لائٹس، پھول، ڈیکوریشن پیسز، غرض تمام اشیا سفید رنگ کے شیڈز میں دیکھنا چاہتی تھی اور یہ معصوم خواب اب پورا ہونے جارہا تھا وہ منیجر کو تمام ضروری باتیں بتانے لگی اس کے والدین نے بھی سارے انتظامات اس پر چھوڑ دیے۔

وہ منت کی خوشی پر خوش تھے وہ اپنی اکلوتی اولاد کی شادی صرف اس کے ذوق کے حساب سے کرنا چاہتے تھے اور کر بھی کررہے تھے۔

''آپ کا بینکوئٹ بہت خوب صورت ہے پر آپ نے ستائیس تاریخ کو اسے بالکل تھیم کے حساب سے ارینج کرنا ہے پردے آف وہائٹ ہوں گے انٹرنس پر جو آپ کا مرکزی فانوس ہے اس کی تمام لائٹس بھی آف وہائٹ ہوں اور آرٹیفیشل کینڈلز بھی باقی فرنیچر ڈارک براؤن رنگ کا ہو جس کے اوپر سارے وہائٹ پھول اور وہائٹ ڈیکوریشن پیسز ہوں میں نے آپ کے ڈیکوریشن پیسز کی کلیکشن دیکھی تھی بہت زبردست ہے بس اس کا پینٹ بدلنا ہوگا اس پر وہائٹ پالش کرنا ہوگی اور باقی کے کام آپ خود دیکھ لیجیے گا۔'' اس مفصل گفتگو کے بعد وہ اپنے والدین کو دیکھنے لگی جو بہت دیر سے اس کی بڑبڑ سن رہے تھے اور اب اسے گھور رہے تھے جیسے وہ کہنا چاہ رہے ہوں کہ اور کچھ بھی رہ گیا تو وہ بھی بتادو، منیجر تو جیسے ان پڑھ ہے ان معاملات میں۔

''آپ بے فکر ہوجائیں میڈم، ڈیکوریشن آپ کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ اچھی ہوگی یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔'' منیجر صاحب نے منت کے دل کو تسلی دی جو اپنی شادی کی سجاوٹ کو لے کر کافی پریشان تھی۔

وہ لوگ منیجر کو ایڈوانس دینے اور مینیو وغیرہ فائنل کرانے کے بعد وہاں سے چلتے بنے۔

……☆☆☆……

''یار اگر وہ تم سے محبت نہیں کرتی تو چھوڑ دو اس کا پیچھا کرنا۔ اس کے پیچھے تم نے اپنی صحت خراب کرلی ہے۔ اچھے خاصے ہو، زبرج سے کئی گنا بہتر لڑکی تمہیں مل جائے گی، میرے بھائی جو قسمت کے پنوں پر نہیں لکھا ہوتا اس پر شکوہ نہیں کیا جاتا شکوے کرکے انسان اپنے رب سے مایوس ہوجاتا ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے۔'' ریشان کی دکھ بھری کہانی سننے کے بعد نہاد اسے سمجھنے کی ناکام کوششیں کررہا تھا جس طرح انسان کا عکس اس کے وجود سے کبھی جدا نہیں ہوسکتا اسی طرح ایک عاشق کی عاشقی اس کی ذات سے کبھی الگ نہیں ہوسکتی چاہے وہ ایک کامیاب عاشق ہو یا محروم۔

''فرض کرو اگر منت بھابی تمہیں نہ ملتیں اور میں یہ سب باتیں تم سے کررہا ہوتا جو ابھی تم نے مجھ سے کیں تو کیا تم منت سے محبت کرنا چھوڑ دیتے، کیا اس کا انتظار کرنا بند کردیتے، نہیں ناں، میرے دوست محبت کے جذبے کو دل سے نکال پھینکنا اتنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ اس جذبے کی پیدائش دل میں ہی ہوتی ہے اور جس احساس کی ولادت ہی دل میں ہو، اس کو دل ہی سے کیسے جدا کیا جاسکتا ہے؟''

ریشان کی دکھی آواز اور کھرے الفاظ سننے کے بعد نہاد بھی کچھ پل کے لیے خاموش ہوگیا۔

''بس ہماری شادی ہوجانے دو پھر دیکھنا میں اور تمہاری بھابی مل کر زبرج کو کس طرح مناتے ہیں پر اک بات یاد رکھنا ریشان ہم زبردستی کسی کے دل میں اپنے لیے محبت پیدا نہیں کرسکتے ہمارے کسی عمل سے لوگوں کے دل میں ہمارے لیے عزت ضرور پیدا ہوسکتی ہے پر ہمارے لیے وہ محبت پیدا نہیں ہوسکتی جس طرح کی محبت تم زبرج سے کرتے ہو، جس طرح کی محبت میں اور منت ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔'' نہاد تسلی کے ساتھ ساتھ اسے صلاح بھی دے رہا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو یار، پر اللہ کے گھر سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا، میری ہر دعا کا حصہ ہے وہ ہر عبادت میں اس کے حصول کی دعا کرتا ہوں اگر اللہ چاہے تو اس کے دل میں میرے لیے محبت پیدا کرسکتا ہے میں نے اللہ سے کچھ ناجائز نہیں مانگا۔''

''ہاں اگر اس کی شادی ہوگئی ہوتی یا اسے کسی اور سے محبت ہوتی تو میں اسے ہرگز نہ مانگتا اپنے رب سے پر ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو کسی اور سے محبت بھی نہیں کرتی اس کا دل اب بھی محبت کے احساس سے خالی ہے اور وہ خلا میں پوری کرنا چاہتا ہوں۔'' بہت پاکیزہ تھی ریشان کی محبت، یہ الفاظ اس کی زبان نہیں، لفظوں کی صورت اس کے دھڑکن بول رہی تھیں۔

……☆☆☆……

دن گزرتے گئے اور اب منت اور نہاد کی شادی میں صرف دو دن باقی تھے زبرج نے لاکھ جتن کیے ان دونوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کے لیے ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے پر دو محبت کرنے والے اس وقت تک جدا نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ خود نہ چاہیں وہ اپنے درمیان آنے والی ہر غلط فہمیوں کو نظر انداز کرتے ہیں، محبت کے گلاب میں لگا کانٹا سمجھ کر اس کو نفیس گلاب کے وجود سے نکال پھینکتے ہیں تاکہ وہ کانٹا ان کے دلوں کے راستوں کے بیچ کوئی رکاوٹ نہ پیدا کردے۔

ٹوٹ گئی تھی چور ہوگئی تھی زبرج جب اس کی کوئی بھی چال اپنا اثر نہ دکھا پائی ایک بار پھر زندگی زبرج کو اس راستے پر کھڑا کر [illegible] وہ عامل ہاشم کے پاس چلی ہی گئی اس نے اس بار [illegible] بھی نہ سوچا بس اگر اس کے دماغ میں کچھ تھا تو وہ تھا منت اور نہاد کو ایک دوسرے سے الگ کرنا کیونکہ اس کے دل میں صرف نہاد تھا۔

''السلام علیکم بابا صاحب وہ میں نے آپ کے بارے میں......!'' زبرج آستانے پر کھڑی بول ہی رہی تھی کہ عامل اپنی پراسرار آواز میں بولنا شروع ہوگیا۔

''بیٹھو زبرج تمہارے ہر مسئلے کا حل موجود ہے میرے پاس آخر شکست کھانے کے بعد تمہیں یہاں آنا ہی پڑا ناں۔''

زبرج اس کی باتیں سن کر حیران رہ گئی وہ اس کا نام بھی جانتا تھا اور شاید اس کی اندرونی کیفیات سے بھی واقف تھا۔

زبرج فوراً ان کے قدموں میں جا گری اور اپنی تمام روداد سنا بیٹھی۔

''بابا صاحب آپ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیں جس کے ذریعے وہ میرا عاشق بن جائے مجھ سے اندھی محبت کرنے لگے اسے میرے سوا کچھ دکھائی نہ دے، وہ بھی شادی سے پہلے۔'' اپنی مکمل داستان سنانے کے بعد بالآخر زبرج نے اپنے مطلب کی بات کر ہی ڈالی۔

''محبت کا جادو، جادو کی اقسام میں سب سے مقبول قسم ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اندھی محبت پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ جس پر کروایا جائے اس کا دیوانہ بن جائے اور ہر جائز ناجائز بات مانے۔ اس جادو کے اثرات کچھ یوں ہوتے ہیں کہ جس پر کیا جائے کرنے والے سے بے انتہا عشق کرنے لگتا ہے۔ جس پر یہ عمل کیا جائے وہ عمل کرنے والے کی جدائی ایک پل بھی گوارا نہیں کرتا، ہر وقت اس کو دیکھتے رہنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور وہ عمل کرنے والے کی اندھی اطاعت کرنا شروع کردیتا ہے پر اس عمل کے لیے مجھے تمہارے محبوب کے بال یا ناخن کی ضرورت ہوگی، ورنہ یہ عمل ممکن نہیں اور شادی سے پہلے تو بالکل ناممکن ہے کیونکہ شادی میں صرف دو دن باقی ہیں ہر عمل پورا ہونے کے لیے وقت لیتا ہے۔'' عامل ہاشم کی سحر انگیز باتوں نے صحیح معنوں میں زبرج کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔

''نہاد کے بال اور ناخن میں کہاں سے لاؤں گی۔

اس سے مانگ کر اس کے گھر میں چوری چھپے جا کر نہیں یہ تو دونوں طرح ممکن نہیں مانگنے پر کیوں دے گا وہ بھی ایسی چیز اور چوری چھپے گھس کر کیا میں اس کے گھر کی ڈسٹ بن میں اس کے ناخن ڈھونڈوں گی، عورت تو وہ ہے نہیں کہ اس کے ہیئر برش میں اس کے بال لگے ہوئے ہوں نہیں یہ تو ناممکن سی بات ہے اگر ایسا ہو بھی گیا تو وہ اس سے محبت کرنا چھوڑ دے گا، نہیں وہ تو منت سے اندھی محبت کرتا ہے اور مجھے نہیں لگتا کہ یہ عمل درست رہے گا۔ وہ اس سے محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتا۔'' زبرج اپنے آپ میں ہزار باتیں سوچنے لگی پھر کچھ سوچ بچار کرنے کے بعد اس نے سفلی عامل ہاشم سے ایک اور سوال پوچھا۔

''کوئی ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے منت پوری طرح برباد ہوجائے اتنی زیادہ برباد کہ نہاد اسے خود چھوڑ دے؟'' بات صرف محبت کو پالینے کی نہیں تھی بات حسد تک جا پہنچی تھی زبرج کی نظر میں نہاد کو پالینے کے لیے منت کو برباد کرنا ضروری تھا کیونکہ وہ نہ صرف نہاد سے محبت بلکہ منت سے حسد بھی کرنے لگی تھی منت کو تباہ کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہی تھا کہ نہاد نے اس کا انتخاب کرنے کے بجائے منت کا انتخاب کیا اور یہ حسن ہی تھی جو زبرج کو یہاں تک لے آئی تھی سفلی عامل ہاشم کے پاس۔

''ہونہہ...... میں سمجھ گیا تم پہلے اسے برباد کرنے کے بعد اپنے محبوب پر محبت کا جادو کرانا چاہتی ہو، ٹھیک ہے اگر تم اسے پوری طرح تباہ کر دینا چاہتی ہو تو تمہارے لیے ''حواطف کا جادو'' مفید ہے۔ اس قسم کے جادو میں مطلوبہ شخص کی طرف ارواح بھیجی جاتی ہیں جو اسے آواز یا دوسرے ذرائع سے تکلیف پہنچاتی ہیں جس پر یہ جادو کرایا جائے اسے خوفناک اور ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں خواب میں خبیث ارواح کا بلانا، جاگتے میں آواز سنائی دینا مگر بولنے والے کا نظر نہ آنا قریب سے کسی کے گزرنے کی آواز، جسم میں کسی چیز کی چبھن محسوس ہونا اور خواب میں کسی اونچی جگہ سے گرنا شامل ہے اور اگر ''حواطف کا جادو'' پرانا ہوجائے تو وہ ''جنون کا جادو'' بن جاتا ہے اور جنون کے جادو سے جو شخص دوچار ہوجائے تو وہ حواس باختہ اور پاگل بن جاتا ہے لیکن پاگل ہوجانا اس عمل کا آخری مرحلہ ہوتا ہے اس سے پہلے مطلوبہ شخص کو کئی دوسرے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اس طرح تمہارا راستہ صاف ہوجائے گا، وہ پاگل ہوجائے گی اور تمہیں تمہارا محبوب مل جائے گا۔'' عامل کی باتوں نے زبرج کو بہت متاثر کیا۔

''ٹھیک ہے پھر میں منت پر ''حواطف کا جادو'' کراؤں گی آپ مجھے بتا دیں کہ مجھے اب آپ کے پاس کب آنا ہوگا؟'' زبرج منت کو تباہ کرنے کے لیے پوری طرح مستعد تھی۔

''اگر تم چاہتی ہو کہ یہ جادو شادی والی رات سے ہی اپنے چھوٹے موٹے اثرات دکھانا شروع کر دے تو کل رات یہاں آجانا، مغرب کے وقت اور اس عورت کے بال لانا مت بھولنا، باقی کا کام میرے اوپر چھوڑ دو اور ہاں ایڈوانس لانا مت بھولنا، پچیس ہزار۔'' زبرج کے لیے پچیس ہزار خاصی بڑی رقم نہ تھی بس اسے اس کے لیے اپنے سونے کا بریسلیٹ بیچنا تھا۔

سر اثبات میں ہلاتے وہ آستانے کے باہر نکل آئی اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔

......☆☆☆......

''لاؤ میں کنگھی کر دوں تمہارے بالوں میں ویسے بھی اب کہاں موقع ملے گا مجھے اپنی دوست کے بال سنوارنے کا۔'' منت کی شادی میں صرف ایک دن باقی تھا منت اپنے بال سنوارنے لگی تو زبرج نے اس کے ہاتھوں سے کنگھی چھین لی۔

''کتنی پیاری دوست ہے میری مجھ سے تو ہوتی ہی نہیں ہے قمر تک کے بالوں کی کنگھی تم ہی کر دو۔'' منت نے اپنے لمبے بالوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

''شام میں پارلر بھی جانا ہے، تمہیں پتا ہے میں نے کاشیز کے بارے میں کافی مہینوں پہلے سنا تھا کہ وہاں کا ہیئر اسٹائل مہندی اور میک اوور بہت لیول کا ہوتا ہے اس لیے میں نے اپنی شادی اور ولیمے کے میک اوور کے لیے کاشیز کا ہی انتخاب کیا ہے۔'' زبرج بالوں پر کنگھی چلا رہی تھی اور منت اپنی شادی کی ایکسائٹمنٹ ظاہر کرنے میں مصروف تھی۔

کنگھی کرنے کے بعد زبرج وہاں سے اٹھ کر ہیئر برش میں لگے بالوں کو کوڑے دان میں پھینکنے کے بہانے سے چلی گئی۔

''میں پارلر جا رہی ہوں سروسنگ کے لیے۔'' منت

اب اپنے ہونے والے خاوند کے ساتھ موبائل پر چیٹنگ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

''مجھے اپنی تصویریں بھیجنا مت بھولنا ورنہ میں ناراض ہوجاؤں گا۔'' زبرج بلوں کو ہیئر برش سے نکال کر پرس میں ڈالنے میں مصروف تھی اور وہ دونوں چیٹنگ کرنے میں۔

''ابھی تو صرف سرونگ ہے نہاد اس میں کیا تصویر بھیجوں؟'' منت نے منہ بناتے ہوئے نہاد کے ٹیکسٹ کا جواب دیا۔

''مجھے نہیں پتا بس مجھے تمہاری تصویر چاہیے ورنہ ایک بار پھر اماں سے کہہ کر تمہیں ملنے کے لیے بلا لوں گا سمجھیں اور ہاں امی کو فون دینا مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے ان سے۔'' نہاد نے اپنی ہونے والی ساس سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

''امی وہ دراصل میں نے اور منت نے مل کر اس بات کا فیصلہ کیا ہے کہ ہم شادی کے بعد کچھ ماہ کے لیے بھوربن جائیں گے پر نہاد کا کہتے کہتے اچانک رک جانا ایمان بیگم کو حیران کر گیا۔

''پر کیا بیٹا، بولو۔'' ایمان بیگم نے ایک نظر اپنی بیٹی پر ڈالی پھر جواب دیا۔

''پر میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم ولیمے کے بعد والے دن ہی روانہ ہوجائیں آپ کو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔'' نہاد نے جھجکتے ہوئے اپنے دل کی بات کہی۔

''ارے مجھے کیا اعتراض ہوگا، اس وقت تم دونوں میاں بیوی ہوگے جو مرضی چاہو کرنا بس میری بیٹی اور اپنا بہت خیال رکھنا، وہاں ٹھنڈ بہت ہوگی خوش رہو۔'' ایمان بیگم کی باتوں نے نہاد کو خوش کر دیا۔

......☆☆☆......

''یہ لیجیے بابا صاحب آپ کے پیسے اور یہ منت کے بال۔'' زبرج نے ایک لفافہ اور ایک کاغذ عامل ہاشم کے حوالے کیا۔

لفافے میں رقم تھی جبکہ کاغذ کے اندر منت کے بال موجود تھے۔

''ہونہہ...... منت کی ماں کا نام بتاؤ، میں نے منت کے نام کا پتلا بنانا ہے اس کے لیے مجھے اس کے ماں کی نام کی ضرورت ہے۔ پھر اس کے بعد عمل شروع ہوجائے گا۔''

''ایمان - آ

چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

......☆☆☆......

وڈ فلور پر نظریں جھکائے، پلکیں بچھائے لبوں پر نیم مسکراہٹ لیے وہ اپنے ہونے والے شریک حیات کے ساتھ قدم سے قدم ملائے آگے بڑھ رہی تھی منت اس رات واقعی ایک پری لگ رہی تھی۔ کندھوں کے آگے گرتے گھنگریالے بال جیسے ہیئر اسٹائلسٹ نے بہت مہارت سے ترتیب دیا تھا سب کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے اوپر سے وہ برائیڈل میک اوور اور ڈیزائنر شرارہ، دولہے میاں تو بہانے بہانے سے اپنی منت کو تکے جارہے تھے جو ان کے ساتھ چلتی ان کی زندگی میں بیوی کی حیثیت سے پہلا قدم رکھنے جارہی تھی۔

''قبول ہے۔'' نکاح کے دو بول ادا کرنے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی زندگی میں میاں بیوی کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ شامل کرلیا، ٹھیک اسی وقت زبرج کی آنکھوں سے دو بوند آنسو بے ساختہ بہہ نکلے یک طرفہ محبت کا لا حاصل ہونا یقیناً بہت درد ناک ہوتا ہے پر اسی یک طرفہ محبت کا کسی اور کے ساتھ رشتہ جڑتے دیکھنا ہر لمحہ ایک نئی موت جیسا ہوتا ہے۔

......☆☆☆......

وہ اپنے اور نہاد کے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی آج اس کی شادی کی پہلی رات تھی۔ اپنے رخسار کو گھونگٹ سے پنہاں رکھے وہ نہاد کا کمرے میں داخل ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک سے اسے خوف آنے لگا اسے لگا کہ کوئی اور بھی ہے جو اس کے ساتھ اس کمرے میں اس بستر پر حاضر ہے جو اسے اپنی موجودگی سے آشنا کرانا چاہ رہا ہے منت خوف کے عالم میں آگئی، اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی پر اسے اپنے برابر میں کسی کی موجودگی کا احساس ہونے لگا گھونگٹ اٹھا کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا وہ ہراساں ہو کر بستر پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے باہر جانے ہی لگی کہ نہاد کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا ہوا بیگم صاحبہ، کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہیں آپ شاید بھول رہی ہیں کہ آج ہماری شادی کی پہلی رات ہے۔'' منت اتنی برق رفتاری کے ساتھ کمرے سے باہر جا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

رہی تھی کہ نہاد کے کمرے میں آتے ہی وہ اس سے ٹکرا گئی۔

''نہاد مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے ایسا لگ رہا ہے کہ اس کمرے میں کوئی ہے جو موجود بھی ہے پر نظر نہیں آ رہا۔'' منت نے نہاد کے بازو تھامے کمرے کے قرب و جوار دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے کوئی نہیں ہے میں نے ہر جگہ دیکھ لیا کیوں پریشان ہو رہی ہو کوئی نہیں ہے یہاں صرف میں ہوں اور تم۔'' کمرے کا پوری طرح جائزہ لینے کے بعد نہاد نے منت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہاں اور اسے بستر پر بٹھا دیا۔

''بالآخر آج ہم ساتھ ہیں اور پاس بھی، ہمیشہ کے لیے محبت کا مل جانا بھی کتنا حسین ہوتا ہے ناں منت حقیقت ہوتا ہے پر خواب سا لگتا ہے اور وہ حقیقت جو حسین خواب بھی لگے وہ محبت ہوتی ہے جو حاصل ہو جائے۔'' نہاد اب منت کی گردن پر ڈائمنڈ کا وہ ہار سجانے لگا جو اس نے منہ دکھائی کے لیے خریدا تھا۔

''میں بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے آپ جیسا پیار کرنے والا شوہر ملا۔'' منت کا خواب اب ختم ہو گیا تھا ہر اندر ہی اندر کہیں نہ کہیں وہی خوف مشتعل تھا۔

''خوش قسمت صرف تم نہیں ہو منت اور نہ ہی میں خوش قسمت تو ہماری محبت ہے جو آج سرخرو ہوگئی اور اسی محبت نے آج ہماری ایک کر دیا، مجھے تمہارے اور تمہیں میرے نکاح میں شامل کر دیا۔'' نہاد نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''نہاد وہاں سے کوئی گزرا ہے وہاں گیلری کی طرف سے میں نے خود دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے دیکھا اپنی آنکھوں سے نہاد پلیز کچھ کریں ناں۔'' نہاد اس کی کلائی پر سے چوڑیاں اتارنے ہی لگا تھا کہ منت نے اسے اپنے قریب سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''زندگی جینے سے پہلے ہی میری سانسیں چھین رہی ہو تم کیوں میرے ساتھ اس طرح کر رہی ہو منت۔'' نہاد نے منت کا دھیان بٹانے کی بہت کوشش کی پر وہ وہی سب کہہ رہی تھی جو وہ محسوس کر رہی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے تم سو جاؤ، میں پاس ہوں تمہارے ڈرو مت۔'' نہاد نے سے دودھ کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔ جسے ختم کرنے کے بعد وہ نہاد کا ہاتھ مضبوطی کے ساتھ تھامے سو گئی۔

''جتنا بے چین کرنا ہے کرلو پر یاد رکھو بھوربن میں تمہارا کوئی مذاق نہیں سنوں گا سمجھیں۔'' نہاد نے منت کے ماتھے کو چومتے ہوئے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

منت اور نہاد ایک ہو کر بھی ایک نہ ہو پائے ولیمے کی رات تک ان دونوں کے درمیان وہی سلسلہ چلتا رہا جو شادی کی پہلی رات تھا اگلے روز انہیں بھوربن کے لیے روانہ ہونا تھا ولیمے کا فنکشن اٹینڈ کرنے کے بعد زبرج سیدھا قبرستان گئی وہاں اسے سفلی عامل ہاشم کا دیا ہوا پتلا دفن کرنا تھا۔

رات کے ڈیڑھ بجے سناٹے کے عالم میں وہ قبرستان جا پہنچی زبرج نے اپنی زندگی میں پہلی بار اتنی بہادری کا کام کیا تھا ورنہ تھی وہ بڑی بزدل قبروں کے پاس سے گزرتی کیڑوں مکوڑوں کا سامنا کرتی وہ قبرستان کے بیچ و بیچ آ پہنچی وہاں اس نے بابا صاحب کا دیا ہوا عمل پڑھا اور پتلے کو قبرستان کی مٹی کے اندر گاڑھ دیا۔

زبرج پوری طرح سے ٹھنڈی پڑ چکی تھی اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ سردی کا موسم تھا اور دوسرا سبب وہ ڈر تھا جو قبرستان کے اندر قدم رکھتے ہی اس کے رگ و پے میں سرائیت کر چکا تھا۔

......☆☆☆......

مری سے تیرہ کلومیٹر کے فاصلے پر بنا بھوربن پاکستان کا سب سے مشہور ترین ہل اسٹیشن اپنے گھنے خوب صورت جنگلات اور پہاڑوں کی دلکشی لیے اس نو بیاہتا جوڑے کا منتظر تھا۔ بھوربن قریباً چھ ہزار فٹ کی اونچائی پر مری اور کشمیر روڈ کے بیچ و بیچ بنا ہل اسٹیشن ہے جس کی وجہ سے بھوربن میں مری اور کشمیر دونوں کی خوب صورتی موجود ہے۔

پرل کانٹی نینٹل ہوٹل سیاحوں کی توجہ کا سب سے خاص ہوٹل ہے ذہن میں اگر بھوربن کا نام آئے اور پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کا نام نہ آئے تو کیا یہ کہنا لے جانا ہوگا۔ بھوربن قدرتی مناظر سے بھری ایک جنت کا نام ہے یہاں کے نظارے سحر انگیز اور دلفریب ہیں پہلے تو آپ کو اپنے شیشے میں اتاریں گے اور شیشے میں پوری طرح سے اتارنے کے بعد اس طرح اپنے سحر میں جکڑ لیں گے کہ آپ کا وہاں سے واپس آنے کا دل ہی نہ کرے۔

پی سی ہوٹل کی عمارت برف سے پوری طرح ڈھکی ہوئی تھی درخت کے پتے پوری طرح سے جھڑ چکے تھے اور اگر کچھ باقی تھا تو صرف شاخیں جس پر برف نے اپنا قبضہ جما لیا تھا وہ نہایت ہی خوب صورت ہوٹل تھا تین سے چار منزلوں پر مشتمل وہ بلڈنگ اس طرح کی تھی جیسے سوئٹزرلینڈ کے ہوٹلز کی ہوتی ہیں ہوٹل کے باہر بڑا سا لان بنا ہوا تھا جس پر ایک سوئمنگ پول بھی تھا سوئمنگ پول کے ساتھ ساتھ ایک ریسٹورنٹ تھا اور ریسٹورنٹ کے سامنے ہی پہاڑ اور جنگلات کے نظارے تھے۔ وہ ایک پرفیکٹ ہنی مون پوائنٹ تھا۔

''ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ یہ لو میری جیکٹ پہن لو تمہیں اس طرح ٹھٹھرتے نہیں دیکھا جا رہا مجھ سے منت ٹھنڈ کے مارے کپکپانے لگی تو نہاد نے اپنی جیکٹ اسے پہنا دی ایک سوئٹر کی گرمائش منت کے لیے کچھ کام نہ کر پائی۔

''میں پہلی بار برف باری دیکھ رہی ہوں بہت خوب صورت منظر لگ رہا ہے نہاد کتنا زبردست ہوٹل ہے اور اوپر سے اس کے نظارے۔'' منت کو وہاں کے نظارے بہت متاثر کر رہے تھے۔

''پہلے بھی آیا تھا یہاں پر کچھ خاص نہیں رہا تھا پر اب جنت جیسا لگ رہا ہے سب کچھ کیونکہ تم جو ساتھ ہو میرے۔'' نہاد نے منت کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور وہ دونوں اس ریسپشن کی جانب بڑھنے لگے۔

ریسپشنسٹ نے سوئٹ کی چابی ان کے حوالے کر دی اور اب وہ دونوں وہاں جانے لگے تھے۔

''واؤ، نہاد ذرا یہاں کی کھڑکی سے نظارے تو دیکھیں۔ سوئمنگ پول، برف باری، ریسٹورنٹ اور پہاڑ، کتنا حسین لگ رہا ہے یہ کہیں خواب تو نہیں ہے؟'' منت سوئٹ کی کھڑکی کھولے کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں کے اندر پورا بھوربن سما گیا تھا۔

''ہاں خواب ہی تو ہے تم میرے ساتھ ہو کر بھی میرے پاس نہیں ہو، تمہارا ہونا تو پھر میرے لیے خواب ہی ہوا ہے ناں؟'' نہاد اب منت کے بالکل عقب میں آ کھڑا تھا۔

''نہاد میرا یقین کریں وہ سب مذاق نہیں تھا۔ میں نے خود وہ سایہ محسوس کیا تھا اور وہ سایہ روز مجھے نظر آتا ہے آپ پلیز۔'' منت

پر اپنی شہادت کی انگلی رکھ کر اسے چپ رہے

منت کو ایک بار پھر وہی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی جو اسے روز تنگ کرنے لگی تھیں اسے سرگوشیوں میں اپنے نام کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔

''نہاد دیکھیں مجھے پھر آواز آئی ہے کوئی میرا نام پکار رہا ہے مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے نہاد پتا نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا پھر اب......!'' منت رونا شروع ہوگئی اور روتے روتے نہاد کے گلے لگ گئی۔

پچھلے دنوں منت نے نہاد سے جو کچھ بھی کہا نہاد کو اب بھی وہ سب مذاق لگ رہا تھا کیونکہ اسے وہ آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں جن کا ذکر منت نے کیا۔

''تم آرام کرلو، تھک گئی ہو، لمبا سفر طے کیا ہے ہم نے تبھی شاید تمہارے کانوں میں کئی آوازیں گونج رہی ہیں میں ذرا باہر سے آتا ہوں ڈنر وغیرہ کا پتا کر کے'' نہاد نے منت کو آرام کرنے کا کہا اور اس کے اوپر کمبل ڈال دی۔

رات کے آٹھ بج چکے تھے پر منت اپنی نیند سے نہیں جاگی تھی نہاد اس کے برابر بیٹھا ایسے پرسکون حالت میں سوتے ہوئے دیکھ رہا تھا وہ گہری نیند میں سو کر بھی نہاد کے وجود میں جاگ رہی تھی بہت محبت کرتا تھا وہ اپنی منت سے۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں، اس طرح کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ کیا مل جائے گا تمہیں میرے ساتھ اس قسم کا مذاق کر کے تم تو میرے پاس آنا چاہتی تھی پھر مجھے خود سے دور کرنے کا مذاق کیوں کر رہی ہو منت۔'' وہ منت کے نازک ہاتھ اٹھا کر جن پر لگی مہندی کا رنگ اب بھی پوری طرح گہرا تھا۔ انہیں محسوس کرنے لگا کہ اچانک وہ حیران رہ گیا۔ منت کے نازک ہاتھ اچانک اتنے بھاری ہو گئے تھے جیسے کسی پہلوان کے ہاتھ ہوں اس منظر نے نہاد کو مشکوک بنا دیا نہاد نے منت کو جھنجوڑ کر نیند سے جگانے کی کوشش کی تو اس نے اچانک سے آنکھیں کھول لیں آنکھیں پوری طرح سرخ پڑ گئی تھیں جیسے ان میں سے خون جاری ہونا شروع ہونے والا ہو، نہاد منت کی یہ حالت دیکھ کر خوف کے عالم میں آ گیا۔ منت نے نہاد کو پوری قوت کے ساتھ بستر پر سے پھینک دیا۔ اس کے اندر اس وقت اتنی طاقت جمع ہو گئی تھی کہ اس نے با آسانی نہاد کو

دور پھینک دیا جس کے نتیجے میں نیہاد کا منہ لکڑی کے ٹیبل کے کنارے سے جا لگا اور اس کے ہونٹ کے کونے سے خون بہنے لگا۔

''منت میری جان کیا ہوگیا تمہیں تم میری منت نہیں ہوسکتی، تم ایسی تو نہیں تھی تم میری منت ہوکر بھی میری نہیں رہی، تمہیں میری قسم تم میری منت بن جاؤ۔'' نیہاد اس کے بازوؤں کو زور سے پکڑ لے اس سے التجا کرنے لگا وہ اپنی بیوی کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھی ہوگیا۔

''کیا ہوا نیہاد، میں تو آپ کی ہی منت ہوں اور یہ خون کیسے نکلا آپ کا؟'' منت کی آنکھیں جو کچھ دیر پہلے تک سرخ پڑی تھیں وہ نارمل ہوگئیں اور جسم بھی اپنے مزاج پر آ گیا۔

''منت مجھے یقین ہوگیا ہے تم ٹھیک کہہ رہی تھی تمہارے ساتھ واقعی میں کچھ غلط ہوا ہے پر تم پریشان مت ہو ان شاء اللہ سب پہلے جیسا ہوجائے گا۔'' نیہاد کو جو چوٹ منت کی وجہ سے لگی تھی اسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی پروا تھی تو صرف منت کی۔

اس رات بھی منت نیہاد کے ساتھ تھی پر اس کے پاس نہ تھی ازدواجی زندگی میں ایک اور رات نیہاد نے منت کے پاس رہ کر بھی اس کے بغیر گزاری۔

فجر سے کچھ وقت قبل منت نیند سے اچانک جاگ گئی اور نیہاد کا بازو پکڑے اسے جگانے لگی۔

''کیا ہوا منت، تم ٹھیک تو ہو؟'' نیہاد منت کے جگانے پر فوراً اٹھ گیا۔

''نیہاد مجھے بہت عجیب سا خواب آیا نیہاد مجھے لگ رہا ہے کہ میں آپ سے دور ہوجاؤں گی، کوئی ہے جو ہمیں ایک دوسرے سے دور کردے گا۔'' منت نے اپنا خواب تو نہیں بتایا پر خواب کی وضاحت پیش کی۔

''کوئی نہیں دور کرے گا منت، نہ تم مجھ سے دور ہونا چاہتی ہو اور نہ ہی میں تو پھر کوئی کتنا ہی کیوں نہ چاہے، ہمیں الگ نہیں کرسکتا سمجھیں۔'' اس کے رخسار کو اپنی ہتھیلی میں لیے وہ اسے اپنی وفا کا یقین دلانے لگا۔

''میں نے خواب میں ایک عجیب سی شکل کی عورت کو دیکھا وہ میرا گلا دبا کر مجھ سے کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے پوری طرح برباد کردے گی اور آپ کو اپنے ساتھ لے جائے گی، نیہاد مجھے آپ سے دور نہیں ہونا، آپ کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزارنی ہے یہ جو آوازیں مجھے روز سنائی دیتی ہیں اور جو عکس مجھے دکھائی دیتا ہے کیا یہ سب کہیں اس عورت نے تو نہیں کیا جو میرے خواب میں آئی تھی وہ کوئی چڑیل تھی۔ نیہاد کیا ہماری شادی شدہ زندگی کو کسی کی نظر......!'' وہ بول ہی رہی تھی کہ نیہاد نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''کچھ نہیں ہوگا، اللہ پر یقین رکھو، اس نے محبت کے نصیب میں ہار نہیں لکھی، وہ منت کو تسلی دے رہا تھا اور اندر ہی اندر خود کو بھی محبت کو کسی کی بری نظر لگ جائے تو محبت کی شدتوں میں فرق پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ محبت چاہے کتنی ہی سچی، کتنی ہی پاک کیوں نہ ہو، بری نظر کے لگ جانے سے بھلے دو لوگوں کے درمیان محبت کم نہیں ہوتی، ہر حادثات کا شکار ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

......☆☆☆......

اگلے روز زبرج سفلی عامل ہاشم کے پاس منت کی حالت کا پتا لگانے دوبارہ گئی، ہمیشہ کی طرح اس روز بھی ان کے آستانے پر بہت ہجوم تھا۔

''تمہارا کام اپنے اثرات دکھا رہا ہے اور اگر میرا یقین نہ ہو تو اپنی دوست کو فون کرکے پوچھ بھی لینا اور ہاں اب تمہیں ہر دوسرے روز میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں، اب تمہارا کام میں اکیلا کروں گا تمہارے حصے کا کام تم کر چکی ہو۔'' عامل ہاشم نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد بولا۔

''بابا صاحب اب کیا ہوگا؟'' زبرج نے آگے ہونے والے مناظر جاننے کے لیے تجسس ظاہر کیا۔

''تمہارے لیے سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان اب تک جسم و روح کا رشتہ قائم نہیں ہوا اور ہاں ایک ماہ کے اندر اندر یا تو وہ پوری طرح دیوانی ہو جائے گی یا پھر مر جائے گی پھر تمہارا محبوب تمہارے حوالے۔'' عامل ہاشم نے یہ خبر سنا کر صحیح معنوں میں زبرج کو مسرور کردیا۔ اب اسے انتظار تھا تو صرف منت کو پوری طرح تباہ ہوتے دیکھنے کا۔

......☆☆☆......

نیہاد صبح صبح منت کو لے کر گھڑ سواری کے لیے نکل پڑا منت کی حالت بھی خاصی بہتر تھی وہ دونوں پی سی ہوٹل کے برف کی تہہ میں جمے لان میں چلتے چلتے ایک سفید گھوڑے کے پاس آرکے۔

''میرا ہاتھ تھامو اور اوپر آؤ، ہم دونوں بھوربن کی سیر کریں گے اس گھوڑے پر، یہاں کی گھڑ سواری بہت مشہور ہے۔'' نیہاد گھوڑے پر بیٹھے اپنا ہاتھ بڑھائے منت کے گھوڑے پر بیٹھنا کا منتظر تھا۔

''آپ جائیں میں یہیں انتظار کروں گی آپ کا مجھے بہت ڈر لگتا ہے گھوڑے سے اگر اس نے گرادیا تو۔'' منت نے گھوڑے پر بیٹھنے سے صاف انکار کردیا۔

''نہیں گرائے گا، گھڑ سوار کو کافی تجربہ ہے آپ ڈریں مت، اپنے پروفیشنل گھڑ سوار ہسبینڈ پر بھروسہ کیجیے۔'' نیہاد کے اسرار کرنے پر بالآخر منت اس کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو ہی گئی۔

سوندھی سوندھی بھوربن کی آب و ہوا اور ہلکی ہلکی برف باری ان دونوں کو اپنے حصار میں باندھے ہوئی تھی وہ دونوں اب اس خوب صورت جگہ کی سیر کرنے لگے تھے صاف ستھری روڈ اور روڈ کی ایک جانب خوب صورت درختوں سے سجا جنگل جنوری کی صبح کے اس پہر بھوربن بہت دلفریب منظر پیش کر رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے منت کل رات تم اچانک سے بدل گئی تھیں، تم نے مجھے بہت زور سے دھکا بھی دیا تھا پتا نہیں کیا ہوگیا تھا تمہیں کیا تمہیں یاد ہے؟'' باتوں باتوں میں نیہاد نے گزشتہ رات کے متعلق سوال کیا وہ سوچ رہا تھا کہ شاید منت کو یاد آجائے کہ رات اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔

''نیہاد مجھے نہیں معلوم کہ کل مجھے کیا ہوا تھا پر جب مجھے ہوش آیا تو آپ کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور میں نے خود کو بہت ہلکان محسوس کیا تھا۔'' منت کے منہ سے نکلے جملے سننے کے بعد نیہاد کو اتنا یقین ہوگیا تھا کہ منت کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اس کا تعلق روحانیت سے ہے۔

بات کرتے کرتے منت اچانک خاموش ہوگئی اور نیہاد کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دینے لگی نیہاد کو اچنبھا ہوا اس نے اپنے پیچھے بہت بھاری وجود کو محسوس کیا، اتنا بھاری وجود کہ نیہاد ٹھیک طرح سے گھوڑے کی لگام بھی سنبھال نہیں پا رہا تھا اچانک ہی منت کی آنکھیں سرخ پڑ گئیں اور اس نے چلتے ہوئے گھوڑے پر سے نیہاد کو گرا دیا اور برق رفتاری کے ساتھ گھوڑا دوڑانے لگی جبکہ اسے گھوڑا دوڑانے کے بارے میں کچھ بھی نہیں پتا تھا۔

نیہاد کی قمر اور پاؤں میں بہت چوٹ آئی تھی پر اس وقت اس نے صرف اور صرف منت کو بچانے کے بارے میں سوچا وہ گھوڑے کے پیچھے تیز تیز دوڑنے لگا پر اس کا پیچھا نہ کر پایا۔ نیہاد نے ہر جگہ ڈھونڈا پر نہ ہی کہیں گھوڑا ملا اور نہ منت، نیہاد رونے لگا تھا وہ صرف یہی سوچ رہا تھا کہ کہیں منت نے اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا دیا ہو یا کہیں اسے کچھ۔

جب اسے منت کہیں نہ ملی تو اس نے ہوٹل جا کر پولیس کو انفارم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ پولیس کی مدد کے ذریعے منت کا کچھ پتا چل سکے۔

وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ منت وہیں کھڑی تھی جہاں سے انہوں نے سیر کا آغاز کیا تھا۔

''تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں آئی، تم یہاں آئی کیسے، چلو میرے ساتھ کمرے میں، اب میں تمہیں کبھی باہر نہیں

الله ہدایت دے

''بہنوں! کیا آپ میں سے کوئی اپنی مردہ بہن کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟'' درس دیتی باجی نے سوال کیا۔

''نہیں'' سب ایک ساتھ بولیں۔

درس کے بعد سب باتیں کرنے لگیں۔

''نزہت کیوں نہیں آئی؟'' باجی نے پوچھا۔

''اسے دیورانی کی عیادت کو جانا تھا۔'' سدرہ بولی۔

''ہنہ بے دین! مجال ہے جو کبھی درس میں آئے۔'' باجی بولیں۔

''اچھا سنا ہے آمنہ کو طلاق ہوگئی، اس کی بہت مردوں سے دوستی تھی، طلاق ہی انجام تھا۔'' باجی رازداری سے بولیں۔

''بس اللہ ہدایت دے۔'' پھر دعا دی۔

اور سدرہ سوچنے لگی ہدایت کی ضرورت کس کو ہے......؟

حریم الیاس

لاؤں گا جب تک تم ٹھیک نہ ہو جاؤ، اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں مر جاتا منت، منت کو بالکل نارمل حالت میں زندہ دیکھ کر نہاد رہ نہ پایا۔ اس نے اپنے جذبات کا اظہار ہوٹل میں آئے تمام سیاحوں کے سامنے کر دیا۔

''پر مجھے کیا ہوا ہے نہاد، میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' منت کچھ دیر کو رکی پھر دوبارہ ہم کلام ہوئی۔

''کیا وہی ہوا جو گزشتہ رات میرے ساتھ ہوا تھا پلیز بتائیں مجھے۔'' کمرے میں جاتے ہی منت نے نہاد سے سوال کیا۔

''میری زندگی میں آگے کوئی بھی مسئلہ ہوا تو میں سب سے پہلے آپ کے پاس ہی آؤں گا کیونکہ میری اماں کے پاس ہر مرض کا علاج ہے۔'' نہاد کو اس وقت وہ جملہ یاد آنے لگا جو اس نے اپنی شادی سے پہلے اپنی اماں سے کہا تھا کچھ سوچ بچار کرنے کے بعد اس نے اماں کو فون لگایا۔

''السلام علیکم بیٹا، یاد آ گئیں اماں تمہیں کیسے ہو تم دونوں کیسا لگ رہا ہے بھوربن۔'' اماں نہاد کا فون سنتے ہی ایکسائیٹڈ ہو گئیں۔

''اماں ایک مسئلہ ہو گیا ہے پلیز آپ گھر میں کسی کو کچھ مت بتایئے گا پہلے مجھ سے وعدہ کریں کہ کسی کو کچھ نہیں بتائیں گی۔'' نہاد نہیں چاہتا تھا کہ گھر کے کسی بھی فرد کو منت کی حالت کے بارے میں پتا چلے۔

''نہیں پتا چلے گا یہ میرا وعدہ ہے تم سے پر مجھے بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے میں بہت پریشان ہو رہی ہوں۔'' اماں کے پوچھنے پر نہاد نے ان کو منت کی حالت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ شادی کی رات سے لے کر اب تک کی تمام تفصیلات انہیں بیان کر دیں۔

''بیٹا میں نے اس سے پہلے بھی تم سے کہا تھا کہ منت پر کسی کی بری نظر ہے پر شادی کی رات کو اس طرح کا رویہ اختیار کرنا اور پھر شادی کی رات سے لے کر اب تک منت کا اس طرح کا رویہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ بری نظر صرف اسے نہیں، تم دونوں کو لگی ہے تمہاری شادی شدہ زندگی کو تم نے جس طرح سے مجھے بتایا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی تم دونوں پر سفلی عمل کر کے تم دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دینا چاہتا ہے۔'' اماں کو نظر بد، جادو کی حقیقت پر پوری طرح یقین تھا۔

''اماں پر یہ سفلی عمل کیا ہے اور یہ کس نے کیا ہے ہم پر، کون ہمیں الگ کرنا چاہتا ہے کس شیطان کی نظر لگی ہے ہماری ازدواجی زندگی پر۔'' نہاد پریشان ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ منت بھی۔

''نظر صرف شیطان کی نہیں لگتی گڈو، نظر تو انسانوں کی بھی لگتی ہے ایسے انسانوں کی جو حسد کی آگ میں اس طرح جھلس جاتے ہیں کہ انہیں صحیح اور غلط میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا اور اپنے ایک ناجائز مقصد کو پورا کرنے کے لیے وہ اشرف المخلوقات کے درجے سے گر کر ابلیس بن جاتے ہیں۔'' وہ دونوں اماں کی باتیں بڑی غور سے سننے لگے۔

''گڈو بیٹا پریشان مت ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا بس تم نماز وغیرہ پڑھنا شروع کر دو اور میں جو قرآنی آیات تمہیں پڑھنے کے لیے دوں گی انہیں باقاعدگی کے ساتھ پڑھنا، تم نے مجھے جو کچھ بھی بتایا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کسی نے منت پر ارواح کا جادو کیا ہے جس میں مطلوبہ شخص پر شیطانی قوت مسلط کر دی جاتی ہے اور اگر یہ عمل پرانا ہو جائے تو مطلوبہ شخص پوری طرح پاگل ہو جاتا ہے۔'' اماں کے آخری جملے سنتے ہی منت نے نہاد کے بازوؤں کو خوف کے مارے پکڑ لیا۔

''اماں کیا میں پاگل ہو جاؤں گی اماں پلیز مدد کریں آپ ہماری آپ جو کہیں گی ہم وہ پڑھیں گے۔'' فون لاؤڈ اسپیکر پر تھا لحاظ نہاد کے ساتھ ساتھ اماں کی باتیں منت تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

''بیٹا تم پر کسی نے روح چھوڑی ہوئی ہے اس لیے جو وظیفے میں پڑھنے کو دوں گی وہ تم نے نہیں بلکہ تمہارے محرم نے تمہارے لیے پڑھنے ہوں گے۔ یعنی نہاد کو اور نہاد کوشش یہی کرنا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے یہ وظائف باقاعدگی کے ساتھ پڑھنے ہیں ذرا سا بھی ناغہ ہوا تو یہ عمل جو منت پر کیا گیا ہے پرانا ہو جائے گا اور اگر پرانا ہو گیا تو نقصان ہو جائے گا۔''

''اب چاہے وہ شیطان مجھے کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچائے، میں ہر وہ تکلیف سہنے کے لیے تیار ہوں جو منت کی طرف سے مجھے ملے مجھے اب وہ شیطان بھلے ختم ہی کیوں نہ کر دے پر میں اپنی منت کے باطن سے اسے باہر نکال پھینک کر ہی دم لوں گا۔ منت کا میرے ساتھ ہو کر بھی میرے پاس نہ ہونا موت سے بھی بدتر ہے۔ میرے اللہ تو مجھے بھلے موت دے دے پر اسے پوری طرح ٹھیک کر دے۔'' نہاد منت کو اس شیطانی روح کی گرفت سے آزاد کرنے کے لیے پوری طرح مستعد ہو گیا جو اس کے باطن میں شادی کی رات سے اپنی جگہ بنائے بیٹھی تھی۔

......☆☆☆......

صرف دس دن باقی ہیں پھر یہ عمل پرانا ہو جائے گا اور گیارہویں روز وہ پوری طرح پاگل ہو جائے گی اتنی پاگل کہ وہ اپنی جان بھی لے سکتی ہے یہ ہمارے عمل کا آخری اور سب سے اہم پتلا ہے احتیاط سے پکڑنا اس پر کئی ساری سوئیاں لگی ہوئی ہیں اس پتلے کو تمہیں آج رات قبرستان میں دفن کرنا ہوگا۔ میں نے اس پر عمل کر دیا ہے۔'' کافی دنوں بعد زبرج سفلی عامل ہاشم کے پاس گئی تھی جس نے ایک بار پھر اس کو یقین دلایا تھا کہ عمل صحیح ہو رہا ہے اور اپنا پوری طرح عیاں کر رہا ہے۔

''السلام علیکم، کیسی ہو منت؟ ہنی مون کیسا جا رہا ہے تمہاری؟'' آستانے سے گھر واپس آ کر زبرج نے سب سے پہلے منت کی حالت جانچنے کے لیے اسے فون کیا۔

''ٹھیک نہیں ہوں یار پتا نہیں کسی کی نظر لگ گئی ہے ہماری ازدواجی زندگی پر تمہیں پتا ہے میری حالت اچانک بگڑ جاتی ہے اور اس قدر بگڑ جاتی ہے کہ میں اپنے ساتھ ساتھ نہاد کو بھی نقصان پہنچانا شروع کر دیتی ہوں پتا نہیں کون ہے جو ہمارا برا چاہتا ہے۔ مجھے تو بس اب یہی خیالات آتے ہیں کہ میں نہاد کی زندگی سے بہت دور چلی جاؤں گی۔'' منت کی حالت سے پوری طرح واقف ہو جانے کے بعد زبرج کو سچی خوشی حاصل ہوئی۔

''پریشان مت ہو سب ٹھیک ہو جائے گا اچھا مجھے امی بلا رہی ہیں میں بعد میں بات کرتی ہوں اپنا خیال رکھنا خدا حافظ۔'' زبرج نے بہانہ بنا کر فون بند کر دیا وہ کمرے سے باہر جانے ہی لگی کہ بے دھیانی میں اسے سامنے سے آتا ریشان نظر نہ آیا۔ ریشان سے ٹکرانے وقت زبرج کا پرس نیچے گر گیا اور پرس کے اندر سے سیاہ رنگ کی شے باہر آ گئی۔

اس سے پہلے کہ زبرج وہ شے اٹھاتی، ریشان نے پہلے ہی اس پر اپنا ہاتھ جما دیا۔ وہ وہی سیاہ پتلا تھا جو سفلی عامل

''زبرج یہ تو ...... کالا جادو ہوتا ہے تم......ک......کا...... کی برسوں کی یک طرفہ محبت کٹہرے میں آ کر کھڑی ہوئی۔

''ن......ن......نہیں......وہ......وہ تو......بس۔'' زبرج کے منہ سے الفاظ نکلنا بند ہو گئے اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ ریشان کو کیا جواب دے۔

''زبرج میں نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ تمہارا شمار اس قسم کے لوگوں میں ہوگا جو حسد میں آ کر جادو سفلی کرتے ہوں، روز روز بے وجہ تمہارا گھر سے باہر جانا میرے ساتھ تمہارا اتنا عجیب سا برتاؤ اور اب......تمہارا ہکلانا کس قسم کی لڑکی سے میں نے محبت کی، اس لڑکی کو اللہ سے مانگا جسے اللہ سے زیادہ شیطان پر یقین ہے دین سے زیادہ کالے جادو پر یقین ہے مجھے تم سے زبرج اور یہ سوچ کر بھی مجھے گھن آتی ہے کہ زندگی میں، میں نے کبھی تم جیسی لڑکی سے محبت کی۔'' سیاہ پتلا اس کے ہاتھ میں تھما کر ریشان وہاں سے چلا گیا اور اب واپس نہیں آنے والا تھا۔

''شکر کم از کم تمہیں یہ تو نہ پتا چلا کہ میں نے یہ سفلی عمل کس پر کرایا ہے۔'' سکون کا سانس لیتی زبرج لاؤنج کی طرف چلی گئی۔

شرمندگی اور ندامت کا کوئی احساس نہیں تھا زبرج کے اندر اور ہوتا بھی کیسے، ابلیس کو اپنے اندر اگر اپنے گناہ کی شرم و ندامت کا احساس ہوتا تو اس کا شمار آج شیطانوں میں نہیں اشرف المخلوقات میں ہوتا۔

......☆☆☆......

اماں کا بتایا ہوا عمل نہاد باقاعدگی اور نماز کی پابندی کے ساتھ پڑھ رہا تھا آج تیرہ فروری کی رات تھی پر منت کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اماں کے بتائے ہوئے عمل نے اپنا اثر نہیں دکھایا پر نہاد نے امید نہیں چھوڑی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ منت کی حالت صرف اور صرف اللہ اور اس کا کلام ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔

رات کے تین بج رہے تھے وہ تہجد کی نماز پڑھنے کے بعد اماں کا بتایا ہوا عمل پڑھنے سے پہلے دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے لگا۔

''یا اللہ میں بہت گناہ گار ہوں میں تو نمازوں کا پابند

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اور اجڑنے سے بچ گئے تھے۔

[illegible]

کی حد تک گر گئی کہ دو محبت کرنے والوں کو جدا کرنے کے لیے اس نے یہ تک نہ دیکھا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط اس نے یہ تک سوچنا گوارا نہیں کیا کہ جو کام وہ کرنے جا رہی تھی اس کا انجام کیا ہوگا روز محشر وہ کیا منہ دکھائے گی اپنے رب کو بس اس نے ایسا کچھ بھی نہیں سوچا تھا شیطانوں کی دنیا کے جو راستے ہوتے ہیں ناں وہاں صرف لذتیں ہوتی ہیں پر شیطانوں کی دنیا بسنے والے شیطان یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی منزل صرف اور صرف جہنم ہے زبرج کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، منت کو برباد کرنے کے چکر میں آج چلنے پھرنے کیا اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہو گئی۔

''آپ صوفے پر کیوں سو رہے تھے نیہاد، جلدی سے اٹھ جائیں میں نے آپ کے لیے بریانی بنائی ہے۔ ارے آپ کے سر پر تو کافی چوٹ آئی ہے یقیناً میری وجہ سے لگی ہوگی میں ابھی فرسٹ ایڈ باکس لاتی ہوں۔'' نیہاد ساری رات نہیں سویا تھا وہ صوفے پر بیٹھ کر منت کو دیکھے جا رہا تھا کہ کب اسے ہوش آئے گا اور کب وہ اس کی آنکھوں کے سامنے جھلملا رہی ہوگی۔

''تم اٹھ گئیں، اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟'' نیہاد نے جاگتے ہی اس کی خیریت دریافت کی۔

''نیہاد میں جانتی ہوں میں نے آپ کو بہت تنگ کیا تھا نہیں جب میرے اندر وہ شیطانی روح طاری ہوتی ہوگی تو وہ میرے ذریعے سے آپ کو کیا کیا نقصان پہنچاتی ہوگی آج میں صحیح معنوں میں خود کو بہت ہلکا اور [illegible]

[illegible]

[illegible] ہو گئی ہے کہ اب تک تمہیں پتا ہے میں نے تمہیں کس طرح سمجھا ہے'' نیہاد نے منت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

''کیسے؟'' منت نے وجہ جاننے کا تجسس ظاہر کیا۔

''ایسے شدید تیز آندھی میں کوئی دیا جلتا ہوا آج صحیح معنوں میں مجھے تمہارا ساتھ ملا ہے تو یوں لگ رہا ہے جیسے منت کی شاخوں پر ہر لمحہ ہر پل کھل اٹھا ہے۔ اب مجھے زندگی سے کوئی شکوہ نہیں منت آج ہم صحیح معنوں میں ایک ہو جائیں گے۔ یہ انتظار صدیوں جیسا تھا اور جب ہم نے صدیوں کا انتظار کیا ہے تو ہمیں اب صدیوں ساتھ بھی رہنا ہوگا چاہے کوئی بھی ہمارے بیچ کیوں نہ آئے ہم کبھی جدا نہیں ہوں گے۔'' نیہاد نے منت کے ماتھے کو ایک بار پھر چومتے ہوئے کہا۔

منت نیہاد کے گلے لگ گئی اور یوں وہ دونوں ساتھ بھی رہنے لگے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے پاس۔

......☆☆☆......

دنیا کی کوئی بھی ایسی طاقت نہیں ہے جو انسان کو مرض بھی دے سکے اور شفا بھی یہ طاقت صرف اور صرف اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے وہ بیماری بھی دیتا ہے اور بیماری سے شفا بھی۔

زبرج اپنی کامیابی کے نشے میں بستر پر لیٹی مستقبل کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی جس میں نیہاد تھا اور وہ تھی کہ اچانک اسے جھٹکا سا لگا اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی سیاہ ہیولے نے اسے جکڑ لیا ہو۔ وہ اسے اپنی باہوں میں بھینچ رہا ہو، اس نے خود کو چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن بے بس رہی آہستہ آہستہ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے لیے عجیب بات یہ تھی کہ اس کا چہرہ [illegible] بھیانک ہو گیا تھا۔

[illegible] آنکھوں سے آنسو جاری ہونے [illegible] یہ بات تو بھی [illegible] لفظ زبان سے نہیں دل سے ادا ہو رہے تھے۔

''میرے اللہ ان سب کو تو میرے حصے میں تو نے جتنی بھی خوشیاں لکھی ہیں اس کے حق میں لکھ دے۔ میری سانسیں بھلے چھین لے مجھ سے پر اس کا ہر غم، ہر دکھ اس کے آنسوؤں پر صرف میرا حق ہو، وہ غمزدہ ہو پر ہنستی رہے اور اس کا غم مجھے لگ جائے چوٹ اس کو لگے پر وہ کھلکھلا رہی ہو اور اس کی چوٹ کا زخم ہتو میرے نصیب کر دے وہ ذریعہ ہے میری سانسوں کی روانی کا اس کے اندر جو بھی شیطان ہے تو اسے باہر نکال پھینک دے یہ کام تو تیرے لیے بہت آسان ہے اللہ پھر یہ آزمائش کیوں؟ مجھے میرا گھر چاہیے پر صرف اس کے نام کا زندگی چاہیے تو بس اس کے نام کی وہ بیوی ہے میری میرے اللہ مجھے اس سے جدا نہ کر۔'' دعا کے لیے جو ہاتھ اٹھے تھے وہ گر گئے اور ہاتھوں کے گرنے کے ساتھ ساتھ نیہاد بھی گر گیا سجدے میں اس کے آنسو اس کا درد اس کی بے بسی اور اس کی چاہت بیان کر رہے تھے۔ انسان کے جینے کا آسرا اگر اس سے چھین لیا جائے تو وہ زندہ رہ کر بھی زندہ نہیں رہ پاتا نیہاد کے ساتھ ساتھ بھی کچھ ایسا۔

دعا کرنے کے بعد وہ اماں کا بتایا ہوا وظیفہ اسی جائے نماز پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔ عمل کے دوران اس نے پیچھے مڑ کر بستر کی جانب دیکھنا چاہا جہاں منت سو رہی تھی پر وہ بستر پر نہیں تھی اپنا وظیفہ ادھورا چھوڑ کر وہ اسے جگہ جگہ تلاش کرنا شروع ہو گیا پر وہ کہیں نہیں ملی۔

پورے پی سی ہوٹل کا اندر سے جائزہ لینے کے بعد وہ ہوٹل کے باہر لان میں جو ہمیشہ کی طرح برف سے پوری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ آ کر اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگا پر منت کہیں نہیں تھی اتنے میں اسے عجیب سی درد کی کیفیت سے بھری چلانے کی آواز سنائی دی۔ نیہاد نے گردن اوپر اٹھا کر دیکھا تو وہ دیکھتا ہی رہ گیا منت کے اندر شیطانی روح ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر داخل ہو چکی تھی اور وہ پی سی ہوٹل کی بلڈنگ کی چھت پر جانوروں کی طرح کھڑی تھی۔ اتنے کونے میں کھڑی تھی کہ اگر ذرا سا بھی ہل جائے تو نیچے گر جائے گی وہ وجود منت کا نہیں بلکہ چڑیل کا لگ رہا تھا منت کا چہرہ پورا سفید پڑ گیا تھا اور آنکھیں بالکل سرخ پڑ گئی تھیں اور منہ کے ہر گوشے سے مسلسل خون بہے جا رہا تھا۔ نیہاد نے اس کی گردن پر چمکتے ڈائمنڈ نیکلس سے پہچانا کہ وہ منت ہی ہے۔

''دیکھو تم جو بھی ہو میری منت کے جسم سے نکل جاؤ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں میری منت کو نقصان پہنچانا بند کر دو، تم ایسا کیوں کر رہی ہو ہمارے ساتھ۔'' نیہاد چیخ چیخ کر اس شیطانی روح سے منت کی خیر کی بھیک مانگنے لگا۔

''میں اس کو برباد کرنے کے لیے بھیجی گئی ہوں اور آج یہاں سے الٹی چھلانگ لگا کر میں نے اس کے دماغ پر ایسی چوٹ لگانی ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے تمہیں بھول جائے گی۔'' وہ وحشت ناک آواز میں بول رہی تھی وہ منت کی آواز نہیں تھی منت کا جسم کسی جنگلی جانور کی طرح ہوٹل کی بلڈنگ کے اوپر اِدھر اُدھر چل رہا تھا۔

''میں تم سے بھیک مانگتا ہوں خدا کا واسطہ ہماری زندگی سے دور چلی جاؤ۔'' نیہاد رو رہا تھا ہر گزرتا لمحہ اسے ڈرا رہا تھا کہ کہیں منت اس سے اس برفیلی سرد رات میں ہمیشہ کے لیے دور ہی نہ ہو جائے۔

جانور کی طرح چلتے چلتے تین منزلوں پر مشتمل ہوٹل کی چھت سے اس نے چھلانگ لگا لی اور نیہاد نے اسے تھام لیا وہ دونوں لان کی گھاس پر گر گئے پر منت نیہاد کے اوپر گری جس کے نتیجے میں اس کے جسم کو کم اور نیہاد کے جسم کو تھوڑا زیادہ نقصان پہنچا تھا نیہاد کے ماتھے پر منت کا سر ٹکرایا تھا جس کے باعث نیہاد کے ماتھے پر گہری چوٹ لگ گئی۔

''یہ وظائف باقاعدگی کے ساتھ پڑھنے ہیں ذرا سا بھی ناغہ ہوا تو یہ عمل جو منت پر کیا گیا ہے پرانا ہو جائے گا اور اگر پرانا ہو گیا تو نقصان ہو جائے گا۔'' نیہاد کا وظیفہ جو وہ ہر رات تہجد کے بعد باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا تھا اس رات ادھورا رہ گیا منت کو جو پوری طرح بے ہوش ہو چکی تھی جگانے کی بہت کوشش کی پر وہ اٹھ نہ سکی وہ سانسیں لے رہی تھی پر ہوش میں نہیں آ رہی تھی۔ رات کے چار بجے اسے بھور بن میں کہاں کوئی ڈاکٹر ملتا وہ امید ہو گیا پر اس نے اپنے عمل کو وضو کرنے کے بعد دوبارہ سے شروع کیا پر وہ بار بار ڈر رہا تھا کہ کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے کیونکہ اماں نے عمل کو

تلاش

حسیب جواد علی

تنہائی اگر انسان کو مارتی نہیں ہے تو اندر سے کھوکھلا ضرور کر دتی ہے اور جو انسان اس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے وہ نفسیاتی ہو جاتا ہے۔

ایک لڑکی کی روداد، جو پاگل پن سے بچنے کے لیے گناہ کی جانب بڑھ رہی تھی۔

منیب نے ریڈیو اسٹیشن کے صدر دروازے سے نکل کر وہاں قریب ہی ٹھہر جانے کا فیصلہ کیا، بھلا رکشے کے لیے چل کر کیوں جایا جائے؟ وہ تو خود ہی آ جائے گا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو رفیعہ بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے ہاتھ سے ساڑھی کا پلو سنبھالے ہوئے دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ منیب نے سرسری سی نظر اس پر ڈالی اور پھر مڑ کر دیکھا بھی نہیں، دراصل وہ کوئی ایسی قابل توجہ تھی بھی نہیں خاص طور پر منیب کے لیے۔ وہ اس سے عمر میں دو چار سال بڑی ہی ہوگی۔ اس کی شخصیت میں ساڑھی ہی ایک منفرد چیز تھی، کم ہی خواتین ساڑھی استعمال کرتی ہیں۔ خاص طور پر وہ جن کو لڑکی کہلانے کا شوق ہو وہ تو بالکل بھی نہیں، یہ لباس سنجیدگی اور وقار کی علامت ہے لیکن عمر بڑھا کر بتاتا ہے اور عمر پر سمجھوتہ کوئی لڑکی یا عورت نہیں کرتی، منیب کا یہی خیال تھا۔

رفیعہ ہفتے دو ہفتے میں ایک بار ریڈیو اسٹیشن کا چکر ضرور لگاتی تھی۔ کبھی کبھی ڈراموں میں چھوٹے موٹے کردار مل جاتے تھے کیونکہ سینئر فن کاروں سے دوستی ہو گئی تھی اس لیے اس کی ریکارڈنگ نہ بھی ہو تو بھی آ جاتی تھی۔ معاوضہ اتنا دلکش نہیں تھا لیکن وہ ریڈیو کا سنہری دور تھا، سنا جاتا تھا۔ فنکار نام سے پہچانے جاتے تھے اس لیے اس ادارے سے تعلق رکھنا ضرور تھا۔ یہ سب معلومات عظمت نے فراہم کی تھیں، اس کا وہ دوست جس کے پاس سے اٹھ کر ابھی ابھی وہ باہر آیا تھا۔ وہاں رفیعہ کو عظمت کے ساتھ بحث میں الجھا چھوڑ کر منیب نے سوچا کہ ضرور وہ بھی رکشے کے انتظار میں ہے لیکن اس کو کیا؟ اس نے اپنا دھیان دور چوک کی طرف کرلیا، جدھر سے کوئی خالی رکشا آتا تھا۔

ڈھلتے دن کے ساتھ یہ سڑک ویران ہوتی جاتی تھی اور مغرب کے بعد تو بالکل ہی سناٹا چھا جاتا تھا۔ اسے پھر رفیعہ کا خیال آ گیا۔

”وہ اتنی جلدی کیسے باہر آ گئی؟“ ابھی چند لمحے پہلے ہی تو وہ عظمت کے کمرے میں اس کے ساتھ بحث میں الجھی ہوئی تھی۔ موضوع تھا رشتہ داروں کی بے اعتنائی، بے پروائی خود غرضی وغیرہ وغیرہ۔ منیب نے اس بحث میں حصہ ہی نہیں لیا تھا، وہ عظمت سے ملنے آیا تھا جو مستقل طور پر رفیعہ سے اٹکا ہوا تھا۔ منیب کی طرف اس نے دھیان ہی نہیں دیا۔ جب کسی لڑکی سے بات کرتے ہوئے کوئی شخص معمول کے خلاف حرکتیں کرتا تھا تو وہاں اس کیفیت کو بریک فیل ہونا کہا جاتا تھا اور اس وقت عظمت کے بریک فیل تھے لہٰذا منیب صرف سن رہا تھا اور بے زار ہو رہا تھا۔ عظمت اپنے آپ کو مثبت سوچ رکھنے والا ثابت کرنے کی کوشش کرر ہا تھا۔

رفیعہ کے ماں باپ نہیں رہے تھے، بھائی بھابی سے لڑ کر گھر تقریباً چھوڑ چکی تھی۔ خوش قسمتی سے ایک اچھے پرائیوٹ اسکول کی نوکری اور ہیڈ مسٹریس کی مہربانی کے طفیل وہاں اسکول ہی میں ایک چھوٹا سا کمرہ رہائش کے لیے مل گیا تھا شاید ساتھ ایک ٹیچر اور بھی رہتی تھی۔ ضرور وہ کچھ ایسے ہی حالات کا شکار ہوئی یا اس کا گھر کسی اور شہر ہی ہوگا۔ رفیعہ چھٹیوں میں چند روز ہی بھائی کے پاس گزارتی تھی اور پھر وہی جھگڑا...... چند روز خالہ یا پھوپی کے یہاں اور باقی قریبی سہیلیوں کے یہاں گزرتے اور پھر گھوم پھر کر واپس اسی چھوٹے سے کمرے میں آ جاتی تھی۔ یہ سب اس بحث کے دوران پتا چلا اور کچھ عظمت اس کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔ عظمت بہت ٹھرکی تھا، یونیورسٹی کالج کے لڑکے اس زمانے میں لڑیوں کے کوائف جمع کرنے کے بہت شوقین ہوتے تھے۔ کچھ اس معاملے میں بہت مشہور بھی ہوجاتے تھے، ایک صاحب کا تو یہ دعویٰ تھا کہ لڑکی کا نام بتاؤ تفصیلات فوراً مہیا ہوجائیں گی۔ ان کو معلوم تھا کہ کوثر شیخ کے ابا کیا کرتے ہیں، کتنے بھائی بہن ہیں اور کیا کیا کرتے ہیں اور نور النساء جو پڑھاتی ہیں بہت سنجیدہ ہے اور ایم اے کے بعد ایم فل اور پی ایچ ڈی کا ارادہ رکھتی ہے۔ کسی یورپین یونیورسٹی سے، دراصل ایک مشہور طوائف کی بیٹی ہے۔ ہیرآباد میں بس چھوڑ دیتی ہے اور دو تین گلیاں بدل کر وہاں یعنی اپنے گھر...... اس بازار والے گھر۔ رستہ بدل بدل کر پہنچتی ہے، ایسے لڑکے آج بھی ہوں گے یقیناً ہوں گے۔

عظمت بھی ان میں سے ایک تھا جو یہ لت یہاں آفس میں اپنی روزگار کی جگہ پر بھی لے آیا تھا۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے اس نے ریڈیو اسٹیشن آنے والی نہ صرف لڑکیوں بلکہ ادھیڑ عمر کی خواتین کے بارے میں بھی بہت سی معلومات جمع کی ہوئی تھیں۔ کچھ تو بہت سنسنی خیز بھی تھیں، معلومات اتنی زیادہ تھیں کہ لوگ کہیں اس زمانے میں کمپیوٹر عام استعمال میں ہوتا تو وہ ان تمام کوائف اور تفصیلات کو محفوظ کرلیتا اور اس عنوان سے ویب سائٹ بھی لانچ کردیتا۔ لڑکیوں کو بہانے سے آفس میں بٹھانا اور ان کو چائے پلانا اس کی بیماری کا دوسری اسٹیج تھی۔

اس وقت بھی وہ رفیعہ کو زیادہ سے زیادہ وہاں روکنے کے مقصد کی بنا پر بات سے بات نکال کر بحث کو طویل کرر ہا تھا ورنہ موضوع میں کوئی جان نہیں تھی سب کچھ رفیعہ کے ذاتی اور مخصوص حالات اور تجربات سے متعلق تھا اور پتا نہیں سچ بھی تھا یا نہیں۔ منیب سنتا رہا تھا، دخل انداز نہیں ہوا اور پھر وہ اس کمرے سے باہر نکل کر گیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔

”تو پھر وہ کیسے آ گئی اتنی جلدی؟“ اس کو پھر خیال آ گیا۔ ”اگر وہ ساڑھی استعمال نہ کرے تو وہ چار سال اس کی

عمر کے جھڑ جائیں گے۔" ایک اور خیال بھی آیا' وہ اتنی عام سی بھی نہیں تھی اگرچہ خوب صورت نہیں تھی لیکن پھر بھی کچھ بات تو تھی اس میں۔

لجپت روڈ کی طرف سے ایک رکشہ آتا نظر آیا' منیب نے اشارہ کیا اور پوری طرح رکنے سے پہلے ہی وہ اچک کر اس میں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف سے رفیعہ قریب آئی لیکن ٹھہر گئی۔

"میں اتر جاتا ہوں' میں نے آپ کو رکشہ روکتے دیکھا نہیں تھا۔" اس نے نہایت خلوص کے ساتھ پیش کش کی۔

"نہیں میں اور انتظار کر لوں گی' آپ بیٹھ گئے ہیں تو آپ ہی جائیں۔" یہ کہہ کر وہ واپس فٹ پاتھ پر چلی گئی' رکشہ چل پڑا۔ ایک لمحے کو منیب نے کچھ سوچا' رکشہ ڈرائیور کو رکنے کے لیے کہا اور تیزی سے اتر کر رفیعہ کے پاس پہنچا۔

"میں لطیف آباد جا رہا ہوں اگر آپ کو اس طرف ہی جانا ہے اور آپ مناسب سمجھیں تو آپ بھی آ جائیں۔ اندھیرا ہو رہا ہے اور اس وقت یہ سڑک ویران ہی رہتی ہے۔" اس سے پہلے منیب نے کسی لڑکی کو اس طرح کی پیش کش نہیں کی تھی۔ نہ جانے کیسے کہہ دیا اس نے لیکن رفیعہ نے یہ پیش کش قبول کرنے میں دیر نہیں لگائی' اب یہ پندرہ منٹ کا سفر خاموشی سے تو نہیں کاٹا جا سکتا تھا' رفیعہ نے ہی پہل کی۔

"یہ عظمت صاحب نہ جانے کس طرح کی باتیں کر رہے تھے جس پر پڑتی ہے وہی جانتا ہے۔ میں نے تو رشتہ داروں سے دکھ ہی پائے ہیں' اپنوں کے دیئے ہوئے زخم گہرے بہت ہوتے ہیں بلکہ دائمی ہوتے ہیں' کبھی نہیں بھرتے۔ اب دیکھیے نا گھر سے دور ہوں' اکیلی رہ رہی ہوں' بالکل غیر محفوظ۔ بھائی بھابی مجھے بوجھ سمجھتے ہیں' ہماری ہیڈ مسٹریس اچھی ہیں جو اسکول میں ہی رہنے کی اجازت دے دی۔" یہ ساری باتیں منیب سن چکا تھا۔

"کبھی کبھی میں مسز شمس کے یہاں چلی جاتی ہوں' بہت اچھی ہیں لیکن ہر روز تو نہیں جا سکتے اور آخر کتنے روز کوئی رہ سکتا ہے اس طرح دوسروں کے گھر۔" رفیعہ کی بات پھر شروع ہو گئی۔ منیب کو مسز شمس اسماعیل کے حالات معلوم تھے' وہ خود شوہر سے علیحدگی اختیار کر کے تنہا رہ رہی تھیں۔ وہ ایک سینئر آرٹسٹ تھیں اور کسی حد تک مستقل طور پر ریڈیو سے وابستہ تھیں۔

"وہ تو بہت اچھی خاتون ہیں' شکر ہے آپ کو اچھے لوگ بھی ملے ہیں زندگی میں۔" منیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کے بھائی بھی ضرور آپ کو چاہتے ہوں گے' ممکن ہے اپنا گھر بچانے کے لیے بیوی سے جھگڑا کرنے سے گریز کرتے ہوں۔ بچے ہو جائیں تو اکثر مرد مصلحت پسند ہو جاتے ہیں ایسا ہو تو لگتا ہے بیوی سے ڈرتے ہیں' شاید ان کو......" رفیعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ بھائی کی طرف داری کر رہے ہیں' مرد ہمیشہ مرد کی ہی طرف داری کرے گا۔ کیوں ڈرتے ہیں یا کیوں مصلحت پسند ہیں؟ یوں کہیں کہ بزدل ہیں' بیوی کو سدھار نہیں سکتے۔" اس کے لہجے میں احتجاج تھا' منیب گھبرا گیا۔

"میں نے طرف داری نہیں کی' میں نے کہا تھا شاید...... شاید ایسا ہو؟ چلیے جانے دیجیے میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آپ بھی اب غصہ تھوک دیجیے۔" منیب نے حسب عادت بہت نرم لہجے میں معذرت کی۔ اس نے سوچا کہ رکشہ میں اس طرح کی باتیں ٹھیک نہیں' رکشہ ڈرائیور بھی سن رہا ہوگا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ اتنا شور ہوتا ہے انجن کا کہ برابر والے کی آواز بھی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے' اس شور کا ایک فائدہ منیب کو ہو رہا تھا لیکن شاید اس کا ادراک اسے بالکل نہیں تھا۔ رفیعہ اپنا کان اس کے منہ کے قریب کر لیتی تھی اس کی بات سننے کے لیے اتنا قریب کہ دو ایک بار رکشے کے جھٹکوں کی وجہ سے اس کا گال منیب کے ہونٹوں سے چھو گیا۔ نہیں معلوم کہ یہ اضطراری تھا یا غیر اضطراری' شعوری تھا یا غیر ارادی۔

"مجھے افسوس ہے' دراصل میں بہت جذباتی ہوں' مجھے الفاظ کا چناؤ بھی نہیں آتا شاید سب ہی دکھی لوگ جذباتی ہو جاتے ہیں۔ چلیے اگر میری بات کوئی بری لگی ہو تو معاف کر دیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ منیب کے گھٹنے پر رکھ دیا لیکن پھر فوراً ہی ہٹا لیا۔ منیب کی منزل آ گئی تھی لیکن رفیعہ کا اسکول تھوڑا آگے تھا۔ اسکول کے سامنے پہنچ کر رفیعہ نے پیسے رکشہ ڈرائیور کی طرف بڑھا دیئے جو اس نے پتا نہیں کب سے پرس سے نکال کر ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے' منیب نے رکشے والے کو سختی سے منع کیا پیسے لینے کو۔

"پیسے میں دوں گا مجھے بعد میں اترنا ہے۔" اس دوران اس نے رفیعہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا جو وہ رکشے والے کی طرف بڑھائے ہوئے تھی فوراً ہی اس نے ہاتھ چھوڑ دیا اور پیسے واپس پرس میں چلے گئے اور پھر رفیعہ نے اپنا منہ منیب کے کان کے قریب لا کے اس کو چائے کی دعوت دی۔

"تھوڑی دیر کو آ جائیں ایک پیالی چائے پی لیجیے پھر چلے جائیے گا' رکشہ کو جانے دیں۔" منیب فیصلہ نہیں کر سکا اسے کوئی ایسی جلدی بھی نہیں تھی ایک رشتہ دار کے یہاں جانا تھا پھر بھی منیب نے معذرت کر لی۔

"نہیں آج نہیں پھر کبھی' اگلے ہفتے...... ہاں اگر کوئی کام میرے لائق ہو تو بتایئے گا۔"

"کیسے بتاؤں گی' کیا آپ نے مجھے اپنا نمبر دیا ہے؟" رفیعہ نے کہا۔

"میں اکثر باہر ہی ہوتا ہوں' ایک دوسری جگہ ٹرانسمیٹر پر۔ آپ عظمت کے کمرے سے ہاٹ لائن پر بات کر لیجیے' وہاں سے میرا دوسرا فون نمبر بھی مل جائے گا۔" منیب نے جان بوجھ کر اپنا فون نمبر نہیں دیا' اس طرح معاملہ ایک ہفتے تک ٹال دیا اس نے رفیعہ کا نمبر بھی نہیں پوچھا۔ گیند رفیعہ کے کورٹ میں پھینک دی' رکشہ سے اترنے سے پہلے رفیعہ نے منیب کو نظر بھر کر دیکھا پھر رکشے والے کو جو سامنے کی طرف منہ نیچے کیے رکشے کے کسی پرزے سے الجھا ہوا تھا۔ رفیعہ نے ہاتھ بڑھایا تو منیب کو بھی اخلاقاً مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانا پڑا۔ اس نے ایک غیر ضروری سا زیادہ دباؤ اپنے ہاتھ پر محسوس کیا' پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی گیٹ کھول کر اندر احاطے میں داخل ہو گئی۔ رکشہ چل پڑا اور منیب نے سوچا کہ اس نے جاتے ہوئے ایک بار ضرور مڑ کر دیکھا ہوگا' ساتھ ہی اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا جہاں رفیعہ کے ہاتھ کا نرم لیکن گرم سا دباؤ ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔

"عجیب ہے یہ لڑکی...... میرا مطلب ہے یہ خاتون' شاید لڑکی بھی کہی جا سکتی ہے بشرطیکہ بجائے ساڑھی کے وہ شلوار قمیص میں ہو۔ شکل صورت کا صحیح اندازہ ہو نہیں پا رہا تھا' وہ ہلکے میک اپ میں ہی رہتی تھی' کسی دن صبح دیکھے تو اندازہ ہو جائے گا اس نے قبول صورت تو مان لیا تھا' عارضی طور پر لیکن خوب صورت بالکل نہیں۔"

اگلے دو چار دن اس کو رفیعہ کا بالکل خیال نہیں آیا' چوتھے روز فون آیا سب سے پہلے اس نے اپنا نمبر منیب کو نوٹ کرایا' ضرور اس نے عظمت سے اس کا نمبر لیا ہوگا تھوڑی سی بات ہوئی چائے کی دعوت دہرائی لیکن وہ وعدہ بھی وفا نہ ہوا۔ اگلے دن ہی فون آیا وہ شکوہ کر رہی تھی اس نے بہت انتظار کیا تھا' ساری شام

اور پھر بقول اس کے لیے واپس آئی یہ اور پھر اس کے بعد کیا ہوا یعنی ڈپریشن سے سب اس نے نہیں بتایا بعد میں منیب نے سوچا کہ ایک بار اس سے مل لیا جائے لیکن تنہائی میں نہیں فلم کی دعوت دے دی جائے ملنا بھی ہو جائے گا اور گھر کی تنہائی اور اس کے متوقع اثرات سے محفوظ بھی رہے گی پھر یہ فیصلہ بھی بدل دیا لیکن وہ تو غلط فہمی میں پڑ چکی تھی کئی بار فون پر بات ہوئی اس کی طرف سے ہی فون آتا تھا اور وہ نرمی سے پیار سے اس کو ٹال دیتا تھا اور ایک نیا وعدہ کر لیتا تھا ملنے کا' رفیعہ کی دل میں اٹھتی چنگاریوں کو منیب کی گرم گفتاری کی ٹھنڈی ہوا نے آگ میں تبدیل کر دیا۔ معاملہ آسان بنانے کے لیے ایک دن خود اس نے پہل کر دی اور دبے دبے الفاظ میں محبت کا اظہار کر دیا' نیند میں کئی راتوں کو چونک کر اٹھ جانا اور پھر دیر تک نہ سو سکنا۔ اس نے منیب کے گھر کا فون نمبر مانگا اس کا کہنا تھا کہ کبھی اسے کسی تسلی دینے والے کی ضرورت پڑے تو وہ اس سے ہی بات کرنے کو ترجیح دے گی۔ سوائے منیب کے اور کوئی اس کو سمجھ ہی نہیں سکا تھا وغیرہ وغیرہ۔

پھر گھر والوں کے اصرار پر وہ اپنے شہر چلا گیا چند روز کے لیے' واپسی پر اپنی شادی کے حتمی فیصلے کی خبر قریبی دوستوں کو سنائی۔ لڑکی گھر والوں کی پسند کی تھی اور اس کے بارے میں منیب کے پاس اتنی ہی معلومات تھیں جتنی اس کو بتائی گئی تھیں لہٰذا دوستوں کی سوالات کے مطمئن کر دینے والے جوابات نہیں دے سکا' اپنے آفس میں اس نے سب کو سمجھا دیا کہ کسی لڑکی کا فون آئے تو اسے ٹال دیا جائے۔

رفیعہ نے کئی بار فون کیا عظمت سے بھی پوچھا تو اس نے ٹال دیا' اس نے چند روز کا وقفہ دے دیا یہ سوچ کر کہ شاید وہ کہیں مصروف ہے۔

اس دن چھٹی تھی اور منیب صبح صبح اپنے دوست سے ملنے قلعے والی سڑک سے اوپر کی طرف جا رہا تھا ایک دروازے پر سڑک سے چار سیڑھیاں اوپر اسے مسز شمس اسماعیل نظر آئیں شاید باہر رکھے کنٹینر میں کوڑا ڈالنے آئی تھیں۔ منیب پر ان کی نظر پڑی تو آواز لگا دی۔

"کہاں بھٹک رہے ہو واہی تباہی' ادھر آؤ بلکہ اوپر آ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئیں' دروازہ کھلا چھوڑ گئیں مجبوراً اسے اندر جانا پڑا۔

"تم میری مہمان سے بات کرو میں چائے لے کر آ رہی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.urdubooksfree.pk

ہوں۔“ انہوں نے صحن میں واقع کچن سے کہا۔ صحن سے گزر کر وہ اندراخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ رفیعہ فرش پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی، شب خوابی کے لباس میں تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ رات مسز شمس کے یہاں ہی رہی تھی۔ منیب کو دیکھتے ہی تیزی سے اٹھی اور منیب کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔

”مجھے بالکل توقع ہی نہیں اس ملاقات کی۔“ اس دوران وہ بالکل قریب آ گئی۔

”میں سامنے سے گزر رہا تھا کہ مسز شمس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا، آپ کا کیا حال ہے؟“ یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا بلکہ اپنے آپ کو دور کر لیا رفیعہ سے۔

”شکر ہے حال تو پوچھا، ہم تو فون پر بھی بات کرنے کو ترس گئے۔ بہت انتظار کرایا، سنگ دلی کا مظاہرہ کیا ہے آپ نے۔“ یہ کہہ کر اس نے باہر کی آہٹ پر کان لگائے اطمینان کر لینے کے بعد پھر منیب کے قریب آ گئی یقیناً وہ مسز شمس کی مصروفیت کا فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھی۔ ایک خود سپردگی کی سی کیفیت میں اس نے اپنے ہاتھ ذرا سے اوپر اٹھا رکھے تھے اور بقیہ اقدام کی منتظر تھی لیکن منیب اپنی جگہ پر جیسے سن ہو گیا تھا۔ اس نے گھبرا کر صحن کی طرف نظر دوڑائی بلکہ اشارے سے رفیعہ کو ممکنہ خطرے سے آگاہ کرنے کی بھی کوشش کی مگر لگتا تھا وہ اپنی چاہت کا طبعی طریقے سے اظہار کرنے پر تلی ہوئی تھی چند لمحے کے لیے ہی سہی تمام تر خطرے کے باوجود بھی۔ اسی اثناء میں باہر کچن سے مسز شمس کی آواز آئی۔

”رفیعہ ان کو مبارک باد دے دو، ان حضرت کی منگنی ہو گئی ہے اگلے مہینے شادی ہے۔ انہوں نے تو مجھے بتایا نہیں ان کے دوستوں نے بھانڈا پھوڑا ہے۔“

رفیعہ کو جیسے بجلی کا جھٹکا سا لگا، اس کے ہاتھ نیچے گر گئے چہرے پر جیسے ویرانی چھا گئی اور پھر وہ اچانک ہی چراغ پا ہو گئی۔

”تم نے مجھے دھوکا دیا......“ اس کی آواز میں تیزی تھی، چبھن تھی لیکن اتنا کنٹرول تھا کہ آواز کمرے کے باہر صحن یا کچن تک نہ جائے۔ ”تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا، جھوٹی آس دلاتے رہے اور پھر میرا فون تک اٹینڈ کرنا چھوڑ دیا......“ اس نے ہاتھ بڑھا کر منیب کا گریبان پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر گریبان چھڑانے کی کوشش کی تو رفیعہ نے زور آزمائی شروع کر دی منیب نے بہت ہی نرمی سے اس کو پیچھے دھکیل دیا اور اپنے کالر کو ٹھیک کیا۔

”میری بات سنیں، سمجھنے کی کوشش کریں میں ابھی شادی کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ یہ میرے گھر والوں کا فیصلہ تھا، وہ نہیں مانے اور مجھے ہار ماننی پڑی۔ یہ سب اچانک ہو گیا ہے میں خود پریشان ہوں۔“ اس نے حسب معمول انتہائی نرم لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ گالم گلوچ پر اتر آئی۔

”تو واپس آتے ہی مجھے کیوں نہ بتایا، کمینے جھوٹے...... بدلحاظ...... سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تم لوگ کوئی بھی رشتہ نہیں نبھا سکتے، کسی طرح کی محبت میں پورے نہیں اترتے۔ تم بھی ان ہی میں سے ایک ہو بزدل کمینے......“ وہ نہ جا اہزیان بک رہی تھی اور منیب حیرت سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ہی اس کو شدید غصہ کا دورہ پڑ گیا، اس کی آواز بدل گئی۔ نرمی اور نرم گفتاری نہ جانے کہاں غائب ہو گئی اس نے رفیعہ کے بال اپنی مٹھی میں پکڑ لیے۔

”الو کی پٹھی...... اگر اب ایک لفظ اور تیری زبان سے نکالا تو اتنا ماروں گا کہ زندگی بھر کو بدزبانی سے توبہ کر لے گی۔ کب میں نے تیری طرف قدم اٹھایا؟ کب میں نے کوئی وعدہ کیا تجھ سے؟ میں نے کیا بے وفائی کی؟ وہ رکشہ کا پندرہ منٹ کا سفر اس پریشانی کا سبب بن گیا۔ ارے پریشانی تو چھوٹا لفظ ہے یہ سفر تو میرے لیے عذاب بن گیا۔ میں نے تو کبھی تم سے ملنے کی کوشش ہی نہیں کی، میں تو اپنی متوقع شادی کی وجہ سے اخلاقی طور پر دباؤ میں تھا اور تم مجھے دعوت پر دعوت دیتی رہیں۔ میں تو اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور تم آگے بڑھتی رہیں میری طرف، میرا تمہاری طرف بڑھنا دھوکا ہوتا بددیانتی ہوتی اور تم......“ اس نے جھٹکے سے رفیعہ کے بال چھوڑ دیئے۔

ہلکی سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور قریب ہی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ رفیعہ چند لمحے کھڑی رہی، بے حس و بے حرکت اور پھر دھم سے قالین پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جیسے کہیں خلا میں بھٹک رہی تھیں، اس نے شکست مان لی تھی اور فی الوقت اپنی شکست کا ماتم منا رہی تھی۔ مسز شمس کی آمد کا چائے کے برتنوں کی ہلکی سی کھنکناہٹ سے پتا چلا، اس نے اپنے دونوں انگوٹھوں سے آنکھوں کو دبایا تو آنسوؤں کا ریلا کئی قطروں کی شکل میں نیچے میلے سے قالین میں جذب ہو گیا۔ اپنا نظر کا چشمہ میز سے اٹھا کر جلدی سے ناک پر ٹکا لیا، اپنی کیفیت کو مسز شمس سے چھپانے کے لیے لیکن ان کا دھیان بالکل ادھر نہیں تھا۔ وہ برتن رکھ کر واپس کچھ لینے کچن کی طرف گئیں تو منیب نے کچھ کہا اور نہ رفیعہ نے...... دونوں اس طرح لاتعلق بیٹھے رہے جیسے ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں تھے اور پھر چائے پی کر اس نے مسز شمس سے اجازت لی اور بجائے دوست کے پاس جانے کے واپس گھر کی طرف چل پڑا۔

چند روز بعد اس نے عظمت سے ملاقات کا پروگرام بنایا اور شام کو اس کے گھر پہنچ گیا خواتین کے بارے میں۔ خاص طور ریڈیو اسٹیشن آنے والی خواتین کے بارے میں نہ صرف اس کے پاس معلومات کا خزانہ تھا بلکہ وہ اس معاملے میں نفسیات دان ہونے کا بھی دعوے دار تھا۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو بہت کچھ ہونے کے دعوے دار ہوتے ہیں لیکن دراصل عملی طور پر ناکام لوگ ہوتے ہیں جو اس نے سوچا کہ بات چیت سے شاید دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جائے۔ خلاف توقع عظمت نے گفتگو کے دوران کہیں کہیں سنجیدگی کا بھی مظاہرہ کر دیا اور کچھ کام کی باتیں بھی بتا دیں۔

”یار...... یہ خراب لڑکی نہیں ہے، اپنوں کی گھر والوں کی محبت کو ترسی ہوئی ہے۔ جو کام گھر والوں کو اس کے بھائی بھابی، خالہ، پھوپی کو کرنا چاہیے وہ اس کو خود کرنا پڑ رہا ہے یعنی شوہر کی تلاش، اس کو ایک گھر چاہیے ایک ٹھکانہ چاہیے۔ شادی ہی اس کے بقا کا ذریعہ ہے۔ وہ تم سے متاثر ہو گئی اور تمہارے تعلق سے مستقبل کے منصوبے بنا بیٹھی، دراصل تم نے ہی اس کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا۔“

”یار میں نے کیا کیا؟ مجھے جو مواقع ملے اس کے لیے تو یہاں لوگ ترستے ہیں۔“ میرے ضمیر نے مجھے روکا۔ ”اگر میں اپنی شادی کے مسئلے میں اٹکا ہوا نہ ہوتا تو شاید میں بھٹک جاتا۔ میرے دل میں ایسی ویسی کوئی بات دراصل آئی ہی نہیں۔“ منیب اس طرح صفائی پیش کر رہا تھا کہ جیسے عظمت جج ہو اور وہ اس کی عدالت میں ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہوا ہو۔

”میرے بھائی غلطی تمہاری یہ ہے کہ تم بہت نرم دل اور نرم گفتار ہو۔ اس بات کا تمہیں اندازہ ہی نہیں۔“ ”اتنے میٹھے لہجے میں بات کرتے ہو کہ سامنے والا پگھل جاتا ہے، خاص طور پر اگر سامنے صنف نازک ہو۔

”سچ بتاؤ اس میٹھی چھری سے کتنی مرغیاں ذبح کر چکے ہو؟“ منیب کو عظمت کا یہ مذاق بالکل پسند نہیں آیا، اس کا بنا ہوا منہ دیکھ کر وہ ذرا سنجیدہ ہو گیا۔

”مذاق ایک طرف

ہے کہ وہ اس طرح کی چوٹیں پہلے بھی کھا چکی ہے کوئی نئی بات نہیں اس کے لیے۔ وہ چوٹ کھا کر سنبھلنا بھی جانتی ہے۔“ معلوم نہیں عظمت کی اس بات پر منیب نے دھیان دیا یا نہیں، وہ سوچوں میں گم تھا اور رفیعہ کے لیے اس کے دل میں رحم کا جذبہ ابھر آیا تھا۔

دو ماہ بعد منیب آفس کی گاڑی میں ریڈیو اسٹیشن کے گیٹ سے نکل رہا تھا تو اس نے رفیعہ کو ایک درمیانہ قد کے سانولے سے خراب اندام شخص کے ساتھ دیکھا حلیہ سے دواؤں کی کمپنی کا نمائندہ لگ رہا تھا وہ اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ شاید رفیعہ اس کے ساتھ ہی آئی تھی اور اب ایک پیار بھری مسکراہٹ کے ساتھ اس نئی آسامی کو رخصت کر رہی تھی۔ اس شخص نے اپنا دواؤں کا بیگ موٹر سائیکل کے کیریئل پر چیک کیا کہ کہیں گر تو نہ جائے گا رستے میں اور پھر وہ ہاتھ ہلا کر روانہ ہو گیا۔

منیب نے سوچا شاید رفیعہ کی اس سے شادی ہو چکی ہے لیکن نہیں شاید ابھی نہیں کیونکہ اس کے لباس سے لگتا نہیں تھا کہ وہ شادی شدہ ہو چکی ہے۔ وہی ملگجی سی ہلکے سبز رنگ کی ساڑھی تھی جس کا پلو اس نے اپنے کھلے پیٹ پر لپیٹا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ اس دواؤں کی کمپنی کے نمائندے کی کس بات سے متاثر ہوئی ہوگی شاید اس طرح کے حالات کی شکار لڑکیوں کو لڑکوں میں متاثر کرنے والی کوئی نہ کوئی بات نظر آ ہی جاتی ہے اور وہ بڑی بڑی برائیوں کو نظر انداز کر کے کسی چھوٹی موٹی اچھائی کو بنیاد بنا لیتی ہیں۔

بے سہارا یتیم بیٹیاں اور بے مہر اور بے پروا بھائیوں کی بہنیں ایسے ہی بھٹکتی ہیں اور دھوکے کھاتی ہیں۔ اللہ کرے کہ اس پروجیکٹ پر رفیعہ کو کامیابی مل جائے اس کے دل سے دعا نکلی اور تب اس کا دل چاہا کہ اگر کہیں رفیعہ کا بھائی اسے نظر آ جائے تو اتنی مار لگائے اس کی کہ بس۔

* * *

کرن

انجم فاروق ساحلی

یہ درست ہے کہ انسان کو صبر اور قناعت کا دامن ہاتھ سے نہی چھوڑنا چاہیے۔ جس نے بھی صبر کا دامن چھوڑ کر شارٹ کٹ راستہ اختیار کیا وہ کامیاب رہ کر بھی ناکام رہتا ہے۔

ایک حسینہ کی رودا، وہ غربت کی کڑواہٹ سے تنگ آگئی تھی۔

کرن کی چمک دمک اور آب وتاب واقعی سورج کی مانند تھی۔ وہ جتنی حسین اور خوبصورت لڑکی تھی اس کا ماحول اتنا ہی گندا اور غلیظ تھا۔ کرائے کا تنگ وتاریک مکان، جس کا رنگ جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا۔ گھر کے افراد کی بہتات، خیر سے آٹھ بہن بھائی تھے اور ابا کرم دین کریانے کی دکان چلاتے تھے۔ جس سے اخراجات کیا پورے ہوتے بس گزر بسر بھی مشکل سے ہی ہوتی تھی۔ اماں لوگوں کے کپڑے دھو دھو کر تھک چکی تھیں اب کمر میں بھی درد رہنے لگا تھا۔ لہٰذا اب انہوں نے کپڑوں کی سلائی کا ہنر سیکھ لیا تھا۔

بے چاری برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھیں مشین کے ساتھ سر کھپاتی رہتیں لیکن ان کوششوں سے مہنگائی کی آگ کہاں بجھنے والی تھی۔ جس کے شعلے آج کل آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور پھلوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ بس روکھی سوکھی سے افطاری کا کام چلانا پڑتا تھا۔

کرن سب سے بڑی تھی۔ اس لیے سب سے زیادہ حالات کے متعلق فکر بھی اسے ہی لاحق رہتی تھی۔ اس سے چھوٹی چار بہنیں نازیہ، فوزیہ، رضیہ اور نادیہ آٹھ، دس بارہ اور چودہ برس کی تھیں۔ امی انہیں کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکالنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ جب سے کمسن لڑکیوں کے متعلق اخباروں میں زیادتی کی خبریں شائع ہو رہی تھیں تین چھوٹے بھائی تھے جو بہنوں سے بھی کم سن تھے۔ ان کے نام عمران، کامران اور جبران تھے۔

گھر سے باہر کے کام کرنا کرن کی ذمہ داری تھی۔ کرن میٹرک کر چکی تھی اور باقی بچوں کو پڑھانے کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی۔ ہوش ربا مہنگائی اور پھر تعلیم کے بھاری اخراجات نے بچوں کو اسکول سے اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی بھی چار، چھ جماعتوں سے آگے نہ جا سکا تھا۔

بیس برس کی عمر میں کرن کا حسن جاں سوز قابل رشک تھا۔ اس کے ابا کا رنگ سرخ وسفید تھا یہ رنگت صرف اسے ہی ورثے میں ملی تھی۔ باقی بہنیں بھائیوں کا رنگ امی جیسا سانولا تھا۔ کرن جب آئینہ دیکھتی تو پہلے مسکراتی اور پھر رنجیدہ سی ہو جاتی۔ وہ ایک ایسا ہیرا تھی جو کھنڈر میں بھٹک رہا تھا۔ اس کے جسمانی نشیب وفراز میں بلا کی کشش تھی۔ چہرے پر نقرئی چمک اور آنکھوں میں شراب جیسا نشہ تھا۔ گلی محلے کے لڑکے اس کے گرد منڈلاتے رہتے تھے لیکن وہ کسی کو زیادہ منہ نہ لگاتی تھی کیونکہ اس محلے میں لڑکے آوارہ نکمے اور ان پڑھ ہی تھے۔ آبادی اوسط درجے کی تھی اور مکانات کی تعمیر پرانی اور بے ترتیب تھی۔

صرف گلی کے سامنے احاطے میں ملک صفدر صاحب نے پراپرٹی کے کاروبار سے روپیہ کمانے کے بعد ایک شاندار دو منزلہ مکان تعمیر کروایا تھا۔ یہ ان کا آبائی علاقہ تھا (جسے پکی ٹھٹھی عارف چوک کہا جاتا تھا) اس لیے انہوں نے اسے چھوڑنا پسند نہیں کیا تھا۔

ان کے بچوں کا رہن سہن، گاڑیوں میں گھومنا پھرنا، کھانا پینا، موج اڑانا، مہنگے ملبوسات پہننا، لڑکیوں کا سج دھج کے ساتھ گھر سے باہر نکلنا اور سیر وتفریح کے ساتھ واپس لوٹنا۔ یہ مناظر کرن کی آنکھوں کے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی طرح غربت اور تنگدستی کی ذلت ناک زندگی سے جان چھڑائی جائے۔ لیکن ابھی تک کوئی راستہ نظر نہیں آیا تھا۔ حالات کا خارجی جبر اسے پوری طرح اپنے حصار میں جکڑے ہوئے تھا۔

افطاری کے بعد کرن اس وقت بھی آئینے کے سامنے پرانے میک اپ بکس کے ساتھ چہرے کی آرائش میں مصروف تھی کہ امی کی آواز نے اس کے خوابوں کا شیش محل چکنا چور کر دیا۔

''کرن تم سنتی ہی نہیں، کیا کسی فیشن شو میں حصہ لینے جا رہی ہو۔ تمہارے دونوں چھوٹے بھائی بیمار ہیں گھر میں سبزی نہیں، دودھ نہیں اور تمہیں بننے سنورنے سے ہی فرصت نہیں۔'' امی نے ایک ہی سانس میں غبار نکالا۔

''امی کیا میں ہر وقت نوکرانی بنی رہوں۔ آج میری سہیلی کی سالگرہ ہے مجھے اب اس میں شرکت کے لیے نکلنا ہے۔ آخر میں کب تک قربانی کا بکرا بنتی رہوں گی۔''

''بیٹی اب تم باہر زیادہ ہی گھومنے پھرنے لگی ہو۔ اب اس گھر کی ہر چیز تمہیں بری لگنے لگی ہے۔''

''امی آپ تو خوامخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ آخر انسان کو باہر تو نکلنا ہی پڑتا ہے۔ اس تنگ وتاریک مکان میں تو میرا دم گھٹنے لگا ہے۔''

''بیٹی انسان کو ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ دولت ہر انسان کے لیے اچھی ثابت نہیں ہوتی۔ یہ دنیا تو فانی ہے۔''

''امی آپ تو جذبات کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہیں، زندگی صرف گھٹن کا نام نہیں۔ آزادی اور ترقی کا نام ہے۔''

''ہاں ہاں اب تم ہمارے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی ہو لیکن یاد رکھو جو لڑکا لڑکی ماں باپ کی انگلی چھوڑ کر کسی اور کا دامن تھامتے ہیں وہ ضرور ایک نہ ایک دن ٹھوکر کھا جاتے ہیں۔''

''چھوڑیے امی جان یہ پرانی باتیں، اب دنیا ان باتوں سے بہت آگے نکل گئی ہے۔'' اب کی بار امی خاموش اور متفکر نگاہوں سے مجھے گھورتی رہی۔ پھر کھانستی ہوئی کرسی سے اٹھیں اور بیمار بچوں کو ساتھ لے کر باہر جانے کی تیاری

کرنے لگیں۔

"ٹھیک ہے بیٹی! تم سالگرہ میں جاؤ' آخر مجھے کیا حق ہے کہ میں گھر کا بوجھ تم پر ڈالوں۔ اب تم جوان ہو اپنے فیصلے خود کرسکتی ہو۔" اتفاق سے میں اور امی ایک ساتھ ہی گھر سے باہر نکلیں۔ امی دائیں اور میں بائیں جانب چل پڑی۔ ہمیں دو مختلف راستوں پر چل کر منزل پر پہنچنا تھا۔

* * *

میں جب اپنی سہیلی شبانہ کی سالگرہ میں شرکت کے لیے بس سے اتر کر اس کی اچھا بلاک میں واقع کوٹھی پہنچی تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ عمارت دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ رنگ برنگی آرائشی روشنیاں' رنگین غبارے' میوزک کی سریلی آوازوں کا جادو۔ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے بہت سے رومان انگیز جوڑے ماحول کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھتے چلے جارہے تھے۔ لڑکیوں نے لڑکوں کے بازوؤں میں ہاتھ دے رکھا تھا۔ سڑک پر ایک خالی پلاٹ میں رنگ رنگ کی خوبصورت گاڑیاں پارک تھیں جو ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ شبانہ کی قیمتی گاڑی میں بیٹھ کر اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آگئی ہو۔ شدید گرمی میں فل اے سی' دلکش میوزک' چھوٹی ایل سی ڈی اسکرین۔ پھر سفر کی آرام دہ سہولت جہاں جی چاہے اڑے چلے جاؤ' صرف گیئر لگانے کی دیر تھی۔

وہ دل مسوس کر رہ گئی۔ وہ اپنے سب سے اچھے سوٹ میں بے حد خوبصورت اور اسمارٹ معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن غربت نے اس کے خوابوں کا گلا گھونٹ رکھا تھا۔ وہ اس قدر شان و شوکت سے کیا اپنی سالگرہ مناتی وہ تو ایک موم بتی بھی گھر میں نہیں جلا پاتی تھی۔ چھوٹے بہن بھائیوں کے مسائل ہی سانس نہیں لینے دیتے تھے۔ پھر امی کی کمر کا درد اور ابا کی کھانسی کی شدت وہ کس کس مسئلے سے نپٹتی۔ اس کا دل بجھ سا گیا۔ جتنے بھی لڑکوں نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی تھی اس نے خود ہی انہیں مسترد کردیا تھا کیونکہ وہ اس کے خوابوں سے بہت دور تھے۔ لڑکوں نے اسے مغرور کا خطاب دے رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگی غربت سو دکھوں کا ایک دکھ ہے۔ یہ ایک ایسا بھنور ہے جس سے غریب کم ہی باہر نکل پاتا ہے۔ دوسری طرف کاغذ کے رنگین ٹکڑوں سے دنیا کے ہر عیش و آرام کا دروازہ کھولا جاسکتا ہے۔ گویا وہ جادو کی چابی تھی دوست احباب' رشتہ دار' معاشرے کے ہر طبقہ کے لوگ کیسے دولت مندوں کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے۔

"خدا کسی کو غریب نہ پیدا کرے۔" اس کے منہ سے زیر لب نکل ہی گیا۔ وہ سوچتے ہوئے ایک لڑکی سے ٹکرا گئی۔ "سوری بہن۔" کرن نے شائستہ لہجے میں کہا اور گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے اپنے روپیہ روپیہ کرکے بچائے ہوئے پیسوں میں سے ایک تحفہ خریدا تھا۔ جو سنہرے رنگ کے پیکٹ میں گلابی ربن سے بندھا ہوا تھا یہ تاج محل کا سستا ماڈل تھا۔ لیکن دنیا کی سب سے مہنگی محبت کی علامت تھا۔

شبانہ اپنی کوٹھی میں باغ میں فوارے کے پاس ایک لمبی میز کے پاس کھڑی تھی۔ جس پر تحائف ڈھیر کی صورت میں موجود تھے۔ فوارے کی چکور پٹی کے اندر رنگین بلب نصب کئے گئے تھے چنانچہ فوارہ کا پانی سات رنگوں کی روشنی میں بڑا سحر انگیز اور رومان پرور منظر پیش کررہا تھا۔ کرن کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ پھر شبانہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آگیا۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو کرن۔"

"آئی ایم فائن' تھینکس۔"

کرن نے پیکٹ اسے تھما دیا۔ شبانہ نے اسے ڈھیر کے اوپر جما دیا۔ اس وقت ان کی اور بھی سہیلیاں جمع ہوگئیں اور گپ شپ کا ماحول بن گیا۔ لمبی میز پر چالیس پونڈ وزنی کیک ڈھکا ہوا تھا اور شمع دان میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ سب مہمان آچکے تو شبانہ نے مائک پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد موم بتیاں بجھانے اور کیک کاٹنے کی رسم شروع ہوئی۔ کیک کے بعد کھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ڈانسنگ فلور پر چلے گئے۔ درختوں کی شاخوں پر نصب تیز روشنیاں بجھ گئیں۔ میوزک کی آواز تیز ہوگئی اور درختوں پر لگائی گئیں چھوٹی روشنیاں ڈانسنگ فلور پر رنگین لہریے پھینکنے لگیں۔

کرن ابھی تک اپنی نشست پر اداس بیٹھی تھی۔ اس کا کوئی پارٹنر نہ تھا شبانہ سونے کا تاج پہنے فلور کے اوپری گول راؤنڈ پر اپنے کزن کے ساتھ رقص کررہی تھی۔

"وہ کتنی آزاد اور دولت مند ہے اور غریب پنجرے میں بند پنچھی کی مانند پھڑپھڑاتا ہی رہتا ہے۔" کرن کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس وقت اس کی ارد گرد بھٹکتی ہوئی نگاہ ایک کونے میں بیٹھے نوجوان پر پڑی۔ وہ دیکھتی ہی رہ گئی۔ پھر وہ دونوں ہی مسکرا دیئے۔ شاید وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا آئیڈیل تھے۔ نوجوان خوب صورت اسمارٹ اور مردانہ وجاہت سے بھرپور تھا۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں لہراتے ہوئے بڑے دلکش معلوم ہوتے تھے۔ وہ چیونگم چبا رہا تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں تیز چمک اور معصومیت تھی۔ رنگ سرخ و سفید' نقش و نگار کشش اور جاذب نظر تھے۔ آنکھوں کی زبان میں کچھ کہا سنا گیا۔ نظروں کے تیر اڑتے ہوئے دلوں میں پیوست ہوگئے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور دل میں ولولہ پیدا ہوا۔ وہ نوجوان والہانہ انداز سے اٹھا اور ہولے ہولے ایک انڈین گیت گنگناتا ہوا شاہ رخ خان کی طرح کرن کی طرف آیا۔

کرن نے پلکیں نہ جھپکائیں۔ وہ قریب آیا۔ تھوڑا سا جھکا۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ پھر بولا۔

"آپ اور میں تنہا اور اداس ہیں باقی سب اوپر فلور پر چلے گئے ہیں۔" اس نے ترنم لہجے میں کہا۔

"آپ کی شخصیت بڑی پرکشش ہے۔" کرن نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دل کی شاخ پر ایک گلاب کھل اٹھا ہو۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" نوجوان نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

"میرا نام کرن ہے۔"

"اور میرا نام چاند ہے' دوست چاند بابو کہتے ہیں۔"

بالکل چاند کا ٹکڑا ہو۔" کرن نے نظروں میں تولتے ہوئے کہا۔

"اور آپ بھی بالکل سورج کی چمکتی دمکتی کرن ہیں جو تاریکی کا سینہ چیر کر رکھ دیتی ہے۔" نوجوان نے برجستہ کہا۔

پھر دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دیئے ڈانسنگ فلور کی طرف بڑھ گئے۔ ڈانس سے فارغ ہو کر پارٹی اختتام پذیر ہوگئی۔ چاند کرن کو اپنی لمبی کار میں بٹھا کر اس کی خواہش پر ایک خوبصورت ریسٹوران میں لے گیا۔ جہاں کرن صرف ایک بار شبانہ کے ساتھ ہی آئی تھی۔ یہاں مختلف طبقوں کے لوگ نشستوں پر براجمان تھے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آخری میز پر چلے آئے۔ اس گوشے میں اندھیرا سا تھا۔ دونوں باتیں کرتے اور کافی پیتے ہوئے ریسٹوران میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لینے لگے۔ درمیان کی بڑی سی میز کے گرد کچھ الٹرا ماڈرن قسم کی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ غالباً یونیورسٹی اسٹوڈنٹس تھیں۔ ہر بات میں بناوٹ' ہر انداز میں تصنع۔ اتنے زور سے قہقہے لگاتی کہ سب ان کی طرف دیکھنے لگتے اور اس میز کے بالکل سامنے والی میز پر کچھ لڑکے بیٹھے سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جارہے تھے۔ حرکات اتنی غیر متوازن تھی جیسے کرسیوں پر بیٹھے ٹوسٹ کررہے ہوں۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ سب کی نظروں کا مرکز بنے رہیں۔ وہ سوچنے لگی یہ دونوں میزیں ہمارے نظام کی نمائندگی کررہی ہیں۔ نئی نسل کی قدروں کی' نظریات' رجحانات اور آدرشوں کی۔ یہ دونوں میزیں گویا دو الگ الگ دنیائیں ہیں۔ دو الگ الگ جزیرے ہیں۔ دو الگ الگ آسمان ہیں اور ان سے پرے آج کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کچھ سیاسی پارٹیوں کے نمائندے بیٹھے ہیں جنہیں عوام کی دگرگوں حالت کا بے حد افسوس ہے۔ جنہیں مہنگائی سے پریشانی ہے۔ جنہیں چھوٹے موٹے بہت سے غم ہیں لیکن ان سب غموں پر محیط ان کا اپنا غم ہے اور یہ چند اشخاص ہزاروں لاکھوں انسانوں کے ترجمان ہیں۔ جو بالکل بے غرض ہو کر معاشرے کی اونچ نیچ دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ نمائندے غریب کے ہیں۔ غریبوں کو طرح طرح کے دعوؤں تحفظ امیر کا کرتے ہیں۔

قربت کی تری جو پیاس ہے پہلے تو نہ تھی
تنہائی مرا لباس ہے پہلے تو نہ تھی
اک ذکر سے مسلسل گھبراتا ہے مرا دل
طبیعت جو اداس ہے پہلے تو نہ تھی
سیاہ طویل رات اور چراغ بھی آخری
بے نام سے آس ہے پہلے تو نہ تھی
امیر شہر ہم سے لہو کا خراج مانگتا ہے
کس قدر افلاس ہے پہلے تو نہ تھی
عامر مرا وطن تصویر مقتل بن گیا ہے
خون میں جو باس ہے پہلے تو نہ تھی

عامر زمان عامر...... بورے والا

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.urdubooksfree.pk

اور دلاسوں سے بہلا کر ووٹ حاصل کر کے ان کے جذبات مصنوعی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جیسے وہ مصنوعی سیارے ہوں۔ جنہیں امریکہ یا روس نے آسمانی خلاؤں میں گردش کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ لیکن جنہیں دھرتی کی مخلوق سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ماحول کا جائزہ لینے کے بعد بڑی ایل سی ڈی اسکرین پر دونوں نے کچھ انڈین کورس گیت دیکھے پھر اٹھ کر چلتے ہوئے ریستوران سے باہر نکل آئے۔ کھانا تو وہ سالگرہ پارٹی میں ہی کھا چکے تھے۔ لہٰذا اس وقت وہ صرف ڈرائی فروٹ چبا رہے تھے۔ یہ پیکٹ ہال میں ہی دستیاب تھے۔

چاند نے کرن کو اپنی قیمتی آرام دہ اور خوبصورت کار میں اس کے گھر کی طرف جانے والی گلی کے موڑ پر ڈراپ کر دیا۔ کرن مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی وہ بھی کھڑکی سے ہاتھ ہلاتا رہا۔ پھر کرن گھر کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ اچانک اسے زور زور سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے قدم جیسے منجمد سے ہو کر رہ گئے اور دل تیز دھڑکنے لگا۔ وہ پلٹ کر دیکھنے لگی اس کا بوڑھا بیمار باپ ہانپتا کانپتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصے کی سرخی چمک رہی تھی۔ ہونٹ سختی سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ وہ قریب آ کر کرن کے پاس رک گیا۔

"اتنی رات گئے کہاں سے آ رہی ہو۔ میں تو اسپتال سے آ رہا ہوں۔ طبیعت کچھ بگڑ گئی تھی۔"

"میں اپنی سہیلی شبانہ کی سالگرہ سے آ رہی ہوں۔"

"یہ لڑکا کون تھا جو تمہیں بڑی سی موٹر میں چھوڑ کر گیا ہے۔"

"ابا جان میری سہیلی کا بھائی تھا۔" کرن نے جھوٹ بول دیا۔

"کچھ بھی ہو بیٹی پیسے والے کا اعتبار نہیں۔ لڑکی کی عزت ایک بار گئی تو جنازہ ہی اٹھ جاتا ہے۔" یہ کہہ کر اس کا باپ اسے گھورتا ہوا گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

* * *

اگلے دن تنگ و تاریک گھر کے ختم نہ ہونے والے مسائل سے جان چھڑا کر کرن گھر سے باہر نکلی اور بس میں بیٹھ کر چاند کی کوٹھی جو رائے ونڈ روڈ پر واقع تھی اس کی طرف روانہ ہو گئی۔ صبح ہی صبح چاند نے اسے موبائل فون کے ذریعے رائے ونڈ روڈ اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے اپنے پرانے موبائل پر کال اٹینڈ کی تھی جو اسے شبانہ نے دلوایا تھا۔ اسے بنتے سنورتے دیکھ کر اس کی امی سے پھر نہ رہا تھا۔ انہوں نے کہہ ہی دیا۔

"خدا خیر کرے یہ لڑکی اب باہر بہت جانے لگی ہے۔ جب جوان لڑکیاں باہر جانے لگیں تو ماں باپ کا دل ہی سینے سے باہر آنے لگتا ہے۔"

"امی آپ تو خوامخواہ ہی گھبرا جاتی ہیں اور خدا کے لیے یہ پرانے بوسیدہ نظریات نہ دہرایا کریں۔" آخر اسے جواب دینا ہی پڑ گیا۔

بس سے اترتے وقت اسے یہ جملے پھر یاد آ گئے تھے۔ مین روڈ سے دائیں جانب مڑنے والی سڑک پر چلتی ہوئی وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ چاند اس کے خوابوں کے شہزادے کے ہو بہو تھا۔ اس وقت اچانک چاند کی لمبی چمکتی ہوئی کار اس کے سامنے آ کر رک گئی۔ اگلا دروازہ کھلا تو خوشبو کا ایک جھونکا بھی باہر آیا۔ کرن مسکرا دی۔ باہر کتنی گرمی تھی اور اندر کا ماحول اے سی کی وجہ سے ٹھنڈا یخ ہو رہا تھا۔ چاند سنہری لباس میں واقعی چاند کا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے لباس سے شعاعیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ وہ دوسرا دروازہ کھول کر اس کے مقابل آ بیٹھی۔ پھر دو چار گہرے گہرے سانس لیے تو اس کے تن بدن میں تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ دونوں میں مسکراتی ہوئی نظروں کا تبادلہ ہوا۔ پھر چاند نے لب کشائی کی۔

"رات میں نے بڑا خوبصورت خواب دیکھا۔ ہر طرف رنگین دھواں چکرا رہا تھا۔ خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ پھول ہوا میں اڑتے پھر رہے تھے۔ ایسے ماحول میں آسمان سے نیچے زمین کی طرف آنے والے دودھ جیسے سفید بل کھاتے زینے سے میں بنسری بجاتا نیچے اتر رہا تھا۔ بنسری کی تان دور دور تک پھیل رہی تھی۔ تم یہ آواز سن کر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی زینے کے قریب آنے لگی۔ میں سیڑھیاں اتر رہا تھا تم سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ پھر ہم دونوں ہی پھولے ہوئے سانس کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے آ کر رک گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا، تم نے بھی بڑھایا۔ میں نے تمہارا ہاتھ تھام لیا۔ ہم اوپر جانے لگے۔ زینے کے اختتام پر قوس قزح جیسے رنگوں کے درمیان سفید موتیوں سے بنا ہوا ایک محل تھا جس کے دروازے پر خوش آمدید لکھا ہوا تھا۔"

کرن بڑے شوق سے سن رہی تھی۔ عین اسی لمحے کار چاند کی کوٹھی کے سامنے رکی۔ کرن دیکھتی ہی رہ گئی۔ کوٹھی کیا تھی پورا سفید محل تھا۔

وہ کار سے اتر کر چند مقامات سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو آپ سے آپ دلکش میوزک بجنے لگا۔ فرنیچر کرسیاں، صوفے وغیرہ سنہرے رنگ کے تھے۔ فرش پر نرم سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ صوفہ سیٹ کے سامنے میز پر تازہ گلابوں سے بھرا ہوا گلدان موجود تھا۔ جس کی مہک سے کمرے کی فضا خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔

کرن سوچنے لگی یہ زندگی اور ماحول اس تنگ و تاریک مکان سے کس قدر مختلف ہے۔ کاش میں اس گھر میں ہی رہ جاؤں مگر پھر چونک کر چاند کا بازو ہلاتے ہوئے بولی۔

"آپ واقعی زمین کے چاند ہیں۔ آپ کے کیا ٹھاٹ باٹ ہیں دیکھ کر رشک آتا ہے۔"

"لیکن اس گھر میں ایک چیز کی کمی ہے۔" چاند نے اداس لہجے میں کہا۔

"وہ کیا! سب کچھ ہی تو ہے۔ کیا والدین نہیں ہیں؟" کرن نے چونک کر پوچھا۔

"والدین گاؤں میں رہتے ہیں۔ انہیں گاؤں کی خاندانی زندگی پسند ہے۔ یہاں کمی ہے تو صرف ایک کرن کی جس سے ہر چیز جگمگا اٹھے۔" چاند مسکرایا اور کرن بھی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

چاند نے اسے پوری کوٹھی کی سیر کروائی۔ کرن دنگ رہ گئی وہ کسی نواب یا شہزادے سے کم نہ تھا۔ پھر اس نے سوئمنگ پول میں چاند سے تیراکی بھی سیکھی۔ اس طرح ان کی دوستی پختہ ربط میں ڈھل گئی۔ اب دونوں باہر ایک دوسرے سے ملتے، گھومتے پھرتے پھر چاند اسے گلی کی نکڑ پر اتار دیتا۔ ایک دن ضد کر کے چاند نے اسے شراب پلا دی۔ وہ خود سرخ رنگ کی شراب کا رسیا تھا۔ کرن کو نشہ ہو گیا۔ کرن گھر میں داخل ہو کر جب اپنے کمرے میں آئی اور لائٹ جلائی تو بستر پر اس کا بوڑھا باپ کرم دین بیٹھا اسے سرخ سرخ آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

قسمت کے ستارے سے کھیلتے ہیں
آگ کے شرارے سے کھیلتے ہیں
اس خواب کی کوئی تعبیر بتاؤ مجھے
ڈبو کر کشتی کنارے سے کھیلتے ہیں
ہم روز سجتے ہیں بکف آئینہ
روز مہنگے خسارے سے کھیلتے ہیں
بیٹھ کر فرقت کی بالکونی میں
شب کے تارے سے کھیلتے ہیں
ہم تخیل میں اشعار کی صورت
خواہشات کے دھارے سے کھیلتے ہیں
رکھ کے داؤ پر زندگی اپنی
چلو آج تمہارے سہارے سے کھیلتے ہیں
بنا کر کچے گھروندے ساحل پر
اک خواب ادھورے سے کھیلتے ہیں
کرکے دل و جان حوالے اس کے
چلو جیون سارے سے کھیلتے ہیں
تری عمر کے بچے عامر زمان
ابھی تک غبارے سے کھیلتے ہیں

عامر زمان عامر ...... بورے والا

"تم راتوں کو باہر آوارہ پھرتی ہو تمہارے پاس پیسے کہاں سے آتے ہیں۔ اس گھر کے حلال میں حرام شامل نہ کرو۔"

"چاہے سب حلال ہی ہو جائیں۔" کرن نے ہاتھ گھماتے ہوئے کہا۔ کرن کی حالت اور باتوں سے اس کے باپ نے اس کے نشہ میں ہونے کا اندازہ لگا لیا۔

"اب شراب بھی پینی شروع کر دی تم نے۔"

"غربت کا زہر بھی تو پینا پڑتا ہے۔" کرن نے چہکتے ہوئے کہا۔

"بکومت، محلے کے لوگ اب باتیں کرتے ہیں۔ وہ تمہیں لڑکے کے ساتھ کار میں بیٹھتے اترتے دیکھتے ہیں۔ میں ہر روز بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ کل سے گھر سے نکلنا بند کر دو۔ ورنہ میں دوبارہ اس گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔" اس کا باپ غم و غصے سے چلا چلا کر بول رہا تھا اس کی ماں اور بھائی بہن بھی اکٹھے ہو گئے۔

واشگاف انداز سے کہہ دیا کہ۔ ''وہ اس لڑکے کو نہیں چھوڑ سکتی۔'' اس نے

''پھر دفع ہو جاؤ بے غیرت میرے گھر سے اور میری نظروں سے۔'' اس کا باپ غصے سے کانپ کر بولا۔ ماں نے روکنے کی کوشش کی لیکن کرن اٹیچی کیس لے کر گھر سے باہر نکل گئی۔

❋ …… ❋ …… ❋ …… ❋

وہ رکشہ لے کر سیدھی چاند کی کوٹھی پہنچ گئی۔ چاند نے صورت حال جاننے کے بعد اس سے کہا۔ ''تم وہ روشنی ہو جو کھنڈر میں نہیں محل میں ہی سج سکتی ہو۔ اب ہم آزاد اور خود مختار ہیں۔'' اگلے روز ہی چاند نے شادی کا آغاز کردیا۔ ایک ہفتہ بعد اس کی کوٹھی میں ان کا نکاح ہوا اور وہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ بڑا شاندار اہتمام تھا۔

وہ دونوں اسٹیج پر بیٹھے سامنے بنائے گئے چبوترے پر شہر کی بہترین رقاصاؤں کا رقص دیکھنے میں محو تھے۔ خوشی سے ان کے چہرے گلنار ہو رہے تھے۔ شادی کے بعد ان کی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ چاند کے والدین اور چھوٹا بھائی شادی میں شرکت کرنے کے بعد واپس گاؤں لوٹ گئے تھے۔ دعوت نامہ تو کرن نے بھی گھر بھیجا تھا لیکن وہاں سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے ملول سی ہوگئی لیکن پھر دولت کی کوشش نے اسے اپنے اندر جذب کرلیا۔

چھ مہینے انہوں نے خوب دل کھول کر ہنی مون منایا پھر چاند کسی ضروری کام سے کراچی روانہ ہوگیا۔ اس وقت کرن بیڈروم کی کھڑکیاں کھولے موسلادھار بارش میں بھیگتے کوٹھی کے خوشنما منظر دیکھنے میں محو تھی۔ دفعتاً موبائل فون کی بیل بجنے لگی اس نے گفتگو سنی اور تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔

❋ …… ❋ …… ❋ …… ❋

موسلادھار بارش میں کرن کے والدین کا سامان باہر تھا۔ مالک مکان نے تین ماہ کا کرایہ ادا نہ کرسکنے کی وجہ سے سڑک پر پھینکوادیا۔ کرم دین کو سردی کی وجہ سے نمونیا ہوگیا تھا۔ وہ بارش میں کھانستا ہوا چارپائی پر پڑا تھا۔ اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ کرن کی ماں سڑک پر بھاگ بھاگ کر خدا رسول ﷺ کا واسطہ دے کر گاڑی والے حضرات کے سامنے منت سماجت کررہی تھی کہ اس کے خاوند کو کسی ڈاکٹر یا اسپتال تک پہنچا دیں لیکن گاڑی والے ذرا دیر رکتے پھر آگے بڑھ جاتے۔ آج کے زمانے میں مادہ پرستی نے انسانیت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ کرن کی ماں کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ باقی بچے ابا کی چارپائی کے گرد پریشانی اور مایوسی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ ایک نئی دکان کھلنے سے کرم دین کی دکانداری اور متاثر ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ گھر کا تین ماہ سے کرایہ نہیں دے پایا تھا۔

''اے مالک انسان حالات کے ہاتھوں کس قدر بے بس ہے۔'' کرن کی ماں نے آسمان کی طرف دیکھ کر التجا کرتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے ایک تیز ہارن نے اسے چونکا دیا۔ وہ سڑک کے بیچ میں کھڑی تھی۔ لمبی سی کار اس کے پاس آکر رک گئی تھی۔

''بڑی بی سڑک کے درمیان سے ہٹ جائیں آپ نے راستہ روک رکھا ہے۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے قدرے تیز لہجے میں اسے ڈانٹ سنائی۔

''صاحب...... صاحب خدا کے لیے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑکی سے لگ گئی۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں کیا چاہتی ہو؟''

''صاحب ادھر دیکھیے۔''

''ادھر کیا ہے؟'' قیمتی لباس والے کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ صاحب میرے گھر کا سامان، بچے اور بیمار خاوند، صاحب اسے علاج کی فوری ضرورت ہے اسے کسی اسپتال پہنچا دیجیے۔ ہمارے سر پر چھت بھی نہیں۔ ادھیڑ عمر آدمی نے ماحول کا جائزہ لیا۔ کرم دین کو کھانستے دیکھا پھر فطری بے رحمی عود کر آنے سے مونچھیں مروڑ کر بولا۔

''بڑی بی غریب کے سر پر ایک ہی چھت اچھی لگتی ہے اور وہ ہے نیلی چھت۔'' یہ کہہ کر اس نے گیئر لگایا اور آگے بڑھ گیا۔

''یا خدا رحم فرما۔'' کرن کی ماں نے سسکتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیے۔ عین اسی لمحے سفید رنگ کی بڑی سی کار اس کے قریب آکر رکی اور اس میں سے کرن تیزی سے باہر نکلی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں چھتری تھی۔ جو اس نے دوسری نشست سے اٹھا کر سر پر تان لی تھی۔ وہ بھاگ کر اپنی ماں کے پاس پہنچی۔

''امی جان گھبرائیے مت، مجھے سب خبر ہو چکی ہے۔ میری سہیلی شبانہ ادھر سے گزری تھی۔ اس نے آپ لوگوں کو اس حال میں دیکھا۔''

کرن نے ابا کرم دین بچوں اور سامان پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تو مجھے موبائل فون پر اطلاع دے دی۔ میں نے ٹرک بھی منگوایا ہے۔'' ''لو وہ آگیا۔'' کرن نے سڑک پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ اس وقت ایک لوڈر ٹرک قریب آکر رکا اور مزدور اس میں سے چھلانگیں مار کر باہر نکلے۔ کرن نے اپنی امی سے کہا۔

''اب آپ لوگ میرے ساتھ کوٹھی میں رہیں گے۔ آپ لوگ میری شادی میں نہیں آئے خیر کوئی بات نہیں۔''

کرن کی ماں کبھی گاڑی اور کبھی کرن کو خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ سب چاند کی کوٹھی کے ایک بڑے کمرے میں شفٹ ہو چکے تھے۔

اس نے چاند کو فون پر اطلاع دے دی تھی۔

''اس نے کہا کہ تم نے اچھا کیا ان کو مصیبت سے نکال لائی ہو۔''

ڈاکٹر کو گھر بلوا کر کرم دین کا ٹریٹ منٹ ہو چکا تھا۔ حالت سنبھلنے پر وہ کرن سے نظریں چرانے لگا۔

❋ …… ❋ …… ❋ …… ❋

ایک رات پھر بارش زور سے ہو رہی تھی۔ آج چاند کراچی سے واپس لوٹنے والا تھا۔

کرن خواب گاہ کی کھڑکیاں کھولے اوپر منزل پر بارش سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ لیکن اس کی نگاہ گھڑی پر تھی وہ چاند کی منتظر تھی۔

ایک میز پر پھل بڑے سلیقے سے سجے ہوئے تھے۔ دوسری میز پر رنگ رنگ کے پھول گلدان میں جمع کیے گئے تھے۔ کمرے میں پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ پھر ہوا کے خوشگوار جھونکے باغ سے موتیے، رات کی رانی اور چنبیلی کی خوشبو اڑا لاتے تھے۔ سامنے دیوار پر چاند کی مسکراتی ہوئی تصویر آویزاں تھی۔

کرن کے گھر کے سب افراد بڑے مہمان خانے میں سو رہے تھے۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ کوٹھی کے ملازم بھی سرونٹ کوارٹر میں جا چکے تھے۔ محافظ کتے اور گارڈز چوکنے ہو کر اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے۔

کوٹھی کی دیواروں پر لگے خاردار تاروں میں برقی رو دوڑ رہی تھی۔ جن میں دو چار مرے ہوئے پرندے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ باغ میں جلنے والی سرچ لائٹ جنریٹر سے منسلک تھی۔ کوٹھی کے اندر بھی جنریٹر اور یو پی ایس لگے ہوئے تھے۔

کرن اس وقت بادل پھٹنے سے آسمان پر چمکتے ہوئے زرد روشن چاند کو دیکھ رہی تھی۔ جس میں اسے اپنے زمین کے چاند کا چہرہ متحرک دکھائی دے رہا تھا۔

اچانک کمرے میں ایک کراہ کی آواز گونجی۔ کرن کا تصور ٹوٹ گیا اور اس نے کمرے پر گھومتی نگاہ ڈالی اور جب عقبی جانب دیکھا تو دھک سے رہ گئی۔ اس کا رنگ اڑ گیا۔

ایک بڑی الماری کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ فرش پر خون اگلتا ہوا چاند سسکیاں بھر رہا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

''میرے سرتاج میرے سرتاج یہ کیا ہوگیا؟'' اور یہ کون سا راستہ ہے؟ کرن کا منہ الماری کو دیکھ کر حیرت سے کھل گیا۔

''کرن میرا آخری وقت آگیا ہے۔''

چاند گہری سانس لیتا ہوا بولا۔ خون تیزی سے اس کے سینے اور رانوں سے نکل نکل کر فرش کے سفید قالین کو سرخ کر رہا تھا۔ اس لمحے چاند کرن کی گرفت سے پھسل کر فرش پر گر پڑا۔

کرن نے اس کا سر گود میں لے لیا۔

''میں...... میں...... ابھی ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔ وہ ابھی آجائے گا۔ آپ بچ جائیں گے۔''

کرن ڈاکٹر کا نمبر موبائل پر تلاش کرنے لگی۔

''نہیں کرن میں جا رہا ہوں۔''

''میں نے تمہیں دھوکے میں رکھا میرا جیولری کا کاروبار نہیں۔ میں شہر کا بڑا منشیات فروش ہوں۔ پولیس سے جھڑپ میں شدید زخمی ہو چکا ہوں۔''

''میری بات غور سے سنو۔''

''اچھی زندگی گزارنے کے لیے یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ مجھے مرنے کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ صرف تم سے جدائی کا غم ہے۔ یہ رفاقت زیادہ نہ چل سکی۔''

''تم حالات سے سمجھوتہ کرنا اور اس کوٹھی کے تہ خانوں میں منشیات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ لوگ تمہارے پاس آئیں گے اپنی ڈیمانڈز بتائیں گے۔ مال پچھلے گیٹ سے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

نکلوا دینا اور پیسے لے لینا۔ یہ عمل رات کے دو بجے کا ہوگا۔‘‘

’’تہ خانے کا ایک راستہ عین پچھلے گیٹ کے پاس نکلتا ہے۔ الماری کے پیچھے بھی ایک پرانی سرنگ ہے۔ جس کا دہانہ چند فرلانگ دور ایک باغ میں واقع پن چکی کے پاس نکلتا ہے۔ وہیں پر پولیس سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔

’’تہ خانوں کی چابیاں یہ لو۔‘‘

چاند نے خون آلود انگلیوں سے فون لے کر چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔

’’مجھے خاموشی سے باغ میں دفن کر دو اور عام لوگوں کو کہہ دینا کہ وہ دوبئی چلے گئے ہیں۔ تہ خانوں کے دروازے تو میں تمہیں دکھا ہی چکا ہوں۔‘‘

اسی لمحے اس کی گردن ڈھلک گئی۔

’’نہیں......نہیں۔‘‘

کرن زور سے چلائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے زندگی کا جیون ساتھی کتنے تھوڑے عرصے کے لیے ملا تھا۔ آنسو پونچھ کر اچانک وہ ایک عزم کے ساتھ کھڑی ہوئی اور اپنے خاوند کی لاش کسی طرح گھسیٹ کر سیڑھیوں سے اتار کر کسی نہ کسی طرح باغ میں لے گئی۔

کتے بارش کی وجہ سے ویسے ہی دبکے ہوئے تھے۔ پھر مالکن کی خوشبو نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔

کرن نے ہمت اور طاقت سے کام لیتے ہوئے ہانپتے کانپتے لاش کو ایک گڑھے تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ جو کچھ عرصہ سے اسی طرح پڑا تھا۔ اس میں لگنے والے پودے پل ہی نہیں سکتے تھے۔

کرن نے لاش کو گڑھے میں ڈالتے ہوئے چوپا اور پھر اپنا لمبا چاقو کھولتے ہوئے مٹی کا جائزہ لیا جو سخت تھی۔ پھر وہ بھاگ کر کوٹھی کے اسٹور سے بیلچہ لے آئی۔

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀

واپس کوٹھی میں داخل ہو کر اس نے ایک گیلے کپڑے سے خون کے تمام نشانات سیڑھیوں اور دوسرے مقامات سے صاف کر دیے۔ اب کوئی اس واقعہ سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ صبح کرن نے گڑھے کے اوپر سے سرخ گلاب کے پودے نکلوا کر اسے کیاری میں تبدیل کر دیا۔

مالیوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ گڑھا کس نے بھرا؟

کرن نے جواب دیا کہ ’’رات اس نے باغ کی سیر کرتے وقت گڑھے کو بدنما محسوس کرتے ہوئے بھر دیا تھا۔‘‘

وہ اپنے خاوند کی جدائی سے نڈھال تھی۔ لیکن اس کی دولت تو اب اس کی مٹھی میں تھی۔ وہ دولت جس کے وہ خواب دیکھتی آئی تھی۔

❀ ...... ❀ ...... ❀ ...... ❀

چاند کے قول کے مطابق لوگ آتے رہے۔

’’لفظ مال‘‘ کوڈ ورڈ تھا جس کو بولتے ہی کرن سمجھ جاتی کہ مدعا کیا ہے۔ وہ تہ خانے میں آ کر ریوالور ہاتھ میں رکھتے ہوئے مطلوبہ مقدار میں مال دے کر خفیہ راستے سے انہیں عقبی گیٹ کے پاس پہنچا کر اندر سے گیٹ بند کر لیا کرتی تھی۔

کرن ٹھاٹ باٹ سے زندگی بسر کرنے لگی۔ اس نے دوسری شادی کی کوشش نہیں کی تھی۔ ابھی چاند کی یادیں اس کے ہمراہ تھیں۔

اس کے گھر کے دیگر افراد بھی اب اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ اس وقت سیاہ رات تھی اور بارش ابھی ابھی تھمی تھی۔

وہ غمگین اور اداس خواب گاہ میں ٹہل رہی تھی۔ اچانک کمرے میں سرخ بلب جلنے لگا اور خطرے کا الارم بھی سنائی دینے لگا۔ کرن نے دراز سے لمبی نال والا ریوالور نکالا اور کمرے سے باہر نکلی۔

عمارت کے مختلف حصوں سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر پولیس کی اناؤنس منٹ سنائی دینے لگی۔

عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ تہ خانے والے راستے کا بھی پتا چل چکا ہے۔ پولیس سرنگ میں بھی پہنچ چکی ہے۔ عقبی گیٹ سے باہر جانے والا اسمگلر گرفتار ہو چکا ہے۔ اس عمارت کے تہ خانے میں منشیات کی بھاری مقدار موجود ہے۔ ہم پولیس اور میڈیا کو بھی ساتھ لائے ہیں۔

اس وقت ایک ہیلی کاپٹر بھی عمارت پر چکرانے لگا۔ چھت پر پہنچے محافظ اوپر سے گولیاں چلانے لگے۔ ہیلی کاپٹر کچھ دور نکل گیا پھر واپس آنے لگا۔ محافظوں کے روپ میں چاند کے بدمعاش تھے جنہوں نے خطرہ محسوس کرتے ہی فائر کھول دیا تھا۔

کرن نے اوپری منزل کے مختلف مقامات سے دیکھ لیا تھا کہ پولیس کچھ محافظوں کو زیر کرنے کے بعد اندر داخل ہو چکی ہے۔ اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ تہ خانے والے

جس گارڈ نے بھی فون پر کہہ دیا تھا کہ وہ قریب المرگ ہے۔

کرن بھاگ کر تیسری منزل کی بڑی بالکونی میں جا پہنچی اور ادھر ادھر کے سب راستے بند کر دیے۔ وہ ایک آرائشی ستون کی آڑ میں تھی۔

نیچے پولیس جمع ہو چکی تھی۔

’’بیگم چاند اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔ آپ کی محل نما خوبصورت عمارت اندر سے انتہائی بدصورت ہے۔ یہ انسانوں کو زہر دے رہی ہے۔ منشیات سے بھری ہوئی ہے۔‘‘

انسپکٹر عمران نے نفرت سے ہونٹ نکالتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

’’انسپکٹر صاحب! یہ کاروبار تو چاند صاحب کا تھا۔ میں تو خواہ مخواہ پھنس گئی ہوں۔‘‘

’’لیکن آپ نے پولیس سے رابطہ کیوں نہیں کیا۔ بلکہ کاروبار کو جاری رکھا۔ آپ اس کام میں ملوث ہیں۔‘‘

’’چاند میری گولیوں سے زخمی ہو چکا تھا۔ وہ مر گیا یا زندہ ہے؟‘‘

’’اس بات کو چھوڑیے۔ آپ مجھے گرفتار نہیں کر سکیں گے۔‘‘

’’تم بھاگ کر کہاں جا سکتی ہو؟ پوری عمارت پر پولیس کا قبضہ ہے۔ تمہارے گارڈز مارے جا چکے ہیں۔‘‘

انسپکٹر عمران نے خون اگلتے ہوئے چند افراد کی طرف اشارہ کیا۔

گھر کے ملازم اور کرن کے گھر کے افراد تھر تھر کانپتے ہوئے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔

’’انسپکٹر عمران نے پولیس کے جوانوں کو حکم دیا کے اوپر کے دروازے توڑ کر بیگم چاند کو گرفتار کر لیا جائے۔‘‘ لیکن جیسے ہی انسپکٹر عمران کے ماتحتوں نے اوپر جا کر تیسری منزل کے دروازوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ کرن کے لگائے گئے بم پھٹ گئے اور دروازوں سمیت پولیس کے افراد کے پرخچے اڑ گئے۔ لیکن پولیس کے جوان کھڑکیاں توڑ کر اندر گھس گئے۔

کرن اب بے بس ہو چکی تھی۔ آخری دو دروازے باقی تھے۔ جن میں بم نہ لگے ہوئے تھے۔

اب کرن نے انسپکٹر عمران کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے کہا......

کا نظام ہے۔ جس میں سرمایہ دار کو غریب تر کرنے کا پورا سامان موجود ہے۔ میں نے اپنی زندگی کو انجوائے کر لیا ہے۔ مجھے مرنے کا غم نہیں۔ میں چاند کے پاس جا رہی ہوں۔‘‘

ان الفاظ کے ساتھ ہی پستول کی نال کنپٹی پر رکھ کر اس نے فائر کر دیا۔

گولی اس کی کھوپڑی میں گھس گئی۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ وہ نیچے گر گئی۔

اس کے گھر کے سب افراد کرم دین، والدہ، بہن، بھائی چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ نوکر بھی منہ چھپا کر رو پڑے۔

اس وقت کرم دین سسکتے ہوئے اپنی بیوی ممتاز بیگم سے بولا۔

’’چلو اس خونی محل سے نکل چلیں۔ جس نے سانپ بن کر ہماری کرن کو ڈس لیا ہے۔‘‘

میرا ایک دوست باہر سے آیا ہوا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں گا۔ ہم پھر سے تنگ و تاریک مکان کرائے پر لے لیں گے۔ جہاں عزت و جان محفوظ رہتی تھی۔

شبانہ کے کہنے پر پولیس نے کرن کے گھر کے افراد کو چھوڑ دیا۔

وہ لوگ کرایہ اور ایڈوانس دے کر پھر اسی مکان میں آ گئے۔ اس وقت کرم دین نے اپنی بچیوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا......

’’انسان کو صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ میری بیٹیوں کبھی کسی لمبی موٹر والے کی گاڑی میں نہ بیٹھنا۔‘‘

قسط نمبر1

پل صراط

ریاض حسین شاہد

الیکٹرونک میڈیا کے ناجائز استعمال سے جنم لینے والے واقعات کا شاخسانہ۔

اس ماں کی کہانی جس نے اپنی محبت کے کھو جانے کا انتقام اپنی بیٹی کی محبت چھین کر لیا۔

اس نوجوان کی داستان الم جس نے محبت کے حصول کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی۔

معروف ادیب ریاض حسین شاہد کے قلم سے سسپنس سے بھرپور سلسلے وار کہانی۔

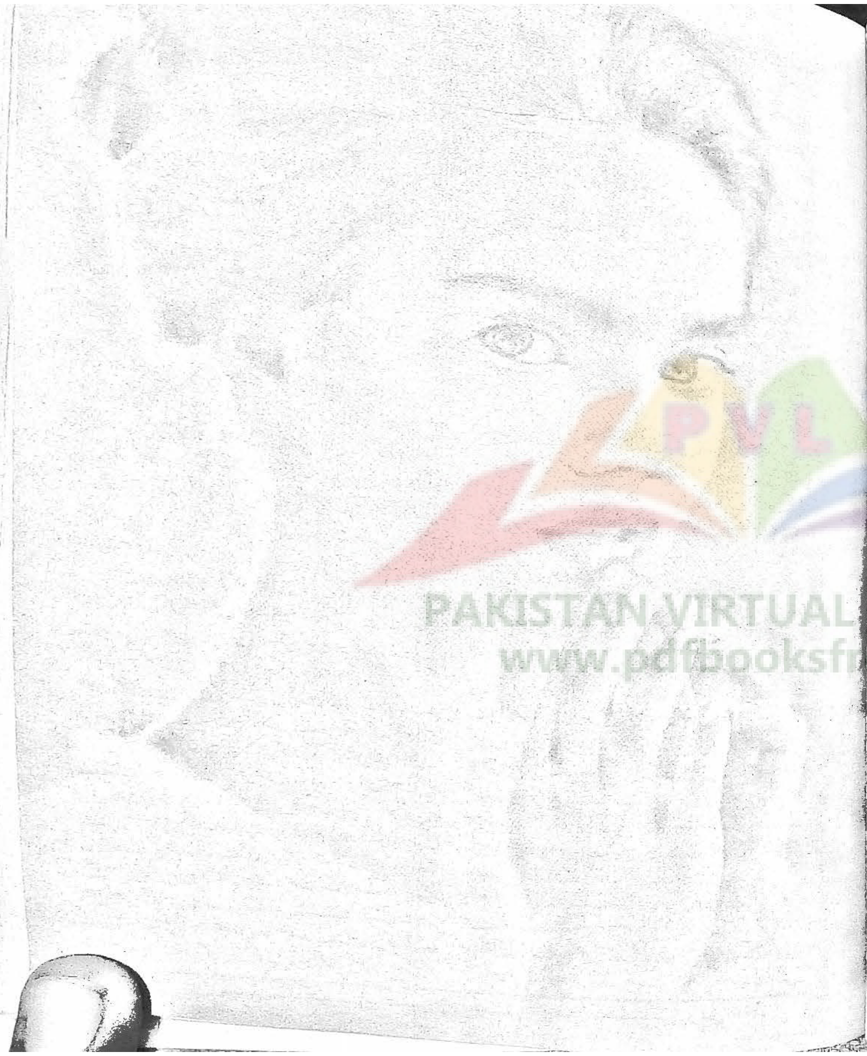

طرح زیرو کی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور ایک کے عدد کی قیمت بس ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر جب ایک کے ساتھ زیرو کو ملا کر لکھ دیا جائے تو وہ دس بن جاتے ہیں۔ ایک بے قیمت زیرو نے ایک کے عدد کو اہمیت دی اور اس کا ساتھ دیا۔ تو اس کی قیمت زیرو سے دس تک جا پہنچی۔ وہ بے قیمت نہ رہا اور جب ایک کے عدد نے اسے اپنے ساتھ قبول کر لیا تو وہ بھی ایک سے دس بن گیا۔ دونوں مل کر باقیمت ہو گئے۔ حالانکہ الگ الگ رہ کر وہ بے قیمت تھے۔ سڑک پر پیدل سفر کرنے والا ایک مزدور مزدوری کی غرض سے پیدل شہر جا رہا تھا۔ پیچھے سے ایک تیز رفتار قیمتی گاڑی آئی۔ کسی دوسری گاڑی کو اوورٹیک کرتے ہوئے وہ ذرا سا پختہ سڑک سے اتری اور گرد و غبار کا ایک طوفان چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ پیدل سفر کرنے والا مزدور گرد سے اَٹ گیا اور بے بسی سے کپڑے جھاڑ کر پھر سے آگے بڑھنے لگا۔ ادھر وہ تیز رفتار گاڑی کوئی دو میل کا سفر طے کر کے کسی فنی خرابی کے باعث بند ہو گئی۔ گاڑی کا مالک نیچے اترا اور نہایت بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایسے میں وہ مزدور وہاں پہنچا۔ اس نے گاڑی کا انجن چیک کیا۔ کیونکہ وہ موٹر مکینک تھا اور شہر میں کسی ورکشاپ پر نوکری کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ورکشاپ پر کام کرنے جا رہا تھا۔ ایک کیبل اپنے مقام سے اتر گئی تھی اس نے تار جوڑ دی اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔

ذرا دیر بعد وہ مزدور اسی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا اور گاڑی کا مالک اس کا بے پناہ احسان مند ہو کر اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ مزدور زیرو کی مانند تھا۔ مگر جب ایک نے اسے ساتھ ملایا تو گاڑی سفر پر گامزن ہو گئی۔ ورنہ وہ لاکھوں کیا وقات کو کھو کر چھکڑا بن کر رہ گئی تھی۔ زیرو کی قیمت ایک کے دم سے ہے اور ایک کا عدد زیرو کے دم سے سربلند ہے۔ یہ بظاہر ایک معمولی سی مگر ایک بہت بڑی بات ہے۔ جو انسان کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ یا پھر انسان اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا۔ ہر انسان ہمیشہ اپنے فائدے کی بات سوچتا ہے۔ اپنی ذات کو نفع دینے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر ممکن اپنی منفعت، اپنے مفاد کی طلب کے لیے وہ سرکس کے جھولے پر الٹا لٹکنے سے بھی باز نہیں آتا۔ جیل میں قیدی کے گلے میں پھانسی کا پھندہ ڈال کر اسے موت کے حوالے کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتا۔ کیونکہ اس کے بدلے اسے دولت ملتی ہے اور دولت کو حاصل کرنا ہی اس کا مقصد ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات کا مقام دیا گیا ہے۔ مگر اپنے مفادات کی خاطر وہ کئی بار اپنے سے کم تر مخلوقات کے درجے سے بھی گر جاتا ہے۔ اپنا فائدہ سوچنے والا انسان دوسروں کو صرف استعمال کرنا چاہتا ہے اور جو انسان دوسروں کے کام نہ آئے۔ تو ان سے کام لینا ظلم ہے اور یہ ظلم شروع دن سے دنیا میں ہوتا چلا آیا ہے۔ اپنی بات منوانا، اپنی خواہش پوری کروانا انسان اپنا حق سمجھتا، اس کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ یہی بات بہت بڑے بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔ آپس میں اختلافات کا موجب بنتی ہے۔ اختلافات بڑھتے ہیں تو رشتے ناتے اور تعلق داریاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ جس طرح بچے جب تک ایک کھلونے سے مل کر کھیلتے رہتے ہیں۔ کھیل پرلطف رہتا ہے۔ مگر جب کوئی کھلونے کو اپنی ملکیت سمجھ کر دوسروں کو اس سے کھیلنے نہیں دیتا تو کھیل میدانِ جنگ بن جاتا ہے۔ ذرا ذرا سی رنجشیں، ذرا ذرا سی باتیں، معمولی سے واقعات بہت بڑے حادثات، بہت بڑے اختلافات کی صورت اختیار کر جاتے ہیں۔

ہابیل نے قابیل کو صرف اس لیے قتل کر دیا کہ تمہاری نذر کیوں قبول ہو گئی اور میری کیوں قبول نہیں ہوئی؟ بھلا اس بات میں اس کا کیا قصور تھا؟ وہ تو نردوش تھا۔ بس وہ ہابیل کی خواہش کی بھینٹ چڑھ گیا اور آج انسان کا قتل بلکہ بہت سے انسانوں کا ایک ساتھ قتل۔ بس ایک شخص جیکٹ ڈال کر آتا ہے خود کو بھی اڑا دیتا ہے اور بھرے بازار کے مجمعے کو بھی موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ آخر کیوں؟ کس کی خواہش پر ایسا کیا جاتا ہے؟ ایسا حکم جاری کرنے والے کا مقصد کیا ہے؟ انسانی خون کی ندیاں بہانے والے کو اپنی موت یاد نہیں۔ یقیناً وہ غفلت میں ہے۔ معاشرے میں عزت کی تمنا خود غرضی کی انتہا ہے اس طرزِ سلوک کو استحصال بھی کہتے ہیں۔ آخر دوسروں میں باعزت ہونے کی تمنا ہی کیوں ہو؟ لوگوں سے اپنی صداقت اپنی دیانت کی قیمت کیوں وصول کی جاتی ہے؟ کیوں لوگوں کو مجبور کیا جاتا ہے؟ کہ وہ آپ کی عزت کریں۔ آپ کا احترام کریں۔ آپ کا ذکر کریں۔ آپ کی تعریف کریں۔ صرف آپ کی بات کریں۔ لوگ اپنے اپنے کام کیوں نہ کریں۔ انسان سوچتا ہے۔ اپنی خواہش، اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے وہ سوچنے پر مجبور ہے۔ انسان مجبور ہے۔ وہ مجبوری توڑنا چاہتا ہے اور فطرت اسے مجبور رکھنا چاہتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے رستے پر مجبور ہیں۔ ہر انسان ایک الگ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ایک گھر میں پیدا ہونے والے، ایک دسترخوان پر پرورش پانے والے، ایک جیسا ذائقہ، ایک جیسا نصیب اور ایک جیسا مزاج نہیں رکھتے۔ گویا ہر انسان مزاج میں رہن رکھ دیا گیا ہے۔ لاکھوں روپے کی قیمتی گاڑی میں بیٹھا ہوا خوش پوش نوجوان گاڑی کے راستے میں حائل ہونے والے گدھا گاڑی چلانے والے انسان کو کھڑکی سے سر نکال کر غلیظ گالی دیتا ہے تو گدھا گاڑی کا مالک جب اسے راستہ دیتا ہے۔ تو بڑبڑاتے ہوئے کئی گالیاں دے ڈالتا ہے۔ دو ایک جیسے انسان جو ایک دوسرے کی صورت سے بھی آشنا نہیں۔ ذرا سی بات پر ایک دوسرے کی زندگیاں ختم کر دیں۔ آخر کیوں؟ کیا ہم صرف اپنے لیے زندہ رہنے کا حق رکھتے ہیں۔ دوسرے انسان کو انسان سمجھنا ہی ہمیں گوارا نہیں۔

بس میں سفر کرتے ہوئے ایک دیہاتی عمر رسیدہ مسافر نے سگریٹ جلائی تو دوسری سیٹ پر بیٹھی دو معزز خواتین نے چلاتے ہوئے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”سگریٹ نہ جلاؤ بابا۔ خدا کے لیے دھوئیں سے ہماری جان پر بن آئے گی۔ بابا کچھ خیال کرو۔ سگریٹ نہ پیو گے تو کیا تمہاری جان نکل جائے گی؟“ پیچھے سے کسی نے فقرہ داغا

”شرم تو نام کی بھی نہیں ہے۔“ یہ بھی کسی خاتون نے دور سے اپنی کیفیت کا اظہار کیا تھا۔

”جانے دو باباجی۔ تھوڑا ہی سفر باقی ہے پھر پی لینا۔“ یہ ہمدردانہ لہجہ بھی کسی مسافر کا ہی تھا۔ دیہاتی جو سگریٹ جلا چکا تھا۔ چاروں اطراف سے جیسے شکنجے میں آ گیا ہو۔ اس نے ایک ہی کش لگایا اور بوکھلا کر سگریٹ کا جلتا حصہ بس کے فرش پر رگڑ کر بجھایا اور اس سگریٹ کو جیب میں ڈال لیا۔ پھر باقی سفر کا حصہ اس نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر نہایت ندامت اور شرمندگی کی حالت میں طے کیا۔ جیسے اس نے کوئی بہت بڑا پاپ کر دیا ہو اور سب کے سامنے مجرم کی حیثیت سے بیٹھا ہو۔ بات صرف اتنی تھی کہ ان خواتین نے جب ان سے کہہ دیا تھا کہ بابا سگریٹ نہ جلاؤ۔ تو کیا یہ کم نہ تھا؟ باقی سب لوگوں نے جو توہین آمیز لہجے میں اسے پھٹکارا، ڈانٹ پلائی۔ وہ کس زمرے میں آتی تھی؟ کیا کسی کو بری حرکت سے روکنے کے لیے بداخلاقی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ بخدا! بات تو چھوٹی سی ہے۔ مگر بہت غیر اخلاقی اور تکلیف دہ بات ہے۔ ناپاک کپڑے کو پیشاب سے پاک نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح کسی کی بری بات کو بداخلاقی اور کرخت لہجے سے نہیں سمجھایا جا سکتا۔

……☆……☆……

ڈاکٹر احتشام الحق ایم بی بی ایس جو ہارٹ اسپیشلسٹ بھی تھے۔ ان کے پرائیویٹ کلینک پر سیکنڈ ٹائم دو بجے ہی مریضوں کی آمد [illegible] ہو [illegible] تھی۔ مریض داخلی رجسٹر میں نام کا اندراج [illegible] انتظار میں بیٹھ جاتے۔ امیر طبقے کے لوگ اور سفارشی طور پر ڈاکٹر صاحب سے فون کال پر وقت لے لیا جاتا اور کچھ بغیر کسی داخلہ اندراج کے ڈائریکٹ ہی اندر چلے جاتے۔ دور دراز کے گاؤں سے آنے والی مریضہ مریم جو بیس برس کی جواں سال کنواری دوشیزہ تھی۔ اسے دوسری بار اٹیک ہوا تھا۔ اسے ٹیکسی میں ڈال کر اس کا بھائی محمد خاں اپنی بیوی سائرہ اور چھوٹی بہن زینب کے ساتھ احتشام کلینک پہنچا۔ زینب اور سائرہ مریم کو سہارا دے اندر آ پہنچی تھی۔ اسے ایک خالی صوفے پر لٹا دیا گیا۔ ان کو سولہ نمبر کی پرچی دی گئی تو محمد خان نے ریکوئسٹ کی۔

”مریضہ کو آج دوسری بار شدید اٹیک ہوا ہے۔ پلیز آپ ایمرجنسی میں سب سے پہلے مریضہ کو دکھانے کی اجازت دے دینا۔“

”بھئی یہ تو مشکل ہے کچھ لوگوں نے تو کل سے پرچی لے رکھی ہے۔ ہم ان کو کیا جواب دیں گے۔ ہمارے بھی کچھ اصول ہیں۔ ہماری نظر میں ہر مریض کو برابر کا حق حاصل ہے۔“ کلرک نے معذرت خیز لہجے میں کہا۔

”مگر جناب ہمارے مریض کو تکلیف ہے اس لیے پہلے ہمارا حق بنتا ہے۔“ محمد خاں نے التجا کی۔

”اچھا بابا بحث نہیں کرو۔ ادھر چل کر مریضہ کے پاس بیٹھو۔ جب ڈاکٹر صاحب آئیں گے تو ان سے بات کر لینا۔“ کلرک نے بے پروائی سے کہا اور دوسرے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو اس کے کاؤنٹر پر گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ محمد خاں کچھ مایوسی کی حالت میں پلٹا تو ایک ادھیڑ عمر شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ پریشان نہ ہوں بھائی۔ میں اپنی والدہ کو چیک اپ کے لیے لایا ہوں۔ میرا ساتواں نمبر ہے۔ آپ میرے نمبر پر اپنی مریضہ کو چیک کروالینا۔ میں آپ کے نمبر پر اپنا مریض دکھا لوں گا۔“ ایک اجنبی شخص کے اس ہمدردانہ سلوک پر محمد خاں بہت متاثر ہوا۔

”آپ کا بہت شکریہ بھائی۔ یہ آپ کا مجھ پر بہت احسان ہو گا۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں اور ٹیکسی سے یہاں بہت مشکل سے پہنچے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں بھائی۔“ اجنبی نے پھر اسے دلاسا دے کر کہا

اور محمد خاں کے ساتھ اس کی مریضہ مریم کے پاس آ پہنچا۔ مریم کراہ رہی تھی۔ سائرہ اس کا سر دبا رہی تھی اور مریم کی بہن زینب مریم کے پاؤں دبانے میں مگن تھی۔ مریضہ کو بار بار پانی کی بوتل سے چند گھونٹ پانی پلایا جا رہا تھا۔ چار بجے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ کی تاخیر تھی اور انتظار کا ایک ایک لمحہ صدیوں پر بھاری پڑ رہا تھا۔ مریضوں کی بھیڑ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ پونے پانچ بجے چالیس برس کے ایک مریض کو اسٹریچر پہ ڈال کر اندر لایا گیا۔ اس کی حالت بھی کافی خراب تھی۔ انہوں نے بھی کلرک کو اپنا مریض پہلے دکھانے پر زور دیا۔ پانچ بج کر پانچ منٹ پر ڈاکٹر صاحب اندر آئے اور سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تمام مریضوں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

ایسے میں ایک لینڈ کروزر گاڑی کلینک کے دروازے پہ پہنچی۔ اس میں آنے والی بھی ایک خاتون مریضہ تھیں۔ ساٹھ برس کی قدرے بھاری بھرکم سراپے کی مالک خاتون شائستہ بیگم کو ویل چیئر پر ڈال کر اندر لے جایا گیا۔ فرنٹ سیٹ سے چوہدری کرامت علی خان جو قیمتی چشمہ لگائے ہاتھ میں بید پکڑے برآمد ہوئے اور سیدھے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں چلے گئے۔ اس سے پہلے فرسٹ مریض اندر جا چکا تھا۔ چوہدری صاحب کو اندر جانے سے نہیں روکا گیا۔ بلکہ دروازے میں کھڑے ملازم نے جو اگلے مریض کو آواز دے کر بلاتا تھا۔ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر دروازہ کھول دیا اور چوہدری صاحب اندر چلے گئے۔ پھر جیسے ہی شائستہ بیگم کی ویل چیئر دروازے تک پہنچی۔ اندر سے بیل دی گئی۔ ملازم اندر گیا اور اگلے ہی لمحے دروازہ کھول کر شائستہ بیگم کی ویل چیئر بغیر کسی ٹوکن کے اندر داخل ہو گئی۔ سبھی مریضوں کے وارثوں نے اس بات کو گہری نگاہ سے دیکھا اور بے بسی کی حالت میں پہلو بدلنے لگے۔

محمد خاں نے مریم کو پانی کا گھونٹ دیا۔ تو اس نے قے کر دی اور زور سے کراہنے لگی۔ اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اس پر اٹیک کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ سارا جسم پسینے میں شرابور اور برف کی طرح سرد ہوتا جا رہا تھا۔ زینب اور سائرہ چیخ پڑیں۔

"خدا کے لیے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔" محمد خاں بھاگ کر ڈاکٹر کے کمرے کی طرف بڑھا اور ملازم کو دھکا دے کر اندر چلا گیا۔ اس لمحے ڈاکٹر صاحب شائستہ بیگم کو اسٹریچر پر لٹا کر چیک اپ کرنے میں مصروف تھے۔

"ڈاکٹر صاحب ہماری مریضہ مر رہی ہے۔ خدا کے لیے اسے بچالو۔" وہ غمناک آواز میں چیخ پڑا۔ کمرے میں موجود بھی لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ڈاکٹر نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"کہاں ہے تمہاری مریضہ؟"

"جی باہر برآمدے میں ہے۔"

"اسے اندر لے آؤ۔" ڈاکٹر نے کہا۔ محمد خاں بجلی کی تیزی سے پلٹا۔ اکھڑی ہوئی سانسوں والی مریم کو اٹھا کر کندھے پر لادا اور ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ کراہتی ہوئی مریم کے منہ سے قے بہہ بہہ کر محمد خاں کی پشت کو تر کرتی جا رہی تھی۔ بیگم شائستہ ابھی اسٹریچر پر تھیں۔

"پلیز ماں جی آپ اٹھ جائیں۔ مریضہ کی حالت سیریس ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے شائستہ بیگم سے ریکوسٹ کی۔ چوہدری صاحب نے کچھ ناگواری سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا اور اپنے بیٹے کو اشارہ دیا۔ ملازمہ بھی ساتھ تھی۔ دونوں نے آگے بڑھ کر شائستہ بیگم کو سہارا دے کر اسٹریچر سے اتارا۔ چند لمحے بڑی بی نے اپنی چادر سنبھالنے اور اسٹریچر سے اترنے میں مزید خرچ کیے۔ پھر جب مریم کو اسٹریچر پر ڈالا گیا۔ تو ڈاکٹر نے پل بھر میں ہی اس کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا اور اپنے کمپوڈر کو فوری مریضہ کو آکسیجن دینے کا اشارہ کیا۔ سرہانے رکھے ہوئے گیس سلنڈر کی نالی اور ہیڈ کور مریم کے چہرے پر لگایا گیا۔ اس عرصے میں ڈاکٹر صاحب نے اسٹیتھو سکوپ سے مریم کی چھاتی کا معائنہ کیا۔ مریضہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ سکتے کی حالت میں تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں ہاتھوں سے اس کی چھاتی کو دبایا۔ اس عرصے میں شائستہ بیگم کی ویل چیئر کمرے سے باہر جا چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں فارغ کر لیں۔ پھر اسے دیکھتے رہنا چوہدری صاحب نے اس گمبھیر صورت حال میں بھی اپنی جاہ و حشمت کا رعب جاری رکھا۔

ڈاکٹر صاحب نے پلٹ کر اپنی کرسی سنبھالی اور شائستہ بیگم کا نسخہ لکھنے لگے اور مریم کا سارا جسم اچانک بے آب مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ ڈاکٹر نے ہیلپر بوائے کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ بوائے نے آگے بڑھ کر مریم کا ہیڈ کور دونوں ہاتھوں سے سنبھالا۔

"او مائی گاڈ۔"

"ڈاکٹر صاحب گیس سلنڈر ختم ہو گیا۔" بوائے نے چیخ کر بتایا۔

"کیا؟" ڈاکٹر بھی اچھل کر رہ گیا۔ نہایت افراتفری کے عالم میں دوسرا سلنڈر اندر لایا گیا۔ مگر جب سلنڈر تبدیل کیا گیا۔ تب مریم کی روح پرواز کر چکی تھی۔

"اوگاڈ۔" ڈاکٹر کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور مریضہ کی نبض چیک کر کے مایوسی سے پلٹا اور اشکبار محمد خاں کے دونوں کندھے تھپتھپاتے ہوئے نہایت بے بسی سے کہا۔

"اس کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" کمرے میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ مریم کی لاش پر سفید چادر ڈال کر اسٹریچر پر باہر بھیج دیا گیا۔ پھر پہلے شائستہ بیگم کی گاڑی رخصت ہوئی اور بعد میں تمام کاغذی کارروائی اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری کر کے مریم کی ڈیڈ باڈی کو ایمبولنس میں رخصت کر دیا گیا۔

موت کا وقت مقرر ہے۔ مان لیا کہ مریم کی موت کا وقت مقرر تھا۔ مگر آخری لمحات میں اس کی نگہداشت کا اندازہ کیا گیا۔ شائستہ کا محض چیک اپ ہونا تھا۔ اسے نہ تو ٹوکن لینے کی اذیت سے گزرنا پڑا۔ نہ اپنی باری کا انتظار کرنا پڑا اور پھر جس لمحے اس کی سانسیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اس لمحے شائستہ بیگم کو اسٹریچر خالی کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ انسان مر جائے تو کچھ نہیں ہوتا۔ انسانیت مر جائے تو ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ سارا معاشرہ بے حس ہو جاتا ہے۔ کسی کی حق تلفی نہ کی جائے۔ کسی کی حوصلہ شکنی سے اجتناب کیا جائے۔ کسی کے ساتھ ہمدردی برت لی جائے تو انسانیت کبھی نہیں مر سکتی۔ بات چھوٹی سی ہے۔ مگر اس پر عمل درآمد کر لیا جائے تو بہت بڑی بات ہے۔ عمل کرنے سے آتا ہے۔ جب کسی کی بات سمجھ میں آجائے تو عمل خود بخود اندر سے شروع ہو جاتا ہے۔

☆ ☆

نایاب کے کمرے میں اس کے بے حد قیمتی موبائل کی گھنٹی وقفے وقفے سے تیسری بار گونج رہی تھی۔ لگتا جیسے بہت سی چڑیاں ایک ساتھ چہچہا رہی ہوں۔

"ہیلو مہک! خیریت تو ہے میری جان۔ آج اس وقت ہماری یاد کیسے آگئی؟"

"یار وہ آج زینا کے ہاں پارٹی ہے نا۔ کیا پروگرام ہے تمہارا؟ کب چل رہی ہو تم؟"

"میں تو تیار بھی ہو چکی ہوں میری جان۔ بس ابھی کچھ دیر میں ہی نکل رہی ہوں۔" نایاب نے بتایا۔

"او یار تو میری طرف آجاؤ نا۔ ہم مل کر چلتے ہیں۔ دراصل وہ مما آج میری گاڑی لے کر کہیں جا رہی ہیں۔ مما نے تو کہا تھا کہ میں آپ کو ڈراپ کر دیتی ہوں۔ واپسی پر فرحان بھائی تجھے ریسیو

کر کہا۔

"میں حاضر ہوں میری جان۔ بس ایک گھنٹے کے اندر اندر رہی ہوں تمہارے پاس۔ بس تم تیار ہو جاؤ۔ تمہاری کمپنی میں میرا وقت بھی اچھا کٹ جائے گا۔" نایاب نے کہا۔ موبائل اپنے بیڈ پر اچھال دیا اور ایک بار پھر سنگھار ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ پھر جب وائٹ کلر کی خوبصورت ہنڈا کینال کالونی جمشید صاحب کے بڑے سے گھر کے گیٹ پر رکی۔ ہارن کی آواز پر چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ نایاب نے اپنی گاڑی اندر لان کے قریب پہنچ کر روک دی۔ لائٹ کلر کے خوبصورت سوٹ میں ملبوس درمیانے قد و قامت کی مالکہ مہک پرس کندھے پر لٹکائے ایک ہتھیلی میں بڑا سا موبائل پکڑے برآمد ہوئی اور چہرے پر دلکش مسکراہٹ سجائے نایاب کے قریب پہنچی۔ اپریل کے ایام تھے۔ اتنی شدید گرمی تو نہ تھی۔ پھر بھی نایاب کی گاڑی کا اے سی پوری گاڑی کو شدید ٹھنڈک پہنچا رہا تھا۔ گاڑی کا بلیک کلر شیشہ قدرے نیچے اتار کر نایاب نے بدستور اپنا سیاہ چشمہ چہرے پر سجائے ذرا سا ہاتھ لہرا کر مہک کو ویلکم کیا۔ وہ اس کے مقابل فرنٹ پر آ بیٹھی۔

"مارکیٹ پہنچ کر زینا کے لیے کوئی گفٹ بھی خریدنا ہے۔" نایاب نے مہک سے مخاطب کر کے کہا۔ پھر گاڑی ریورس ہوئی اور کینال کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگی۔ مہک بار بار نایاب کو رشک بھری نظروں سے جھانک رہی تھی۔ نایاب نے بھی یہ بات نوٹ کر لی اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"قسم سے یار آج تو تمہارا حسن قیامت ڈھا رہا ہے۔ چاکلیٹ کلر کا سوٹ تم پر اس قدر سما رہا ہے کہ جیسے یہ بس تمہارے لیے ہی بنا تھا۔"

"بکواس نہیں کرو یار۔ کبھی تو سیریس بھی رہ لیا کرو۔" نایاب نے سر جھٹک کر اس ادا سے کہا کہ مہک اس پر جان نثار ہو گئی۔

"نایاب ایمان سے آج میں تمہارے حسن پر عاشق ہو گئی ہوں اور میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آج جو نگاہ بھی تیری طرف اٹھے گی وہ پھر کہیں اور نہیں اٹھ سکے گی۔ کئی دل پھینک آج تیری تیر نظر کا شکار ہوں گے۔"

"یہ سب کیا کہہ رہی ہو تم مہک؟ مجھے بنا رہی ہو یا حقیقت میں کچھ ہے۔" نایاب نے الجھ کے پوچھا۔

"قسم سے نایاب اگر تم آئینے میں خود کو بغور دیکھو تو خود پر فریفتہ ہو جاؤ گی۔" مہک نے سنجیدگی سے اسے بغور دیکھتے ہوئے

ے آگے پیچھے رواں تھیں۔ کینال کے کنارے کھڑے درختوں پر بہار کا سبزہ ہر سو بکھرا تھا۔ آسمان سے اڑتے ہوئے سفید بگلوں کی ایک ڈار درختوں کی چوٹیوں سے سڑک کو پار کر رہی تھی۔ نایاب کی نگاہ ادھر اٹھی تو اس نے کسی نئے جذبے کے ساتھ آج پہلی بار خود کو ہواؤں میں اڑتے ہوئے محسوس کیا۔

''آج تک تمہاری خواہش کا تمہیں کوئی آئیڈیل نہیں ملا نا۔'' مہک نے کچھ وقت کے بعد اسے جیسے چونکا سا دیا۔ جواب میں اس نے ذرا سے اقرار میں گردن ہلائی۔

''جانے کیوں آج یہ دل گواہی دے رہا ہے کہ آج وہ تمہارے سپنوں کا شہزادہ ضرور تم سے ملے گا۔''

''مہک! خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ یہ آج تم کیا اول فول بک رہی ہو۔ کئی شہزادے میرے عاشق بنے پھرتے ہیں۔ مگر میرے دل نے ابھی تک کسی کو قبول نہیں کیا۔''

''میں جانتی ہوں یونیورسٹی کے کئی امیر گھرانوں کے خوش پوش لڑکوں نے تمہارا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر تم اس قدر کٹھور ہو کہ کسی کی ذرا سی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اس لیے مغرور اور خود سری لڑکی جانی جاتی ہو۔ ہم اس وقت لاسٹ ائیر میں ہیں۔ چوبیس پچیس برس کی عمر کچھ کم نہیں ہوتی۔ جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں۔ اس عمر میں تو لڑکیاں ماں بن چکی ہوتی ہیں۔ ہمسفر کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ خدا کے لیے اپنی ذات کے خول سے باہر نکلو اور زندگی کی پر کیف بہاروں کو قریب سے محسوس کرو۔ بہاریں سدا بہار بن کر نہیں رہا کرتیں۔ ہر بہار اور ہر رت کا اپنا ایک موسم ہوتا ہے۔ جس پھولوں سے بھری شاخ پر گلاب کے پھول کھلتے رہیں اور وہیں کھڑے کھڑے اپنی بہار کو خزاں کے ہاتھوں پتی پتی بکھیر دیں۔ ان کی بھی کوئی زندگی ہے۔ گلاب تو کھلتے ہی اوروں کے لیے ہیں اور وہ سجتے ہی کسی کی زلفوں اور کالر کے لیے ہیں۔ جو پھل پکنے پر بھی توڑے نہ جائیں۔ وہ اپنی موت آپ مرجایا کرتے ہیں۔'' مہک بولے چلی جا رہی تھی اور نایاب کے دماغ میں اس کی باتیں ایک ہلچل سی پیدا کر رہی تھیں۔ وہ اپنے اندر بہت بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔

''آخر تم نے اپنے بارے میں کیا سوچ رکھا تھا؟ آخر تم چاہتی کیا ہو؟ کوئی ایسی خواہش تو تم نے اپنے اندر پال رکھی ہے۔ جس کی تکمیل کے لیے تمہیں کسی خاص وقت کا انتظار ہے۔'' مہک نے جیسے آج اس کے اندر ایک چنگاری سی جو خاموشی سے کہیں دبی پڑی سی۔ اسے پھونک کر شعلہ بنا کر فیصلہ کر لیا تھا۔ دونوں باتیں کرنے میں اس قدر مگن تھیں کہ جس شاپنگ سنٹر پر انہوں نے جانا تھا وہ سڑک عبور کر کے آگے نکل گئی تھیں۔

''ہمیں تو پینوراما جانا تھا۔'' اچانک مہک نے نایاب کو احساس دلایا۔

''او آئی سی۔'' نایاب نے چونک کر کہا اور اگلے یوٹرن سے گاڑی واپسی کے لیے موڑ لی۔ شاپنگ سنٹر تک آتے آتے دونوں پر ہی ایک پر اسراری خاموشی چھائی رہی۔ گاڑی پارک کر کے دونوں ایک ساتھ شاپنگ سینٹر داخل ہوئیں۔

نایاب نے اپنی دوست زینا جس کی منگنی کی تقریب میں شمولیت کے لیے وہ جا رہی تھیں کے لیے ہیرے کا ایک قیمتی سیٹ خریدا۔ مہک نے بھی ایک قیمتی گولڈن لاکٹ اور کنگن خریدے۔ مہک دکاندار کو اپنا بل پے کر رہی تھی کہ اچانک نایاب کی نگاہ اپنے سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے اس خوش پوش نوجوان کی طرف اٹھی۔ جو محویت کے عالم میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے کے لیے ان کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ چونکے اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئیں۔ جیسے صدیوں پہلے سے انہیں ایک دوسرے کی تلاش تھی۔ نوجوان نے رخ پھیر کر دکان دار کی طرف خود کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی گردن جیسے کسی مقناطیسی کشش کے ہاتھوں پیچھے پلٹنے پر مجبور ہو چکی تھی۔ نایاب کے یاقوتی سرخ لب ذرا سے کھلے تھے۔ اس کی مخمور نگاہیں دراز پلکوں کی چلمن سے ادھر ادھر جھانکنے پر اسے مجبور کیے جا رہی تھی۔ نایاب نے بھی خود کو سنبھالنے اور مہک کی طرف متوجہ ہونے کی بھرپور تگ و دو کی۔ اس کا رخ بھی مہک کی جانب تھا۔ مگر اس کی گردن کندھے کی آڑ میں کروٹ لیے ہوئے تھی۔ اس کا دل تھا کہ سے اچھل کر باہر آ رہا تھا۔ اس کی سانسوں میں تلاطم سا تھا اور وہ خود میں نہ رہی تھی۔ اسے لگا جیسے کسی نے شاخ پہ سجا گلاب نوچ لیا ہے اور خالی شاخ احتجاج کرتے ہوئے لرز رہی ہے۔ اس نوجوان معیز کے وجود میں بھی لرزہ طاری تھا اور وہ خود کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

''چلیں ڈارلنگ؟'' مہک کی آواز اسے کہیں دور سے سنائی دی۔

''آں...... ہاں ہاں چلیں۔'' نایاب نے کچھ ہکلا کر کہا۔ اب وہ پلٹ کر گیٹ کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ مگر اس کے پاؤں بوجھل سے ہو کر رہ گئے تھے۔ مہک بہت ذہین اور تیز طرار سی لڑکی

تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھتی ہوئی نایاب کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو معیز کو ادھر متوجہ پا کر وہ سرتاپا چونک گئی۔ پھر اس نے بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اپنے قدم روکے اور نایاب کے تعاقب میں آ گئی۔ اب معیز بھی ان کے تعاقب میں ادھر آ رہا تھا۔ گاڑی تک آتے آتے نایاب ہر دو قدم پر پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بہت بے چین اور مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ پھر جب وہ گاڑی کے قریب پہنچی۔ نایاب نے ریموٹ دبایا اس کی گاڑی نے آواز بلند کر کے اپنی کھڑکیوں کے لاک کھلنے کا اعلان کیا۔ پندرہ برس کا لڑکا ان کا پیکٹ اٹھائے ان کے ہمراہ چل رہا تھا۔ لاک کھلنے پر لڑکے نے مہک کے اشارے پر گفٹ پیک پچھلی سیٹ پر رکھ دیئے۔ چشمہ نایاب کے ہاتھ میں پکڑا تھا۔ کبھی وہ پہن لیتی پھر اتار کر ادھر جھانک لیتی پھر چشمہ پہن لیتی۔

''خیریت تو ہے میری جان۔ لگتا ہے دل کا پھول آج کسی کی نگاہوں نے چرا لیا ہے۔ ویسے انتخاب تو لاجواب ہے۔ انگوٹھی میں نگینے جیسا۔

''واہ۔'' مہک نے ذو معنی فقروں میں نایاب کو ہلا کر رکھ دیا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟ گاڑی میں بیٹھو۔'' نایاب نے چشمہ آنکھوں پر سجایا اور تیزی سے کھڑکی کھول کر اپنی سیٹ سنبھال لی۔ مہک دوسری کھڑکی سے اس کے مقابل سیٹ پر آ بیٹھی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے نایاب کی نگاہیں سیاہ گاڑی کے شیشے کے پار اس طرف اٹھی تھیں۔ جہاں کھڑا ہوا پریشان حال شخص معیز مجسمہ حیرت بنا دکھائی دے رہا تھا۔ ''ہونہہ'' نایاب نے کچھ ناگواری سے گردن جھٹک کر جیسے خود سے ہنکارا بھر کر کہا اور گاڑی بیک کی۔ اسی لمحے معیز بھی تیزی سے شاید اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔

''یہ پل بھر میں کیا ڈرامہ کھیلا گیا بھئی؟ مجھے تو کچھ بتاؤ۔ یہ کس کو پلٹ پلٹ کر دیکھا جا رہا تھا؟ اور اب کس پر نفرت بھری ہنکار بھری گئی ہے؟'' مہک نے پر تجسس انداز میں نایاب سے پوچھا۔ اس عرصے میں ان کی گاڑی پارکنگ سے نکل کر روڈ پر ٹرن کر رہی تھی۔ نایاب کی نگاہیں بار بار سائیڈ مرر کا طواف کر رہی تھیں۔

''کچھ لوگ خود کو بہت اہمیت دینے لگتے ہیں۔ ایسے ہی دوسروں کے حواس پر غالب ہونے کی کوشش کرتے ہیں اور خود ہی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ سامنے کھڑا شخص میری شخصیت سے بہت امپریس ہوا ہے۔ ہونہہ۔'' نایاب نے ایک بار پھر ناگواری سے ہنکار بھری۔

''اوہو بھئی ہوا کیا ہے؟ کچھ مجھے بھی پتہ چلے معاملہ کیا ہے؟'' مہک نے قطعی اجنبی بن کر پوچھا۔ جیسے اسے کسی بات کا پتہ ہی نا ہو۔ حالانکہ وہ جان چکی تھی کہ نایاب نے کبھی کسی کی طرف اس طرح پلٹ پلٹ کر نہیں دیکھا۔ نایاب کی گاڑی کچھ سست روی سے آگے بڑھ ہی رہی تھی اور وہ خود پر قابو پانے کی تا حال کوشش کر رہی تھی۔ مگر اس کی عجیب سی بے چینی مہک کو چغلی کھاتے ہوئے بتا رہی تھی کہ گلاب کا پھول توڑ لیے جانے پر شاخ ابھی تک لرز رہی ہے۔

''شاید تم نے بھی دیکھا ہو گا شاپنگ سنٹر کے داخلی گیٹ پر بلیو جینز وائٹ اینڈ بلیک شرٹ میں ملبوس ایک نوجوان ہماری طرف متوجہ تھا۔ جہاں سے ہم نے خریداری کی۔ وہاں قریبی دکان پر اس نے ہمیں دیکھا اور تب سے جیسے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ کچھ عجیب سے انداز میں مجھے جھانکتا رہا اور پھر ہمارے تعاقب میں باہر تک آ پہنچا۔'' نایاب نے اسے بتایا۔

''وہ تو سنٹر کے اندر موجود کئی لوگ ہماری طرف بلکہ صرف تمہاری طرف متوجہ تھے اور آنکھ بھر کے تمہیں دیکھ رہے تھے۔ اگر آپ کے جادوئی حسن نے اسے بے چین کر دیا تو اس میں اس بیچارے کا کیا قصور تھا بھلا؟ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کیوں اسے بار بار پلٹ کر دیکھ رہی تھیں؟'' مہک نے جیسے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

''ن...... نن نہیں تو...... میں تو صرف اس لیے ایک دو بار ادھر پلٹ کر صرف یہ دیکھنے کی کوشش کی تھی کہ وہ ہمارے تعاقب میں تو نہیں آ رہا۔'' نایاب نے اسے یہ بتانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ میں اس کی شخصیت سے متاثر ہوئی اور اسے بار بار دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تو ٹھیک ہے۔ وہ جو بھی تھا ہمیں اس سے کیا۔ وہ پیچھے رہ گیا اب تم تو اپنا موڈ ٹھیک کر لو نا بھئی۔'' مہک نے کہا تو نایاب کے پاؤں نے ایکسلریٹر پر دباؤ ڈال کر گاڑی کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جانے کیوں مہک کو لگ رہا تھا کہ وہ ہمارے تعاقب میں ضرور آئے گا۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے مہک بھی ذرا سی گردن جھکا کر سائیڈ مرر میں پیچھے سے آنے والی ٹریفک پر بار بار گہری نظر ڈال کر دیکھتی اور نایاب کی نگاہیں اسکرین کیپار گاڑی کے قدموں میں دوڑتی سڑک کے ساتھ ساتھ سائیڈ مرر پہ بار بار جھانک رہی تھیں۔ گاڑی کے اندر ایک عجیب قسم کی بے چینی تھی۔ گہری

خاموشی کا عالم طاری تھا۔ ایسے میں مہک کے سیل پر بیل ہونے لگی۔ اس نے ایک نظر سکرین پر ڈالی اور سیٹ آن کر لیا۔

"ہیلو ڈارلنگ! اسلام علیکم۔"

"کیا حال ہے میری جان؟ ہم کچھ ہی دیر میں آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ بے غم ہو جاؤ۔ ہاں میں راستے میں ہوں۔"

"او اچھا...... ویلڈن یار...... پھر تو خوب محفل جمے گی۔"

"او کے۔ او کے بائے۔" مہک نے رابطہ ختم کیا تو نایاب نے پوچھا۔

"کس کی کال تھی؟"

"زینا پوچھ رہی تھی کہ کب پہنچ رہے ہو تم لوگ؟ تقریباً سبھی لوگ آ چکے ہیں۔ میری کئی دوست آپ سے ملنے کی منتظر ہیں۔ بس تم فوری پہنچو۔" مہک بتا رہی تھی کہ اسی لمحے نایاب کے سیل کی بھی چڑیاں چہچہانے لگیں۔

"یقیناً یہ زینا کی ہی کال ہو گی۔" مہک نے کہا تو نایاب نے نمبر چیک کر کے آہستہ سے مسکرا کر گردن ہلائی۔

"یس میڈم! آ رہے ہیں ہم۔ بھئی آ رہے ہیں۔ بس کچھ ہی پلوں میں آپ کے پاس ہوں گے۔ او کے" نایاب نے مختصر بات کی اور کال آف کر دی۔ وہ سنجیدہ سے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ویسے بھی وہ بہت کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی۔ مہک اسے سنجیدہ دیکھ کر بہت بے چین تھی۔ وہ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر نایاب کا سرد سا لہجہ اسے بولنے سے روک رہا تھا۔ پھر بھی اس نے کسی بہانے سے نایاب کو بولنے پر مجبور کر ہی دیا۔

"وہ اوپر درختوں کی چوٹیوں میں اڑتی ہوئی پتنگ دیکھ رہی ہیں آپ؟" مہک نے انگلی کے اشارے سے سکرین کے پار نایاب کو متوجہ کر کے جیسے چونکا سا دیا۔

"ہاں" اس نے آہستگی سے پتنگ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا۔

"یہ ایک کٹی ہوئی پتنگ ہے۔ اس کی ڈور اب کسی کے ہاتھ میں نہیں رہی۔ اب یہ ہواؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ اسے جہاں چاہے گی اپنے ساتھ لے جائے گی اور اسے نا چاہتے ہوئے بھی اس کا ساتھ دینا ہو گا۔ اس کی بے بسی یہ ہے کہ یہ کسی مقام پر بھی اپنی مرضی سے رک نہیں سکتی اور اگر کوئی اس کی مدد کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتا کیونکہ یہ سب کی پہنچ سے باہر ہے۔ آہ۔ بس یہی حالت کچھ ہم لڑکیوں کی ہے۔ ہماری ڈور بھی ایک دن کسی کے ہاتھ میں تھما دی جاتی ہے۔ پھر ہم ساری زندگی اس کے اشاروں پر گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اکثریت کی زندگی اسی ڈور پر بندھے بندھے گزر جاتی ہے اور کچھ کی زندگیاں اس کٹی پتنگ کے جیسی ہو جاتی ہے۔

جب حالات کی آندھی چلتی ہے۔ کسی بات پر تلخی بڑھتی ہے۔ رویوں میں تبدیلی آتی ہے۔ تو بندھن کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے اور ہم مقدر کی ہواؤں کی زد میں آ جاتی ہیں۔ اس لیے کیوں نا اپنی زندگی کی ڈور اپنی مرضی سے ان ہاتھوں میں دیں۔ جن پر یقین ہو کہ یہ ہماری زندگی کا بھی خیال رکھیں گے۔ کچھ ہماری بھی مان جایا کریں گے۔ محبت کی ڈور بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ یہ ٹوٹ کر بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونے دیتی۔ جس طرح کٹی پتنگ کی ڈور کسی شاخ سے الجھ کر پتنگ کو روک لیتی ہے۔ اسے ہواؤں کے دوش پر کہیں دور نہیں جانے دیتی۔ اسی طرح محبت کی ڈور ٹوٹ کر بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتی۔ بعض اوقات واپسی کی راہ بھی نکل آتی ہے۔" مہک بول رہی تھی اور نایاب اس کی باتوں کی گہرائی میں خاموشی سے ڈرائیو کرتے ہوئے بار بار مہک کی طرف دیکھ لیتی۔

"محبت کی ڈور ایک بار ٹوٹ جائے۔ تو پھر دوبارہ جڑ تو نہیں سکتی نا؟" نایاب نے مہک کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"محبت کی ڈور مضبوط ہو تو وہ کبھی ٹوٹتی ہی نہیں۔ خواہ ان کی راہ میں حالات کے طوفان ہی کیوں نا حائل ہو جائیں۔" مہک نے کہا۔ تو اسی لمحے اس کے سیل کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ کال کرنے لگی اور ادھر نایاب نے گاڑی زینا کی گلی میں موڑ لی۔ جانے کیوں نایاب کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زینا کے گھر جانے کی بجائے آگے نکل جائے۔ مہک کو بھی ساتھ نہ رکھے۔ بس وہ تنہا ہو جائے اور کہیں چھپ کر جی بھر کے رو لے۔ اسے زندگی میں کبھی نا تو ایسے حالات سے پالا پڑا کہ اس کی آنکھ سے آنسو برسے ہوں اور نا کبھی کسی محرومی نے اسے غمزدہ کیا۔ اس کے مما پاپا نے اس کی پرورش شہزادیوں کی طرح کی تھی۔ گھر میں بے پناہ دولت کی فراوانی تھی۔ وہ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی۔ زندگی کی چوبیس بہاریں اس نے اپنی مرضی سے ہنستے مسکراتے بسر کر لی تھیں۔ جانے آج کا دن اس کی زندگی میں کیسا دن آیا تھا کہ وہ تنہا بیٹھ کر رونا چاہتی تھی۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ اسے ہو کیا گیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں الجھ رہی تھی۔ سامنے گلی میں دائیں بائیں کئی گاڑیاں کھڑی

تھیں۔ نایاب نے بھی ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی پارک کی۔ مہک نے اتر کر گفٹ پیک اٹھائے۔ دونوں کی نگاہیں ایک ساتھ گلی میں دور تک اٹھی تھیں۔ دو گاڑیاں ایک ساتھ ان کے تعاقب میں آ کر قریبی دیوار کے ساتھ آ کر ٹھہر گئیں۔

زینا اور اس کی مما نے ان کا پرجوش انداز میں استقبال کیا۔ زینا کی بہنوں نے گفٹ پیک وصول کیے۔ جو زینا نے ان کی طرف بڑھائے تھے۔ پورا گھر عورتوں اور بچوں سے بھرا تھا۔ دس مرلے کا ڈبل سٹوری گھر تھا۔ آنگن میں شامیانہ سجا تھا۔ زینا ان کو لیے اوپری منزل پہ جانے لگی تو مہک نے واش روم کا پوچھا اور ادھر چلی گئی۔ نایاب کو اوپر جس کمرے میں پہنچایا گیا۔ وہاں تین لڑکیاں پہلے ہی موجود تھیں۔ زینا نے ان سے تعارف کروایا۔

"یہ میری بیسٹ فرینڈ نایاب ہے۔ سیٹھ کامران کی بیٹی جن کا یورپ میں بھی اپنا بزنس ہے۔ یہ ماسٹرز کر رہی ہے اور نایاب یہ کومل ہے۔ یہ بھی ماسٹرز کر رہی ہے۔ گوجرانوالہ سے بیلانگ کرتی ہے۔ یہ میمونہ ہے۔ ڈی ایس پی صاحب کی چہیتی بیٹی۔ لاہور ہاسٹل میں رہتی ہے۔ جلد ہی ڈیفنس میں آپ کے قریب آ جائیں گے اور یہ عارفہ مجید ہے۔ بی ایس سی کر رہی ہے۔ مسلم ٹاؤن سے ہے۔ ان کے ابو بھی بہت بڑے تاجر ہیں۔" زینا نے سب سے باری باری تعارف کرایا تو نایاب نے سب سے نا صرف ہاتھ ملایا بلکہ سب کو کس بھی کی۔

"یار کہاں رہ گئی ہو؟ اتنی دیر۔" نایاب نے مہک کو کال کر کے پوچھا۔

"واش روم میں بزی تھی۔ بس پہنچ رہی ہوں ابھی۔" مہک نے بتایا۔ پھر جب زینا مہک کو لیے کمرے میں پہنچی۔ سب سے اس کا تعارف کرایا اور سب سے الگ الگ پوچھا گیا کہ

"کیا پسند کرو گی؟"

"سب کچھ ہی منگوا لو یار۔ ڈرنک بھی، چائے بھی، قہوہ بھی، سویٹ بھی، نمکین جو بھی ہو لے آؤ سب چلے گا۔ عارفہ کے لیے بس ڈنگ ڈانگ ببل گم ہی منگوالو۔" شریری میمونہ نے جھک کر کہا تو پورا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ نایاب کے لب بھی کھل سے گئے۔ وہ الگ صوفے پر دراز تھی۔ میمونہ اور کومل ایک ڈبل صوفے پر اور مہک عارفہ کے ساتھ مقابل کے صوفے پر بیٹھی تھی۔ درمیان میں بڑی سی میز بچھی تھی۔

"بڑی کمینی ہو تم۔ بچاری عارفہ کے ہر وقت پیچھے پڑی رہتی ہو۔" زینا نے میمونہ کو فری موڈ میں ڈانٹ پلائی۔

"کیا کروں یار؟ یہ بچاری ان بزرگوں کی طرح کنجوسی سے کام لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کم سے ہی کام چلا لے۔ نہیں تو پھر ایک سلنٹی ہی لا کر دے دو۔ اگر گلی میں کوئی پھیری لگانے والا مل جائے تو کھوئے ملائی کی قلفی لا کر دے دو اسے۔" میمونہ بدستور عارفہ کو نشانے پر لیے ہوئے تھی۔ عارفہ بھی کچھ شرماتے ہوئے ہنسے جا رہی تھی۔ باقی سب بھی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ نایاب نروس سی بمشکل ذرا سے لب کھولے قہقہوں میں ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ ٹیبل پر رکھے ڈبے سے اس نے ٹشو نکالا۔ چشمہ صاف کیا۔

"بھئی دراصل عارفہ کچھ مذہبی ٹائپ کی ہے۔ بڑی عارفانہ گفتگو کرتی ہے اور میمونہ کا ان سے بہت مذاق چلتا ہے۔"

"تو اچھا ہے نہ یار۔ اب یہاں دینی مسئلے سیکھنے یا کوئی مجلس پڑھنے کا فنکشن تو ہے نہیں۔ بے انتہا خوشی کا موقع ہے اور ہم سب زینا کی خوشیوں کو دوبالا کرنے آئی ہیں۔" کومل نے میمونہ کی پاسداری کرتے ہوئے کہا۔

"تو اور کیا؟ ہم تقریباً سبھی ہم عمر اور سٹوڈنٹ لائف کی لڑکیاں یہاں جمع ہیں۔ ہلا گلا تو ہونا ضروری ہے نا۔" مہک نے بھی رائے دی۔

"یہ نایاب صاحبہ لگتا ہے۔ کچھ سنجیدگی کے غلبے میں ہیں۔"

"نہیں...... نہیں...... میمونہ۔ نایاب میری بہت کلوز فرینڈ ہیں۔ بڑی ہنس مکھ اور زندہ دل شخصیت ہیں۔ اچھے بھلے خوشگوار موڈ میں میرے ساتھ گھر سے چلی تھیں۔ جانے کس خیال نے راہ میں نروس کر دیا؟ بہر حال آپ محفل جاری رکھیں اور بے تکلفی سے اپنی شوخیاں اور مستیاں جاری رکھیں۔ ذرا دیر تک یہ بھی ہماری ہم نوالہ ہم پیالہ بن جائیں گی۔" مہک نے میمونہ کے جواب میں کہا۔

"او اچھا یہ بات ہے۔ اوں، ہوں۔ کوئی یاد آ رہا ہو گا۔ کسی سے راستے میں کال پر کوئی بات ہو گئی ہو گی۔ ایک تو آج کل کے لڑکوں کو پتا نہیں کیا مسئلہ ہے؟ ہم لڑکیوں کا کہیں آنا جانا کسی فنکشن میں شامل ہونا۔ ان کو ہضم ہی نہیں ہوتا۔" میمونہ نے کہا۔

"ہاں یار یہ تو ہے۔ تم وہاں کسی کے ساتھ گئی تھیں؟ کون ملا؟ کس کے ساتھ وقت گزرا؟ تمہارا جانا کوئی ضروری تھا؟ تمہارا نمبر کیوں اتنی دیر سے بزی جا رہا تھا؟ تمہارا سیل آف کیوں تھا؟ اب ایسے سوالوں کا بندہ کیا جواب دے؟ یار کیا ہم وہاں کسی سے دوستی کرنے اور عشق لڑانے جاتی ہیں۔ آپ ہمارا سب کچھ

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ہیں ہمارے

بچاری سے کہا۔

"ہاں بی بی جان۔ مرد بچاروں نے تو سارے زمانے کے حقوق عورتوں کو ہی دے رکھے ہیں۔"

"وہ کیسے جناب مثلاً؟" مہک نے اترا کر پوچھا۔

"وہ اس طرح میری جان! جب بس پر سواریاں چڑھ رہی ہوں تو سب لوگ بیک زبان ہو کر بولیں گے۔ او۔ پہلے لیڈیز کو بیٹھنے دو بھئی۔ پہلے زنانیاں نوں چڑھن دیو۔ پہلے عورتاں نوں اترن دیو۔ کسی پارٹی کی دعوت کی تقریب میں جانا ہو۔ تو پہلے عورتوں کو وہاں چھوڑ آؤ بھئی۔ مرد بعد میں چلے جائیں گے۔ کھانا پہلے عورتوں کو دو بھئی۔ ان کے ساتھ بچے ہیں۔ عورتوں کے لیے رستہ چھوڑ دو جی۔ ڈاکٹر صاحب عورتوں کو پہلے فارغ کر دو۔ لیڈیز کو سیٹ دے دو یار۔ تھانے کچہری میں عورتوں کی بڑی فریاد سنی جاتی ہے اور مرد بیچارے کیا کریں؟" ان کی اسی گفتگو کے دوران ٹیبل پر کھانے پینے کی اشیاء سجا دی گئیں۔ سب نے اپنی اپنی پسند کی چیزیں لے لیں۔ نایاب نے نمکین دال کی چٹکی بھری اور چبانے لگی۔ مہک نے اسے ڈرنک پیش کی۔

"منگنی کی رسم ادا ہونے میں کتنی تاخیر ہے ابھی؟" نایاب نے پوچھا۔

"ابھی کہاں بھئی۔ ابھی تو کھانے کا پروگرام چلے گا۔ پھر ناچ گانا ہلا گلا۔ پھر جا کر رسم ادا ہو پائے گی۔"

"تب تو رات کے گیارہ بج ہی جائیں گے۔" میمونہ نے ساری تفصیلات سے آگاہ کیا۔

"او گاڈ! یہ تو بہت دیر ہو جائے گی۔" نایاب نے کچھ بےزاری ظاہر کی۔

"او ہو کیا ہوا بھئی؟ خوبصورت اور باذوق لوگوں کی محفل سجی ہے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوگا۔ دو خواتین بیٹھی ہوں تو رات بھر بول سکتے ہیں۔ ہم پانچ ہیں کیا یہ دو چار گھنٹے بھی نہیں گزار سکیں گی۔"

"منہ سنبھال کر بات کرو محترمہ خواتین کے خلاف بول رہی ہیں آپ۔ حقوق نسواں کی پاسداری کرنے کی بجائے ان کے خلاف پروپیگنڈا کر رہی ہو۔" کومل نے میمونہ کو جیسے دبوچ سا لیا۔ سبھی کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

"بھئی اتنی ساری خواتین میں ایک آدھ مردوں کی بات

کو ہونا چاہیے نا۔"

"تمیز سے رہو تمیز سے۔ ابھی ہم چاروں نے پکڑ لیا نا تو ساری مردانگی نکل جائے گی۔" کومل نے کہا تو مہک بھی بول اٹھی۔

"او ہو۔ بھئی نہیں۔ کچھ نا کہو بیچاری کو۔ مرد بننے کی حسرت نکال ہی لینے دو۔" وہ تینوں بول رہی تھیں۔ عارفہ اور نایاب خاموش تھیں۔ بس کھانے میں بھی ہلکا پھلکا لے رہی تھیں۔

"اچھا چلو چھوڑو یار۔ کسی ایک ٹاپک پر سنجیدہ سی گفتگو کرتے ہیں۔" مہک نے کہا۔

"ہائے سنجیدہ گفتگو۔ وہ تو پھر ہماری عارفہ یا پھر آپ کی نایاب صاحبہ ہی کر سکتی ہیں۔ سنجیدگی کا زہر ہم سے تو بھئی ہضم نہیں ہو سکتا۔ سوری۔" میمونہ نے کہا تو کومل بول اٹھی۔

"چلو یار کچھ تو کرو۔ کچھ تو بولو بابا۔ عارفہ جانی۔ ابتدا ہوتی ہے رب جلیل کے بابرکت نام سے۔ جو دلوں کے بھید خوب جانتا ہے۔ آغاز گفتگو سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔" اب عارفہ سبھی کی توجہ کا مرکز بن گئی۔

"بھئی میں کیا بات کروں؟ مجھے تو بابا معاف ہی رکھو۔" عارفہ نے ہاتھ باندھ کر معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

"لو جی مولوانی صاحبہ تو صاف ہی مکر گئیں۔ اب کیا کریں ہم؟" نایاب فون پر کسی سے مدھم لہجے میں بات کر رہی تھی۔ کومل نے مہک کو اشارہ کیا کہ نایاب سے بولو وہ کوئی بات کرے۔ سب ہی نایاب کو بڑی شک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مہک نے سر ہلا کر اشارہ کیا کہ میں بات کرتی ہوں۔ پھر جب نایاب نے اپنی کال ڈراپ کی۔ تو مہک نے کومل کو مخاطب کر کے کہا۔

"نایاب پلیز یار۔ ریلیکس۔ سبھی چہرے آپ کے چہرے پر مسکان کے منتظر ہیں۔ پلیز۔" نایاب نے ایک نظر کمرے میں موجود سبھی چہروں پر ڈالی۔ اس کے لرزتے ہونٹوں سے بے ساختہ سی آہ نکلی۔

"آپ سبھی لوگ بے پناہ خوش نظر آرہے ہیں۔ کیا آپ اندر سے بھی بہت خوش ہیں؟" نایاب نے عجیب سے انداز میں کہا تو لمحے بھر میں سبھی کے چہروں پر سکتہ سا چھا گیا۔ پل بھر میں پورے کمرے میں اداسی برس پڑی۔

"ہاں یار کیوں نہیں؟ ہم اندر سے خوش ہیں تو چہرے پر مسکراہٹ ہے۔" میمونہ اور کومل ایک ساتھ بول اٹھیں۔

"واہ واہ! کیا بات کی ہے نایاب آپ نے؟ یہ دونوں جھوٹ

بول رہی ہیں۔ اگر یہ اندر سے خوش ہیں تو لمحے بھر کو ان کے چہرے مرجھا کیوں گئے تھے۔ ہاں؟" عارفہ نے مدھم سی تالی بجا کر نایاب کو داد دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں عارفہ یہ بات آپ کیسے وثوق سے کہہ رہی ہیں کہ ہم جھوٹی ہنسی ہنس رہے ہیں۔" کومل نے تصدیق چاہی۔

"دیکھو میمونہ بہت خوش مزاج لڑکی ہے۔ سب کو ہنسا دیتی ہے۔ یہ نروس رہ ہی نہیں سکتی۔ میں اسے بہت قریب سے جانتی ہوں۔ سب کے چہرے پر مسکراہٹ سجا دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مگر جب یہ رونے پہ آجائے تو سب کو جی بھر کے رلا دیتی ہے۔"

"اگر یہ اندر سے خوش ہے تو پھر روتی کیوں ہے؟" عارفہ نے کہا تو سب چونک سی گئیں اور میمونہ کی طرف بغور دیکھنے لگیں۔ میمونہ کی حالت پل بھر میں غیر ہونے لگی۔ مگر وہ خود پر قابو پا کر اک زخمی سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے عارفہ کے کندھے پر دھپ سی جما کر بولی۔

"یہ کیا ناٹک شروع کر دیا بھئی آپ نے؟ اچھی خاصی محفل سجی تھی کہ تم نے سب کو سنجیدہ کر دیا۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ بکواس کر رہی ہے یہ۔" میمونہ نے اپنی لرزتی آواز کو پھیلتے ہونٹوں کی ہنسی میں چھپا کر کہا اور ساتھ ہی اپنی دونوں آنکھوں کے نچلے حصے میں ایک طرف انگوٹھے کے ساتھ اور دوسری طرف انگلی کے ساتھ جیسے کچھ صاف کیا ہو۔

"او۔ آئی سی۔" مہک نے پر تجسس انداز میں کہا اور میمونہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"چہرہ انسان کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر کی تصویر اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بس ہم غور سے یہ تصویر دیکھتے نہیں۔ کون سا ایسا دل ہے جس میں درد نہ بھرا ہو؟ سنگدل اور وحشی انسان بھی رو لیا کرتے ہیں اور یہ درد محبت کا ہوتا ہے۔ محبت کسی انسان کے ساتھ ساتھ کسی جانور یا کسی مادی چیز سے بھی کی جا سکتی ہے اور محبت کا درد بہت گہری ٹھیس دیتا ہے۔ بڑی دردناک چبھن ہوتی ہے اس میں۔ جس دل میں یہ درد ایک بار بس جائے تو پھر آخری سانس تک جاتا نہیں۔ مرتے ہوئے بھی آخری ہچکی بھی کسی کی یاد کا آخری تحفہ ہوا کرتی ہے۔" مہک کی آواز بھی بھیگ سی گئی۔ کمرے کی ساری فضا جو ذرا دیر پہلے تک قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ اب اداسی میں ڈوب رہی تھی۔

"مہک یہ تو بتاؤ کہ محبت اس قدر رلاتی کیوں ہے؟" کومل پوچھ رہی تھی۔

"تم یہ بتا دو کہ تم نے محبت کی ہی کیوں تھی؟" میمونہ نے اسے برجستہ جواب دیا۔

"محبت کی تو نہیں جاتی میمونہ۔ یہ کمبخت تو ہو جاتی ہے۔" کومل نے کہا تو نایاب کے پورے وجود میں ایک سنسنی سی پھیل گئی اور اس نے بڑھ کر ڈرنک کا گلاس اٹھا لیا۔

"آخر یہ محبت کا فلسفہ ہے کیا؟" مہک نے الجھ کے پوچھا۔

"میری جان اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی محبت ہے۔ خدا نے خود اپنے محبوب ﷺ سے عشق کیا اور پھر اپنے محبوب کی خاطر کائنات کو سجا دیا۔ اللہ نے فرما دیا کہ اگر میں اپنے محبوب کو پیدا نہ کرتا۔ تو اس کائنات کو ہی پیدا نہ کرتا۔" عارفہ نے وضاحت کی۔

"مگر عارفہ اب اللہ کا اپنے محبوب سے عشق اور ہم انسانوں کا اپنے محبوب سے عشق ایک سا تو نہیں ہو سکتا نا؟" کومل کا سوال بہت معصومانہ تھا۔

"وہ عشق حقیقی ہے۔ ہم عشق مجاز کے پجاری ہیں۔"

"کیا ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں اور سوہنی مہینوال کا عشق بھی مجازی ہی تھا؟"

"رانجھے کا عشق مجاز تھا۔ وارث شاہ کا عشق حقیقی تھا۔ مجنوں کے عشق کا آغاز مجاز سے ہوا۔ مگر اس نے مجاز سے عشق حقیقی کو پا لیا۔ کیونکہ مجاز عشق حقیقی کا پہلا زینہ ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم مجاز کے زینے پر ٹھہر جاتے ہیں اور اسے پانے کی جستجو میں لگ جاتے ہیں۔ مگر جب معاشرہ یہ سماج اور انا پرستی ہماری خواہش کو پایہ تکمیل نہیں پہنچنے دیتا تو ہم محبت کا رونا رونے بیٹھ جاتے ہیں۔ اپنے محبوب پر بے وفائی کے الزامات لگاتے ہیں۔ بھلا محبوب پہ بھی کبھی طعنہ زنی کی جا سکتی ہے؟ اس پر بھی کوئی الزام لگایا جا سکتا ہے؟ نہیں نا۔ مگر ہم تو سب کچھ کرتے ہیں۔ تو بے وفا ہے۔ تو جھوٹا فریبی دغاباز اور مطلب پرست ہے۔ جو میری محبت کی قدر نہیں کی۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ پھر ہم خود کو بدنصیب اور جانے کیا کیا کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمیں آج تک محبت کے مفہوم کا ہی پتہ نہیں۔ ایک تو بیڑہ غرق ہو اس انگریزی زبان کا جس نے Love u آئی لو یو کے تین لفظوں سے محبت اور عشق کی ناموس کو ہی ڈبو کے رکھ دیا ہے۔ بسوں، ویگنوں، رکشاؤں بلکہ اب تو بائیک کے نمبر پر ہی لکھا ہوتا ہے آئی لو یو۔ پوری نسل تو برباد ہو چکی ہے ان تین لفظوں کے استعمال سے۔ راہ چلتے کسی شریف دوشیزہ کو قریب سے گزرتے ہوئے آئی لو یو کا پیغام

کی محبت بس ایک کھیل تماشا ہے۔ نئی سائنسی ایجادات، موبائل فون اور انٹرنیٹ نے بے حیائی فحش گوئی کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے اور محبت کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے ہیں۔ عشق تو بڑی دور کی منزل ہے۔ خون کے حقیقی رشتوں میں بھی محبت بس ایک رسمی سی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ بہن بھائیوں کے درمیان، والدین اور اولاد کے درمیان محبت اپنی قدر و منزلت کھو بیٹھی ہے۔ قریبی رشتے داروں اور پڑوسیوں سے تعلقات ناساز ہیں اور دور کے دوستوں سے بلکہ رشتے داروں سے بھی زیادہ محبت ہے۔ کچھ عجیب سی ہوا چلی ہے۔ کوئی جائے تو کہاں جائے؟ کوئی کرے تو کیا کرے؟" عارفہ نے ایک لمبی بات ختم کرکے بے بسی سے آہ سی بھری اور سر ہلانے لگی۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے سناٹا سا چھایا رہا۔ کمرے کے دروازے کا پردہ ہٹا کر ذرا دیر بعد کوئی نا کوئی اندر جھانکتا اور پھر لوٹ جاتا۔

"ہم میں سے ابھی تک کسی نے بھی پریکٹیکل زندگی میں قدم نہیں رکھا۔ ہم سبھی اپنے والدین کے گھران کے زیر سایہ رہ رہی ہیں۔ وہ ہمارے مستقبل کے لیے کیا کیا خواب بن رہے ہوں گے اور ہم اپنی جگہ اپنے مقدر کا فیصلہ اپنے حق میں کرانے کی جستجو میں ہیں۔ میں تو ایک متوسط طبقے کی مشرقی طرز کی لڑکی ہوں۔ والدین میرے متعلق جو بھی فیصلہ کریں گے۔ میں قبول کرلوں گی۔ گو میرے دل کی دھڑکن بھی کسی اور کے نام سے دھڑکتی ہے۔ مگر میں اپنی خوشی کی خاطر حکم عدولی نہیں کرسکتی۔ جنہوں نے مجھے جنم دیا۔ مجھے اپنے قدموں پر کھڑے ہونے اور زمانے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ اعلیٰ تعلیم دلائی۔ میں ان کی خواہش کبھی رد نہیں کرسکتی۔ یہ میرے لیے قطعی ناممکن بات ہے۔"

"عارفہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر زمانہ جہالت کے گنوار لوگوں والا فیصلہ کرکے اپنی زندگی برباد کرنا چاہتی ہو تم۔ اپنے والدین سے صاف کہو کہ میں اپنی زندگی کا ساتھی فلاں لڑکے کو بنانا چاہتی ہوں۔ بھئی اس بات کی مذہب اجازت دیتا ہے۔ حیرت ہے۔ میں تو آپ کی بات سن کر پاگل ہونے لگی ہوں۔ امپاسبل یار۔" قریب بیٹھی مہک نے عارفہ کو جیسے جھنجھوڑ دیا۔

"میں نے بتایا نا یار کہ یہ اللہ میاں کی گائے ہے۔ جہاں مرضی باندھ دو بندھی رہے گی۔ بس ایک یہ والدین کی فرمانبردار ہے۔ باقی سارا زمانہ تو والدین کا نافرمان ہے نا۔" میمونہ نے خفگی سے کہا۔

"مگر میمونہ جب تم اس دور حاضر کی ایک پڑھی لکھی گریجویٹ لڑکی ہو۔ اپنے والدین سے اپنے حقوق کی بات بھی کرسکتی ہو تو پھر تمہیں دکھ ہے؟ جو تمہیں اندر سے رلاتا رہتا ہے۔" نایاب نے پہلی بار اس گفتگو میں شمولیت کرتے ہوئے میمونہ سے پوچھ ڈالا۔ میمونہ پہلے تو ذرا سا چونکی۔ پھر سنبھل کر نایاب سے مخاطب ہو کر بولی۔

"شکر ہے نایاب یار۔ آپ نے بھی کچھ بولنے کا حوصلہ کیا۔ اب ہم دوست بن چکی ہیں اور دوستوں سے کچھ چھپایا نہیں جاسکتا۔ میری بیڈلک یہ ہے کہ جس سے میں نے دل کا رشتہ جوڑا وہ میرا کزن ہے۔ خالہ کا بیٹا اس نے لاء کر رکھا ہے۔ مگر ابھی یہ پریکٹس کے عملی میدان میں نہیں آیا۔ پچھلے تین چار سال سے ہم ایک دوسرے کی دھڑکنوں میں بس رہے ہیں۔ میں اس کی دیوانی ہوں۔ وہ بھی مجھے ٹوٹ کر چاہتا ہے۔ ہمارے پیرنٹس بھی جانتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب چاہیں ہم ایک ہوسکتے ہیں۔ ہماری محبت کی راہ میں کوئی سماجی رکاوٹ بھی حائل نہیں ہے۔ مگر......" اچانک بات روک کر میمونہ ہاتھوں سے چہرہ چھپائے سسک سسک کر رو دی۔

"ریلکس یار۔ میمونہ...... پلیز۔ خود کو سنبھالو یار...... جب سب کچھ ہی ٹھیک ہے تو پھر مسئلہ کیا ہے۔" کومل، مہک، نایاب سبھی اسے ڈھارس دیتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ مگر وہ خود پر ضبط نہیں کرپا رہی تھی۔ اسے پانی کے چند گھونٹ دیئے گئے۔

"وہ راز شاید یہ آپ کو کبھی نا بتاسکے اور نا ہی وہ بات بتانے کے قابل ہے۔" اچانک عارفہ نے کہا تو سب کے چہرے ششدر رہ گئے اور سب کی سوالیہ نگاہیں عارفہ کے چہرے پر جم گئیں۔ میمونہ ٹشو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی اور بار بار سوں کرکے ناک کھینچ رہی تھی جیسے نزلہ ہوا ہے۔

"ہاں بتادو سب کو؟" اس نے سرگوشی کے انداز میں عارفہ کو اپنی زندگی سے متعلق راز بتادینے کی اجازت دے دی۔ عارفہ نے کچھ دیر سوچنے میں وقت گزارا۔ پھر جو کچھ بتایا۔ وہ سب کو چونکا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ پھر اس نے دبے لفظوں میں بتایا۔

"میمونہ اور کاشف کا تعلق بہت بڑے امیر گھرانوں سے ہے۔ دونوں خاندان اعلیٰ سوسائٹی کے گرویدہ ہیں۔ گھر کے سبھی افراد اپنی اپنی جگہ پر خواہش کی تکمیل کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کاشف اور میمونہ کو آپس میں ملنے پر کوئی پابندی نا تھی۔ وہ جب چاہتے اور جہاں چاہتے گاڑی میں گھومنے نکل جاتے تھے۔ کوئی چھ ماہ قبل دونوں ایوبیہ وزٹ پر گئے۔ ریسٹورنٹ میں قیام کے دوران ڈرنک کیا۔ پھر شرافت کی ساری حدوں کو پار کرلیا گیا اور اس بات کو کچھ معیوب نہیں سمجھا گیا۔ جیسے یہ بھی ان کی محبت کا ایک حصہ تھا اور محبت کی پختگی کی دلیل تھی۔ ویسے بھی جوانی دیوانی ہوتی ہے اور جب خود ہی پٹرول کو آگ پہ چڑھایا جائے تو شعلہ بھڑکنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ محبت داغدار ہوگئی تو کشش میں کمی آنے لگی اور میمونہ کی آنکھ محبت کے نشے سے اس وقت کھلی۔ جب اس کی بہن نورین نے صاف اعلان کردیا کہ میں اور کاشف ایک دوسرے سے شدید پیار کرتے ہیں اور ہمیں ایک ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میمونہ نے کاشف کا دل بہت ہی دکھایا ہے۔ اس لیے مجھے بھی کاشف سے بہت ہمدردی ہے اور میں اس کے سامنے بھی سینہ سپر ہوسکتی ہوں۔ ذرا سی پس و پیش کے بعد نورین کا فیصلہ گھر والوں نے قبول کرلیا اور نورین کو کاشف کا ہمسفر بننے کی اجازت دے دی گئی۔ اب گھر والوں کی ساری ہمدردیاں بھی نورین اور کاشف کے ساتھ ہیں۔ میمونہ سے کہہ دیا گیا ہے کہ کوئی بات نہیں بیٹا اگر کاشف نہیں مان رہا تو اس سے اب زبردستی تو تمہاری شادی نہیں کی جاسکتی نا۔ تمہیں کوئی اچھا ہمسفر مل جائے گا۔ جو ہوسکتا ہے کاشف سے بھی زیادہ تمہیں چاہنے والا ہو۔ اب اس کی زندگی تو برباد ہو ہی چکی ہے۔ کہاں گئی محبت؟ کہاں گئی عمر بھر ساتھ نبھانے کی وہ قسمیں، وہ وعدے وہ دعوے؟ کیا یہ سب کچھ محبت میں آکر کیا گیا؟ نہیں یہ سب کچھ محبت کی آڑ میں کیا گیا۔ جہاں اپنے سماج، اپنے معاشرے، اپنے مذہب اور اپنے بڑوں کی پاسداری کا لحاظ نہ رکھا جائے۔ وہاں پھر اسی طرح کے ہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔" عارفہ نے پوری بات بتا کر اعلیٰ سوسائٹی کے تقاضوں کے گھناؤنے نتائج برآمد ہونے کی اپنے دل میں چھپی ساری بھڑاس نکال دی۔

"نہیں عارفہ تم اس سارے واقعہ میں پوری سوسائٹی کو ملزم نہیں ٹھہرا سکتی۔ کاشف اور میمونہ کے اندھے جذبات کی رو میں بہہ کر ایسا قدم اٹھانے کا جرم سوسائٹی پر نہیں تھونپا جاسکتا۔ سفید پوش طبقے اور مزدور طبقے کے لوگوں میں بھی ایسے واقعات جنم لیتے رہے ہیں۔ بلکہ غریب کی عزت چند روپوں کی خاطر پامال ہوتی رہی ہے۔ آپ نا صرف امیر طبقے کی تذلیل کررہی ہیں۔ بلکہ نئی نسل کے حقوق پامال کرنے کا سگنل بھی دے رہی ہیں۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ کسی کے جذبات کو مجروح کیا جائے۔ یا کسی کی کردار کشی کی جائے۔" کومل نے عارفہ کو جیسے پچھاڑ سا دیا۔

"میں خود مانتی ہوں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ میری جذباتی خواہشات کا نتیجہ تھا۔ ورنہ میں کاشف کو روک بھی سکتی تھی۔ وہ میری غلطی تھی اور مجھے میری غلطی کی سزا ملنی چاہیے۔ مجھے گلہ اپنے بہن سے بھی نہیں۔ کیوں کہ کسی کو پسند کرنے کا حق وہ بھی رکھتی ہے۔ شکوہ کاشف سے کروں تو کیوں؟ جب نورین خود اس کی طرف مائل ہوگئی تو میں کس کو موردِ الزام ٹھہراؤں؟ اپنے نصیب اور مقدر پر شاکی نہیں ہوں۔ جب اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہوگا تو کسی دوسرے کے اختیارات کو غصب کرنا تو قطعی نامناسب بات ہوا کرتی ہے نا۔" میمونہ نے سرد سی آہ بھر کر کہا۔ ایسے میں زینا کمرے میں داخل ہوئی۔

"واہ! محفل تو خوب گرم ہے۔ سوری یار مہمانوں میں بزی ہوں۔ آپ کو وقت نہیں دے پا رہی۔ اب کھانا تیار ہے۔ کھانے میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں گی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتایئے گا۔"

"نو نو یار ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری محفل اس وقت بڑی جذباتی قسم کی چل رہی ہے۔" مہک نے زینا کو بتایا۔

"کیوں بھی کیا ہوا؟ جذباتی کیوں؟" زینا نے حیرت سے پوچھا۔ کومل نے کہا۔

"یار یہ سارا کیا دھرا اس میمونہ بیگم کا ہے۔ خدا کے لیے اسے یہاں سے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اگر یہ کچھ وقت اور یہاں موجود رہی نا تو ہوسکتا ہے۔ اس کمرے سے آپ کو درد بھرے نالوں اور چیخ و پکار سنائی دینے لگے۔ یا پھر ہم فرش پر سر جھکائے آپ کو تسبیح کرتی ہوئی ملیں۔" شوخ سی میمونہ نے ہاتھ باندھ کر زینا سے ریکوسٹ کی۔ اچانک کمرے میں قہقہے بکھرے تو سوگوار فضا پھر سے جلترنگ ہونے لگی۔ مہک بار بار اپنے سیل پہ کسی سے ایس ایم ایس پر بات کرتی اور پھر کسی عمیق سی سوچ میں ڈوب جاتی۔ میمونہ کی کہانی سب کے دماغ پر سوار ہوچکی تھی اور سبھی اس کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ مگر نایاب کی کیفیت سب سے الگ سی تھی۔ نایاب نے بہت کم کھانا کھایا۔ زینا ان کے ساتھ کھانے میں شریک رہی۔ پھر اسی کمرے میں انہیں چائے دی گئی تو کومل نے اپنی تعارفی ملاقات میں بتایا کہ

"گوجرانوالہ میں ہمارا برتن سازی کا بہت بڑا کاروبار

ہے۔ ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ تین بھائی ہیں۔ ایک بھائی امریکا میں زیر تعلیم ہے۔ چھوٹا اسلام آباد میں پڑھ رہا ہے۔ منجلا بھائی ایف اے کے بعد ابو کے ساتھ بزنس میں شامل ہوگیا۔ اگلے دو ماہ بعد دونوں بھائیوں کی شادی ہونے جارہی ہے۔"

"تمہاری نہیں ہورہی کیا؟" میمونہ نے لقمہ دیا۔

"ابھی کہاں یار جب ہوگی تو سب لوگوں کو انوائیٹ کروں گی۔"

"کس کے ساتھ ہوگی؟"

"اس کے ساتھ کہ بس۔ سب کے ساتھ۔" میمونہ نے ذومعنی پوچھا۔

"وہ تو ابھی یورپ میں میموں کے ساتھ وقت گزاری کر رہا ہے۔ جب آئے گا تب سوچیں گے۔ تم خود ہی وہاں چلی جاؤ۔ ایسے کو تیسا۔ تم بھی کسی انگریز کے ساتھ کلب جاکر رقص کرنا شاید غیرت کام آجائے۔" منہ پھٹ سی میمونہ نے بے باکی سے کہا۔

"ویسے بڑی زبان دراز ہو ایمان سے۔ شاید کاشف بھائی نے اسی لیے تم سے نجات حاصل کرلی کہ اس ڈائن سے تو جان چھڑانا ہی مشکل ہوجائے گا۔"

"دیکھ لو آپ مجھے ڈائن کہہ رہی ہیں تو پھر میں آپ کو ڈائن بن کر دکھاؤں؟"

"او نا بابا نہ۔ آئی ایم سوری۔" کومل نے ہاتھ باندھ کر اس سے جان بخشی کرائی۔

"اچھا یار مہک نایاب کے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔ یہ کوئی بڑی پراسرار سی شخصیت دکھائی دے رہی ہے مجھے۔" میمونہ نے مہک سے کہا۔

"نایاب کی کیا بات پوچھتی ہو یار۔ نایاب تو پھر نایاب ہی ہوا کرتی ہے نا۔ کروڑ پتی باپ کی بیٹی ہے نا۔ بڑے ناز و نعم سے زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہر جھنجٹ سے آزاد بس نئے سے نئے ماڈل کی گاڑی، اچھا ڈریس، اچھا کھانا، قیمتی موبائل، ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا۔ جو دل چاہے کر سکتی ہے۔ کسی کی کوئی مداخلت نہیں ہے۔ میری بیسٹ فرینڈ ہے اور بوائے فرینڈ......؟ کوئی بھی نہیں۔"

"کیا؟" میمونہ نے اچھل کر پوچھا۔

"جی ہاں ابھی تک کسی بھی لڑکے کو بطور دوست قبول نہیں کیا۔"

"حیرت ہے۔ آخر وجہ؟"

"بس اپنی پسند کا آئیڈیل نہیں مل سکا انہیں۔ ورنہ چاہنے والوں کا تو شمار ہی نہیں ہے۔" مہک نے بتایا تو نایاب اسے بس ترچھی نگاہ سے دیکھتی رہی۔

"کون ہوگا وہ خوش قسمت؟ ویسے بائی داوے اگر میں لڑکا بن جاؤں تو کیا میں آپ کا آئیڈیل بن جاؤں گی؟" میمونہ نے براہ راست نایاب سے پوچھا۔

"ہاں تم بہت اسمارٹ ہو۔" نایاب نے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر ہاتھ ملاؤ۔ آج سے ہماری دوستی پکی۔ میں لمبی کال کرنے کی عادی ہوں اور آئے دن آپ کی مہمان بنوں گی۔ آپ کو کھانے پر بلاتی رہوں گی۔ خوب تنگ کیا کروں گی۔ بولو قبول ہے۔"

"ہاں قبول ہے۔" نایاب نے مسکراتے ہوئے اس کی گرفت میں اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"قبول ہے، قبول ہے۔ تین دفعہ کہو نا۔" میمونہ نے شرارت سے کہا۔ "بڑی شریر ہو تم۔ مجھے تمہاری کہانی سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔ کاشف نے بہت کم ظرفی کا ثبوت دیا ہے۔ اتنا دکھ سہہ کر بھی تم ہر وقت خوش باش رہتی ہو۔ یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ بہت زندہ دل شخصیت ہو تم۔ یہ میرا کنٹیکٹ نمبر لے لو اور میرے گھر کے دروازے تجھے ہمیشہ کھلے ملیں گے۔ بلکہ آپ بھی لوگوں کے لیے" نایاب نے کومل اور عارفہ کو بھی دعوت دے دی۔

"ضرور کیوں نہیں۔ آپ کی ہمارے دوستوں کی صف میں شمولیت ہمارے لیے باعث فخر ہوگی۔" پھر سب نے ایک دوسرے سے اپنے نمبر شیئر کیے۔ منگنی کی رسم میں شرکت کی گئی اور واپس لوٹتے ہوئے مہک نے نایاب سے بات چھیڑی۔

"نایاب آج کا دن تم نے بہت بوریت میں گزارا ہے۔ مجھے بہت فیل ہوتا رہا۔ کوئی خاص بات بھی نہیں ہوئی اور تم اس قدر نروس ہوگئی۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ میری خود سمجھ میں نہیں آرہا یار کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ بڑی مشکل سے یہ وقت میں نے گزارا ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔ میں بھاگ کر کسی اجاڑ کسی ویرانے میں چلی جاؤں اور وہاں بیٹھ کر بس روتی رہوں۔ میرا چیخ چیخ کر رونے کو دل چاہ رہا ہے۔ دل کی عجیب کیفیت ہے۔ لگتا ہے دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔ روح بے چین ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ میں تمہاری وجہ سے محفل میں موجود رہی۔ اگر میں اکیلی ہوتی تو میں

نے زینا سے معذرت کرلینا تھی اور چلے آنا تھا۔" نایاب بتا رہی تھی اور اس کی آواز میں ہلکا سا درد اور غم چھلک رہا تھا۔

"وہ نوجوان جو ہمیں شاپنگ سنٹر پر ملا تھا۔ پہلی نظر میں وہ آپ کو کیسا لگا تھا؟" مہک نے جیسے جھجک کر یہ بات پوچھی تھی۔

"ہاں۔ اچھا لگا۔ ہینڈسم تھا۔"

"پھر...... آپ نے ایک دوسرے کو بغور دیکھا؟"

"اچانک میری نگاہ ادھر اٹھی تھی۔ وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھا۔ بس نگاہ ملتے ہی وہ چونک کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ مگر بار بار میری طرف دیکھتا رہا۔ میں بھی دیکھتی رہی۔ اس وقت میں جیسے کسی خواب کی حالت میں تھی۔ میں خود کو ادھر دیکھنے سے روک رہی تھی۔ یہی عالم اس کا تھا اور گاڑی تک آتے آتے یہ سلسلہ دونوں طرف چلتا رہا۔" نایاب نے بتایا۔

"تو پھر تمہیں ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ یہ سب کیا ہے؟" مہک نے پوچھا تو نایاب نے انکار میں آہستہ سے گردن ہلادی۔

"بابا تمہارے دلوں نے محبتوں کا سودا کرلیا ہے۔ اس کا عالم بھی یہی ہوگا۔ یار یہ کیسے ممکن ہے؟ یوں بھی ہوسکتا ہے کبھی۔ میں نہیں مانتی۔ بات کوئی اور ہے۔ مجھے کوئی فزیکل مسئلہ ہوا ہے۔ کل کسی اچھے سے ڈاکٹر کو چیک اپ کراتی ہوں۔"

"یہ فزیکل مسئلہ نہیں ہے یار۔ کیوں ڈاکٹروں اور میڈیسن کے چکروں میں پڑتی ہو۔" مہک نے کہا۔

"تو بابا میں کیا کروں؟ میری حالت اچھی نہیں ہے۔ میں رونا چاہتی ہوں۔ بین کرنا چاہتی ہوں پھر شاید میری حالت سنبھل جائے۔ میرا سر بوجھل اور سارا جسم وزنی سا ہورہا ہے۔" نایاب کا چہرہ بہت غمزدہ سا تھا۔

"ریلیکس یار۔ پلیز۔ خواہ مخواہ ٹینشن دے رہی ہو خود کو۔ فرسٹ ایڈ باکس تو گھر میں ہوگا۔ کوئی ہلکی پھلکی ٹیبلٹ لے لینا اور آرام کرو۔ آج تھک بھی بہت گئی ہو۔ کتنے گھنٹے مسلسل بیٹھنا پڑا ہے۔" مہک نے اپنے گھر کے دروازے پر اتر کر نایاب کو تاکید کی۔ وہ گھر داخل ہوگئی اور نایاب کی گاڑی واپسی کے سفر پر روانہ ہوگئی۔

......☆......☆......

سلور کلر کی مرسڈیز اورینٹ ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں آن رکی تو مہک نے اپنا سیل آن کر کے ایک کال کی۔ "میں مہک بات کر رہی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟ اس وقت میں ریسٹورنٹ پہنچ چکی ہوں۔"

"آپ سیکنڈ فلور گیلری سویٹ نمبر چار میں چلی آئیں۔ میں یہاں آپ ہی کا ویٹ کر رہا ہوں۔" معیز نے بتایا تو مہک نے گاڑی لاک کی اور اپنے شانوں تک بکھرے بالوں میں انگلیوں کی کنگھی کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدموں سے داخلی گیٹ کی طرف بڑھنے لگی۔ چیئر لفٹ نے پل بھر میں اسے سیکنڈ فلور پر پہنچا دیا۔ چار نمبر سویٹ پر ہلکی سی دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔ بلیک پتلون اور گرین شرٹ میں وہ اونچا لمبا گورا چٹا نوجوان چہرے پر مسکراہٹ سجائے دروازے کی اوٹ سے نمودار ہوا اور سلام کے بعد سر جھکا کر بڑے ادب سے مہک کو اندر آنے کی دعوت دی۔ معیز اور مہک کی ویسے بھی دوسری ملاقات تھی۔ مگر پہلی ملاقات بڑی عجلت اور افراتفری کی حالت میں اس وقت ہوئی تھی۔ جب مہک نایاب کے ساتھ شاپنگ سنٹر میں خریداری کے لیے گئی تھیں۔ معیز اور نایاب کا آمنا سامنا ہوا تھا۔ پھر جب ان کی گاڑی زینا کے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی تو معیز کی وائٹ کلر کی ٹویوٹا بھی ان کے تعاقب میں تمام عرصہ رہی تھی۔ جانے کیوں مہک کو یقین تھا کہ نایاب پر مر مٹنے والا تعاقب میں ضرور آئے گا۔ وہاں جب وہ گاڑی سے اتر رہی تھی تو دو گاڑیاں ایک ساتھ وہاں پہنچ کر رکی تھیں۔ ان میں پچھلی گاڑی معیز کی تھی۔ پھر جب وہ گاڑی لاک کر کے گھر کے دروازے سے ان ہوئی تھی۔ اس وقت مہک نے معیز کو گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اسی لیے وہ زینا سے استقبالیہ سے مل کر واش روم جانے کا بہانہ کر کے باہر اس جگہ پہنچی جہاں معیز کی گاڑی رکی تھی اور اس نے اسے گاڑی سے برآمد ہوتے دیکھا تھا۔ نایاب اوپر دوسری منزل پر چلی گئی اور جب مہک گاڑیوں کے پاس پہنچی تو معیز اپنی گاڑی سے برآمد ہوکر اس کے روبرو ہوگیا۔

"اسلام علیکم! ایکسکیوزمی۔ آپ پینوراما سے آرہے ہیں نا؟" مہک نے جاتے ہی لڑکھڑاتی سی زبان میں پوچھا تھا۔

"جی ہاں" معیز نے بھی کچھ تھرا کر جواب میں کہا۔

"میں مہک ہوں۔ نایاب میری دوست ہے۔ پلیز آپ اپنا تعارف اور اپنا کنٹیکٹ نمبر دے دیں۔ ہم خود ہی آپ سے رابطہ کرلیں گی۔ دراصل ہم یہاں کسی فنکشن میں آئے ہیں۔" مہک نے چند لفظوں میں اپنا مدعا بیان کیا۔

"مجھے معیز کہتے ہیں۔ ڈیفنس میں رہائش ہے۔ آپ کی دوست نایاب نے اپنی قاتلانہ نگاہوں سے ہم پر کچھ ایسا جادو کر

ز نے مہک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ دراصل نایاب بڑی نروس سی ہو رہی تھی۔ اسے آپ کے یہاں آنے کی کچھ خبر نہیں۔ خیر میں بات کرلوں گی۔ پھر آپ سے رابطہ کرلیں گے۔" مہک نے کہا۔ معیز سے کارڈ پکڑ کر اپنے پرس میں ڈالا اور تیزی سے واپس پلٹ پڑی۔ اسی لمحے نایاب کی کال آگئی تھی کہ

"تم کہاں رہ گئی ہو؟ آج اس بات کو ایک ہفتہ ہو چلا تھا۔ نایاب کی حالت بہت ابتر تھی۔ کئی ڈاکٹروں کو چیک اپ کروا چکی تھی۔ ہر طرح سے وہ بالکل نارمل تھی۔ سبھی نے اسے نفسیاتی مریض قرار دے دیا تھا۔ بے وجہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ رونے لگتی۔ مہک نے ہر قدم پر اس کو سنبھالا۔ وہ جان چکی تھی کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ مگر نایاب اس کی بات سے اکتفا نہیں کر پا رہی تھی۔ مہک سے معیز نے کال پر رابطہ بحال رکھا۔ دن میں دو سے تین بار وہ اسے کال کرکے صرف ایک ہی بات کہتا۔

"پلیز مہک مجھے ایک جھلک نایاب کی دکھا دو۔ اگر وہ مجھ سے نہیں ملنا چاہتی تو نہ سہی۔ بس دور سے ہی میں اسے جی بھر کے دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ جب سے اس کی ایک جھلک دیکھی ہے۔ تب سے رات کی نیند اور دل کا سکون میرا برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ میری حالت پر سب گھر والے پریشان ہیں۔ دل بس میں نہیں ہے۔ کہیں چین نہیں آتا۔ کئی بار اس کی یاد میں میں رو بھی چکا ہوں۔" مہک اس کی ساری بے چینیوں کو بخوبی سمجھ رہی تھی مگر ابھی وہ اس حال میں نہیں تھی۔ کہ اس سے کوئی وعدہ کرتی یا اسے کچھ یقین سے کہہ پاتی۔ اگلی شام نایاب نے اسے اپنے پاس بلا کر یہ کہا کہ

"میں کسی طرح اس شخص سے ملنا چاہتی ہوں۔ جس کی ایک جھلک نے مجھے مریض بنا دیا ہے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس ایک وہم سا ہے کہ اس نے کوئی دم جھاڑ کر کے میری طرف پھونک ماردی ہے۔ جس کا مجھ پر اثر ہو رہا ہے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ جو تم نے میرے ساتھ یہ ناروا سلوک کیا۔" مہک اسے برابر سمجھا رہی تھی کہ

"بابا ایسا کچھ نہیں ہے اور اب میں اسے کیسے ڈھونڈوں"؟" "آپ اس سنٹر پر جائیں۔ بار بار جائیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔ ہوسکتا ہے وہیں دوبارہ ملاقات ہو جائے۔ میں دو تین بار وہاں جا بھی چکی ہوں۔ اس کے بغیر سارا سنٹر ہی کسی اجاڑ بیابان کا منظر پیش کرتا ہوا مجھے دکھائی دیا پر دل گھبرانے لگا میں چلی آئی۔ مگر دوبارہ پھر وہاں گئی ہوں۔ وہ نہیں تھا اور اس بن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔"

"او مائی گاڈ! تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ آگ ہے برابر دونوں طرف لگی ہوئی۔" مہک نے دل میں سوچا اور نایاب کو ڈھارس دی۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے ٹریس کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔"

"تم اسے ڈھونڈ لو گی میرا دل کہتا ہے۔" نایاب نے کہا تھا۔ رات بھر سوچ بچار کے بعد صبح مہک نے معیز کو کال کرکے ایک بار اسے ملنے کی خواہش کی تھی اور اسی سلسلے میں اسی وقت یہاں ریسٹورنٹ میں موجود تھی۔ کیونکہ معیز نے اسے یہاں انوائیٹ کیا تھا۔ ذرا دیر بعد ہی ویٹر نے ڈرنک اور دوسری ہلکی پھلکی کئی چیزیں لا کر ان کی ٹیبل پر سجا دی تھیں۔

"معیز صاحب میں کسی تمہید کے بغیر آپ سے کہنا چاہوں گی کہ نایاب میری بہت کلوز فرینڈ بلکہ میری محبوب دوست ہے۔ بڑی حساس اور نرم دل کی مالک ہے۔ ہم ایک ساتھ ماسٹرز کر رہی ہیں۔ والدین کی بے حد چہیتی لختِ جگر ہیں۔ سیٹھ کامران کی بیٹی جن کا یورپ میں اپنا بزنس ہے۔ یہاں اربوں کی پراپرٹی ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ آج تک اس نے کسی کو بوائے فرینڈ اسی لیے نہیں بنایا کہ کوئی اس کا آئیڈیل نہیں ملا۔ والدین نے اسے اجازت دے رکھی ہے کہ جہاں چاہو اپنا ہمسفر تلاش کرسکتی ہو۔ مگر اس نے تو ابھی تک کوئی بوائے فرینڈ ہی نہیں بنایا۔ ہمسفر بنانا تو بہت دور کی بات ہے۔ آپ کی شخصیت سے وہ کچھ متاثر ضرور ہوئی ہے۔ وہ آپ سے ملے گی۔ ہوسکتا ہے آپ اس کا آئیڈیل بن جائیں۔" مہک نے کہا۔ تو معیز کے چہرے پر مسرت اور تجسس کی ملی جلی کیفیت نمایاں ہونے لگی۔

"اب آپ مجھے اپنی شخصیت کا تفصیلی حوالہ تب دیں۔ تاکہ ملاقات سے قبل وہ آپ کے متعلق کچھ جان سکے اور اسے اپنا فیصلہ کرنے میں آسانی رہے۔" مہک نے کہا۔ "مجھے معیز کہتے ہیں۔ دو بھائی اور دونوں ہی مجھ سے بڑے ہیں۔ دونوں کی شادیاں بھی ہوچکی ہیں۔ دو ہی بہنیں ہیں۔ جو مجھ سے چھوٹی ہیں اور کالج میں زیر تعلیم ہیں۔ والد صاحب اور بھائیوں کا بہت وسیع بزنس ہے۔ جو عرب امارات تک پھیلا ہوا ہے۔ میر پور سے حال

ہی میں لاہور سیٹل ہوئے ہیں۔ بی کام کر چکا ہوں۔ کچھ عرصے کے لیے یورپ جانا چاہتا ہوں۔ واپسی پر اپنی عملی زندگی کا آغاز کروں گا۔" معیز نے تفصیل سے اپنے تعارف میں بتایا۔

"ہوں..... اچھا یہ بتائیں۔ اس سے پہلے آپ کی زندگی میں کوئی ایسی شخصیت آئی ہو جسے آپ بہت چاہتے ہوں۔ بہت مس کرتے ہوں۔" مہک کا اشارہ شاید کسی فی میل شخصیت کی طرف تھا۔ معیز نے چند ثانیے جیسے کچھ سوچا۔

"زندگی میں میں پہلی بار جس شخصیت سے میں متاثر ہوا ہوں۔ وہ نایاب ہے۔ جس کی ایک جھلک نے مجھے خود سے بیگانہ کر دیا ہے اور اب شاید زندگی بھر کوئی دوسری ہستی میرے من میں نہ سما سکے۔ یہ بات میں پورے یقین اور وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ نایاب کے بغیر میں ادھورا ہوں۔ اگر میں اسے نہ پا سکا تو میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ پچھلے ایک ہفتے سے مجھ پر جو کیفیت طاری ہے۔ وہ میں جانتا ہوں یا میرا خدا۔ مجھے لگتا ہے جیسے اس کے بغیر یہ جہاں سونا سا، بے رنگ ہے۔" وہ بولے چلا جا رہا تھا اور مہک کے من میں خوشی کی ایک عجیب سی لہر دوڑ رہی تھی۔ پھر مہک نے جانے کی اجازت چاہی تو معیز کو یقین دلایا کہ

"تم حوصلہ رکھو۔ اگلے دو چار دن میں نایاب کے ساتھ پھر آپ سے ملاقات ہوگی۔"

"تھینک یو سوچ۔ یہ میری طرف سے حقیر سا گفٹ آپ کے لیے ہے۔" معیز نے رخصتی پر ایک چھوٹا سا گفٹ پیک مہک کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کیا؟ بھئی اس کی کیا ضرورت تھی۔" مہک نے پر تکلف انداز میں کہا۔

"پلیز میری خوشی تھی کہ میں آپ کو کچھ پیش کروں۔ بس حقیر سا ہے۔ قبول کرلیجیے۔"

"نہیں بھئی گفٹ کوئی بھی حقیر سا نہیں ہوتا۔ اس میں دوستوں کا خلوص بھرا ہوتا ہے اور خلوص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔" مہک نے کہا اور گفٹ وصول کر کے معیز سے رخصت ہو گئی۔ وہ اسے گاڑی تک چھوڑنے ساتھ آیا۔

......☆......☆......

مہک نے نایاب کو سرپرائز کے طور پر یہ پیغام دیا کہ میں اسے تلاش کر چکی ہوں۔" تو نایاب کے بدن میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ وہ لمحے بھر کے لیے ششدر رہ گئی۔ پھر جب مہک نے اس کے روبرو بیٹھ کر اسے بتایا کہ معیز صاحب سے میں مل چکی ہوں۔ بس اتفاقیہ ٹریفک اشارے پر اس کی گاڑی میری گاڑی کے ساتھ آٹھہری۔ میری اتفاقیہ نظر ادھر اٹھی۔ تو پہلی نظر میں ہی میں نے اسے پہچان لیا۔ پھر شیشہ اتار کر میں نے اسے انگلی سے اشارہ کر کے آگے چلنے کو کہا تو وہ پہلے تو حیرت زدہ سا ہوا۔ پھر اس نے میری بات کو پک کر لیا اور یوں سرِ راہ چلتے چلتے ہماری ملاقات ہوگئی۔ ہم ایک ریسٹورنٹ میں ٹھہرے اس کا تعارف حاصل کیا۔ وہ بھی اس دن سے آپ کی طرح اضطرابِ محبت میں ہے۔ اس کی حالت بھی آپ کی طرح ابتر ہے۔ وہ بھی کئی بار تنہائی میں رو چکا ہے اور جس نتیجے پر میں پہنچی ہوں۔ اس کا بھی محبت میں پہلا ایکسپیرینس ہے۔ آپ دونوں پہلی بار محبت سے آشنا ہو رہے ہیں اور محبت سے آشنا ہونے والا انسان ہر طرف صرف اپنے محبوب کو ہی دیکھتا ہے۔ محبوب کا چہرا محبت کے لیے کعبہ بن جاتا ہے۔ محبت اور محبوب کا قرب موسموں کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو کوشش یا محنت سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عطا ہے۔ یہ نصیب ہے۔ بلکہ یہ بڑے ہی نصیب کی بات ہے۔" مہک نے محبت کے موضوع پر بہت بامعنی گفتگو کی۔ جو نایاب کے دل پر پر اثر ثابت ہوئی۔

پھر اگلے دن وہ لمحہ بھی آیا۔ جب معیز مہک کے ہمراہ نایاب کی دعوت پر اس کے گھر پہنچ کر گاڑی سے اتر رہا تھا اور نایاب برآمدے میں اس کے استقبال کو موجود تھی۔ وہ منظر دیدنی تھا۔ جب دو قطعی اجنبی انسان ایک دوسرے کے قریب ہو رہے تھے۔ مگر دونوں کے وجود میں دھڑکنوں کا ایک تلاطم بپا تھا۔ دونوں کے دل پھٹ کر باہر آنے کو مچل رہے تھے۔ سر کی جنبش سے معیز نے قریب پہنچ کر دھیرے سے سلام کہا اور نایاب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نایاب کا لرزتا ہوا ہاتھ آہستگی سے اٹھا اور معیز نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ کی ہتھیلی میں جذب ہو گیا۔

بہت ہی نفاست سے سجے ہوئے کمرے میں وہ تینوں ایک دوسرے کے رو برو آ بیٹھے۔ بے اختیار دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر جمی تھیں۔ نایاب نے اپنے ہاتھوں سے جوس کا گلاس معیز کو پیش کیا۔ پھر جب معیز اور نایاب نے اپنے اپنے جام سے ایک ایک گھونٹ لے لیا تو مہک نے دونوں کے جام تبدیل کر دیئے۔ وہ دونوں حیرت سے دیکھتے رہے اور سوالیہ نظروں سے مہک کو دیکھا۔

"دل سے دل مل جائے تو پھر جام کیوں الگ الگ رہیں۔" مہک نے شرارت سے کہا۔

گزار رہا ہوں۔" معیز نے نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مہک سے کہا۔

"میں خود سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ کبھی ہمارا دوبارہ سامنا ہو سکے گا۔" نایاب نے کہا۔

"جن روحوں نے ملنا ہوتا ہے نا۔ وہ کسی نا کسی بہانے مل ہی جایا کرتی ہیں۔ وہ آپ کو یاد نہیں کہ پیکر حسن بدری جمالہ پری وادی ناران کاغان میں بستی تھی اور شہزادہ سیف الملوک ایران میں مقیم تھا۔ بدری جمالہ اسے خواب میں ملی تو وہ اس کی تلاش میں دشوار گزار رستے عبور کر کے اس تک پہنچ گیا تھا۔ آپ تو پھر ایک شہر کے باسی ہیں۔ آپ کا سنگم آپ کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔ پھر اس میں میرا کیا کمال ہے؟" مہک نے ان دونوں کے جواب میں کہا۔ وہ دونوں مقابل کے صوفے پر آمنے سامنے تھے۔ جبکہ مہک ٹیبل کے تیسری جانب براجمان تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے میں اس قدر گم تھے کہ جیسے کسی تیسرے فرد کی موجودگی کا انہیں احساس ہی نہ رہا تھا۔

"بھئی کوئی بات کرو۔ گہری خاموشی سے مجھے تو وحشت ہو رہی ہے۔ لگتا ہے جیسے دو بے جان سے بت مقابل میں بیٹھ رہے ہیں۔" مہک نے جیسے ان کو پکڑ کر جھنجوڑ سا دیا۔ دونوں نے چونک کر مہک کی طرف جھانکا اور پھر دونوں کے لب مسکرانے لگے۔

"کچھ کہنے کو باقی رہ ہی نہیں گیا۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے۔ جیسے میں کہیں بھٹک رہا تھا۔ جس منزل کی مجھے کھوج تھی۔ وہ منزل مجھے مل گئی ہے۔" معیز نے خوابیدہ سے لہجے میں کہا۔

"میں تو خود کو ایک خواب کی سی کیفیت میں محسوس کر رہی ہوں۔ جاگتی آنکھوں کا خواب شاید اسی کو کہتے ہیں۔" نایاب کی آواز بھی جیسے کسی گہرے کنویں سے ابھری ہو۔ مہک سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"او بھئی یہ خواب نہیں۔ تم جیتے جاگتے انسان ہو اور ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہو۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں ایک دوسرے کی محبت میں لیلیٰ مجنوں جیسی کہانی کے کردار بن کر ایک نئی داستان کو نا جنم دے دینا۔" مہک نے کہا۔

"آخر لیلیٰ مجنوں کے قصے کی خاص بات کیا تھی؟ جو ان کا نام ہر زبان پر عام ہے۔" نایاب نے مہک سے پوچھا۔

"لیلیٰ کے عشق میں مجنوں دیوانہ ہو گیا تھا۔ وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے شہزادی کے محل کے پاس جاتا تو بچے اسے پتھر مار کر مجنوں اور دیوانہ کہہ کر زخمی کر دیتے۔ مگر وہ لہولہان ہو کر بھی لیلیٰ کی ایک جھلک دیکھنے تک وہاں موجود رہتا۔ لیلیٰ گلی میں شور سن کر بام پر آتی اور مجنوں کو اپنی جھلک دکھا کر ہاتھ باندھ کر یہاں سے چلے جانے کو کہتی۔ ایک روایات میں تو یہاں تک درج ہے کہ مجنوں نے لیلیٰ کے کتے کے پاؤں بھی چوم ڈالے تھے۔"

"او۔ ونڈرفل۔" معیز کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی ہاں۔ درحقیقت محبت آرزوئے قربِ حسن کا نام ہے۔ ہم ہمہ وقت جس کے پاس رہنا چاہتے ہیں۔ جس کو اپنا بنا لینا چاہتے ہیں۔ وہی محبوب ہے۔ محبوب ہر حال میں حسین ہوتا ہے۔ کیونکہ حسن تو دیکھنے والے کا اپنا اندازِ نظر ہے۔ محبت کو محبوب میں خامی کی نظر نہیں آتی۔ اگر نظر آئے بھی تو محسوس نہیں ہوتی۔ محسوس ہو بھی تو ناگوار نہیں گزرتی۔ محبت کی ہر ادا دلبری ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ستم بھی کرم ہے۔ اس کی وفا بھی پرلطف اور اس کی جفا بھی پرکشش۔ محبوب کی جفا کسی محبت کو ترکِ وفا پر مجبور نہیں کرتی۔ دراصل وفا ہوتی ہی بے وفا کے لیے ہے۔ محبوب کی راہ میں معذوری اور مجبوری کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کا عملی تجربہ آپ بخوبی کر چکے ہیں۔ محبوب کی پسند محبت کی پسند اور محبوب کی ناپسند محبت کی ناپسند بن کر رہ جاتی ہے۔ محبت کرنے والے جدائی کے علاوہ کسی اور قیامت کے قائل نہیں ہوتے۔" مہک بولے چلی جا رہی تھی۔ نایاب اور معیز بغور اس کی باتیں بھی سن رہے تھے اور ایک دوسرے کو اک ٹک باندھے دیکھے بھی چلے جا رہے تھے۔ اچانک نایاب کی ماما کمرے میں آئی تو نایاب نے کھڑے ہوتے ہوئے معیز کو بتایا

"یہ میری مما ہیں۔ معیز نے بھی ادب میں کھڑے ہو کر اس خاتون کو تعظیم دی۔" خاتون نے سر کے اشارے سے معیز کو سلام کیا۔

"ماما۔ یہ میرا دوست ہے اور مہک کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔"

"ہاں بیٹھو۔ بھئی بیٹھو آپ لوگ...... میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ دراصل بیٹا میں اسلام آباد جا رہی ہوں۔ ابھی دو گھنٹے بعد میری فلائٹ ہے۔ تم ریلیکس ہو۔ پچھلے کئی دنوں سے تمہاری طبیعت کافی متاثر چلی آ رہی تھی۔"

"آپ فکر نہ کریں ماما۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" نایاب نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

"آپ کو ائیر پورٹ ڈراپ کریں۔"

"نہیں بیٹا تم بیٹھو۔ تمہارے دوست تم سے ملنے آئے ہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔" مسز کامران نے کھڑے کھڑے بات کی اور واپسی کے لیے چل دیں۔

"میرے ماما، پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ معیز دیکھ لو میں پچھلا پورا ہفتہ ڈسٹرب رہی ہوں تو ماما میری وجہ سے اب بھی کتنی فکر مند ہیں۔"

"تم شہزادی ہو بابا۔ اب تمہیں شہزادہ مل گیا ہے۔ اب ہمارے لیے آپ کے پاس کہاں وقت ہوگا۔" مہک نے اسے تنگ کرتے ہوئے بات سنائی۔

"بکواس کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا۔ تم میری سانس ہو اور سانس کے بغیر بھلا جیا جا سکتا ہے؟" نایاب نے اس کے جواب میں کہا۔

"اچھا بابا اب مجھے تو اجازت دو۔ میری ایک دو جگہ اپائنٹمنٹ ہے۔ رات کو کال پر بات ہوگی۔" مہک نے اپنا پرس سنبھال کر اجازت مانگی۔

"بیٹھو بھئی۔ یہ اچانک کیا جلدی آپڑی؟ آپ کی باتوں سے خوب رونق جمی تھی۔" معیز نے تکلفانہ کہا۔

"تمہاری پسندیدہ ڈش مٹن بریانی اور پائے اسپیشل بنوائے ہیں۔ میں نے۔" نایاب نے مہک کو رک جانے کے لیے کھانے کی پیشکش کرتے ہوئے کہا۔

"او ہوئے ہوئے۔ مگر سوری یار پھر جب آئی ضرور بنوا کر کھاؤں گی۔" مہک نے نایاب کا چہرہ چوما۔ معیز سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئی۔

"معیز کوئی بات کرو تمہیں کھانے میں کیا پسند ہے؟ ڈریس کون سا اچھا لگتا ہے؟ موسم کون سا دل کو بھاتا ہے؟ ڈرنک میں کیا پیتے ہو؟ چائے میں شوگر کتنی پسند کرتے ہو اور کیا کیا مشاغل ہیں؟" نایاب نے ایک ہی سانس میں ساری باتیں پوچھ لیں اور بے اختیار معیز کی بڑی سی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔

"سچی بات بتاؤں جان۔ یہ اپنا ہاتھ ذرا میرے دل پر رکھنا۔" معیز نے نایاب کی مرمری سی کلائی تھام کر اپنی چھاتی سے لگائی۔ اس کا دل دھک دھک کرتے ہوئے جیسے جسم سے باہر اچھل پڑنے کو بے قرار ہو رہا ہے۔

"زندگی میں آج پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ اب تک میں بس اپنا خالی سا وجود لیے زندگی کا سفر طے کرتا رہا ہوں۔ بخدا مجھے یوں لگ رہا ہے۔ جیسے میری روح آج مجھ سے آ ٹکرائی ہے۔ تمہارا قرب مجھے زندگی کی حقیقت سے آشنا کر رہا ہے۔ بس میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم اسی طرح تصویر بن کر بیٹھی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں۔ تمہاری ان مخمور آنکھوں پر جھکتی دراز پلکیں میرے دل کی دھڑکن ہیں۔ میرے گھر میں دھن دولت کی کمی نہیں۔ میری زندگی میں سب کچھ تھا۔ مگر آج مجھے احساس ہوا کہ میرا سب کچھ تو آپ تھیں اور میں اب تک آپ کے بغیر تنہا تھا۔ جاگتی آنکھوں کا یہ خواب جنت کے تصور سے کسی بھی طور کم نہیں۔" معیز جیسے بے اختیار بولے چلا جا رہا تھا۔

"میری حالت بھی کچھ آپ سے کم نہیں ہے۔ معیز محبت کا نام سنتے سنتے چوبیس سال گزر گئے۔ اب پتا چلا کہ ہمیں تو محبت کے مفہوم کا بھی نہیں معلوم۔ لذتِ محبت کی مستی اس قدر مدہوش کر سکتی ہے۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ مہک نے مجھے احساس دلایا کہ تم کسی سے محبت کرنے لگی ہو۔ مجھے کچھ خبر نہیں ہو سکی۔ اس دن میں کیوں پلٹ پلٹ کر آپ کو دیکھ رہی تھی؟ مجھے نہیں سمجھ آتی تھی میرا دل کیوں اچاٹ سا ہو گیا ہے؟ میں کیونکر بے چین ہو کر رہ گئی ہوں؟ سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ بے شک محبت کی نہیں جاتی بس یہ ہو جاتی ہے اور جو زبردستی کر کے کسی کو اپنی محبت میں لینا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔ محبت قید و بند سے آزاد ہے۔ یہ سب کو اپنی گرفت میں تو لے سکتی ہے۔ مگر خود کسی کی گرفت میں رہ نہیں سکتی۔ محبت ایک لافانی جذبہ ہے۔ ہر انسان کے ساتھ محبت ایک الگ تاثیر رکھتی ہے۔ کہیں محبت کے دم سے تخت حاصل کر لیے جاتے ہیں۔ کہیں تخت چھوڑ دیئے جاتے ہیں۔ آج کے اس مشینی دور نے انسان سے محبت چھین لی ہے۔ دورِ حاضر میں اگر محبت کا وجود کسی طرح باقی ہے تو وہ غرض کی صورت میں محبت سانسیں لے رہی ہے۔" نایاب نے کافی لمبی بات کی۔

"مگر ہماری محبت ہر غرض سے پاک ہوگی۔ ہم محبت کے اس لافانی جذبے کو اغراض و مقاصد کی ہر آلائش سے پاک رکھیں گے۔ ہم اپنی محبت کو امر کریں گے۔" معیز نے پرجوش انداز میں نایاب سے عہدِ محبت کی تجدید کی اور نایاب نے بھی اپنی بے لوث محبت معیز پہ پھول پتیوں کی صورت نچھاور کر دی۔

......☆......☆......

شام کو دن بھر کا تھکا ہارا عبدالمجید گھر پہنچا تو اس کا چہرا بہت بجھا ہوا تھا اور وہ پریشان حال دکھائی دے رہا تھا۔ بائیک آنگن کے کونے پر چھوڑ کر اس نے واپس کمرے کی راہ لی۔ اس کی بیوی نزہت نے مجید کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا کہ مجید کو تنخواہ آج بھی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

... بنانے والی فرم میں ملازم ... نے وہاں رکھا تو منشی کے طور پر تھا۔ مگر دن بھر اس سے طرح طرح کے کام لیے جاتے تھے۔ کاریگروں کے ساتھ بطور ہیلپر کام کرنا۔ مارکیٹ سے سامان لانا ہوتا۔ مجید صاحب ذرا گھر سبزی تو پہنچا دو۔ آج بچوں کو تو اسکول سے جا کر لے آؤ۔ آج ڈرائیور نہیں ہے۔ گھر والوں نے کہیں جانا تھا۔ تم ہی ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ غرض ٹھیک۔ مجید منشی، مزدور، ڈرائیور اور گھریلو ملازم سب کے کام کرنے کی ذمہ داری نبھا رہا تھا۔ اس کے پانچ بچے تھے۔ بڑی تین لڑکیاں ندا، فضا اور ردا درجہ ہائی کے ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ بڑی منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والا اکلوتا چاند سا بیٹا ثقلین نرسری اسکول میں تیسری کلاس کا طالب علم تھا اور سب سے چھوٹی دو سالہ رمشا دن بھر اپنی ماما کے پاس گھر میں رہتی۔ کل پندرہ ہزار کی سیلری تھی۔ گھر کے اخراجات بمشکل پورے کیے جا رہے تھے۔ گھر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مجید اپنے مالکوں سے کافی رقم ایڈوانس لے خرچ کر چکا تھا۔ ہر ماہ دو ہزار وہ اپنے قرض کی ادائیگی کے جمع کرا دیتا اور باقی رقم سے پورا مہینہ گھر کا نظام چلایا جاتا۔ اب پچھلے تین دن سے اس کا مالک لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں ان کے کسی عزیز کی ڈیتھ ہو چکی تھی۔ چاروں بچوں کی فیس لیٹ ہو رہی تھی۔ ہر روز بچیاں فیس وصولی کا نوٹس لا کر اپنی ماں کو دیتیں۔ آج تو بچیوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ ہمارے پرنسپل نے کہا ہے۔ اگر فیس کی رقم نا لا سکو۔ تو اسکول مت آنا۔ نزہت بہت پریشان تھی۔ اسے کسی حد تک امید بھی تھی کہ آج مجید کو تنخواہ ضرور مل جائے گی۔ مگر مجید کی گھر آمد پر اس کی پریشان صورت دیکھ کر نزہت کا دل بجھ سا گیا تھا۔

"کیا ہوا مجید؟" پری نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ حاجی صاحب آج بھی لاہور سے نہیں آئے۔ پھر کون دیتا تنخواہ؟"

"ان کا بیٹا تو ان کی عدم موجودگی میں سارا نظام چلا رہا ہے۔ آپ اس سے کہتے کہ بچوں کی فیس کے لیے تو پانچ ہزار کی رقم دے دیتا۔ باقی حاجی صاحب کی آمد پر ہم لے لیتے۔ بچوں نے کل فیس لے کر جانا ہے۔ ورنہ انہیں کلاس میں نہیں بیٹھنے دیا جائے گا۔" نزہت نے غمزدہ سی ہو کر کہا۔

"تو اسے کل نا بھیجنا اسکول۔ کل سے میں اس سے بکواس کر رہا ہوں کہ چلو مجھے آدھی رقم ہی دے دو۔ مگر وہ حرام خور۔ مجال ہے جو اس کے کان پر جوں بھی رینگی ہو۔ بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیتا ہے۔ حاجی صاحب آئیں گے تو دیں گے۔ میں کہاں سے دوں؟ پے منٹ کہیں سے آ نہیں رہی۔ ایڈوانس لے کر جن کا مال تیار کرنا تھا۔ وہ کام رکا ہوا ہے۔ آپ لوگوں کو بس اپنی پڑی رہتی ہے۔ ہماری مجبوریوں کا تمہیں احساس ہی نہیں ہے۔ پچاس ہزار سے زائد کی رقم تم ایڈوانس میں لے کر کھا چکے ہو۔ اب اگر تنخواہ میں دو چار روز کی تاخیر ہو گئی ہے تو تم ہماری جان پر بن آئے ہو۔ صبح سے تین چار بار مانگ چکے ہو تم مجھ سے۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے۔ پہلے ہمارے پچاس ہزار پورے کرو۔ پھر تمہیں ہر ماہ کی یکم کو پوری تنخواہ نقد ملتی رہے گی۔ اس نے آج تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔" مجید نے غصے کی حالت میں نزہت کو ساری تفصیل بتا کر جیسے اپنے اندر کا سارا غبار اس بیچاری پر انڈیل دیا۔

"اب کیا ہوگا مجید؟" وہ پریشانی سے بولی۔

سبھی بچے جو پاس ہی یہ ساری گفتگو سن رہے تھے۔ انتہائی بے بسی کی حالت میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہونا ہے۔ دو وقت کی روٹی مشکل ہو رہی ہے۔ کہاں سے لا کر دوں تمہیں۔ بڑا شوق تھا نا تمہیں بچیوں کو انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم دلانی ہے۔ ہم نے۔ اب کرو اپنا شوق پورا۔ میں صبح سے شام تک مشین کے پرزے کی طرح ان کے ہاں کام کرتا ہوں۔ ہفتے میں ایک جمعہ کی چھٹی ہوتی ہے۔ اس دن بھی وہ مجھے کسی نا کسی کام کے لیے بلوا لیتے ہیں۔ مجھے اپنی صحت کا ہوش نہیں ہے۔ بیمار رہنے لگا ہوں۔ میں اب۔ سر پر قرض ہے۔ آخر کروں تو کیا کروں میں؟" مجید نے سر پیٹ کر کہا۔

"دیکھو نزہت بیگم کل سے تینوں بچیوں کو سرکاری اسکول میں داخل کروا دو۔ وہاں فیس بھی نہیں دینا پڑتی اور اب تو کتابیں بھی مفت مل رہی ہیں۔ انگلش میڈیم اسکولوں کیا خراجات برداشت کرنا ہمارے جیسے سفید پوش طبقے کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہ مال دار اور دولت مند لوگوں کے چونچلے ہیں۔ غریب طبقہ کسی بھی صورت پرائیویٹ اداروں کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا۔ اتنی بھاری فیسیں۔ پھر مہنگی ترین کتابیں اور ہر روز اسٹیشنری کا خرچ۔ نرسری کا بچہ ہر روز ایک پنسل ایک ربر اور ایک شاپنر لے کر جاتا ہے اور شام کو خالی ہاتھ لوٹ آتا ہے۔ صبح اسٹیشنری کی دکانوں پر بچوں کی بھیڑ لگی ہوتی ہے اور بس ہر بچہ پنسل کاپی شاپنر اور ربڑ مانگ رہا ہوتا ہے۔ دکاندار حضرات نے اپنی من مانے دام وصول کرتے ہیں۔ جیب خرچ سے نا صرف بچوں کی عادت بگڑ رہی ہیں۔ بلکہ انہیں فضول خرچی کی لت بھی پڑ رہی ہے۔ امیر گھروں کے بچوں کو دیکھ کر غریب کے بچے بھی گھر والوں سے دگنا جیب خرچ مانگتے ہیں۔ میرا بس چلے تو میں سارے زمانے کو چیخ چیخ کر کہہ دوں کہ خدا کے لیے چھوٹے معصوم بچوں کو روپے دے کر اسکول نا بھیجا کرو۔ بڑے ہو کر یہ آپ سے زیادہ جیب خرچ مانگیں گے۔ عمر اور بڑی کلاسوں کے ساتھ ساتھ ان کے ریفریشمنٹ کے اخراجات بھی بڑھتے جائیں گے۔ ہم اپنی اولادوں کے ناز نخرے اٹھاتے اٹھاتے انہیں اس قدر بگاڑ دیتے ہیں کہ جس دن ان کو جیب خرچ نہ ملے۔ وہ اسکول جانے سے بھی انکاری ہو جاتے ہیں۔ پھر جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو رشوت لے کر کام کرتے ہیں۔ جیب خرچ کی عادت رشوت کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ صرف اس لیے کہ انہیں پہلے دن سے ہی جیب میں نوٹ ڈال کر اسکول جانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ تاکہ اس لالچ میں آ کر وہ اسکول جانے پر آمادہ ہو جائیں۔ بس جیب میں روپیہ ڈالنے کی عادت جو والدین نے اپنے بچے کو گھر میں ڈالی تھی۔ اس جیب میں جب تک روپیہ نہیں ڈالتا۔ تب تک اس کے سرکاری اور غیر سرکاری کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچتے۔ رشوت خور کو رشوت خور بنایا کس نے؟ والدین نے۔ اس کے جنم دینے والوں نے لاڈ اور پیار میں اس کی جیب میں روپے ڈال ڈال کر اسے رشوت خور بنا دیا۔ بخدا بچوں سے لاڈ پیار ضرور کرو۔ مگر جو بہت کم عمر بچے ہیں۔ ان کو اپنے ہاتھ سے کھانے پینے کی چیزیں لے کر دو اور اسکول چھوڑ کر آؤ۔ ان کو اپنے ہاتھ سے پیسے خرچ کرنے کی عادت نہ ڈالو۔ جب دوسری تیسری کلاس میں جانے کے قابل ہو جائیں تو مناسب سا خرچ دیں۔ مگر اس عادت کو بھی روز کا معمول نہ بنایا جائے۔ ماں کی گود سے بچپن کی حدیں ختم ہونے تک والدین کی تربیت انسان کے بڑھاپے تک اسے اپنے اثرات کے زیر اثر رکھتی ہے۔ لہٰذا اولاد کی کم عمری میں ان کی تربیت محتاط طریقے سے کریں۔ جس طرح کسی بھی پیڑ کی فالتو شاخوں کو ساتھ ساتھ نہ کاٹا جائے تو وہ کبھی سیدھا اور تناور پیڑ نہیں بن سکتا۔ بلکہ ادھر ادھر اپنی بے ترتیب شاخوں کو پھیلا کر جھاڑی نما بن کر رہ جاتا ہے۔ بے حد لاڈ پیار بچوں کی عادت کو بگاڑتا ہے۔ بچوں سے بہت پیار کیجیے۔ مگر کبھی کبھی ذرا سی سختی بھی برت لینا اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا آٹے میں نمک کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔

تو ماں باپ کماتے کس لیے ہیں؟ اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دینے ان کی صحت اور ان کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے انہیں قربانی تو دینا پڑتی ہے نا اور پھر ہم کون سا اپنی اولاد کو خرچ کرنے کے لیے روزانہ سو سو کا نوٹ دے کر بھیجتے ہیں۔ بڑی بچیوں جو آٹھویں اور نویں کلاس میں پڑھ رہی ہیں۔ کبھی دوسرے تیسرے دن گنتی کے چند روپے دے کر ان پر بہت بڑا احسان کرتے ہیں۔

نزہت نے مجید کی لمبی چوڑی تقریر سن کر منہ بناتے ہوئے شکن آلود پیشانی سے کہا۔

"تو ٹھیک ہے نا۔ ہم اپنی اوقات میں رہتے ہیں۔ اب جو ثقلین بیٹے کو بیس روپے روزانہ دینے کی تو نے اسے عادت ڈالی ہے۔ کل ذرا اسے پانچ کا نوٹ دے کر دیکھنا۔ وہ تمہارے منہ پر دے کر مارے گا۔ تجربہ کر کے دیکھ لینا۔ تو نے اسے ہمیشہ کے لیے جیب خرچ لینے کا عادی بنا دیا ہے۔ کل جب وہ اور بڑا ہوگا تو اسے گھر کے لیے بازار سے سبزی لانے یا گھر کی کوئی چیز منگوانے کے لیے جو رقم دو گی نا۔ وہ اس میں سے اپنا جیب خرچ خود ہی نکال لیا کرے گا اور تو نے کہہ دینا ہے۔ کوئی بات نہیں پھر کیا ہوا۔ ایک ہی تو بیٹا ہے ہمارا۔ میں اسے کیوں روکوں اور اسے ڈانٹ پھٹکار کروں۔ بس آپ کے اس ایک جملے نے اس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے جگہ بنا لینی ہے کہ میری ماں مجھے کچھ نہیں کہے گی۔ مجھے گھر والے بھی نہیں ٹوکتے۔ میں جو بھی کروں۔ مجھے کوئی کچھ نہیں کہتا۔" بس یہاں سے وہ خار دار جھاڑی بننا شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کے لیے ان باتوں کو معمولی نہ سمجھو۔ اولاد کی تعلیم پر اتنا خرچ کرتے ہو۔ ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے ہو۔ ان کے لیے جائیدادیں خریدتے ہو۔ بڑے بڑے گھر بناتے ہو۔ بڑی بڑی گاڑیاں لے کر دیتے ہو۔ ان کی شادیوں پر لاکھوں کروڑوں خرچ کرتے ہو۔ ان کی خاطر ہر مشکل برداشت کرتے ہو۔ کیا ان کے بچپن میں ان کی تربیت پر غور نہیں کر سکتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ ہم ان کو کن رستوں پر ڈال رہے ہیں؟ ہماری ذرا سی بے پروائی سے ان کی عادات کس قدر بگڑ رہی ہیں؟ بچے کی ہر خواہش اور ہر ضد کو پورا کرنا ان سے ہمدردی نہیں۔ ان سے دشمنی کے مترادف ہے۔ جس طرح بچے کو آگ سے روکا جاتا ہے۔ ناجائز باتیں منوانے اور ناجائز خرچ کرنے کی ضد بھی تو آگ سے کھیلنے جیسی ہے۔ اسے روکنے کی بجائے اس کی تکمیل کیوں کی جاتی ہے؟" مجید نے اپنی زندگی کا رخ قبول کر لیا۔ بچوں کو سرکاری اسکول میں داخل کروا دیا۔ پرائمری تک بچے کو انگلش میڈیم تعلیم دلانا متوسط طبقے کے لیے مناسب ہے۔ پر اسے سرکاری اسکول

میں بھی کوئی [illegible]نہیں۔ پھر بھی وہ انگلش میڈیم اسکولوں سے کم خرچ ہوگا۔ ایسا قدم اٹھانے سے مجید کے معاشی حالات۔ بہت حد تک بہتر ہوگئے۔ حالات کی سنگینی نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وقت۔ بہت بڑا استاد ہے۔

……☆……☆……

معیز اور نایاب کی محبت دن بدن گہری ہوتی گئی۔ وہ جنون کی حد تک ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ رات کا کھانا کبھی ایک دوسرے کے گھر سے کبھی کسی ریسٹورنٹ سے مل کر کھاتے اور پھر رات گئے تک ایک ساتھ گھومتے رہتے۔ دوپہر کے بعد نیند سے بیدار ہوتے۔ تو پہلے کال کر کے ایک دوسرے کی خبر لیتے۔ پھر اپنا حلیہ سنوارنے واش روم کی راہ لیتے۔ معیز نایاب کو اپنے مما پاپا بھائیوں بھابھیوں اور اپنی بہنوں سے ملوا چکا تھا۔ سبھی نایاب سے مل کر بہت خوش تھے اور اسے معیز کا ہمسفر بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ نایاب بھی معیز کو اپنی مما اور پاپا سے ملوا چکی تھی۔ ایک ماہ کی رفاقت نے ان دونوں کو ایک دوسرے کی عادات سے بھی بخوبی آشنا کردیا تھا۔ نایاب کے لبوں سے نکلی ہوئی بات معیز کے لیے ایک حکم کا درجہ رکھتی تھی اور وہ فوری طور پر اسے پورا کرنے کا آرزو مند ہو جاتا تھا۔ پھر جس طرح بچوں کو لاڈ اور پیار بگاڑ دیتا ہے۔ ان کی خواہشوں کو پورا کرتے کرتے وہ ضدی اور اکھڑ بن جاتے ہیں۔ اپنی بیوی اور محبوبہ سے بھی حد کے اندر رہ کر محبت کرنی چاہیے۔ کوئی بھی چیز حد سے بڑھ جائے تو وہ نقصان دہ ثابت ہوا کرتی ہے۔ آج کل محبت کی شادیاں ستر فیصد اس لیے ناکام ہوتی ہیں کہ شروع شروع میں محبوبہ اور بیوی کی ہر بات کو بڑے شوق اور فخر سے مان کر اسے پورا کیا جاتا ہے۔ مگر شادی کے بعد جب عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے تو محبوبہ۔ جواب بیوی بن چکی ہوتی ہے۔ وہ ہر کام میں اپنی بات منوانے کی کوشش کرتی ہے۔ جو شروع میں تو قابل قبول ہوتی ہے۔ مگر آگے چل کر اس کی خواہشات کچھ تلخی اور ناپسندیدگی کا باعث ثابت ہونے لگتی ہے۔ بس یہاں سے دونوں کی محبت دم توڑنے لگتی ہے۔ لڑکا خواہش مند ہوتا ہے کہ میں نے ہمیشہ اس کی ہر بات مانی ہے۔ اس کی ہر خواہش پوری کی ہے۔ اب ہم گھر کی ذمہ داری مل کر سنبھالیں اور ایک دوسرے کی بات کی پاسداری کریں۔ ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کریں۔ ایک دوسرے کی مجبوریوں کو سمجھ کر ایک دوسرے کی ڈھارس بن جائیں۔ اس کے دکھ سکھ کے ساتھی بنیں۔ جبکہ لڑکی سوچتی ہے کہ یہ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ میری ہر ذرا سی بات کو پورا کرنے تک اسے چین ہی نہیں آتا تھا۔ اب یہ پہلے سا نہیں رہا۔ اس کے لہجے میں تلخی آگئی ہے۔ اپنے گھر والوں کے کہنے پہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کر رہا ہے۔ یہ اب بالکل بدل کر رہ گیا ہے۔ یا تو اسے مجھ سے محبت نہیں رہی یا کسی اور طرف مائل ہونے لگا ہے۔ یا پھر اپنے گھر والوں کے کہنے پر میرے ساتھ یہ ناروا سلوک کر رہا ہے۔ بس اسی بات پر دن بدن دونوں میں تلخی بڑھنے لگتی ہے۔ گھر کی فضا بوجھل ہونے لگتی ہے۔ لڑکی اپنے سسرال والوں سے بدظن ہو کر ان سے دور رہنے لگتی ہے اور لڑکا اس کے طرز سلوک سے پریشان ہو کر ایک ایسی صلیب پر لٹک جاتا ہے۔ جو کسی اور کو تو دکھائی نہیں دے رہی ہوتی۔ مگر وفادار اجل پر سانسیں لے رہا ہوتا ہے۔ ایک طرف والدین۔ بہن بھائی ہوتے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہوتے ہیں تمہاری بیوی ہمیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ کتنے ارمانوں اور شوق سے ہم اسے بیاہ کر لائے ہیں۔ اب تم بھی اس کی طرف داری کرتے ہو۔ اپنے خونی رشتوں کو بھول چکے ہو تم۔ اس کے لیے سب کچھ کرتے ہو۔ اس کی ہر ذرا ذرا سی بات کو مانتے ہو۔ وہ پھر بھی تم سے نالاں ہے۔ وہ پھر بھی تم سے خوش نہیں۔ بس یا تو بیوی کو چھوڑ دو یا پھر ہمیں چھوڑ دو۔ ہم کسی طور بھی اس کے ساتھ مل کر نہیں چل سکتے۔

دوسری طرف بیوی مظلوم بن کر دامن جھنجوڑ کر پوچھ رہی ہوتی ہے کہ پہلے تو میرے ساتھ بڑا عشق کرتے تھے۔ میرے بغیر تمہیں نیند نہیں آتی تھی۔ دل کو چین نہیں ملتا تھا۔ میری خاطر تم آسمان سے ستارے توڑ لائے اور دودھ کی نہر نکالنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اب میں اپنوں کو چھوڑ کر تمہارے پاس آگئی ہوں۔ تو تم نے طوطے کی طرح آنکھیں بدل لی ہیں۔ گھر والوں کی خاطر مجھے جوتے کی نوک پر بھی نہیں رکھتے۔ آخر میرا جرم کیا ہے؟ کیا میں نے تم سے محبت کی تھی یہ اس کی سزا ہے؟ تمہاری خاطر اپنے ماں باپ۔ بہن بھائی سب کو چھوڑ کر یہاں آئی اور اب میرے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی۔ بس اپنے گھر والوں کو چھوڑ دو۔ ہم علیحدہ مکان میں رہ لیں گے یا پھر مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔ میں اس عذاب ناک ماحول میں نہیں رہ سکتی۔ میں میکے جا رہی ہوں۔ جب تمہارا گھر بسانے کو دل مان جائے تو مجھے لے آنا۔ نہیں تو۔ میں تمہارے فیصلے کے نوٹس کا انتظار کروں گی۔ اب جو بندہ دونوں طرف سے ایسے حالات کی گرفت میں ہو تو کیا وہ سولی پر نہیں لٹک رہا ہوتا؟ کیا اس کے زندہ رہنے کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے بھلا؟ ہرگز ہرگز نہیں۔

تو اے محبت کرنے والو! ضرور محبت کرو۔ مگر حد میں رہ کر۔ جب حد پار کرو گے تو پھر تمہاری حالت بھی اس مچھلی جیسی ہو جائے گی۔ جو جذبات اور جوش میں آکر چھلانگیں لگاتے لگاتے ساحل کی حد کو توڑ کر پار جا گری۔ اب وہ وہاں رہ کر تڑپتے ہوئے جان تو دے سکتی ہے۔ واپس نہیں لوٹ سکتی۔ بعض اوقات پھر صورت حال کچھ یوں ہو جاتی ہے۔ بیوی ہو یا محبوبہ پہلا مطالبہ ہی یہ کرے گی کہ مجھے موبائل لے کر دو میں آپ سے باتیں کیا کروں گی۔ جب موبائل سیٹ گھر میں آگیا تو سمجھ لو ایک ہزار آفتیں بھی ساتھ ہی آپ کے گھر میں نازل ہو گئیں۔ ہر دن موبائل کے لیے لوڈ کرانا ضروری ہوگا۔ کیونکہ آج بیگم صاحبہ نے اپنی اماں سے بات کرنی ہے۔ آج بڑی باجی سے بات کیے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ آج چھوٹی سے بات کرنی ہے۔ آج فلاں دوست سے بات کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ خالہ سے بات کیے ہوئے مہینوں ہی گزر گئے۔ وہ کیا سوچیں گی کہ ہمیں بھول ہی گئے۔ پھوپھو سے تو آج میں نے ضرور بات کرنی ہے۔ ممانی مجھے ہمیشہ گلہ دیتی ہیں کہ کبھی بھول کر بھی آپ لوگوں نے ہمیں یاد نہیں کیا۔ اب بھلا محترمہ بیگم صاحبہ کو دن بھر اتنے لوگوں سے بات کرنا ضروری ہو۔ تو وہ گھر کے کام کس وقت کرے گی؟ ایک سروے کے مطابق پاک وہند کے ہر گھر میں موبائل فون سیٹ تقریباً ہر فرد کے پاس موجود ہے۔ مرد حضرات سٹوڈنٹ طبقے سے لے کر بزرگ عمر تک کے لوگ جہاں بھی بیٹھے ہوں گے۔ جس محفل میں بھی ہوں گے کسی مرنے والے کے سوگ میں فرش پر بھی تشریف فرما ہوں گے۔ تو ذرا دیر کے بعد موبائل کو نکال کر ہاتھ میں لیے بیٹھے ہوں گے۔ راہ چلتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے آفس کے کام روک کر کوئی بھی مشن آپریٹ کرتے ہوئے ایک ہاتھ موبائل کو کان کے قریب سہارا دینے پر مجبور رہتا ہے۔ اسی طرح خواتین سبزی کاٹتے ہوئے، جھاڑو لگاتے ہوئے، کھانا بناتے ہوئے اور بعض دفعہ کپڑے دھوتے ہوئے موبائل کان سے لگائے رکھنا مجبوری سمجھتی ہیں۔ اس کا استعمال بھی حد سے بڑھ کر ہو رہا ہے۔ ساٹھ فیصد بے وجہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ جس کے نتائج خطرناک صورت حال اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ لہذا بیوی اور محبوبہ کو پیار سے دیے گئے موبائل فون پر کسی بھی رونگ نمبر پر اندر ہی اندر بعض دفعہ وہ داستان رقم کر دیتے ہیں۔ جن کا ازالہ زندگی بھر نہیں ہو سکتا۔ موبائل گھر میں ضرور ہونا چاہیے مگر اس کا تصرف جائز حد تک رہے۔ کہیں وہ ہیپاٹائٹس کی طرح گھر کی بنیادوں کو کھوکھلا نا کردیں اور پتہ اس وقت چلے جب عمارت سر پر آن پڑے۔ اپنے بچوں کو موبائل کے استعمال سے منع کریں۔ وہ گیمیں کھیلتے کھیلتے ایک دن ایسی گیم کھیل جائیں گے۔ جس کے نتائج آپ کو بھگتنا پڑیں گے۔ اللہ سب کو اپنے حفظ و ایمان میں رکھے۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا۔ کہ ہر بات اپنی حد کے اندر ہی اچھی لگتی ہیں۔ اعتدال پسندی نظام زندگی کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیتی۔

……☆……☆……

اس دن بھی وہ دونوں اسی شاپنگ سنٹر میں موجود تھے۔ جہاں انہوں نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ وہ اندر جاتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے چلے جاتے تھے۔ پھر جب شاپ سے نایاب نے اپنی دوست زینا کے لیے ہیرے کا سیٹ خریدا تھا۔ معیز نایاب کو لیے اسی شاپ پر پہنچا اور دکان دار کو کنگن دکھانے کی خواہش ظاہر کی۔

"او۔ معیز اب میرے لیے کنگن خریدو گے؟"

"کیوں آپ کو پسند نہیں ہے کیا؟"

"ہاں پسند تو ہیں۔ مگر کوئی اتنے خاص بھی نہیں۔ مگر آپ کی خواہش ہے تو ضرور۔" نایاب نے جیسے معیز کی دلجوئی کے لیے کہا ہو۔ پھر جو کنگن نایاب کو پسند آئے۔ ان کا بل معیز نے ادا کیا۔

دراصل یہ دیہات میں رہنے والی لڑکیاں اور عورتیں کلائیاں بھر کر چوڑیاں پہنتی ہیں۔ کنگن ڈالتی ہیں۔ سندھی عورتیں اور شمالی علاقہ جات کی خواتین شوق سے ان زیورات کا استعمال کرتی ہیں۔ میں تو نہیں ڈال سکتی۔ میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔ نایاب نے ہنستے ہوئے معیز کا گفٹ پیک قبول کیا اور پھر دونوں ٹہلنے کے انداز میں آگے بڑھنے لگے۔

بس یہ بھی تقسیم قدرت ہیکہ کم آمدنی والے غریب طبقے کی لڑکیاں کانچ کی چوڑیاں عید اور کسی شادی بیاہ کے موقع پر خرید کر اپنا شوق پورا کرتی ہیں۔ ان کو کانچ کی چوڑیاں خریدنے کو بھی رقم نہیں ملتی اور کہیں سونے کے کنگن پہننے پر دم گھٹنے لگتا ہے۔ واہ مالک تیرے ہر کام میں چھپی مصلحت کو سمجھنا تیرے پیارے بندوں کا کام ہی ہو سکتا ہے۔

اب وہ سنٹرل مال کے ریسٹوران میں آبیٹھے اور پیزے کا آرڈر دیا۔

"آج اس سنٹر پہ آنا کیسا لگا آپ کو۔" معیز نے نایاب سے پوچھا۔

"بہت زبردست معیز۔ بلکہ مجھے تو اب اس شاپنگ سنٹر سے بھی گہری محبت ہوگئی ہے۔ جس دن پہلی بار یہاں ہمارا سامنا ہوا تھا۔ اس دن کے بعد میں کئی بار یہاں آئی تھی کہ شاید وہاں پھر آپ سے ملاقات ہو جائے۔" نایاب نے ایک دلکش مسکراہٹ سے کہا۔

"میں خود کئی بار آپ کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔ مگر کیونکہ مہک نے میری تلاش کا سفر ختم کیا۔ ورنہ میں تو پورے شہر کی ہر گلی چھاننے کا سوچ رہا تھا۔" معیز نے کہا تو نایاب اچھل سی پڑی۔

"کیا؟ واقعی؟"

"ہاں نایاب اگر آپ مجھے نہ ملتیں تو میں آپ کو فیس بک پر، شاپنگ سنٹروں، شہر میں ہونے والی دوسری رنگارنگ تقریبات میں ڈھونڈتا۔ اگر آپ سے پھر بھی میری ملاقات نہ ہوتی تو میں گلی گلی تمہاری جستجو میں اگر پیدل بھی گھومنا پڑتا تو میں کبھی نہ ہچکچاتا۔" حیرت ہے آخر اس قدر مجھ سے گہری وابستگی کی وجہ؟ اتنا بڑا شہر ہے۔ مجھ سے لاکھوں خوبصورت مالدار لڑکیاں یہاں موجود ہیں۔ آپ کسی اور کو بھی اپنی دوست بنا سکتے تھے۔ کوئی بھی لڑکی آپ سے بخوشی ملنے کو تیار ہو سکتی تھی۔ بلکہ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ جس کو بھی نظر بھر کر دیکھ لیں۔ وہ آپ سے ضرور ملاقات کرے گی۔" نایاب نے حیرت بھرے لہجے میں معیز سے پوچھا۔

"یہ بات بھی نہیں ہے کہ میں کوئی بڑا حسین شہزادہ ہوں۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت لڑکا موجود ہے۔ لڑکیاں بھی ہیں۔ مگر اصل بات پتہ ہے کیا ہے؟" معیز نے سوالیہ پوچھا۔

"ہاں بولو!"

"حسن کسی انسان، کسی چیز یا کسی رنگ میں نہیں ہوتا۔ بلکہ حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ ایک چیز آپ کو بے حد حسین نظر آ رہی ہے۔ لیکن مجھے نہیں آ رہی۔ مجھے کوئی دوسری حسین صورت اپنی جانب کشش کر رہی ہے۔ جو آپ کو متاثر نہیں کر رہی۔ تو پھر ثابت ہوا نا کہ انسان کی آنکھ کسی کو خوبصورتی دیتی ہے۔ میری نگاہ نے جب تمہاری طرف پہلی بار دیکھا تو وہیں ٹھہر گئی اور میرے وجود پر سکتے کی سی کیفیت طاری کر دی۔ میری آنکھوں نے آپ کو دل میں اتار لیا اور پھر کہیں اور متوجہ ہونے سے گریزاں ہونے لگیں اور اب میرے نزدیک اگر کوئی حسین صورت ہے تو وہ آپ کی ہے۔" معیز نے بے اختیار نایاب کی کلائی پر اپنے ہونٹ ثبت کرتے ہوئے بڑے مستی بھرے انداز میں کہا تو نایاب نے بھی بے اختیار معیز کے چہرے پر اپنے گلابی ہونٹوں کی مہک بکھیر دی۔ آج کی ملاقات ہماری ایک یادگار ملاقات رہے گی۔ انہوں نے اپنے موبائل پر ایک دوسرے کی بے شمار تصاویر بنا ڈالی تھیں۔ دو پریمی ہر غم سے بے نیاز، ہر فکر سے آزاد اپنی محبت کے نشے میں رات گئے واپس گھر کو لوٹ رہے تھے۔

……☆……☆……

شب کا ایک بج رہا تھا۔ مہک کے کمرے کی لائٹ روشن تھی اور وہ تھکے تھکے سے وجود کے ساتھ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے اپنا پاؤں دوسرے پاؤں پر رکھے کسی میگزین میں کوئی سیڈ سی سٹوری پڑھ رہی تھی۔ کہانی کے کرداروں میں وہ اس قدر گم تھی کہ نہ اسے وقت کا احساس ہو رہا تھا اور نہ اسے یہ خبر تھی کہ وہ کتنا تھک چکی ہے۔ اپنی آنکھوں میں نمی محسوس کی تو ٹشو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے انگلی سے ناک کو رگڑا اور اپنا گلا کھنکھارا۔ چند ثانیے میگزین کے اندر انگلی رکھے اسے بند کیا۔ پلکیں موند کر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا اور اپنے اندر سے اٹھنے والے شدید کرب کو پی جانے کی کوشش کی۔ اس کی یہ حالت فقط کہانی پڑھ کر نہیں ہو رہی تھی۔ دراصل آج وہ ذہنی دباؤ کا شکار بھی تھی۔ بظاہر ایک خوش باش اور شوخ سی دکھائی دینے والی لڑکی اندر سے کس قدر زخم خوردہ تھی۔ یہ بات اس کیا یک دو دوستوں کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کی پرورش بھی بڑی ناز و نعم سے ہوئی تھی۔ ایک بھائی جوان دنوں اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی میں رہ رہا تھا۔ بڑی دو بہنیں اپنے اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ مہک سے چھوٹا حائق جو میٹرک میں تھا۔

مہک کی اپنی مما سے دراصل اس وقت سے اک سرد سی جنگ چھڑ گئی۔ جب اس نے اپنی مما کو بتایا کہ میں کسی فریال نامی لڑکے سے محبت کرتی ہوں اور میں نے اسی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی یہ بات سنتے ہی اس کی مما معراج بیگم یک لخت نہائت غصے کی حالت میں آ گئیں۔ غصے سے بولیں۔

"یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم……؟ تم جانتی ہو کتنی بڑی بات کر دی ہے تم نے……؟ اپنی زندگی کے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ بھی کر لیا تم نے۔ جان سے ماردوں گی میں تمہیں۔ خبردار جواب کبھی ایسی بات بھی تمہاری زبان تک آئی تو۔" معراج بیگم چیختے ہوئے نہایت غصے کی حالت میں پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں اور مہک سکتے کے عالم میں بت بنے وہیں کھڑی رہی۔ اس کادماغ گھوم گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مما اتنی کرخت اور سنگدل بھی ہو سکتی ہے۔ کبھی آج تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ بائیس برس کی عمر کو پہنچ رہی تھی۔ کبھی مما نے ایسا تلخ لہجہ نہیں اپنایا تھا۔ ہاں پاپا کے ساتھ انکی کبھی کبھی تلخ کلامی ہو جایا کرتی تھی۔ یا پھر پرانی ملازمہ ذکیہ کو ڈانٹ ڈپٹ پلا لیا کرتی تھیں۔ اپنی اولاد میں سے کبھی کسی کے ساتھ اس قسم کا ناروا سلوک کبھی بھی تو نہیں کیا تھا۔ مہک اپنی مما کو اپنی دوست سمجھتی تھی۔ اس سے پہلے کبھی مما نے اس کی کسی خواہش کو کبھی رد نہیں کیا تھا۔ اس کی کسی بات کو ٹھکرایا نہیں تھا۔ یہ آج ان کا عجیب سا برتاؤ دیکھ کر مہک کا تو سر گھوم گیا تھا۔ وہ نڈھال سی ہو کر کرسی پر بیٹھ رہی۔ کبھی کسی نے اسے ذرا سی بھی ڈانٹ نہیں پلائی تھی۔ آج پہلی بار اسے ڈانٹ سننا پڑی۔ وہ بھی اپنی مما سے۔ اووری سیڈ۔

آج اس نے فریال کے ساتھ جلو پارک جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ وہ فریال سے اس قدر محبت کرتی تھی کہ اس کی سجدائی کا تصور کرنا ہی محال تھا۔ وہ بھی اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ دونوں محبت کی بہت سی منزلیں عبور کر چکے تھے اور اب وہ ایک جان دو قالب تھے۔ مہک فریال کو بتا چکی تھی کہ میرے گھر والے کبھی میرے فیصلے کو رد نہیں کر سکتے۔ فریال نے بھی اسے یقین دلا رکھا تھا کہ میرے والدین اور بہن بھائی بھی میرے فیصلے کو ماننے سے انکار نہیں کر سکتے۔ مگر……یہ کیا ہوا؟ اب وہ کیسے فریال کو بتائے کہ مجھے جنم دینے والی میری سگی ماں نے میری خواہش ماننے سے نا صرف صاف انکار کر دیا ہے۔ بلکہ مجھے جان سے مار دینے کی بھی دھمکی دے ڈالی ہے۔ اف گارڈ۔ وہ دونوں ہاتھوں سے بار بار سر تھام لیتی۔ اس کا بلڈ لو ہونے لگا۔ وہ پورا دن اس نے کمرے میں قید ہو کر گزارا۔ اپنا سیل آف کر دیا۔ رات اس کے پاپا اس کے کمرے میں غیر متوقع چلے آئے۔

"کیا بات ہے بیٹا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری۔ تم کھانے کی میز پر بھی نہیں آئیں۔ تمہاری مما بتا رہی تھی کہ تم دن بھر اپنے کمرے سے باہر ہی نہیں آئی ہو۔"

"کچھ نہیں پاپا۔ شفقت پدری کو سامنے پا کر مہک یک لخت نہایت دکھ سے جیسے پھٹ سی پڑی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر دوسری طرف رخ پھیر کر سر جھکائے چھما چھم رو دی۔

"کیا ہوا بیٹا؟ آخر بات کیا ہے کچھ بتاؤ تو؟" پاپا نے آگے بڑھ کر بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔

"یہ آپ کو اپنے کرتوت کیا بتائے گی۔ میں بتاتی ہوں تمہیں۔ یہ کسی فریال نامی لڑکے سے عشق کرتی ہے اور اب اسے اپنا ہمسفر بنانا چاہتی ہے۔ میں نے سختی سے روک دیا ہے کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ نکال دے اس کے خیال کو اپنے دل سے۔ بس اسی بات کو ایشو بنا کر دن بھر اندر پڑی رہی ہے اور اب رو کر آپ کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتی ہے۔" معراج بیگم نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر اپنے شوہر ایوب ملک کو تفصیل سے بتایا۔ اس کا لہجہ اب بھی نفرت بھرا تھا۔ ماں کی آواز سن کر مہک اچانک پلٹی اور اپنے پاپا کو باہوں کے دائرے میں لے کر چیختے ہوئے اس سے لپٹ کر سسک سسک کر رو دی۔

"معراج بیگم کس لہجے میں بات کر رہی ہو تم؟ وہ بھی اپنی بیٹی کے بارے میں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ سن لیا تم نے۔ اپنی زندگی کے بارے میں میری بیٹی جو فیصلہ کرے گی۔ وہ مجھے قبول ہو گا۔ کیونکہ میری بیٹی گریجوایٹ ہے۔ ذہین ہے۔ اچھے برے کی تمیز کر سکتی ہے۔ تم کون ہوتی ہے؟ اس پر دھونس جمانے والی۔" ایوب ملک نے اپنی بیگم کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔

"اچھا یہ تمہاری بیٹی ہے۔ میں تو دشمن ہوں نا اس کی۔ پھر اس گھر میں میری تو کوئی حیثیت نہیں ہے نا۔ ٹھیک ہے اگر میری بات آپ لوگوں کو زہر لگتی ہے۔ تو کوئی حق نہیں ہے مجھے اس گھر میں رہنے کا۔ جا رہی ہوں میں۔ تم کو بیٹی مبارک ہو۔" معراج بیگم نہایت جذبات میں آ کر سارے رشتے ناتے ختم کر کے واپس ہو لی۔

"پاپا پلیز مما کو روک لو۔ وہ جا رہی ہیں۔" مہک نے اپنے پاپا کو جھنجوڑ سا دیا۔

"پاگل ہو گئی ہے تمہاری مما۔ جانے دو اسے۔ اس کا دماغ اکثر خراب ہو جاتا ہے۔ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہے یہ۔ خود ہی آ جائے گی۔" باپ نے بیٹی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ اپنے کمرے تک آتے آتے جذبات میں بھری معراج بیگم کا ہائی بلڈ پریشر حد سے بڑھ گیا۔ وہ چکرا کر چوکھٹ پر ہی گر گئی۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ ماہ)

طرفہ تماشہ

مہتاب خان

انتقام کا لفظ ذہن میں آتے ہی دکھ، تکلیف اور پریشانیوں کا تصور چھم سے سامنے آجاتا ہے، لیکن یہ روداد ہے ایسے انتقام کی جسے پڑھ کر آپ بے ساختہ مسکرادیں گے۔

معروف قلم کار مہتاب خان کی تحریر نئے افق قارئین کے لیے بطور خاص

وہ لوگ میری اس بات سے سو فیصد اتفاق کریں گے جو اپنے گھر میں منتوں مرادوں سے پیدا ہوئے۔ اکلوتی نرینہ اولاد ہیں کہ صرف نفرت ہی انسان کے لیے تکلیف دہ نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات حد سے بڑھی ہوئی محبت اور بے جا کا لاڈ و پیار بھی اتنا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

میرے گھر کے قابل احترام خواتین نے یہ دن دکھایا ہے کہ آج میں اپنے دوستوں جو میرے کزنز بھی ہیں کے آگے دل کی بات کہنے پر مجبور ہوگیا اور دوستوں کے آگے سچ بولنے میں ایسا کچھ مضائقہ بھی نہیں تھا۔

"اسے تمہارا ای میل ایڈریس کیسے پتا چلا؟" اس قسم کا احمقانہ سوال اسفند عرف انّی ہی کرسکتا ہے۔

"تیرے موٹے دماغ میں بھیجا ہے کہ نہیں، بالوں کے ساتھ کیا عقل بھی رخصت ہوگئی۔ وہ اس کے گھر کا فون نمبر اس کا موبائل نمبر گھر کی اور ذاتی زندگی کی ہر بات یہاں تک کہ اس کا نک نیم تک جانتی ہے۔ اس کے لیے ای میل ایڈریس معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے۔" فراز نے اسفند کو گھرکا۔

نک نیم کے لفظ سے مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری دکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو مگر بات چونکہ میرے حق میں ہورہی تھی اس لیے احتجاج نہ کرسکا۔ میں اپنی مشکل اور اپنے درد والم کا ٹھیک ٹھاک اندازہ دوستوں کو کروانے کے لیے کمپیوٹر آن کرکے کرسی پر بیٹھ گیا۔ چاروں میرے گرد جمع تھے، ان دل جلانے والی ای میلز کو پڑھنے کے لیے جو میں انہیں پڑھوانا چاہ رہا تھا۔ میں سائن ان ہوچکا تھا پہلے کی میلز تو میں ڈیلیٹ کرچکا تھا جو تازہ بہ تازہ آج ہی پہنچی تھی وہ سب بڑی شان سے میرے ان باکس میں موجود تھیں۔

چیکو کا بچپن یہ پہلی میل کی ہیڈ لائن تھی۔ تفصیلات بھی اس سے کچھ کم نہیں تھیں، بڑی صفائی اور ذہانت سے ایک مشہور شاعر کی مشہور نظم پر ہاتھ صاف کیا گیا تھا۔ دوسری میل کھولی تو ٹی وی کے ایک اشتہار کو اس ظالم نے اپنے الفاظ کا کامیابی سے جامہ پہنایا تھا۔ مجھے غصہ میں کرسی سے اٹھتا دیکھ کر نعمان عرف نومی نے مجھے دوبارہ کرسی پر بٹھایا اور خود دوسری میلز کھولنے لگا۔

"لگتا ہے خاتون ٹی وی بڑے شوق سے دیکھتی ہیں۔" وہ میل پر نظر دوڑاتا ہوا بولا۔

"شعر و شاعری کا بھی بہت شوق لگتا ہے محترمہ کو۔"

"لاکھ پردوں میں چھپائے چیکو خود کو
یہ بھید کھولتی ہے شاعری سچ بولتی ہے"

وہ بلند آواز سے میل پڑھنے لگا۔ شاعرانہ بکواس سے مزین یہ ایک طویل نظم تھی جس کا عنوان جلی حروف میں انڈر لائن کیا ہوا تھا۔ نیچے نظم بے حد طویل تھی جسے ہم سب دوست مل کر پڑھ رہے تھے۔

"ابے یہ دیکھ اس نے تو غالب کو بھی نہیں چھوڑا، یہ دیکھ غالب کی اتنی خوب صورت غزل کا کیا بیڑا غرق کیا ہے۔ غالب اپنی شاعری کا یہ حشر دیکھتے تو خودکشی کرلیتے۔" سب کو مجھ سے زیادہ غالب کی غزل کی پڑی ہوئی تھی۔

"چپ بیٹھو آگے پڑھو کیا لکھا ہے۔" محمود نے نوشی کو دھموکا جڑا۔

میں مونیٹر کے ساتھ گاہے بگاہے اپنے دوستوں کی طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ سب کے چہروں پر سنجیدگی مگر آنکھوں میں ہنسی صاف نظر آرہی تھی یہ نئی ای میل میں نے خود ابھی پڑھی تھی میرا خون کھول رہا تھا نظریں غیض و غضب کے عالم میں مونیٹر کو گھور رہی تھیں۔

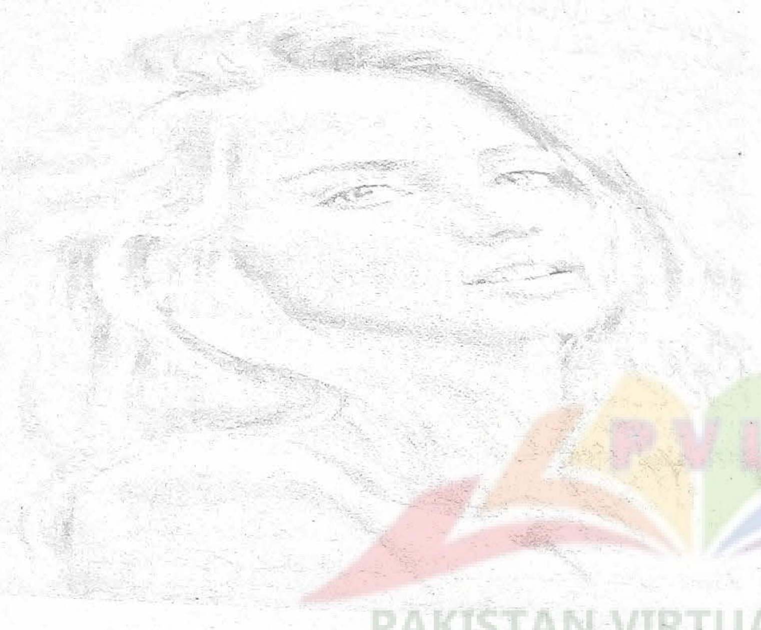

"اسے تو تیرا سب کچا چٹھا معلوم ہے عثمان!" مودی (محمود) میری ناراضی کی پروا کیے بغیر بولا۔ غم و غصہ سے پاگل ہوتا میں دانت کچکچا رہا تھا۔

"یہ لڑکی ایک بار میرے سامنے آجائے۔" تمام دوست حق دوستی ادا کرنے کے لیے بامشکل اپنی ہنسی ضبط کررہے تھے۔

"کیا کررہے ہو تم؟" ہم سب نے یک زبان ہوکر انّی سے پوچھا جو مونیٹر کے آگے کرسی سنبھال چکا تھا۔

"اس کی بدتمیزی کا جواب بدتمیزی سے دے رہا ہوں، خود کو بڑا چیمپئن سمجھتی ہے۔ ابھی انی کی شاعری نہیں دیکھی، اکبر الٰہ آبادی نے ایسی لڑکیوں کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔"

"میرے پیارے غصہ جانے دو، اس کی بے ہودہ ای میلز کا جواب دینے کا مسئلہ ہوتا تو یہ کام تو میں خود پہلے ہی کرچکا ہوتا۔ وہ مجھے چڑانا چاہتی ہے۔ اسے جواب دینے کا مطلب اسے یہ بتانا ہے کہ میں اس کی خواہش کے عین مطابق چڑ رہا ہوں، میں اسے یہ تسکین نہیں دوں گا کہ وہ مجھے چڑانے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔" انی میرے سمجھانے پر کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھ گیا۔

اب ہم سارے دوست کارپٹ پر آڑے ترچھے لیٹے خاموشی سے کوئی معقول طریقہ سوچنے لگے۔

"دوستو اس موقع پر اتنا غور و خوض کافی ہے یوں بھی ایک بات پر بہت دیر سوچنے سے ذہن الجھ جاتا ہے اور ویسے بھی ہم یہاں پڑھائی کے لیے جمع ہوئے تھے اس رنجیدہ و سنجیدہ فضا میں یوں بھی پڑھائی نہیں ہوسکتی، چلو ٹی وی دیکھتے ہیں۔" فراز جیسے پڑھائی کے چور سے اور کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ اس نے مودی کے گھورنے کی پروا کیے بغیر ٹی وی آن کردیا۔ ٹی وی پر وہی اشتہار آرہا تھا جو کچھ دیر پہلے میل پر پڑھا تھا، ہم سب دوستوں کا فلک شگاف قہقہے نے میرا موڈ جو ان ای میلز اور اپنی

خجالت کے سبب آف تھا از خود خوشگوار بنا دیا۔

آج میرا آف تھا، اس لیے ذرا بے فکری سے لمبی تان کے سوتے رہنے کے بعد دن بارہ بجے اٹھا نہا کر کمرے سے نکلا تو شامت اعمال پہلی ملاقات والد صاحب سے ہو گئی۔

"یا اللہ! یہ اس وقت گھر پر کیا کر رہے ہیں؟" میں اندر ہی اندر دہل گیا، پر کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے گھور کر سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"اتنی جلدی کیا تھی اٹھنے کی کچھ دیر اور سو لیتے۔"

"بس جی نیند پوری ہو گئی تھی۔" ڈھٹائی اور بے شرمی کے میرے اس مظاہرے نے انہیں طنز اور طعنوں سے براہ راست غصہ کی طرف آنے پر مجبور کر دیا۔

اکلوتی اولاد وہ بھی ناہنجار نالائق ایک ہی انڈہ وہ بھی گندہ جیسے نامعقول، ناقابل اشاعت اور ناقابل اعتراض الفاظ وہ اپنے فقروں میں استعمال کر رہے تھے۔

ابا کا تعلق آرمی سے تو نہیں مگر ہمارے گھر میں انہوں نے آرمی کے اصول وضوابط رائج کیے ہوئے ہیں۔ صبح فجر کے وقت سب اٹھ جاتے ہیں، رات نو بجے سونے کا وقت مقرر ہے یہاں تک کہ کھانے پینے کا وقت بھی مقرر ہے۔ ان اصولوں سے روگردانی کی ہمت کسی میں نہیں ہے۔

"کیا ہو گیا ہے آصف! ایک ہی بیٹا ہے کیوں ہر وقت بے چارے کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ مجال ہے جو کبھی شفقت اور محبت سے بیٹے سے بات کی ہو۔" دادی نے تند لہجے میں بیٹے کی خبر لی۔

"اکلوتا بیٹا ہے تو کیا سر پر بٹھا لوں، پہلے ہی آپ لوگوں کی دی شہ پر قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔"

"صبح صبح میرے بھتیجے کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، ابھی تو بچے نے ناشتا بھی نہیں کیا اور تم شروع ہو گئے۔" ابا کی بڑی بہن جو غیر شادی شدہ تھیں اور ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں، بگڑیں۔

"یہ صبح صبح ہے آپا! دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں۔" ابا دادی اور پھوپی کو آپس میں الجھتا چھوڑ کر میں ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا جہاں امی میرے لیے میری پسند کا گرم گرم ناشتا لیے موجود تھیں۔ میں اپنے آگے رکھے بہترین ناشتا سے لطف اندوز ہونے لگا۔ آج فراغت ملی ہے تو اچھے بچوں کی طرح دل لگا کر اور خوب جم کر پڑھائی کرنی ہے، اس نیک خیال پر عمل درآمد کرتے میں ٹائم ٹیبل بنانے لگا۔ دن بھر کیا کیا پڑھنا ہے اور کتنی کتنی دیر پڑھنا ہے، ابھی یہ کام ہونے نہ پایا تھا کہ امی کی بہن میمونہ خالہ اور ان کی بیٹی لیلیٰ ہمارے گھر آ گئیں۔

لیلیٰ میری نوعمری کے زمانے کی پہلی محبت جسے سوچ کر اب میں مسکرا دیتا ہوں۔ سولہ سال کی عمر میں جب مجھے خود سے تین سال بڑی لیلیٰ اچانک ہی بہت اچھی لگنے لگی تھی تب لگتا تھا کہ وہ نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔

وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور میں نالائق، وہ ان دنوں فرسٹ ائر میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی جب میں اس سے مدد لینے اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ اس کا گھر ہمارے پڑوس میں ہی تھا، میں اس کے عشق میں ڈوب چکا تھا اور وہ تھی کہ کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی تب ایک روز ہمت کر کے میں نے سرخ گلاب کا پھول جو اس کے ہی لان سے توڑا تھا، اس کی طرف بڑھا کر آئی لو یو بول دیا تھا۔ اس کا ردعمل بڑا ہتک آمیز تھا، پہلے وہ حیران ہوئی پھر زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔

"چیکو پہلے بڑے تو ہو جاؤ۔"

"میں بڑا ہو چکا ہوں، پورے سولہ سال تین ماہ کا ہوں۔"

"ہاں واقعی بڑے ہو گئے ہو مگر تم جتنے بھی بڑے ہو جاؤ مجھ سے تین سال چھوٹے ہی رہو گے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے اس کی مذاق اڑاتی آنکھوں کی پروا کیے بغیر کہا۔

"اس سے بہت فرق پڑتا ہے اور چلو اگر میں مان بھی لوں کہ اس سے فرق نہیں پڑتا تب بھی میرا آئیڈیل تم جیسا نالائق اور نکما لڑکا نہیں ہو سکتا۔ میں ڈاکٹر بنوں گی اور کسی ڈاکٹر ہی سے شادی کروں گی اور پڑھائی میں تم جتنے نکمے ہو، اسے دیکھ کر سوچا ہی نہیں جا سکتا کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکو گے۔"

اپنی پہلی معصوم سی محبت کی ناکامی پر میں اپنا سا منہ لے کر وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ لیلیٰ نے میرے اظہار محبت کی جس طرح دھجیاں بکھیری تھیں اس پر میں کئی دنوں تک سوگوار اور مغموم رہا تھا۔ ایک طویل عرصے تک میں اپنی محبت کی ناقدری اور اپنی ذلت ورسوائی پر اس سے سخت ناراض رہا تھا۔

"سمجھتی کیا ہے خود کو مجھے نکما اور نالائق کہتی ہے۔" ابا کی ڈانٹ ڈپٹ پڑھائی کے معاملے میں اتنا نہیں سدھار سکی جتنا ایک لڑکی کے توہین آمیز جملوں نے میری غیرت کو للکارا تھا۔

تب یہ جنون سا میرے اندر بھر گیا تھا کہ اب اسے کچھ بن کر دکھاؤں گا، یہ سب اسے نیچا دکھانے کے لیے تھا۔

خیر یہ قصہ جب کا ہے کہ جب عثمان عرف چیکو نادان تھا، سولہ سال کی عمر میں واقعی بچہ تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو پتا چلا میرے ارد گرد ہیر سوہنی شیریں لیلاؤں کا ایک جہاں آباد ہے۔ ان کے آگے تو یہ لیلیٰ کچھ بھی نہیں تھی تب اپنی نادانی پر ہنستے ہوئے میں نے لیلیٰ کے خلاف سارا بغض اور عناد دل سے نکال دیا تھا۔ میری اس سے خود ساختہ ناراضی ختم ہوئی تو خود بخود ہم اچھے دوست بن گئے۔

لیلیٰ نے کبھی بچپن کے اس واقعہ کا حوالہ نہیں دیا تھا تب مجھے لگتا کہ شاید وہ پرانی باتیں بھول ہی چکی ہے اس کا میڈیکل کالج میں یہ آخری سال تھا۔ چند ماہ میں وہ پاس آؤٹ کر جانے والی تھی۔

"آؤ چیکو یہاں اور سناؤ کیسے ہو؟ ابھی میں خالہ سے تمہارا ہی پوچھ رہی تھی۔" وہ مجھے دیکھ کر شرارتی انداز میں مسکرائی۔ امی، خالہ میمونہ اور دادی مسکرائی تھیں جبکہ چیکو کا لفظ سنتے ہی میرا موڈ آف ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بظاہر مسکرایا ایسی بھرپور مسکراہٹ جو اسے میرے چڑنے کا پتا نہ دے سکے۔ لیلیٰ سے گو کہ اب میرے دوستانہ مراسم تھے مگر اس کی شرارتی مسکراہٹ دیکھ کے میں چڑ بھی رہا تھا اور مشکوک بھی ہونے لگا تھا۔ ابھی مشکوک ہوئے کچھ دیر نہ گزری تھی کہ چچی اور قیس بھائی بھی ہمارے گھر آ گئے۔ یہ بچپن سے بڑے پڑھاکو قسم کے تھے، ان کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سب کچھ کتابیں تھیں۔ خیر سے امریکہ کے ایک اسپتال میں سرجن تھے، کچھ دن کے لیے پاکستان آئے تھے اور عنقریب واپس روانہ ہونے والے تھے

قیس ابو کے بہت فیورٹ تھے، محنتی، ذہنی، جینئس وہ انہیں نا جانے کون کون سے خطابات سے نوازتے تھے۔ امی، پھوپی اور دادی نے انہیں تعجب سے دیکھا بے حد مصروف رہنے والا یہ بندہ اپنے گھر والوں کو بھی بڑی مشکل سے ملا کرتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ کل شام ہی ہمارے گھر آئے تھے غالباً امریکہ روانگی کے حوالے سے ابو سے کوئی کام تھا۔ امی نے انہیں کھانے پر روک لیا تھا، رات کے کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر سے گئے تو مجھے یقین تھا کہ اب دو تین سال سے پہلے ان کی شکل دیکھنے کو نہیں ملے گی مگر حیرانی اور تعجب کی بات تھی کہ وہ اگلے ہی دن یعنی آج پھر ہمارے گھر میں موجود تھے۔

میری [illegible] روز روز آمد بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ ابھی میں [illegible] کہ ان سب کے جانے کے بعد امی نے یہ عقدہ کھولا کہ چچی قیس کے لیے ہماری پڑوسن عرشیہ کے ساتھ رشتے کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھیں، وہ امی کے ساتھ ان کے گھر قیس کا رشتہ لے جانا چاہتی تھیں۔

کل ہمارے گھر آمد پر چچی کو امی سے بریانی کی ترکیب پوچھتی عرشیہ اس قدر بھائی کہ انہوں نے اگلے ہی روز ہمارے گھر آ گئیں۔ میں عرشیہ کے حسن سے متاثر تو تھا مگر مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اپنے ہی گھر کے کچن، لاؤنج، ڈرائنگ روم میں میں اس کی موجودگی میں کسی ضرورت کے تحت چلا جاتا تو جھٹ ادھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتی جیسے میں کوئی اچکا لفنگا ہوں اور امی بعد میں "پتا بھی ہے کہ پردہ کرتی ہے پھر اس طرح منہ اٹھا کر کیوں گھسے" کہہ کر مجھے ڈانٹتیں۔ اپنے ہی گھر میں بندہ آزادی سے گھوم بھی نہ سکے صرف عرشیہ ہی کیا میں اب پڑوس میں مقیم اس پوری فیملی سے چڑنے لگا تھا۔ امی کو سوشل ورک کا بڑا شوق تھا ابتدا میں یہ پڑھائی کے بہانے ہمارے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔

اُف لڑکیوں نے آہستہ آہستہ اپنے قدم ہمارے گھر میں جما لیے تھے۔ عرشیہ کے ساتھ اس کی چھوٹی دو بہنوں کی دبے پاؤں آمد شروع ہو گئی تھی۔ جب بیٹیوں نے قدم جما لیے تو ان کی والدہ صاحب اور دادی کی بھی ہمارے گھر بے تکلف آمد ورفت شروع ہو گئی اور میں مفت کا ڈرائیور ان کے ہاتھ آ گیا۔ کبھی دادی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ تو کبھی کچھ لا دو۔

میرے گھر کی تینوں خواتین اس خاندان کی رانی رشید تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسی کیا ترکیب لڑاؤں کہ اس فیملی کا ہمارے گھر میں بے تحاشا آمد ورفت کا سلسلہ ختم ہو جائے اور مفت کی ملازمت سے جان چھوٹ جائے۔ بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہونے والی عرشیہ کا رشتہ اپنے کزن سے طے ہو جانے پر مجھے کیا پریشانی لاحق ہو سکتی تھی۔ ہاں البتہ میں اس بات پر حیران تھا کہ قیس جیسا قابل ڈاکٹر اور گھر داری کی شوقین میری پڑوسن جس کا تعلیمی ریکارڈ خاصا زبوں حالی کا شکار تھا میں اس زبوں حالی سے کافی عرصے سے آگاہ تھا۔

یہ آگاہی مجھے دراصل اس روز حاصل ہوئی تھی جب ایک روز امی اسے پڑھاتی نظر آئی تھیں، میں برابر والے کمرے میں

خجالت کے سبب آف تھا از خود خوشگوار بنا دیا۔

آج میرا آف تھا، اس لیے ذرا بے فکری سے لمبی تان کے سوتے رہنے کے بعد دن بارہ بجے اٹھا نہا کر کمرے سے نکلا تو شامت اعمال پہلی ملاقات والد صاحب سے ہوگئی۔

"یا اللہ! یہ اس وقت گھر پر کیا کررہے ہیں؟" میں اندر ہی اندر دہل گیا، پر کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے انہیں سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے گھور کر سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا پھر طنزیہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"اتنی جلدی کیا تھی اٹھنے کی کچھ دیر اور سو لیتے۔"

"بس جی نیند پوری ہوگئی تھی۔" ڈھٹائی اور بے شرمی کے میرے اس مظاہرے نے انہیں طنز اور طعنوں سے براہ راست غصہ کی طرف آنے پر مجبور کردیا۔

اکلوتی اولاد وہ بھی نانہجار، نالائق ایک ہی انڈہ وہ بھی گندہ جیسے نامعقول، ناقابل اشاعت اور ناقابل اعتراض الفاظ وہ اپنے فقروں میں استعمال کررہے تھے۔

ابا کا تعلق آرمی سے تو نہیں مگر ہمارے گھر میں انہوں نے آرمی کے اصول و ضوابط رائج کیے ہوئے ہیں۔ صبح فجر کے وقت سب اٹھ جاتے ہیں، رات نو بجے سونے کا وقت مقرر ہے یہاں تک کہ کھانے پینے کا وقت بھی مقرر ہے۔ ان اصولوں سے روگردانی کی ہمت کسی میں نہیں ہے۔

"کیا ہوگیا ہے آصف! ایک ہی بیٹا ہے کیوں ہر وقت بے چارے کے پیچھے پڑے رہتے ہو۔ مجال ہے جو کبھی شفقت اور محبت سے بیٹے سے بات کی ہو۔" دادی نے تند لہجے میں بیٹے کی خبر لی۔

"اکلوتا بیٹا ہے تو کیا سر پر بٹھالوں، پہلے ہی آپ لوگوں کی دی شہ پر قابو سے باہر ہوتا جارہا ہے۔"

"صبح صبح میرے بھتیجے کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، ابھی تو بچے نے ناشتا بھی نہیں کیا اور تم شروع ہوگئے۔" ابا کی بڑی بہن جو غیر شادی شدہ تھیں اور ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں، بگڑیں۔

"یہ صبح صبح ہے آپا! دوپہر کے بارہ بج رہے ہیں۔" ابا، دادی اور پھوپی کو آپس میں الجھتا چھوڑ کر میں ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا جہاں امی میرے لیے میری پسند کا گرم گرم ناشتا لیے موجود تھیں۔ میں اپنے آگے رکھے بہترین ناشتا سے لطف اندوز ہونے لگا۔ آج فراغت ملی ہے تو اچھے بچوں کی طرح دل لگا کر اور خوب جم کر پڑھائی کرنی ہے، اس نیک خیال پر عمل درآمد کرتے میں ٹائم ٹیبل بنانے لگا۔ دن بھر کیا کیا پڑھنا ہے اور کتنی کتنی دیر پڑھنا ہے، ابھی یہ کام ہونے نہ پایا تھا کہ امی کی بہن میمونہ خالہ اور ان کی بیٹی لیلیٰ ہمارے گھر آ گئیں۔

لیلیٰ میری نوعمری کے زمانے کی پہلی محبت جسے سوچ کر اب میں مسکرا دیتا ہوں۔ سولہ سال کی عمر میں جب مجھے خود سے تین سال بڑی لیلیٰ اچانک ہی بہت اچھی لگنے لگی تھی تب لگتا تھا کہ وہ نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔

وہ پڑھائی میں بہت اچھی تھی اور میں نالائق، وہ ان دنوں فرسٹ ائر میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی جب میں اس سے مدد لینے اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ اس کا گھر ہمارے پڑوس میں ہی تھا، میں اس کے عشق میں ڈوب چکا تھا اور وہ تھی کہ کچھ سمجھتی ہی نہیں تھی تب ایک روز ہمت کرکے میں نے سرخ گلاب کا پھول جو اس کے ہی لان سے توڑا تھا، اس کی طرف بڑھا کر آئی لو یو بول دیا تھا۔ اس کا ردعمل بڑا اہتک آمیز تھا، پہلے وہ حیران ہوئی پھر زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔

"چیکو پہلے بڑے تو ہو جاؤ۔"

"میں بڑا ہو چکا ہوں، پورے سولہ سال تین ماہ کا ہوں۔"

"ہاں واقعی بڑے ہوگئے ہو مگر تم جتنے بھی بڑے ہو جاؤ مجھ سے تین سال چھوٹے ہی رہو گے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میں نے اس کی مذاق اڑاتی آنکھوں کی پروا کیے بغیر کہا۔

"اس سے بہت فرق پڑتا ہے اور چلو اگر میں مان بھی لوں کہ اس سے فرق نہیں پڑتا تب بھی میرا آئیڈیل تم جیسا نالائق اور نکما لڑکا نہیں ہوسکتا۔ میں ڈاکٹر بنوں گی اور کسی ڈاکٹر ہی سے شادی کروں گی اور پڑھائی میں تم جتنے نکمے ہو اسے دیکھ کر سوچا ہی نہیں جاسکتا کہ تم اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکو گے۔"

اپنی پہلی معصوم سی محبت کی ناکامی پر میں اپنا سا منہ لے کر وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ لیلیٰ نے میرے اظہار محبت کی جس طرح دھجیاں بکھیری تھیں اس پر میں کئی دنوں تک سوگوار اور مغموم رہا تھا۔ ایک طویل عرصے تک میں اپنی محبت کی ناقدری اور اپنی ذلت و رسوائی پر اس سے سخت ناراض رہا تھا۔

"سمجھتی کیا ہے خود کو مجھے نکما اور نالائق کہتی ہے۔" ابا کی ڈانٹ ڈپٹ پڑھائی کے معاملے میں اتنا نہیں سدھار سکی جتنا ایک لڑکی کے توہین آمیز جملوں نے میری غیرت کو للکارا تھا۔

تب یہ جنون سا میرے اندر بھر گیا تھا کہ اب اسے کچھ بن کر دکھاؤں گا یہ سب اسے نیچا دکھانے کے لیے تھا۔

خیر یہ قصہ جب کا ہے کہ جب عثمان عرف چیکو نادان تھا، سولہ سال کی عمر میں میں واقعی بچہ تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو پتا چلا میرے اردگرد ہیر سوہنی شیریں لیلاؤں کا ایک جہاں آباد ہے۔ ان کے آگے تو یہ لیلیٰ کچھ بھی نہیں تھی تب اپنی نادانی پر ہنستے ہوئے میں نے لیلیٰ کے خلاف سارا بغض اور عناد دل سے نکال دیا تھا۔ میری اس سے خود ساختہ ناراضی ختم ہوئی تو خود بخود ہم اچھے دوست بن گئے۔

لیلیٰ نے کبھی بچپن کے اس واقعہ کا حوالہ نہیں دیا تھا تب مجھے لگتا کہ شاید وہ پرانی باتیں بھول ہی چکی ہے اس کا میڈیکل کالج میں یہ آخری سال تھا۔ چند ماہ میں وہ پاس آؤٹ کر جانے والی تھی۔

"آؤ چیکو یہاں اور سناؤ کیسے ہو؟ ابھی میں خالہ سے تمہارا ہی پوچھ رہی تھی۔" وہ مجھے دیکھ کر شرارتی انداز میں مسکرائی۔

امی، خالہ میمونہ اور دادی مسکرائی تھیں جبکہ چیکو کا لفظ سنتے ہی میرا موڈ آف ہوگیا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بظاہر مسکرایا۔ ایسی بھرپور مسکراہٹ جو اسے میرے چڑنے کا پتا نہ دے سکے۔ لیلیٰ سے گو کہ اب میرے دوستانہ مراسم تھے مگر اس کی شرارتی مسکراہٹ دیکھ کے میں چڑ بھی رہا تھا اور مشکوک بھی ہونے لگا تھا۔ ابھی مشکوک ہوئے کچھ دیر نہ گزری تھی کہ چچی اور قیس بھائی بھی ہمارے گھر آ گئے۔ یہ بچپن سے بڑے بڑھاکو قسم کے تھے، ان کا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا سب کچھ کتابیں تھیں۔ خیر سے امریکہ کے ایک اسپتال میں سرجن تھے، کچھ دن کے لیے پاکستان آئے تھے اور عنقریب واپس روانہ ہونے والے تھے

قیس ابو کے بہت فیورٹ تھے محنتی، ذہنی، جینئس وہ انہیں نا جانے کون کون سے خطابات سے نوازتے تھے۔ امی، پھوپی اور دادی نے انہیں تعجب سے دیکھا بے حد مصروف رہنے والا یہ بندہ اپنے گھر والوں کو بھی بڑی مشکل سے ملا کرتا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد وہ کل شام ہی ہمارے گھر آئے تھے غالباً امریکہ روانگی کے حوالے سے ابو سے کوئی کام تھا امی نے انہیں کھانے پر روک لیا تھا، رات کے کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر سے گئے تو مجھے یقین تھا کہ اب دو تین سال سے پہلے ان کی شکل دیکھنے کو نہیں ملے گی مگر حیرانی اور تعجب کی بات تھی کہ وہ اگلے ہی دن یعنی آج پھر ہمارے گھر میں موجود تھے۔

میری پھپھی کس لیے روز روز آمد بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ ابھی میں غور بھی نہ کر پایا کہ ان سب کے جانے کے بعد امی نے یہ عقدہ کھولا کہ چچی قیس کے لیے ہماری پڑوسن عرشیہ کے ساتھ رشتے کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھیں، وہ امی کے ساتھ ان کے گھر قیس کا رشتہ لے جانا چاہتی تھیں۔

کل ہمارے گھر آمد پر چچی کو امی سے بریانی کی ترکیب پوچھتی عرشیہ اس قدر بھائی کہ انہوں نے اگلے ہی روز ہمارے گھر آ گئیں۔ میں عرشیہ کے حسن سے متاثر تو تھا مگر مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اپنے ہی گھر کے کچن، لاؤنج، ڈرائنگ روم میں میں اس کی موجودگی میں کسی ضرورت کے تحت چلا جاتا تو جھٹ ادھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتی جیسے میں کوئی اچکا لفنگا ہوں اور امی بعد میں "پتا بھی ہے کہ پردہ کرتی ہے پھر اس طرح منہ اٹھا کر کیوں گھسے" کہہ کر مجھے ڈانٹتیں۔ اپنے ہی گھر میں بندہ آزادی سے گھوم بھی نہ سکے صرف عرشیہ ہی کیا میں اب پڑوس میں مقیم اس پوری فیملی سے چڑنے لگا تھا۔ امی کو سوشل ورک کا بڑا شوق تھا ابتدا میں یہ پڑھائی کے بہانے ہمارے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔

ان لڑکیوں نے آہستہ آہستہ اپنے قدم ہمارے گھر میں جما لیے تھے۔ عرشیہ کے ساتھ اس کی چھوٹی دو بہنوں کی دبے پاؤں آمد شروع ہوگئی تھی۔ جب بیٹیوں نے قدم جما لیے تو ان کی والدہ صاحب اور دادی نی بھی ہمارے گھر بے تکلف آمدورفت شروع ہوگئی اور میں مفت کا ڈرائیور ان کے ہاتھ آ گیا۔ کبھی دادی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ تو کبھی کچھ لادو۔

میرے گھر کی تینوں خواتین اس خاندان کی رانی رشید تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسی کیا ترکیب لڑاؤں کہ اس فیملی کا ہمارے گھر میں بے تحاشہ آمدورفت کا سلسلہ ختم ہو جائے اور مفت کی ملازمت سے جان چھوٹ جائے۔ بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہونے والی عرشیہ کا رشتہ اپنے کزن سے طے ہو جانے پر مجھے کیا پریشانی لاحق ہو سکتی تھی۔ ہاں البتہ میں اس بات پر حیران تھا کہ قیس جیسا قابل ڈاکٹر اور گھر داری کی شوقین میری پڑوسن جس کا تعلیمی ریکارڈ خاصا زبوں حالی کا شکار تھا میں اس زبوں حالی سے کافی عرصے سے آگاہ تھا۔

یہ آگاہی مجھے دراصل اس روز حاصل ہوئی تھی جب ایک روز امی اسے پڑھاتی نظر آئی تھیں، میں برابر والے کمرے میں

کمپیوٹر پر اپنا کام بھی کر رہا تھا اور اس طرف کا منظر بھی درمیانی کھڑکی کھلی ہونے کی وجہ سے نظر آ رہا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اس فیملی سے کوئی پرخاش نہیں ہوئی تھی۔ امی کچھ دیر اس سے اس کے بی اے کے مضامین پر گفتگو کرتی رہیں پھر کتابیں کھل گئیں۔ امی اسے ہسٹری پڑھا رہی تھیں، میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ کچھ دیر پہلے اچھی خاصی چاق و چوبند اور فریش نظر آنے والی عرشیہ فقط دس پندرہ منٹ کی پڑھائی کے بعد ہی بے حد تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آنکھیں نیند کے بوجھ سے بند ہوئی جا رہی تھیں، ہر اگلے سیکنڈ منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی روکی جا رہی تھی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کا تاریخی پس منظر بیان کرتے امی جرمنی کی تاریخ بیان کر رہی تھیں کہ آئن اسٹائن کا ذکر شروع کیا کہ اپنے ہی ملک میں اس کی قدر نہیں ہوئی، محترمہ نے بمشکل جمائی روکتے ہوئے نیند میں ڈوبی آواز میں پوچھا۔

"آنٹی! یہ آئن اسٹائن شاعر تھا۔" اس معصومانہ سوال پر غالباً امی کا اپنا سر پیٹنے کو دل چاہا ہوگا اور رہا میں تو مجھے اسی ایک جملے سے اس کا بیوٹی ود آؤٹ برین کا پتا چل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں کچن میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ دیر پہلے جو محترمہ کتابیں سامنے پھیلائے لمبی لمبی جمائیاں لے رہی تھی۔ اب بالکل فریش اور چاق و چوبند امی سے خدا جانے کون کون سے کھانے بنانا سیکھ رہی تھی۔ یہ نظارہ دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ یہ دھکے کھاتی بمشکل بی اے پارٹ ون تک پہنچ گئی ہے مگر آگے پڑھنا مشکل ہے۔

پڑھائی سے جی چرانے والی عرشیہ شادی کی بے حد شوقین تھی اس کا اندازہ مجھے ایک روز ان کے گھر جانے پر ہوا جہاں وہ میری آمد سے بے خبر اپنی سہیلیوں کے ساتھ لان میں بیٹھی گپ شپ کر رہی تھی۔

"عرشیہ کا تو لگتا ہے بی اے سے پہلے بیاہ کا خیال ہے۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر کاش ایسا ہو جائے۔ یہ پڑھائی وڑھائی ہم سے نہیں ہوتی اور پھر زیادہ پڑھ کر کرنا بھی کیا ہے، گھر داری سنبھالنے کے لیے اتنی تعلیم کافی ہے۔" عرشیہ نے اپنی سہیلی کی بات کا جواب بڑی حسرت اور شدت سے دیا تھا۔

اس واقعہ کا چشم دید گواہ ہونے کے سبب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی اور ڈاکٹر صاحب کی نبھے گی کیسے؟ خیر کسی کی شادی کسی سے ہو مجھے غرض لیکن نہیں جناب مجھے غرض ہے ناں وجہ

وہی میری والدہ، پھوپی اور دادی جان اور ان تینوں کا اس سلسلے کی وجہ سے پڑوسیوں کی طرف ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا التفات گوکہ ابھی رشتے کی بات چھیڑی نہیں گئی تھی اور اس التفات کا سب سے زیادہ میں شکار ہو رہا تھا۔

ہماری گاڑی پانی سے نہیں پیٹرول سے چلتی تھی اور میں مفت کا ڈرائیور ان کی خدمت کو حاضر تھا۔ بچیوں کو بازار جانا ہو یا دادی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوتا، مجھے بلایا جاتا تھا۔ ان کے ابا، بھائی، چاچا، ماما سب مصروف رہتے تھے، فارغ اور بے کار تو بس ایک میں ہی تھا اسی کی تاویلیوں میں سے جلتا، کڑھتا رہتا تھا۔

اس دن صبح سویرے ناشتے کی ٹیبل پر ہم سب گھر والے بمع والد صاحب کے بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ دو پراٹھے میں کھا چکا تھا کہ دادی نے تیسرا پراٹھا میرے تنومند چھ فٹ ایک انچ قد کے مالک بقول میرے دوستوں کے خوبرو نوجوان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو تو بچہ پورے دن کچھ نہیں کھاتا، آگ لگے ایسی پڑھائی کو۔ چیکو! خوب ڈٹ کر ناشتا کرو، کتنے کمزور ہو رہے ہو۔" ابا نے چونک کر انہیں دیکھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی، سکینہ (ملازمہ) نے فون اٹھایا کچھ دیر کسی سے بات کی اور کہا۔

"چیکو بیٹا! آپ کا فون ہے، کوئی لڑکی ہے۔" سب نے بے یقین نظروں سے مجھے گھورا، جیسے ہی میں نے ہیلو کہا وہی منحوس آواز میرا منہ چڑا رہی تھی۔

"چیکو باہر بہت سردی ہے، سویٹر پہن کر جانا کہیں زکام نہ ہو جائے۔" میں نے غصہ سے فون پٹخ دیا، واپس ٹیبل پر پہنچا تو ابا کی خشمگیں نگاہیں مجھے بدکردار ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں کہ پھوپی بول پڑیں۔

"کس کا فون تھا؟"

"پتا نہیں، بات نہیں کی اس نے شاید رانگ نمبر تھا۔" میرا پارہ ہائی ہوتا جا رہا تھا کہ دادی بولیں۔

"چیکو باہر بہت سردی ہے، سویٹر پہن کر جانا کہیں زکام نہ ہو جائے۔"

"نہیں پہننا مجھے سویٹر۔" میرا دماغ بھک سے اڑ گیا اور میں پاؤں پٹختا یونیورسٹی روانہ ہو گیا۔

آج مجھے کچھ فراغت ملی تو اپنے کئی روز سے التوا میں پڑے کام نمٹانے کا ارادہ کیا تھا جن میں سر فہرست اردو بازار سے کچھ کتابوں وغیرہ کی خریداری کے لیے جانا تھا۔ سیٹی پر اپنے پسندیدہ

گانے کی دھن بجاتا میں تولیے سے سر رگڑتا ہوا باتھ روم سے نکلا۔ گیلا تولیہ کرسی پر اچھال کر ابھی میں نے بال بنانے کے لیے برش اٹھایا ہی تھا کہ ادھ کھلے دروازے سے سکینہ اندر آ گئیں۔

"آپ اردو بازار جا رہے ہیں نا۔"

"ہاں تو پھر؟" صبح ناشتے کے وقت امی سے اردو بازار جانے کا ذکر کر رہا تھا شاید اس وقت انہوں نے سن لیا ہوگا۔

"عرشیہ بی بی کو کچھ ضروری کتابیں چاہئیں، یہاں آس پاس دکانوں پر نہیں مل رہیں، بے چاری پریشان ہو رہی تھیں، میں نے بتایا کہ آپ جا رہے ہیں اپنی کتابیں لینے، ان بے چاری کی بھی کتابیں لا دیں۔" بے چاری کا لفظ جملے میں کئی بار بے دریغ استعمال کرتے اپنی بات مکمل کر لینے کے بعد سکینہ مٹھی میں دبا ایک کاغذ کھولتی میری طرف بڑھا کے کھڑی تھی۔

ابھی میں غصے میں کھڑا لسٹ کو گھور ہی رہا تھا کہ میرا موبائل بجا، میں غصہ میں تو تھا ہی میں نے دہاڑتے ہوئے لہجے میں ہیلو کہا۔

"آپ کے بیٹے نے پہلی بار بابا کہا۔" کچھ اٹھلاتے ہوئے وہ شوخ سے انداز میں بولی۔

"کیا بکواس ہے۔" ٹی وی پر چلنے والے اشتہارات سے جتنی خار میں کھانے لگا تھا ایسے میں یہ جملہ مجھے جلا کر راکھ کر گیا۔ اس وقت میرا انتقامی جذبہ عروج پر تھا۔ سکینہ کے جاتے ہی میں نے وہی نمبر ڈائل کیا جس سے اس ظالم نے فون کیا تھا۔

"ہالو!" کافی دیر تک کھانسنے کے بعد کسی بزرگ کی آواز آئی۔

"آپ کے فون سے ابھی ابھی کسی خاتون نے مجھے فون کیا تھا۔"

"کس نے فون کیا تھا؟" وہ شاید اونچا سنتے تھے۔

"خاتون نے...... لڑکی نے......" میں جھلا کر بولا۔

"باؤلے تو نہیں ہوگئے میاں، یہاں کوئی خاتون نہیں۔"

"اچھا محترم یہ تو بتا دیں آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟"

"تمہارے باوا کے گھر سے۔" بزرگ فون بند کر چکے تھے۔

"عثمان میں تم سے صبح سے کہہ رہی ہوں مراد صاحب کی امی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ، کتنی مرتبہ فون کر کے تمہارا پوچھ چکی ہیں، بخار ہے بے چاری کو۔" امی میرے کمرے میں آ کر ذرا خفگی اور حکمیہ انداز سے بولیں۔ ایک امی ہی تھیں جو مجھے میرے اصلی نام سے پکارتی تھیں۔

"ایک میں ہی ہوں ان کا مفت کا ڈرائیور۔" میں نے چڑ کر امی کو جواب دیا۔

"بُری بات ہے بیٹا! دوسروں کے کام آنا چاہیے اور ویسے بھی اب ان لوگوں سے رشتہ جڑنے جا رہا ہے، پرسوں تمہاری چچی آ رہی ہیں قیس اور عرشیہ کے رشتے کی بات کرنے۔"

"ہم اس دنیا میں دوسروں کی خدمت کے لیے آئے ہیں اور دوسرے ہم سے خدمت لینے کے لیے۔" ناراضی سے بولتا میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنے گیٹ سے نکل کر میں سیدھا برابر والے گیٹ میں گھس گیا، مراد منزل کا گیٹ ہمہ وقت چوپٹ کھلا رہتا تھا۔ دن دہاڑے چوریاں ہو رہی تھیں، ڈاکے پڑ رہے تھے۔ شہر کے حالات ابتر تھے مگر اس مچھلی بازار کو کوئی سروکار نہیں تھا، جتنے گھر میں افراد رہتے تھے اتنے ہی افراد ہر وقت مہمانوں کی صورت موجود رہتے تھے۔ اس رشک اور بھگدڑ میں آپ کون ہیں؟ کس لیے آئے ہیں؟ اور کس سے ملنے آئے ہیں۔ یہ جاننے کی کسی کے پاس فرصت نہیں ہوتی تھی، یہاں آنے والا اپنی مدد آپ کے تحت اپنی مطلوبہ شخصیت کو باقاعدہ ڈھونڈ کر ان سے شرف ملاقات حاصل کرتا تھا۔

میں اس خیال سے یہاں آیا تھا کہ اگر دادی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگی تو ڈاکٹر کو ان کے گھر لے آؤں گا۔ بہرحال میں بچتا بچاتا دادی محترمہ کے کمرے تک بلا آخر پہنچ گیا یہ کمرہ کیونکہ گھر کے شروع کے حصہ میں ہے اس لیے مجھے زیادہ مشقت نہیں اٹھانا پڑی۔ ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، میں گلا کھنکار کے اندر داخل ہوا ہی چاہتا تھا کہ ان کے کمرے میں صوفہ پر براجمان سر جوڑ کر بیٹھی عرشیہ اور اس کی دو بہنوں کو دیکھا۔ دادی بیڈ پر سر تک کمبل اوڑھے سو رہی تھیں، ان تینوں کی میری طرف پیٹھ تھی۔ قبل اس کے کہ میں شائستگی اور تہذیب کا مظاہرہ کرتا اور انہیں اپنی موجودگی سے آگاہ کرتا۔ میرے کانوں میں عرشیہ کی آواز گونجی جو بہت بدلی ہوئی تھی۔

"ہیلو مجھے عثمان صاحب سے بات کرنی ہے۔"

میں جہاں تھا وہیں کا وہیں رہ گیا، مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا زمین اور آسمان اپنی جگہ سے ہلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے جو میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور کان سن رہے تھے اگر جو میں اپنے دوستوں کے مشورے پر عمل

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

کرتے ہوئے مشکوک لڑکیوں کی فہرست تیار کرتا تو عرشیہ کو کبھی اس میں شامل نہ کرتا۔

میری مجرم میرے سامنے بیٹھی تھی شکر ہوا کہ جوش اور غصہ میں آ کر میں لیلیٰ یا دوسری کزنز سے کچھ کہہ نہیں بیٹھا ورنہ میرے متعلق جو کچھ انہیں نہیں معلوم تھا وہ سب میں خود اپنے منہ نہیں بتا کر اپنے لیے ایک نئی مصیبت مول لے بیٹھتا اور لیلیٰ کے سامنے تو میرا پچھلا ریکارڈ ویسے ہی مشکوک تھا۔

عرشیہ کے ہاتھوں میں موبائل تھا' گھر سے فون یقیناً سکینہ نے اٹھایا تھا' آواز جس مہارت سے بدلی گئی تھی وہ سکینہ ہرگز نہیں پہچان سکتی تھی۔ اس نے ضرور ہولڈ کرنے کا کہا تھا اور اب انہیں ہولڈ کروا کر میرے کمرے میں گئی ہوگی' میں ان تینوں بہنوں کے عین پیچھے کھڑا انہیں اپنا ہی انتظار کرتا دیکھ رہا تھا۔

"آ گیا...... آ گیا......" وہ یقیناً سکینہ کے واپس فون کے قریب کی آواز کو میرے قدموں کی آواز سمجھ کر جوش سے بولی۔

میں بے آواز چلتا ہوا آہستہ آہستہ ان تینوں کے بالکل سامنے آ کھڑا ہو گیا اور ہیلو بولا۔ موبائل کان سے لگائے وہ اتنی عقل رکھتی تھی کہ اپنے سامنے سے ابھرتی آواز اور موبائل سے آتی آواز میں فرق کر سکے۔ اپنی بہنوں کی طرف گھمائی گردن اس نے سیدھی کی تو نظریں مجھ سے ٹکرائیں' اب دھک سے رہ جانے کی باری اس کی تھی میں جس کی اس وقت اپنے گھر میں موجودگی کا یقیناً پتا نہیں تھا۔ گھبراہٹ' بوکھلاہٹ' پریشانی' شرمندگی اور ندامت جیسے تاثرات اس کے چہرے پر ابھرے اس کی بہنیں بھی اس وقت تک مجھے دیکھ چکی تھیں۔

"آپ بات کریں۔" میں بے فکری اور بے نیازی سے بولتا پاس ہی رکھی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

میری خوش قسمتی کے میں محبوب کو پکڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا' وہ ہو گیا تھا جو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مجھے پریشان کرنے والی' میرا مذاق اڑانے والی یہ گستاخ اور بدتمیز عرشیہ اپنی اصلیت ظاہر ہو جانے پر شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔

"آ...... آپ......؟" بمشکل اس کے منہ سے آپ کا لفظ بہت اٹکتے ہوئے نکلا۔

"جی میں نے سوچا کہ مجھ سے بات کرنے کے لیے آپ کو اتنا تردد نہ کرنا پڑے میں خود جا کر مل لیتا ہوں' بائی دا وے میں عثمان ہوں۔" جسے یہ گمان اور خوش فہمی تھی کہ وہ کبھی پکڑی نہیں جائے گی۔ اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا اور شرمندہ ہوتے دیکھنا ایک بڑا دلفریب اور خوشگوار منظر تھا۔

"کرن تمہارے دادا کا موبائل نہیں مل رہا' سارا گھر چھان مارا' ذرا ڈھونڈنے میں میرا ساتھ دو۔" باہر سے ہی بولتی آنٹی رشیدہ اچانک ہی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"ارے عثمان تم۔" بچیوں سے مخاطب ہوتے ہی ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں نے اٹھ کر انہیں باادب سلام عرض کیا اور اپنے آنے کی وجہ یعنی دادی جان کے بخار کا ذکر کیا۔ اس دوران دادا جی کا موبائل عرشیہ کے ہاتھوں سے چھوٹی بہنوں کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ اپنی والدہ کی نگاہوں سے بچتے ہوئے دونوں بہنیں موبائل سمیت کمرے سے کھسک لی تھیں۔ رہ گئی عرشیہ جو التجا آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی کہ میں اس کی والدہ کے سامنے پول نہ کھول دوں۔

آنٹی رشیدہ نے بتایا کہ دادی کا بخار کافی حد تک کم ہو چکا ہے فی الحال ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے' میں آنٹی سے رخصت لیتا اپنے گھر لوٹ آیا۔

اپنے دشمن کو میں نے معاف نہیں کیا تھا' اب یہی دیکھ لیں اس وقت وہ کہیں میں اس کے گھر والوں کو کچھ بتا نہ دوں کہ خوف کا شکار دہشت سے یقیناً اندر ہی اندر دہل رہی تھی۔ عین اس وقت میں ایک منصوبہ کو حتمی شکل دے لینے کے بعد اپنی گاڑی باہر نکال رہا تھا' میرے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا' میرا رخ چچی جان کے گھر کی طرف تھا۔

حصول علم اور آزادی نسواں پر ابتدائی کلاسوں سے رٹے گئے جملے شکر ہے کہ وہ سب میرے حافظہ میں محفوظ تھے جو بروقت اور صحیح موقع پر کام آ گئے۔ قیس بھائی کے سامنے بیٹھا میں ایک مقرر کی طرح جوشیلے انداز میں بول رہا تھا۔

ایک لڑکی جو ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی اور ابھی شادی کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی' اسے حصول علم کا بے حد شوق تھا' اپنے ان خوابوں کو ٹوٹا دیکھ کر وہ کسی قدر صدمہ میں ہے۔ میں شہنشا جذبات بنا قدرے جذباتی آواز میں انہیں بتا رہا تھا۔ "وہ دوران تعلیم شادی کی زنجیروں میں نہیں جکڑنا چاہتی" جذباتی تقریر کا میں نے جذباتی انداز میں اختتام کیا۔

"اور قیس بھائی چچی کو شادی کا فائدہ دیا جا سکتا مگر کیا آپ کی بھی قریب کی نظر خراب ہے۔"

"کیا مطلب؟" انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا۔

"آپ کو خاندان میں کوئی لڑکی نظر نہیں آئی شادی کے لیے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

"لیلیٰ کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"یار تمہیں تو پتا ہے میں ان سب معاملوں سے کتنی دور رہتا ہوں' میں امریکا میں مزید تنہا نہیں رہنا چاہتا تھا اس لیے شادی کی ہامی بھری تھی۔"

"تو عرشیہ آپ کو پسند نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"عرشیہ کو امی نے پسند کیا ہے میں نے تو اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں۔"

"بس تو پھر بات ختم' میں چچی جان کو سمجھا دوں گا کہ اب رشتہ عرشیہ کے لیے نہیں بلکہ لیلیٰ کے لیے جائے گا۔" میں نے پرجوش انداز میں بات ختم کی۔

علم' عقیدت اور محبت کے لفظوں پر بمشکل لب بھینچ کر میں اپنی مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔ میری چشم تصور میں کسی کی لمبی لمبی جمائیاں اور نیند سے بند ہوتی آنکھیں آ رہی تھیں۔ میں وہاں سے اٹھ کر چچی جان کے پاس آ گیا حسب توقع انہیں منانا آسان ثابت ہوا' باقی انہیں لیلیٰ کے قائل کرنے کا کام امی پر چھوڑ کر میں وہاں سے گھر آ گیا۔ اس تخریبی ذہانت رکھنے والی لڑکی کو تعمیر کی طرف لانے کا میں نے تہیہ کر لیا تھا۔

ان دنوں حالات کچھ یوں ہیں کہ لیلیٰ اور قیس کی شادی ہو چکی ہے اور دونوں بہت خوش ہیں۔ میں امی کو قائل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں کہ وہ عرشیہ کو اپنی بہو بنا لیں لیکن فی الحال میں صرف منگنی کرنا چاہتا ہوں' شادی عرشیہ کے ایم اے ہو جانے کے بعد ہوگی۔ دادی اماں اور پھوپو دونوں کی نظر سے دیکھا کرتے تھے نہ سکھ کا سانس لیا ہے۔

ہماری منگنی کے بعد عرشیہ کا ہمارے گھر آنا جانا تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ دادی اور امی اکثر اس موضوع پر اظہار خیال کرتی نظر آتی ہیں کہ عرشیہ پڑھائی میں بے حد مصروف ہو گئی ہے بے چاری کے امتحان سر پر ہیں کہاں روز نئی نئی ڈشیں پکاتی اور سیکھی جاتی تھیں اور کہاں اب سر پر امتحان کی تلوار ہے' بی اے کے بعد ایم اے کا عذاب ہے۔ چوبیس گھنٹے کتابیں ہیں اور رٹے لگائے جا رہے ہیں۔ سریلے گیتوں کی جگہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب رٹے جا رہے ہیں۔ میں ان دل خراش نظاروں کو دیکھ تو نہیں پاتا مگر دیکھے بغیر بھی کتابوں میں سر دیئے جمائیاں [illegible] کا مفاد [illegible] انتقام ہے جس میں دراصل اس ہی [illegible] شاعری کا شوق رکھنے والی ایک اچھی خاصی ذہین لڑکی' اپنی ذہانت کا تخریبی انداز میں استعمال کر رہی تھی۔ میں نے اس کی تخریبی ذہانت کو تعمیر کی طرف لگا دیا ہے۔ رہا قیس تو قیس کو اس کی ہم مزاج اور ہم خیال بیوی مل گئی۔

ابھی کل ہی کی بات ہے میں کہیں جانے کے لیے گاڑی نکال رہا تھا جب اپنی وین کا انتظار کرتی عرشیہ سے میرا سامنا ہوا تھا۔ وین کا انتظار بھی ہو رہا تھا اور ہاتھ میں پکڑی کسی کتاب سے رٹے بھی لگائے جا رہے تھے۔ آنکھیں ویسے ہی سرخ اور نیند سے بھری نظر آ رہی تھیں' مجھ پر نظر پڑی تو منہ دوسری طرف پھیر لیا تب اس کے ہی پسندیدہ شغل پر عمل کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھے بغیر بے پروائی اور بے نیازی سے اس کے قریب پہنچ کر اونچی آواز سے گنگنایا۔

ایک ہی چاہت ایک ہی خواہش
پڑھی لکھی ہو بیگم ہماری

ایک ضروری بات تو میں بتانا بھول گیا یعنی دادی' پھوپی اور امی کا حد سے بڑھا ہوا لاڈ پیار اور مجھے چھوٹے بچوں کی طرح ٹریٹ کرنا تو جناب مجھے اس تکلیف دہ رویہ سے اسی دن نجات مل گئی جس دن اس کا فون دادی نے اٹھایا اور اس نے میرا نام لے کر کوئی گستاخی کی تھی۔ اسی دن دادی نے گھر کی خواتین کی میٹنگ بلائی اور فیصلہ سنایا کہ اب چیکو بڑا ہو گیا ہے اس لیے آئے گئے کے آگے اس کی عزت کا پاس رکھنا ضروری ہے۔ جانے کون لڑکی تھی جو ان کے لاڈلے پوتے کا مذاق اڑا رہی تھی۔

اس روز کے بعد میری دنیا ہی بدل گئی' اپنی دشمن سے مجھے چاہے جتنی شکایتیں ہوں بہرحال یہ کریڈٹ میں اسے ضرور دوں گا کہ جو کام میری التجائیں اور فریادیں نہ کر سکیں وہ اس کے مذاق نے کر دیا۔ خیر اس کا بدلہ میں اس بے پڑھی لکھی لڑکی کو تعلیم کی راہ پر لگا کر اتار ہی چکا ہوں جب تک میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا عرشیہ بھی ایم اے کر لے گی۔

عزت

خلیل جبار

لڑکیوں کی چڑھتی جوانی سیلابی ریلے کی مانند ہوتی ہے جو جہاں راستہ ملے بہتی چلی جاتی ہے اور ہر رکاوٹ کو جوانی کے نشے میں توڑتی یا اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔

ایک نوجوان لڑکی کا المیہ' وہ نو عمری میں شادی کی خواہش مند تھی۔

میری جب اطہر پر پہلی نظر پڑی تو میں سحر زدہ سی ہوگئی۔ اس سے نظریں ملنے پر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں نے بے شمار لڑکوں کو دیکھا تھا کبھی ایسا نہیں ہوا تھا جیسا آج ہو رہا تھا۔

میرے جذبات میں ہل چل مچ گئی تھی۔ میں اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی مگر کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ میری سہیلی نورین کا بھائی تھا اور کسی کام سے نورین کے کمرے میں آیا تھا۔ ان کا گھر کسی حویلی سے کم نہ تھا۔ میں جب پہلی بار ان کے گھر گئی تو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

نورین کا گھر اتنا شاندار بنا ہوا تھا کہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ گھر شہداد پور میں ہے۔

اطہر کے جانے پر نورین نے مجھے بتایا کہ وہ اس کا بھائی ہے۔ بے اختیار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس گھر میں دلہن بن کر آ جاؤں۔ یہاں میری قدر ہوگی۔ مالی طور مستحکم ہونے کے سبب وہ میری ہر جائز نا جائز خواہش پوری کر کے دے گا۔

اطہر کے والد کاشف احمد اور اس کے بڑے بھائی ریحان نے کاروبار سنبھالا ہوا تھا۔ اطہر بھی ان کی مدد کی غرض سے کچھ وقت دکان پر دے رہا تھا۔ نورین کی شادی کے بعد کاشف احمد کا جو کچھ بھی تھا وہ ان دونوں بھائیوں کا ہی تھا۔

میرا تعلق اندورن سندھ کے شہر شہداد پور سے ہے۔ میں لوہار پاڑے میں کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔ میں خود کو جوان تصور کرتی ہوں۔ مگر میرے والدین مجھے ابھی تک بچی ہی سمجھتے ہیں۔

فلم اور ڈرامے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک بات سما گئی تھی کہ عورت کے عیش کے دن شادی کے بعد ہی شروع ہوتے ہیں۔

شوہر کی حیثیت بیوی کے لیے ایک بینک کی سی ہے۔ جو بیوی کی ہر خواہش پوری کر دیتا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں ایسے ہی نہیں آ گئی تھی۔

اس کی مثال گھر میں ہی موجود تھی۔ میرے دونوں بھائی رمضان اور عبدالکریم سرکاری ملازم تھے۔ اور وہ اپنی بیویوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ادھر ان کے منہ سے فرمائش نکلی ادھر پوری ہوئی۔ جب کہ اس کے برعکس غیر شادی شدہ لڑکیوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر رکھا جاتا ہے۔

یہ سب دیکھ کر میرے دل میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح لڑکیاں ہی ہیں۔ شادی ہو کر ان کو کون سے سرخاب کے پر لگ گئے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی ان جیسا سلوک کیا جانا چاہیئے۔ ہمارے ساتھ کیوں سوتیلا رویہ روا رکھا جاتا ہے۔

ہمارے جسم میں بھی دل ہے۔ ہمارا بھی من کرتا ہے مختلف خواہشات کو۔ کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ ہماری خواہشات کا احترام کرتے ہوئے انہیں فوری پورا کیا جانا چاہیئے۔ اس میں بھی کسی ٹال مٹول سے کام نہیں لیا جانا چاہیئے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ نندوں کا بھابیوں سے حسد اور رقابت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ان کے خلاف سازش کرتی تیار کرتی ہیں کہ انہیں کس طرح نیچا دکھایا جائے اور کبھی کسی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔

ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رجحان نہیں تھا۔ میری ضد کے آگے مجبور ہو کر میرے والد میر حسن نے کالج میں داخلہ دلایا تھا۔

میرا ایڈمیشن ہونے پر گھر میں میرے پڑھنے کی شدید مخالفت ہوئی تھی۔ میری دونوں بہنوں ثناء اور بینش کو بھی میٹرک کرتے ہی گھر میں بٹھا لیا گیا تھا۔

کالج میں داخلہ مل جانے پر میں خود کو خوش نصیب تصور کرنے لگی تھی۔ ہمارے خاندان میں کسی لڑکی نے میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہیں کی ہے اور میرے زیادہ تعلیم حاصل کرنے سے میری عزت و توقیر میں ضرور اضافہ ہو جائے گا۔

اطہر سے اس دن میری آنکھ کیا لڑی وہ بھی میری قربت حاصل کرنے کی جستجو میں لگ گیا تھا۔ اب جب بھی میں نورین سے ملنے اس کے گھر جاتی اطہر بہانے بہانے سے اس کے کمرے میں کئی چکر لگا لیتا۔

میں خود بھی محسوس کر رہی تھی کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اسی بناء پر میں اس کی حوصلہ افزائی کرنے کو اس سے بات چیت کر لیا کرتی تھی۔ نورین کی موجودگی میں اس سے کھل کر بات نہیں ہو پاتی تھی۔ اس لیے میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دے دیا۔ وہ میرا موبائل نمبر لے کر ایسا خوش ہوا کہ جیسے اس کی کوئی لاٹری کھل گئی ہو۔

اطہر نے جب مجھ سے پہلی بار موبائل پر بات چیت کی تو وہ ڈرا ڈرا سا محسوس ہوا۔

''اطہر خیریت ہے نا کچھ ڈرے ڈرے لگ رہے ہو۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں زندگی میں پہلی بار کسی لڑکی سے فون پر بات کر رہا ہوں اس لیے خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' اطہر نے کہا۔

''میں بھی پہلی بار کسی لڑکے سے بات کر رہی ہوں مگر مجھے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آہستہ آہستہ یہ خوف بھی ختم ہو جائے گا۔''

"آنٹیوں سے کیوں؟" اطہر نے چونک کر کہا۔

"وہ لڑکی سمجھ کر موبائل پر دوستی کرتے ہیں پھر ملاقات ہونے پر پتا چلتا ہے کہ وہ لڑکی نہیں آنٹی ہے۔" میں نے زور دار قہقہہ لگایا۔

"سلمی اتنا زور سے مت ہنسو ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" میں نے پوچھا

"بھئی کوئی ہماری بات چیت سن نہ لے اور تمہیں موبائل پر بات چیت کرنے سے روک دیا جائے گا۔"

"اطہر یہ کیسی باتیں کررہے ہو کسی کو کیا پتا چلے گا کہ میں اطہر سے بات کررہی ہوں۔ گھر والے یہی سمجھیں گے میں اپنی کسی سہیلی سے بات کررہی ہوں۔" میں نے کہا۔

"سلمی صاحبہ تم جو بات چیت میں میرا نام استعمال کررہی ہو اس سے انہیں شک ہوجائے گا۔"

"اوہ! ہاں اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا، میں آئندہ کوشش کروں گی کہ تمہارا نام استعمال نہ کروں۔" میں نے اس کی بات کی تائید کی۔

"غیر ضروری قہقہے لگانے سے بھی پرہیز کرنا ورنہ گھر والوں کے دل میں شکوک پیدا ہوجائیں گے۔"

"تم بہت احتیاط پسند ہو، اچھی بات ہے انسان محتاط پسندی کی وجہ سے بڑی پریشانی سے بچ جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

اطہر سے موبائل پر بات کیا ہوئی پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ کسی دن اگر ہم دونوں کی بات کسی وجہ سے نہ ہو پاتی تو مجھے وہ دن عجیب سے لگتا تھا۔

موبائل سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ ہم دونوں کی محبت کے بارے میں کسی کو کچھ خبر نہ ہوسکی۔

انٹر کے امتحان ختم ہونے پر میں بالکل فارغ تھی۔ کوئی مصروفیت بھی نہیں تھی۔ ایسے میں میرا زیادہ وقت اطہر سے بات چیت کرنے میں گزرنے لگا تھا۔

اطہر کی زبانی ہی مجھے یہ علم ہوا کہ اس کے بھائی کی شادی کو مشکل سے دو سال ہوئے ہیں۔ اور ابھی اطہر کی شادی کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔

ادھر میرے گھر میں بھی بھائیوں کی شادی ہونے کہ بعد میری بہنوں کی شادی کا نمبر تھا۔ مگر ان کی شادیوں کا دور دور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

ایسے میں میری شادی کہاں سے ہوگی۔ اپنی بہنوں سے زیادہ مجھے اپنی شادی کا شوق تھا۔ اور یہ شوق مجھے جلد پورا ہوتے نظر نہیں آرہا تھا۔

میں نے شادی کے لیے اطہر پر زور ڈالنا شروع کردیا کہ وہ اپنے والدین سے بات کرے۔ اور ہمارے گھر رشتے کا پیغام بھیجے۔ جب میرا زیادہ زور اطہر پر پڑا تو ایک دن اس نے عجیب بات کردی۔

"سلمی تم سمجھدار لڑکی ہو جب تم مجھ پر شادی کے لیے زور ڈالتی ہو مجھے ایسا لگتا ہے کہ کوئی ضدی بچی ایسے کھلونے کی ضد کررہا ہے جو اسے فوری نہیں مل سکتا۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔" میں حیرانی سے بولی۔

"تمہاری دو بہنیں جوان ہیں۔ میں کسی طرح اپنے والدین کو تیار بھی کرلوں تو تمہارے گھر والے میری شادی تمہاری بڑی بہنوں میں سے کسی ایک کے ساتھ کرنے کو ترجیح دیں گے۔ اور میں کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ محبت تم سے کروں اور شادی تمہاری بہن سے کروں۔"

"میں بھی ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔" میں نے کہا۔

"میں بھی ایسا نہیں چاہتا اسی لیے چاہتا ہوں کہ شادی تاخیر سے ہو۔"

"اطہر ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ ہم دونوں کی شادی جلدی ہوجائے۔ مجھ سے اب دوری برداشت نہیں ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"سلمی ایک صورت ہے۔ اس میں ہمارے گھر والے وقتی طور پر ہم سے ناراض ہوجائیں گے۔ پھر کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ ہمیں اپنالیں گے۔"

"کیا واقعی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کورٹ میرج کے ذریعے ہم ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔"

"یہ انتہائی خطرناک قدم ہوگا۔ میرے بھائی ہم دونوں کے خون کے پیاسے بن جائیں گے۔" میں نے خوف سے جھرجھری لی۔

"زمانہ بدل گیا ہے اب لوگ کورٹ میرج کرنے والوں کو اس لیے قتل نہیں کرسکتے۔ کیونکہ کورٹ میرج کرنے والے پریمی جوڑے کو حکومت کی طرف سے قانونی تحفظ حاصل ہے۔"

"اور ہم کورٹ میرج کرکے اپنے شہر میں ہی رہنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ بلکہ پنجاب چلے جائیں گے۔" جب دیکھیں گے کہ ہمارے والدین کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا ہے۔ ہم واپس اپنے شہر آجائیں گے۔" اطہر نے کہا۔

"مجھے یہ تصور کرکے ہی خوف آرہا ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ صبر سے کام لو اس کے علاوہ ہمارے لیے کوئی اور چارہ نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

اطہر کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ یہ انتہائی خطرناک اقدام تھا۔ اور مجھ جیسی کمزور لڑکی جس نے شادی کے بعد عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے سپنے دیکھے تھے۔ وہ بھلا اتنا خطرناک راستہ کیسے اپنا سکتی تھی۔

کئی دن گزر جانے پر میں نے پھر اطہر سے شادی کے لیے زور نہیں دیا۔ اور نہ ہی اس نے مجھ سے بات کی۔

وہ بھی سمجھ گیا تھا کہ میں ڈر گئی ہوں اور ایسا کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی جس سے زمانہ ہمارا دشمن ہوجائے۔

دو ہفتے گزر گئے۔ میں اطہر سے موبائل پر روزانہ ہی بات کرتی تھی۔ مگر کورٹ میرج کے حوالے سے بات کرنے کی ہمت نہ کرپارہی تھی۔ میرے ذہن پر پھر شادی کا بھوت سوار ہونے لگا تھا اور میں نے پھر دوران گفتگو شادی پر زور دینا شروع کردیا۔

"سلمی میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ اتنا آسان نہیں ہے تم خود سوچو۔ کبھی ایسا ہوا ہے کہ بڑی بیٹی کو چھوڑ کر چھوٹی بیٹی کی شادی کردی جائے۔ مجھے کوئی ایسی مثال بتادو۔" اطہر نے غصے میں کہا۔

"نہیں میں نے ابھی تک ایسی کوئی مثال اپنی برادری سمیت کہیں بھی نہیں دیکھی ہے۔ لیکن زور دے کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تمہارے کہنے پر رشتے کے لیے اپنے والدین کو بھجوادیتا ہوں اور اگر تمہارے والدین نے تمہاری بڑی بہن سے رشتہ کردیا تو پھر مجھے کچھ نہ کہنا۔ کیونکہ بڑوں کی بات سمجھ لو وہ پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔" "میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"

"ہاں سمجھ رہی ہوں اسی لیے پریشان ہوں۔ اگر تمہاری شادی میری بہن سے ہوجائے گی تو میں خودکشی کرلوں گی۔" میں نے دھمکی دی۔

"اور میں نہیں چاہتا کہ تم خودکشی کرو، اسی لیے تمہیں صبر کرنے کی تلقین کررہا ہوں۔"

"مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔ میری بہنوں کی عمریں نکلی جارہی ہیں اور گھر والوں کو ان کی شادی کی کوئی فکر نہیں ہے۔" میں نے غصے میں کہا۔

"وہ ان کی شادی کیوں نہیں کردیتے۔" اطہر نے پوچھا۔

"بس میرے والدین کی فرمائش ہے کہ میری بہنوں کے لیے کسی بڑے افسر کا رشتہ آئے تا کہ وہ شادی کے بعد سسرال میں جا کر راج کریں۔"

"تم خود سوچ لو جب تمہارے والدین تمہاری بہنوں کی خاطر افسران کے رشتوں کے متلاشی ہیں پھر وہ کس طرح چاہیں گے کہ تمہاری شادی مجھ سے ہو۔ وہ تمہاری شادی بھی کسی سرکاری افسر سے ہی کرنا چاہیں گے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔ یہ میں نے سوچا ہی نہیں کے وہ میری تمہارے ساتھ شادی کیونکر کردے گے۔"

اطہر کی بات پر میں سوچ میں پر گئی۔

"سلمی مجھے اتنی جلدی نہیں ہے۔ تم خوب اچھی طرح سوچ لو، کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو یا اپنے والدین کی خواہش کا احترام کرو گی۔" اطہر نے کہا۔

میں عشق میں اتنی اندھی ہوگئی تھی کہ میں ہر حالت میں شادی کرکے اپنا گھر بسانے کا خواب دیکھ رہی تھی اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے میں اطہر کو پاکر ہی رہوگی۔

چاہے اس کے لیے مجھے کورٹ میرج ہی کیوں نہ کرنا پڑے اور پھر میری رضامندی پر ہم دونوں کورٹ میں پیش ہوگئے۔

میں نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرادیا۔

اس بیان کی بنیاد پر میں نے اطہر سے نکاح کرلیا۔ اور اپنا شہر چھوڑ کر لاہور آگئے تھے۔

دو تین دن اچھے گزرے پھر اطہر نے اپنی اوقات دکھانی شروع کردی۔ اس نے میرے لیے ہوٹل سے کھانا لانا بند کردیا۔ کھانے کے وقت وہ مجھے داتا دربار پر لے جاتا۔ خود بھی لنگر لوٹتا اور مجھے بھی لنگر لوٹنے پر مجبور کرتا۔

ایک دو بار مجھے شرم آئی مگر بھوک بڑی ظالم شے ہے۔ وہ انسان کو وہ کچھ کرنے پر مجبور کردیتی ہے جو اس کا دل کرنے کو نہ

چاہیے۔ میں جب بھی اس کے عمل پر احتجاج کرتی تو وہ مجھے پیار سے سمجھاتا۔

"سلمیٰ میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ ہم ہوٹل کا بل ادا کریں اور کھانے پینے پر خوب خرچ کریں۔"

"ہوٹل کا کرایہ ہم نہیں بچا سکتے۔ ہاں کھانے پینے کا بچا سکتے ہیں وہ ہم خرچہ بچا رہے ہیں۔ پتا نہیں ہمیں کتنے دن یہاں رکنا پڑ جائے۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ ہوٹل کا کرایہ کسی صورت میں بچ نہیں سکتا تھا۔

"تمہیں زیادہ پیسے لانے چاہیئے تھے۔" میں کہتی۔

"پرائے شہر میں کتنے ہی زیادہ پیسے لے آؤ کم پڑ جاتے ہیں۔"

"پھر مجھے خرچ کے لیے اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں جو میں بینک میں جمع کر لیتا اور ایسے وقت میں انہیں کام میں لے آتا۔"

میں اس کی بات پر لاجواب ہو جاتی۔

کئی دن گزر جانے پر میں داتا دربار پر لنگر لوٹ کر کھانے کی عادی ہو گئی تھی۔ اگرچہ فقیروں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی پھر بھی میں لنگر لوٹنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں اس طرح بھی لنگر سے اپنی بھوک مٹایا کروں گی۔ کوئی رشتے دار مجھے اس طرح اپنی بھوک مٹاتا دیکھ لے تو میں مارے شرم کے زمین میں گڑھ جاؤں گی۔

میں نے کیا کیا ارمان دیکھے تھے۔ شادی ہوگی میں اپنے میاں سے ضد کر کے ہنی مون کے لیے پاکستان کے مختلف تفریحی علاقوں کی سیر کو جاؤں گی۔ اور پھر اپنی سہیلیوں اور رشتے داروں پر رعب جمانے کو خوب بڑھا چڑھا کر ہنی مون پر جانے کے واقعات سناؤں گی۔

مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ میرے سارے ارمان دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔

آج صبح جب لنگر تقسیم ہو رہا تھا۔ میں دیر سے پہنچی تھی اور میں لنگر کھانے سے محروم ہو گئی تھی۔ دوپہر میں بھوک سے میرا برا حال تھا۔

لنگر تقسیم ہونے پر میں تیزی سے آگے بڑھی۔ میرے ہاتھ میں جیسے ہی تھیلی آئی۔ ایک فقیر نے مجھ سے چھین لی۔ مجھے اس کی حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اور میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ میں اس پر جھپٹ پڑی۔ میں نے گھونسوں سے اس فقیر کا منہ بگاڑ دینا چاہتی تھی۔

میں صبح سے بھوکی تھی اوپر سے اس نے میرے ہاتھ آئی تھیلی چھین لی تھی۔

ہمیں لڑتا دیکھ کر دوسرے لوگ بیچ بچاؤ کرنے آ گئے تھے۔ میں اسے کسی صورت چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اس کا مار مار کر بھرکس نکال دینا چاہتی تھی۔

اچانک اطہر سخت غصے میں میری طرف بڑھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔

"کیوں اپنا اور میرا مذاق بنوانے پر تلی ہوئی ہو۔"

"اس نے میری تھیلی چھین لی ہے۔"

"تم اور لے لو۔"

"میں صبح سے بھوکی مر رہی ہوں اور تم اس فقیرنی کی طرف داری کر رہے ہو۔"

"میں بھی صبح سے بھوکا ہوں، مگر میں تمہاری طرح باؤلا کتا نہیں بن رہا۔ لو یہ تھیلی پکڑ لو میں اور لے آتا ہوں۔"

اطہر غصے میں اپنی تھیلی مجھے دے کر آگے بڑھ گیا۔

مجھے اطہر کا رویہ بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ میرا دل چاہا کہ وہ تھیلی پھینک دوں۔ بھوک اتنی شدت سے لگ رہی تھی کہ میں نے تھیلی کو پھینکنے کے بجائے بریانی کھانے لگی۔

اطہر بھی تھیلی لے آیا اور میرے پاس بیٹھ کر ہی بریانی کھانے لگا۔ مجھے اس پر شدید غصہ تھا اس نے میرا ساتھ دینے کے بجائے فقیرنی کا ساتھ دیا تھا۔ اطہر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور جان بوجھ کر میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔

"سلمیٰ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں۔ ہمیں لوگوں سے اس طرح لڑنا جھگڑنا نہیں چاہیئے۔ اس طرح ہمارے پیچھے پولیس لگ جائے گی۔"

"پولیس کیا فقیرنی کے باپ دادا ہیں جو ہمارے پیچھے لگ جائے گی۔" میں بدستور غصے میں تھی۔

"ہمارے شہر کی پولیس ہماری تلاش میں ہے۔ تمہارے والدین نے میرے خلاف زنا کی نیت سے تمہیں اغواء کرنے کی ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔ اور پولیس میری تلاش میں ہے۔"

"اس لیے میں اپنا موبائل بھی آن نہیں کر سکتا۔ ورنہ موبائل استعمال کرنے پر پولیس کو پتا چل جائے گا کہ ہم کہاں پر ہیں۔"

"اگر تم اس طرح فقیرنیوں سے لڑائی جھگڑا کرو گی۔ تو

ہیں توجہ میں آئے گی۔ اور وہ ہم سے تفتیش کرے گی۔ تفتیش کرنے پر جب انہیں پتا چلے گا کہ ہم شہداد پور سے آئے ہوئے ہیں وہ یقیناً ہم پر یہی شک کرے گی کہ ہم گھر سے بھاگے ہوئے ہیں۔"

"پولیس اپنے شک کو دور کرنے کے لیے شہداد پور کی پولیس سے رابطہ کرے گی اور وہاں سے اس بات کی تصدیق ہو جائے گی کہ ہم گھر سے بھاگے ہوئے ہیں اور ہم گرفتار ہو جائیں گے۔" اطہر نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

مجھے سخت غصہ تھا۔ وہ بات ٹھیک کر رہا تھا۔ مگر میں اس کی بات کو سمجھنے کو تیار نہ تھی۔

"اچھا ہے پولیس پکڑ لے۔ کم از کم اس طرح فقیروں کی طرح زندگی گزارنے سے نجات مل جائے گی۔" میں نے کہا۔

"سلمیٰ دماغ سے سوچو، دل سے نہیں سوچو۔" اطہر نے کہا۔

"دماغ سے کیا خاک سوچوں، ہر وقت بریانی کھا کھا کر میری حالت خراب ہو گئی ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ سوائے شرمندگی کے۔"

"تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" اطہر کو بھی غصہ آ گیا؟

"یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ فقیروں کی طرح لنگر لوٹ کر کھائیں۔"

"ہزاروں سفید پوش اسی طرح لنگر لوٹ کر زندگی گزار رہے ہیں؟"

"گزار رہے ہوں مگر مجھے یہ پسند نہیں ہے۔"

"پھر تم کیا چاہتی ہو؟"

"جب ہم کرائے پر ہوٹل میں رہ سکتے ہیں پھر کھانا خرید کر کیوں نہیں کھا سکتے اپنے پیسوں سے انسان ہر قسم کا کھانا کھا سکتا ہے۔ لنگر میں روز بریانی کھانے کو مل رہی ہے بار بار ایک ہی چیز کھانے سے جی اکتا جاتا ہے۔"

"ہاں کھا سکتے ہیں مگر پیسے کون دے گا کیا تمہارا باپ یہاں پیسے دینے آئے گا۔" وہ غصے سے بولا۔

"تم دو گے اور کون دے گا۔"

"میرے پاس اتنے فالتو پیسے نہیں کہ ہوٹل کا کرایہ بھی دوں اور کھانے کے اخراجات بھی اٹھاؤں۔" اس نے غصے سے مجھے گھورا۔

ہوں تم کھانے پینے کے اخراجات کون کرے گا۔"

"میں نے تمہیں سمجھایا بھی تھا کہ میں فی الحال شادی کی پوزیشن میں نہیں ہوں مگر محض تمہاری ضد کی وجہ سے یہ پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے گھر سے بے گھر ہو گیا ہوں، گھر کا کھانا کھانے کے بجائے لنگر کا کھانا کھانا پڑ رہا ہے۔"

"یہ محض چند روز کی پریشانی ہے جب ہمارے گھر والوں کے دل میں تمہارے لیے نرم گوشہ ہو جائے گا ہم واپس گھر چلے جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم اس خوش فہمی میں نہیں رہنا۔ تمہارے گھر والے ہم دونوں کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ وہ ہم دونوں کے خون کے پیاسے بنے ہوئے ہیں جیسے ہی ہمارا ان سے سامنا ہوا گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔" اطہر نے کہا۔

"میں اپنے والدین کو جانتی ہوں وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے وقتی طور پر جذبات میں آ کر وہ ایسی باتیں کر رہے ہیں جس سے محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔"

"اپنے گھر پر اچھی بھلی زندگی گزار رہا تھا، خواہ مخواہ تمہارے چکر میں آ کر میں نے اپنی زندگی خراب کر لی۔" اطہر نے غصے سے کہا۔

"میں تو جیسے عیش کر رہی ہوں، شرم کرو میں تمہاری بیوی ہوں کیا یہ اچھی بات ہے کہ میں لنگر پر گزارا کروں۔"

"میں کون سا مرغ مسلم کھا رہا ہوں جو تمہیں کھانے کو نہیں مل رہا۔ جو تم کھاتی ہو میں بھی وہی کھاتا ہوں۔"

"اطہر میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے گھر والوں سے بات کرو ان کے راضی ہو جانے پر ہم سکون سے اپنے گھر میں رہ سکیں گے۔" میں نے اپنے لہجے میں نرمی پیدا کی۔

"میرے گھر والے بھی میرے اس اقدام سے خوش نہیں ہیں وہ بہت غصے میں ہیں۔ جب تک ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا وہ کسی صورت میں ہمیں گھر میں رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے۔"

"تم نے گھر والوں سے رابطہ بھی نہیں کیا اور خوامخواہ ان کے نام سے ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

"تم سمجھ رہی ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں میں جھوٹا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرے بالوں کو پکڑ کر زور

سے جھٹکا دیا۔ "کمینی تیری وجہ سے میں گھر سے بے گھر ہو گیا ہوں گھر والوں کی نظر میں الگ گر گیا ہوں پھر تو مجھے جھوٹا سمجھ رہی ہے۔"

"اطہر...... چھوڑو میرے بال لوگ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تماشا نہ بناؤ۔" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

وہاں موجود لوگوں کی اطہر کے میرے بال پکڑنے پر توجہ اسی طرف ہو گئی تھی اور وہ منتظر تھے اب جو تماشا شروع ہونے والا ہے اسے دلچسپی کے ساتھ دیکھیں اطہر نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر میرے سر کے بال چھوڑ دیے۔ رات کو میں جب بیڈ پر لیٹی مجھے اپنا گھر شدت سے یاد آ رہا تھا۔ کتنی اچھی زندگی گزر رہی تھی جب بھوک لگتی تھی کھانے کو کھانا مل جاتا تھا۔ پہننے کو اچھے کپڑے مل جاتے تھے کسی قسم کی کوئی فکر نہ تھی شدت غم سے میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"یہ آنسو کیوں بہا رہی ہو؟" اطہر نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

"گھر یاد آ رہا ہے۔"

"کیوں؟"

"گھر انسان کو کیوں یاد آتا ہے گھر میں سکون ملتا ہے۔"

"تم سے کس نے کہا تھا کہ اپنا سکون برباد کرو، تمہیں ہی شادی کا شوق چڑھا تھا۔ نا شادی کرتیں اور نہ تمہارا سکون برباد ہوتا۔"

"اطہر تم میرے زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکتے تو ان زخموں پر نمک بھی مت چھڑکو۔"

"میں کب تمہارے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہوں، میں صرف تمہیں یاد دلا رہا ہوں یہ جو مصیبت تم پر آئی ہے وہ خود تم نے مول لی ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے کیا سمجھیں۔" اطہر نے اپنے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

"گھر سے بھاگ کر شادی کرنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟"

"یہ بھی میں نے اس وجہ سے دیا تھا کہ تم بضد تھیں کہ میں تم سے شادی کرلوں۔ ایسا اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ ہم گھر سے بھاگ کر شادی کر لیں۔"

"ہاں اس میں میرا ہی قصور ہے تم تو فرشتہ صفت انسان ہو۔" میں نے جل کر کہا۔

"جب تم میں اتنا حوصلہ نہیں تھا۔ حالات سے مقابلہ کرنے کا تو میری رکھیل بن جاتیں۔ دونوں مزے کرتے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔"

"تمیز سے بات کرو، مجھ سے ایسی باتیں کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"اچھا تو مجھے عقل و تمیز سکھائے گی حرام زادی۔" یہ کہہ کر اطہر نے مجھے زور سے بیڈ سے دھکا دے دیا۔

"یہ تم مجھ سے کیسا برتاؤ کر رہے ہو، کیا اپنی بیویوں کو اسی طرح بیڈ سے دھکا دیا جاتا ہے۔"

"غلطی میری ہے جو تم میری جان کو اٹک گئی ہو، ورنہ تم جیسی لڑکیوں کو رکھیل بنا کر رکھنا ہی مردوں کے حق میں بہتر ہوتا ہے جب تک جی چاہے کھیلو، جب دل چاہے چھوڑ دو۔"

"مجھے تمہیں سمجھنے میں غلطی ہو گئی۔ کاش میں تمہیں وقت سے پہلے پہچان لیتی۔"

"غلطی تم سے نہیں مجھ سے ہوئی ہے جو نکاح کر لیا۔ میں تمہیں بغیر نکاح کے یہاں لے آتا تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ کسی بھی وقت تمہیں یہاں چھوڑ کر فرار ہو جاتا پھر تمہیں پتا چلتا۔"

"کہ تم کتنے کمینے ہو۔" مجھے بھی غصہ آ گیا۔

"اپنی زبان کو لگام دے ورنہ تیری زبان کو گدی سے کھینچ کر الگ کر دوں گا۔" اطہر غصے سے دہاڑا۔

"میرے عورت ہونے کا تم ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

"جب میں تم سے کوئی بات کر رہا ہوں اس کا مطلب یہی ہے کہ میں نے کسی سے رابطہ کیا ہے جبھی بات کر رہا ہوں ورنہ مجھے کیسے پتا چلتا کہ تمہارے گھر والے ہمارے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ میرے گھر والے بھی ہم سے بدظن ہیں۔" اطہر نرم پڑتے ہوئے بولا۔

"یہ بات تم نرم لہجے میں بھی کہہ سکتے تھے۔ دوپہر میں تم نے بتایا تھا کہ موبائل اس لیے استعمال نہیں کر رہے کہ پولیس کو پتا چل جائے گا کہ ہم کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"ضروری ہے بات چیت موبائل پر کی جائے۔"

"پھر تمہاری کیسے بات ہوئی ہے۔"

"میں نے پی سی او سے بات کی ہے۔"

"اچھا یوں کہو نا۔" میں نے کہا۔

"کیا کریں ہوشیاری کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ پولیس کے

ہم تک پہنچ جائیں گے اور ملک کی پولیس سب سے زیادہ خطرناک ہے۔"

"ہم نے باقاعدہ نکاح کیا ہے پھر پولیس کیوں ہمیں تنگ کرے گی۔"

"اس لیے کہ تمہارے والد نے میرے خلاف ایف آئی آر تھانے میں کٹوادی ہے۔ پولیس ہمیں پہلے گرفتار کرے گی اور پھر ہم پر تشدد کرے گی۔"

"میں نے سنا ہے کہ پولیس پریمی جوڑوں کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔"

"صرف انہیں جن کے پیچھے کسی کی مدد حاصل ہو، ہمارے ساتھ یہ المیہ ہے کہ ہم دونوں کے گھر والے ہمارے دشمن بنے ہوئے ہیں۔"

"فی الحال جب تک ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا ہمیں اسی طرح چھپ کر زندگی گزارنی پڑے گی یا کہیں سے کچھ رقم حاصل ہو جائے تو ہم عدالت میں تحفظ فراہم کرنے کی درخواست دیں گے، اس طرح ہمیں قانونی تحفظ مل سکتا ہے۔" اطہر نے بتایا۔

"اطہر ہمارے پاس سے تیزی سے پیسے خرچ ہو رہے ہیں۔ میں سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہوں کہ جب پیسے ختم ہو جائیں گے پھر ہم کیا کریں گے یہ ہوٹل والے کرایہ نہ ملنے پر ہمارا سارا سامان نکال پھینکیں گے۔"

"تم بھی جذبات میں آ کر گھر سے نکل آئی ہو اپنے ساتھ سونے کے زیورات وغیرہ لے آتیں۔ انہیں فروخت کر کے ہم جیسے تیسے گزارا کر لیتے۔"

"مجھے کیا پتا تھا کہ تمہارے پاس اتنے تھوڑے سے پیسے ہوں گے۔"

"تم نے مجھے بینک سمجھ لیا ہوگا کہ جب چاہے رقم نکال لو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں سمجھا میں نے یہی تھا۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہر لڑکی یہی سمجھتی ہے کہ شادی کر کے عیش کی زندگی گزارے گی۔ جب بھی کسی چیز کی فرمائش کی شوہر فوراً حاضر کر دے گا۔"

"ہاں ہوتا ایسے ہی ہے فی الحال یہ ہماری آزمائش کے دن ہیں ختم ہو ہی جائیں گے۔"

"خیر میں نے اپنے ایک عزیز ندیم سے بات کی ہے۔ وہ ہماری مالی مدد

نے کہا۔

دوسرے دن ہم ابھی مزار کے قریب ہی پہنچے تھے کہ اچانک ناجانے کیوں اطہر کو کیا ہوا وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے پلٹ پڑا۔

"کیا ہوا؟"

"خاموشی سے چلتی رہو۔ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔" اطہر تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔

"کچھ بتاؤ بھی......" میں نے غصے میں کہا۔

میں نے ایک گاڑی سے دیگ اترتی ہوئی دیکھ لی تھی۔ مجھے شدید بھوک لگی ہوئی تھی۔ دیگ دیکھ کر میری بھوک چمک اٹھی تھی ایسے میں اطہر کا پلٹ جانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ پتا نہیں پھر دیگ کتنی دیر میں آئے۔ اطہر کا رخ سیدھا ہوٹل کی طرف تھا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو، خدا کے لیے فضول قسم کے سوالات مت کرو۔" اطہر غصے سے بولا۔

اس کے غصہ کرنے پر میں خاموش ہو گئی۔ ہم پھر ہوٹل میں تھے۔

"ہاں اب بتاؤ کہ مزار پر تم نے کیا دیکھا تھا جو تم اتنے بدحواس ہو کر پلٹ آئے۔" میں نے پوچھا۔

"وہاں میں نے تمہارے بھائی رمضان کو دو پولیس کانسٹیبل کے ہمراہ دیکھا تھا۔" اطہر نے بتایا۔

"کیا اس نے ہمیں دیکھا تھا۔"

"نہیں...... اگر وہ ہمیں دیکھ لیتا تو ابھی ہم یہاں نہیں ہوتے بلکہ پولیس کی حراست میں ہوتے۔"

"یہ تم کس طرح کہہ رہے ہو کہ تم نے اس کو دیکھ لیا اور اس نے ہمیں نہیں دیکھا۔" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تمہارا بھائی پولیس کانسٹیبل سے باتیں کر رہا تھا اسی لیے اس کی ہم پر نظر نہیں پڑی۔" اطہر نے بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے والدین کو ہمارے لاہور آنے کی خبر لگ گئی ہے۔"

"ہاں کسی نے ہماری مخبری کر دی ہے ورنہ انہیں کیا معلوم کہ ہم لاہور میں چھپے ہیں۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"ہمیں ہوٹل سے نکلتے وقت احتیاط کرنا پڑے گی۔ صرف

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

تم ہوٹل سے باہر جاؤ گی۔"

"میں کیسے بچ سکتی ہوں۔" میں نے پوچھا۔

"تم برقع میں نقاب لگا کر ہوٹل سے باہر جانا، کسی کو خبر ہی نہیں ہوگی کہ برقعے میں کون ہے۔" اطہر نے کہا۔

"ہاں ایسا ممکن ہے مگر داتا دربار پر میرا بھائی ہوگا، کہیں وہ مجھے آنکھوں سے نہ پہچان لے۔"

"تمہیں کون بے وقوف کہہ رہا ہے کہ داتا دربار جاؤ۔ ہم کسی قریبی ریسٹورنٹ سے کھانا منگوالیں گے۔ اور کھانا تم لے کر آؤ گی۔"

"میں کیوں ہوٹل کا ملازم کیوں نہیں۔"

"وہ کھانا سستا لائے گا اور پیسے ہم سے زیادہ لے گا۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں خود ہی لے آؤں گی۔" میں نے کہا۔

"ابھی باہر نکلنے کی بے وقوفی مت کرنا، داتا دربار ہوٹل سے زیادہ دور نہیں ہے، کہیں ایسا نہ ہو وہ ٹہلتے ہوئے اس طرف نکل آئیں۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ اس ہوٹل پر آ کر منیجر سے پوچھ لیں کہ یہاں کوئی جوڑا شہداد پور سے آ کر تو نہیں ٹھہرا ہوا ہے؟"

"ہاں ایسا ہوسکتا ہے مگر یہاں بہت سارے ہوٹل ہیں، جب تک وہ اس ہوٹل تک پہنچے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔" اطہر نے کہا۔

"ہمیں یہاں سے کل تک نکل جانا چاہیے مگر ہم فوری طور پر کہاں جائیں گے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ کہاں جائیں گے ہمارے لیے اب لاہور محفوظ نہیں رہا۔ تم مجھے کچھ سوچنے دو۔" یہ کہتے ہوئے وہ گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ صبح سے دوپہر ہوگئی تھی اطہر گہری سوچ میں ہی غرق تھا۔ دوپہر ہونے پر میری بھوک سے حالت خراب ہونے لگی۔ جب میں نے اطہر کی توجہ کھانے کی طرف مبذول کروائی۔

"میری جان پر پڑی ہے، تمہیں کھانے کی پڑی ہے۔"

"سوچنے سے تمہیں کون روک رہا ہے۔ سوچ بچار سے ہی مسئلے کا حل نکلتا ہے۔ لیکن بھوکا رہ کر اپنے اوپر کیوں ظلم کر رہے ہو؟"

"تم نے مجھے بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے اور اب باتیں بنا رہی ہو نا جانے کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے تمہاری باتوں میں آ کر یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔

مجھے بھی اس کی بات پر غصہ آ گیا اور میں منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ بھوک مجھ سے بھی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں کب تک پانی پی پی کر گزارا کرتی شام گئے تک میں نڈھال ہو کر بیڈ پر گر پڑی تھی۔ اور میری ہمت جواب دینے لگی تھی۔ نا چاہتے ہوئے بھی میں نے پھر اطہر کی توجہ کھانے پر مبذول کرائی۔

"اطہر میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"اچھا! میں تو صبح سے خوب مرغ مسلّم کھا رہا ہوں۔"

"میں نے یہ کب کہا ہے؟"

"مقصد تمہارا یہی لگ رہا ہے۔"

"میری بھوک سے حالت غیر ہوگئی ہے اور تمہیں باتیں آ رہی ہیں۔"

"آخر تم کیا چاہتی ہو۔" وہ غصے سے مجھے گھورنے لگا۔

"کھانا! اور کیا چاہوں گی۔"

میرا دل بالکل بھی اطہر سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا بھوک اتنی شدت کی لگ رہی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے اس سے بات کرنی پڑ رہی تھی۔

"لے مر اس کا کھانا لے آ۔" اطہر نے غصے سے 100 روپے میری طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

اطہر نے جس انداز سے میری طرف سو روپے کا نوٹ پھینکا تھا مجھے اس کا یہ انداز قطعی پسند نہیں آیا تھا اور دل میں آیا کہ وہ نوٹ اس کے منہ پر مار دوں۔ بھوک اتنی شدت کی لگ رہی تھی کہ میں چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں کرسکی اور خاموشی سے وہ نوٹ لے کر ہوٹل سے باہر نکل گئی۔

اس دور میں 100 روپے کا کیا آتا ہے۔ پھر تھوڑا بہت کھانے کو لے آئی دونوں نے مل کر وہ کھانا کھایا۔ بھوک زیادہ تھی کھانا کم تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پیٹ میں کچھ تو گیا۔

صبح اطہر نے مجھے جلدی اٹھا دیا۔

"چلو ہمیں ابھی اور اسی وقت یہ ہوٹل چھوڑنا ہے۔"

"یوں اتنی جلدی۔" میں نے پوچھا۔

"یہ میرے باپ کا ہوٹل نہیں ہے، جو جب دل کرے ہم اسے چھوڑیں۔"

"یہ تم صبح صبح کیسی بات کر رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں چلو جلدی چلنے کی تیاری پکڑو۔"

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟"

"ہم ٹرین سے ٹنڈو آدم جائیں گے۔ ابھی ہمیں ٹرین تیار ملے گی۔" اطہر نے بتایا میں جلدی جلدی تیار ہوئی اپنا سامان پیک کر کے اطہر کے ساتھ اسٹیشن چل دی۔ اسٹیشن جلدی پہنچنے پر ہمیں ٹرین مل گئی۔ ٹرین میں سوار ہو کر میں سوچ میں پڑ گئی تھی کہ ٹنڈو آدم سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر ہی شہداد پور ہے۔ ہم کس طرح سے اپنے گھر والوں اور رشتے داروں سے محفوظ رہ سکیں گے مگر اطہر نے یہ کہہ کر میری تسلی کر دی کہ "ہم گیسٹ ہاؤس میں رہیں گے۔ وہاں کوئی رشتے دار نہیں آ سکتا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے کہا۔

"گیسٹ ہاؤس کا کرایہ کہیں زیادہ نہ ہو۔"

"کرائے کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ، گیسٹ ہاؤس میرے رشتے دار کا ہے۔ ہمیں کچھ نہیں دینا پڑے گا۔"

"پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

گیسٹ ہاؤس پہنچ کر جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ محض اطہر نے مجھے ٹنڈو آدم لانے کے لیے ڈرامہ رچایا تھا کہ اس نے میرے بھائی رمضان کو پولیس کانسٹیبل کے ہمراہ دیکھا ہے مجھے شدید دکھ ہوا کہ اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔ وہ مجھے صاف بتا دیتا کہ اس کے پاس گزارے کے پیسے ختم ہوگئے اور اب سوائے کسی رشتے دار کے یہاں پناہ لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ میں کیا اسے ٹنڈو آدم چلنے کو انکار کرتی۔ اطہر مجھے سمجھنے کے بجائے میری زندگی کو تلخ سے تلخ بنائے دینے پر تلا ہوا تھا۔ اطہر کی زبانی ہی مجھے پتا چلا کہ اس کا عزیز نوید کھانے پینے کے اخراجات پورے کر رہا ہے۔ سوچا تھا کہ کچھ دن گیسٹ ہاؤس میں اچھے گزر جائیں گے مگر اطہر کی دن بدن باتیں تلخ ہونے سے میری زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے میں اس کی بیوی ہوں۔ کیا بیوی سے اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ نوید جب بھی ہم سے ملنے آتا تھا مجھے اس کی آنکھوں میں ہوس نظر آتی تھی۔ میں نے جب اطہر سے اس بات کا ذکر کیا وہ الٹا مجھ پر ہی برس پڑا۔

"تم میرے عزیز پر الزام لگا رہی ہو، یہ کیوں نہیں کہتی تم اس پر ڈورے ڈال رہی ہو اور وہ تمہارے قابو میں نہیں آ رہا ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" میں نے احتجاج کیا۔

الحال کنگلا۔ اسی لیے تم مجھ سے جان چھڑا چاہتی ہو۔" اطہر نے کہا۔

اطہر کی اس بات نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ حقیقت یہی تھی کہ اطہر کے ساتھ گزرے میرے دن اذیت ناک تھے۔ بظاہر شکل و صورت سے معصوم دکھائی دینے والا اطہر دل کا انتہائی خراب انسان تھا۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے سے کہیں بہتر تھا میں اکیلے زندگی گزار لوں۔ میری بہتری اسی میں تھی کہ میں اطہر سے جان چھڑا لوں۔ اور میں نے جان چھڑانے کی تدبیر سوچنی شروع کردی۔ سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی اس ترکیب سے میری عزت بھی رہ جاتی اور میں اپنے گھر بھی چلی جاتی۔ اطہر کی غیر موجودگی میں، میں نے موبائل پر ابو سے بات کی اور انہیں بتایا کہ اطہر نے مجھے اغوا کر کے اپنے عزیز نوید کے گیسٹ ہاؤس میں رکھا ہوا ہے۔ میرے ابو سے بات کرنے کی دیر تھی وہ پولیس کو لے کر گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ اور مجھے وہاں سے بازیاب کرا لیا۔ پولیس نے مجھے عدالت میں پیش کیا جہاں میں نے عدالت کو بتایا کہ مجھ سے گن پوائنٹ پر کورٹ میں حلفیہ بیان دلایا گیا اگر میں ایسا نہ کرتی تو اطہر نے دھمکی دی تھی کہ وہ مجھ پر تیزاب پھینک کر چہرہ خراب کر دے گا۔ اس طرح میں اپنے گھر آ گئی اور عدالت نے اطہر کو پولیس ریمانڈ پر دے دیا۔ ریمانڈ ختم ہونے پر اطہر کو جیل کسٹڈی کر دیا گیا۔ مجھے ایسا کرتے ہوئے دکھ ضرور ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے مگر وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔ میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر اس کا ساتھ دیا تھا اور نتیجے کے طور پر اس نے میری زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ اور مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں نے اطہر کے ساتھ شادی کر کے بہت ہی غلط کیا ہے۔

بے وفا

حسن اختر

دھوکے، فریب اور جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے مگر وہ پھر بھی سفر کرتے ہیں اور یہ سفر عامل کو بدنامی اور تباہی کے صحرا تک پہنچا کر ختم ہوتا ہے۔

ایک پروفیسر کی روداد' وہ بدنامی سے بچنا چاہتا تھا۔

وہ تینوں پولیس والے تھے اور تینوں ہی کی طرف سے مجھ پر کی بوچھاڑ ہو رہی تھی ان میں سے ایک میرے دائیں طرف کھڑا تھا اور دوسرا بائیں طرف اس کے پیر مسلسل حرکت میں تھے جبکہ تیسرا پورے نصف گھنٹے سے کمرے میں میرے آگے پیچھے ٹہل رہا تھا۔

پھر بہت دیر بعد ان کی زبانیں جو پہلے قینچی کی طرح چل رہی تھیں بند ہو گئیں۔ ان میں سے ایک میرے سامنے کھڑا ہو کر سگریٹ سلگانے لگا اس کا نام میلوان تھا اگر اس سے عام حالات میں ملاقات ہوتی تو وہ یقیناً مجھے بہت پسند آتا اس کی سنہری مونچھیں اور نیلی آنکھیں مجھے بہت اچھی لگتیں اور اس کی باتوں کا انداز مجھے بے حد متاثر کر ڈالتا لیکن حالات اس قسم کے تھے کہ اس وقت وہ مجھے کوئی درندہ نظر آ رہا تھا۔

سگریٹ کے تین چار کش لینے کے بعد اس نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے پوچھا۔ ''تم اس چکر میں پڑ کیسے گئے لین؟''

اس کا یہ سوال میرے دل کی بھی ترجمانی کر رہا تھا خود میں بھی یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ مجھ جیسا دانشور اس چکر میں کس طرح پڑ گیا؟

میں جینئس تھا یونیورسٹی کیمپس میں مجھ سے زیادہ مقبول شخصیت کسی اور دل کی نہ تھی لوگ مجھے بگ مین آف دی کیمپس کہا کرتے تھے میرے تعلیمی کارناموں کی دھوم تھی اور اس حقیقت کا سب ہی کو علم تھا کہ یونیورسٹی کی سینیٹ نے گریجویشن کی تقریب کے صرف پانچ گھنٹے بعد ہی مجھ سے درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کا معاہدہ کیا تھا مجھے کوچنگ کے فرائض انجام دینے کے لیے بھی اچھی تنخواہ دی گئی تھی۔

تدریسی فرائض کے علاوہ میں جمنازیم کی بھی تربیت دینے لگا اور پھر حسین ترین اینی سے میری شادی ہو گئی۔

اینی میری روح ہے میں اب بھی اس سے محبت کرتا ہوں جب پہلی بار اپنی کلاس میں سیاہ زلفوں والی شوخ و شنگ حسینہ کو دیکھا تھا تو پل بھر میں دل ہار بیٹھا تھا۔ میرا دل آج بھی اینی کے پاس محفوظ ہے میں اس کا شوہر ہی نہیں اس کا عاشق بھی ہوں۔

شادی سے قبل اینی نے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ پہلے گریجویشن مکمل کرے گی اور میں اس پر آمادہ بھی ہو گیا تھا لیکن...... اینی خود شادی کے لیے اتنی بے تاب ہوئی کہ اس نے اپنی شرط واپس لے لی اور ہم نے شادی کر لی پھر ایک روز اینی نے مجھے خوشخبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ پہلے تو مجھے یقین نہ آیا لیکن اکتوبر کے اواخر میں سب کچھ واضح ہو گیا اور میں خوشی سے سرشار رہنے لگا۔

ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال بچے کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتائیں گے اینی کے والدین کو بھی نہیں جو ڈاؤن اسٹیٹ میں رہتے ہیں۔ اینی نومبر کے دوسرے ہفتے میں اپنے میکے جانے والی تھی اور خود میرا پروگرام بھی تھا کہ یوم تشکر سے قبل وہاں پہنچ جاؤں گا اور پھر ہم دونوں انہیں بتا کر حیرت زدہ کر دیں گے۔

پروگرام کے مطابق میں نے پیر کے روز اینی کو ٹرین میں سوار کرایا اور پھر واپس گھر چلا آیا...... پہلے دو روز تو ٹھیک ٹھاک گزر گئے اس کی یاد نے زیادہ پریشان نہ کیا۔ میں فزیکل ایجوکیشن کی کلاسوں میں مصروف رہا اور پھر رات کے وقت مصروف رہنے کے لیے جو بار آتا رہا لیکن

پھر میرا اضطراب بڑھنے لگا اور بدھ کی صبح انتہا کو پہنچ گیا۔ شام ڈھلے میں گھر واپس آیا تو اپارٹمنٹ خالی دیکھ کر بہت اداس ہو گیا مجھے اینی یاد آنے لگی جو ہر شام میرے استقبال کے لیے دروازے پر موجود رہتی تھی پھر جب رات آئی تو میں بے چین ہو گیا اور جتنی پی سکتا تھا اتنی بیئر پی لی۔

جمعرات افسردگی اور آزردگی کا پیغام لے کر آئی لہٰذا میں نے کچھ وقت کالج لائبریری میں گزارنے کا فیصلہ کیا تاکہ خود کو اپنے ریسرچ ورک میں غرق کر کے اینی کی جدائی کا غم بھلا سکوں۔

میں اس کام میں منہمک تھا کہ اچانک میری نظر ایک لڑکی پر پڑی وہ ایک شیلف میں کتاب رکھ رہی تھی۔ میری نظریں اس پر جم کر رہ گئیں وہ واقعی حسین تھی۔ اینی کی طرح دلکش تھی۔ پھر جب وہ چند قدم آگے بڑھی تو میرے دل پر بجلی سی گر گئی، اس کی چال قیامت تھی میں اس سے نظریں نہ ہٹا سکا۔

وہ دراز قامت تھی اس نے سیاہ اسکرٹ اور زرد بلاؤز پہن رکھا تھا اس کی سیاہ زلفیں شانوں پر سانپ کی طرح لہرا رہی تھیں۔ شاید اسے اپنے حسن کا احساس تھا اور یہی وجہ تھی کہ اس نے چست لباس منتخب کیا تھا۔

میری رگوں میں میٹھا رس دوڑنے لگا اور پھر ہم دونوں کی نظریں مل گئیں، اس کی آنکھوں میں شوخی تھی، شرارت تھی شرارے تھے میں نے آنکھیں جھکا لیں۔

تب ہی اس نے کوٹ شانوں پر ڈال کر فرنٹ ڈور کی سمت میں قدم بڑھا دیے میں ایک لمحے تک ساکت بیٹھا رہا لیکن میرے وجود میں کھلبلی سی مچی رہی میرا دل اچھل اچھل کر حلق میں آتا رہا اور پھر میں کسی تنویم زدہ آدمی کی طرح کتاب کھلی چھوڑ کر اس کے پیچھے لپکنے لگا میرے باہر پہنچنے تک وہ سڑک پار پہنچ چکی تھی۔ میں بھی تیزی سے فٹ پاتھ پر پہنچ گیا اور اس سے قبل کہ میں سڑک

پار کرتا وہ نیلی اسپورٹس کار میں بیٹھ کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

میں نے اپنے اندر قلب و ذہن میں...... ایک نئی تبدیلی کا احساس بہت جلد کر لیا ایسا لگا جیسے میں کیمپس کا ذہین ترین آدمی نہیں ہوں استاد نہیں ہوں میری بیوی اینی کا وجود ہی نہیں ہے اور یہ کہ میں باپ بھی بننے والا نہیں ہوں۔ میں سب کچھ بھلا بیٹھا۔

اس لڑکی نے میرے وجود کو جلا کر خاک کر ڈالا تھا اور اب میں صرف عاشق تھا ایسا عاشق جسے اپنی محبوبہ کا نام پتا بھی معلوم نہیں تھا جمعہ کی شام جمنازیم میں کلاس لیتے ہوئے بھی وہ میرے اعصاب پر سوار رہی اور میں ایک موہوم سی امید کے سہارے کلاس کے بعد فوراً لائبریری میں آ گیا لیکن وہ وہاں موجود نہ تھی میں پسینے میں شرابور ہو گیا میری امیدیں آگ میں جلنے لگیں۔ مگر میں ایک گھنٹے تک لائبریری میں اس کا انتظار کرتا رہا۔

اس سے نہ ملنے پر میری جو کیفیت ہوئی تھی اس کا اندازہ صرف میرے دل ہی کو تھا میں اداس، دلگیر اور آزردہ ہو کر بار میں آ گیا اور بیئر کی تین بوتلیں چڑھا گیا۔

جوئے بار سے باہر اب سرد ہوا چلنے لگی تھی اور تمام آثار ایسے تھے کہ بہت جلد موسم کی پہلی برف باری ہونے والی تھی۔

میں اسے اپنے ذہن اور اپنے دل سے کھرچ کر پھینکنے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا اور پھر نو بجے کے قریب میں بار سے باہر نکل آیا۔

سڑک پر پہنچتے ہی میرا دل اچھل پڑا، میری کنپٹیاں سلگنے لگیں اس کی اسپورٹس کار کونے پر کھڑی ہوئی تھی اسٹیرنگ وہیل پر ایک سایہ نظر آ رہا تھا اور کار کے اندر، گہری تاریکی میں ایک سگریٹ کا انگارہ دہک رہا تھا۔

میں ابھی اس کار کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اس کا دروازہ کھل گیا۔

''آؤنا...... کار میں بیٹھو۔'' ایک سریلی نقرئی آواز میرے کانوں میں رس گھول گئی۔

میں کسی سحرزدہ آدمی کی طرح کار کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا سیٹ بہت آرام دہ تھی لڑکی نے سگریٹ کھڑکی سے باہر اچھال دیا اور پھر اسپورٹس کار بڑی تیزی سے آگے بڑھا دی۔

''میں ایک گھنٹے سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' اس کے لہجے میں کٹیلا پن اور شکوہ تھا۔

''اوہ......وہ...... تمہیں یہ کیسے علم ہوا کہ میں جو بار میں ہوں؟'' میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

''میں تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتی ہوں لین۔'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا اس کی ہنسی بھی اس کی طرح قیامت خیز تھی ''میں نے تم سے متعلق بہت سی باتیں معلوم کر لی ہیں۔''

مجھے گرمی لگنے لگی اور میں نے کوٹ کے بٹن کھول ڈالے۔

''میرا نام ایڈی جیکسن ہے میں نیو آرلینز کی رہنے والی ہوں۔ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اتنی دور صرف اس وجہ سے آئی ہوں کہ میں آزادانہ اور خود مختارانہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں ایسی زندگی جس کے گزارنے پر کوئی اعتراض نہ کرے اور میں جو چاہوں کرتی رہوں۔''

ہم خاموش ہو گئے برف صاف کرنے والے وائپروں کی آواز بہر حال سنائی دیتی رہی۔

میں نے سگریٹ سلگائی۔ ''ایک اور میرے لیے......!''

اس نے دھیرے سے کہا اور میں نے دوسری سگریٹ سلگا کر خود اس کے ہونٹوں میں تھما دی وہ مسکرانے لگی۔

''کیا تم جو چاہتی ہو حاصل کر لیتی ہو ایڈی؟'' میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''ہاں ہمیشہ سے یہی ہوتا رہا ہے میرے والد بہت امیر آدمی تھے وہ میری ہر فرمائش پوری کر دیتے تھے۔''

''تم مردوں کو خود پسند کرتی ہو......یا......!''

''میں مردوں کو یہ حق نہیں دے سکتی کہ وہ مجھے منتخب کریں کیونکہ میں پیشہ ور نہیں ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے بارے میں کیا خیال ہے، پسند تو میں نے کیا تھا۔''

''نہیں۔'' وہ ہنس پڑی ''یہ سچ ہے کہ پہلے تم نے مجھے پسند کیا تھا لیکن اگر میں تمہیں پانے کا فیصلہ نہ کرتی تو تم اب بھی سڑکوں پر گھوم رہے ہوتے کل جب میں نے تمہیں اپنی طرف متوجہ پایا تو فوراً ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تم میرے لیے بنے ہو۔''

میں بھی ہنس پڑا بات ایک ہی تھی ہم ایک سا
بڑی دلی تمنا پوری ہو رہی تھی اب اس کا کریڈٹ وہ خود لے رہی تھی اس پر مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن اس کی باتوں اور اداؤں سے میں حیران ضرور تھا۔

''لیکن تم میری باتوں پر حیرت زدہ ہو، نا خیر کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے میں ایسی ہی ہوں جو چاہتی ہوں کر بیٹھتی ہوں اور دوسرے سے بھی یہی توقع رکھتی ہوں کہ وہ میری بات مان لے گا میں تمہیں پسند تو آئی ہوں نا؟''

''فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا......'' میں نے دبے دبے لفظوں میں جواب دیا۔

''لیکن تم میری قربت کے تو متمنی ہو۔'' وہ ہنس پڑی اور میں سمجھ گیا کہ وہ دل کا چور پکڑنے میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔

کچھ دیر بعد ہی گاڑی ایک شاندار اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں رک گئی میں بھی بے صبری سے اس کے ساتھ ہی اتر آیا۔

ہم دیر تک تاریکی میں کھڑے رہے ''کیا میرے گھر نہیں چلو گے لین۔'' کچھ دیر بعد اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''چلو جہاں کہو گی وہیں چلوں گا۔''

''میں اٹھارہ سال کی ہوں لین۔'' اس کا لہجہ بڑا عجیب سا تھا۔ ''لیکن تجربے کے اعتبار سے میری عمر دگنی ہے بہت سے مرد میرے دوست رہ چکے ہیں لیکن میں کسی ایسے کو دوست بنا کر رکھنا چاہتی ہوں جس میں تمام خوبیاں ہوں۔''

میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ باتیں کیوں کی تھیں لیکن میں اس وقت ان باتوں سے بہت خوش تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے سہارے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے وہ واقعی بہت نفاست سے سجا ہوا تھا اور بیڈ روم خوابوں کی طرح حسین تھا وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بجائے بیڈ روم میں لے گئی جہاں ایک خوب صورت ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔

وہ دیر تک مجھے گیت سنواتی رہی تمام کیسٹ بالکل نئے اور مقبول تھے ہم دیر تک باتیں کرتے رہے پیتے رہے اور پھر اس نے لائٹ سوئچ آف کر دیا میں نے ایک ہلکی سی کلک سنی اس نے شاید ٹیپ ریکارڈ کا بٹن بند کیا تھا۔

کمرے میں تاریکی اور گرمی تھی۔

اور میں نے سکون ... اس ...
طرف جھکی ہے پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی میں نے اس کے لبوں میں دو سگریٹ دبی ہوئی دیکھیں پھر اس نے سگریٹ سلگا کر ایک میری طرف بڑھا دی اور ایش ٹرے درمیان میں رکھ کر دوبارہ لیٹ گئی۔

''کچھ اپنے بارے میں تو بتاؤ لین۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا یہ بات واقعی کتنی عجیب تھی کہ ہم بے تکلفی کی بیشتر حدیں پھلانگ چکے تھے لیکن ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف نہ تھے۔

میں نے اسے سب کچھ بتا دیا اپنے بارے میں سب کچھ۔

''کیا تم ایک ہفتے تک میرے ساتھ رہ سکتے ہو لین؟''

اس کا لہجہ اس مرتبہ بہت عجیب اور بدلا ہوا تھا میں خوشی سے جھوم اٹھا وہ کہہ رہی تھی۔

''اس ایک ہفتے کے دوران ہم گھر سے باہر بھی قدم نہ رکھیں گے، بس......یہیں رہیں گے۔''

''ضرور...... اب تم مجھ سے بہ مشکل چھٹکارا حاصل کر سکو گی، بے بی۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا جس پر وہ قہقہہ مار کر اٹھ بیٹھی، اس نے ہاتھ بڑھ کر ٹیبل لیمپ روشن کر دیا اور پھر بیڈ شیٹ سے سگریٹ کی راکھ جھاڑتی قدرے شرمیلے لہجے میں بولی۔

''میرے پاس ایک اہم راز ہے، لین۔''

''وہ کیا؟''

''یہ......!'' اس نے بیڈ سے جھکتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کی انگلیاں ٹیپ ریکارڈ پر پہنچیں میں نے کلک کی آواز سنی اور پھر مجھے ایڈی کی آواز سنائی دی۔ ''مجھ سے محبت کی باتیں کرو، لین۔''

میں نے اس کی طرف چونک کر دیکھا آواز اسی کی تھی مگر ٹیپ ریکارڈ سے آ رہی تھی۔ اور پھر جب میں نے اپنی آواز سنی تو چکرا کر رہ گیا میں پسینے پسینے ہو گیا اس نے میری تمام باتیں ٹیپ کر لی تھیں اور یہ باتیں ایسی تھیں جن کو ضبط تحریر میں لانا ممکن نہیں۔

ایڈی نے ٹیپ بند کر دیا۔

خاموشی...... کمرے میں خاموشی طاری ہو گئی میرا دل

بہت زور زور سے دھڑکنے لگا سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے پھر معاً مجھ پر جنون سوار ہو گیا میں تڑپ کر اٹھا۔ میں نے اس کے بال پکڑ کر اسے جھنجوڑنے کی کوشش کی مگر اسی لمحے اس نے پہل کردی کوئی چیز میری کھوپڑی پر پڑی اور میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔

میں صرف اتنا ہی دیکھ سکا کہ وہ ہاتھ میں ایش ٹرے لیے مجھے گھور رہی ہے اس کا چہرہ بہت بدلا ہوا تھا اس پر معصومیت کے بجائے سنگدلی عیاں تھی۔

''آئندہ مجھ پر ہاتھ مت اٹھانا لین۔'' اس نے کڑے لہجے میں کہا۔

''کمینی...... بے غیرت...... بلیک میلر......!'' میں بے بسی سے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''تمہیں تمام گالیاں آتی ہیں، لین۔'' وہ ایک بار پھر معصوم بن گئی۔ اس کے چہرے سے سنگدلی کی سلوٹیں ختم ہو گئیں۔

''مم...... مگر...... تم نے یہ ٹیپ...... کیوں تیار کیا ہے؟'' میں نے کھوپڑی میں ہونے والے درد کو برداشت کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ میرا واحد شوق ہے اس میں منافع بھی بہت ہوتا ہے۔''

وہ مکاری سے مسکرانے لگی۔

میں سب کچھ سمجھ گیا ہر بات واضح ہو گئی۔

''اوہ...... تو نیو آرلینز میں رہنے والا تمہارا باپ اتنا امیر نہیں کہ تمہارا خرچہ ہی برداشت کر سکے۔''

''ارے نہیں...... وہ تو میں نے بس یونہی کہہ دیا تھا میرا باپ ملاح تھا اور زندگی میں اس سے میری کبھی ملاقات نہ ہوئی۔''

''میرا خیال ہے کہ تم نیو آرلینز کی رہنے والی بھی نہیں ہو...... لیکن ایڈی...... اس کام کے لیے تم نے مجھ ہی کو کیوں منتخب کیا؟'' میرے اکاؤنٹ میں تو سو ڈالر بھی نہیں ہوں گے۔''

''پتا نہیں۔'' وہ طویل سانس لے کر بولی۔ ''نہ جانے کیوں میں تمہیں منتخب کرنے پر مجبور ہو گئی تھی شاید لائبریری میں تم نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ وہی فیصلہ کن تھیں میں جانتی تھی کہ تم اگر مفلس نہیں تو امیر زادے بھی نہیں ہو، جبکہ مجھے امیروں کی تلاش رہتی ہے لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں تمہیں لے آئی پتا نہیں کیوں۔''

''تم نے گھاٹے کا سودا کیا ہے۔''

''نہیں...... میں نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا، لین۔'' وہ بڑی اداسی سے مسکرا کر بولی۔

''میں تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہ دے سکوں گا۔''

''میں تم سے ایک دھیلا بھی نہیں مانگوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''تم نے جو چاہا، حاصل کرلیا۔ اب ٹیپ مجھے واپس کردو۔''

میں نے ٹیپ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وہ بہت پھرتیلی ثابت ہوئی، اس نے فرش پر جھک کر اپنا سینڈل اٹھایا اور اس سے قبل کہ میں اس کا ہاتھ پکڑتا سینڈل کی نوکدار ایڑی میرے سر پر پڑی۔ اندھیروں نے مجھ پر حملہ کردیا اور اس مرتبہ اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ میں اس کے چہرے کے تاثرات ہی دیکھ سکتا۔

پتا نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہا میری آنکھ کھلی تو مجھے سر میں شدید ترین درد کا احساس ہوا ایسا لگا جیسے سر میں سوئیاں سی چبھ رہی ہیں میں نے آنکھیں پوری کھول دیں اور پھر بند کرلیں۔

''سر میں درد ہو رہا ہے ڈارلنگ۔'' میں نے اس کی وہی پیاری سی آواز سنی تو بل کھا کر رہ گیا میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا وہ بیڈ کے کنارے بیٹھی ہوئی نظر آئی۔

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اس مرتبہ وہ ایک سفید گاؤن پہنے ہوئی تھی۔ ''مجھے معاف کردو لین، مگر میں مجبور تھی اگر تم پر حملے میں پہل نہ کرتی تو تم کیسٹ نکال سکتے تھے۔ میں نے صرف کیسٹ چھپانے کے لیے یہ حرکت کی تھی۔''

''چڑیل۔'' میں بڑے غصے سے بولا۔ مگر اس کے آگے مجھ سے بولا نہ گیا اس پر وہ مسکرانے لگی اس نے بڑی احتیاط سے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالی اور پھر ایش ٹرے فرش پر رکھنے کے لیے جھک گئی۔

تب ہی میں نے وہ انگوٹھی دیکھی جو اس نے اپنی صراحی دار گردن والی زنجیر ڈال رکھی تھی یہ میری شادی کی انگوٹھی تھی میں نے تڑپ کر انگوٹھی کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں لین...... پلیز کم از کم اس ہفتے کے اختتام پر میرے پاس ہی رہنے دو۔'' اس نے بڑے عجیب انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے درخواست کی۔ میں حیران ہو گیا۔

''مگر کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں کیوں بس میں اتنا چاہتی ہوں کہ تمہاری کوئی چیز میرے پاس رہے وقتی طور سے ہی سہی۔''

میں نے انگوٹھی پکڑ لی مگر اس نے سونے کی زنجیر سے اتارنا اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک زنجیر نہ اتر جاتی اور اس وقت میں زنجیر کھینچ کر ایڈی کی گردن زخمی کرنا نہیں چاہتا تھا اس نے دونوں ہاتھ میری کلائی پر رکھ دیے۔

''لین...... میری بات مان لو پلیز سنو اگر تم نے انگوٹھی ابھی واپس لینے پر ضد کی تو میں واپس کردوں گی لیکن ٹیپ شدہ کیسٹ بذریعہ رجسٹرڈ پارسل مورگن ویل بھیج دوں گی اور پھر تم......!''

''مورگن ویل۔'' میرے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''ہاں تمہاری بیوی اینی وہیں رہتی ہے نا، مسز اینی لین معرفت پی ایم مارو مورگن ویل۔''

انگوٹھی پر میری گرفت کمزور پڑ گئی، میں خود بھی کمزور پڑ گیا لیکن پھر میں نے بہت خونخوار لہجے میں کہا۔ ''سنو بے بی...... اگر تم نے ایسی کوئی حرکت کی تو میں تمہیں قتل کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہوں۔''

''میں جانتی ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی ''لیکن اتنا ضرور یاد رکھنا کہ میرے قتل کے بعد تم اپنے لیے حالات کو بدتر کرلو گے، پولیس تم پر قتل کا الزام لگائے گی جبکہ اس وقت میں تم سے صرف یہ فرمائش کر رہی ہوں کہ اچھے لڑکوں کی طرح میرے ساتھ ایک ہفتہ تک رہو پھر میں تمہیں انگوٹھی اور کیسٹ واپس کردوں گی اور تم اپنی بے زار کن زندگی میں پھر واپس جا سکو گے۔''

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ سنتا رہا وہ مجھے بلیک میل کر رہی تھی لیکن بلیک میلنگ بھی کہیں نہ رقم کا مطالبہ نہ تاوان کی خواہش......

''کیا تم پاگل ہو ایڈی۔'' میں نے بہ مشکل پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کی آنکھیں بے جان ہو گئیں۔ ''نہیں لین میں پاگل نہیں...... مریض ہوں ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میں ناقابل مزاحمت طلب کی مریضہ ہوں اور مجھے یہ مرض بارہ سال کی عمر میں لگا تھا۔''

انکشاف تھا [illegible] ''لین یقین کرو کہ یہ مرض بہت سی لڑکیوں [illegible] لیکن میں نے ذہانت سے کام لیتے ہوئے اسے پیشہ بنا لیا ہے۔''

''ٹھیک ہے ایڈی...... سنو...... میرے اکاؤنٹ میں چھ سو ڈالر ہیں کہو تو میں چیک لکھ کر دے دوں بشرطیکہ تم میری انگوٹھی اور کیسٹ میرے حوالے کردو۔''

''نہیں دوست میں تم سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔''

''تب پھر تم کیا چاہتی ہو؟''

''صرف تمہیں صرف ہفتے تک میرے ساتھ رہو مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

میں احتجاج کرنا چاہتا تھا مگر اس نے لات مار کر ٹیبل لیمپ پھر گرا دیا اور میں تاریکی میں ہاتھ پاؤں مارتا رہ گیا۔

اتوار کی رات تک ہم اپارٹمنٹ سے نہ نکلے ہم نے زیادہ کھانا بھی نہ کھایا پینے پلانے میں بھی وقت ضائع نہ کیا اور سونے میں بھی وقت نہ گزارا۔

اس دوران میں نے کیسٹ تلاش کرنے کی بھی کئی ناکام کوششیں کیں۔

اتوار کی سہ پہر ایڈی نے پہلی بار باہر جا کر تفریح کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ ویسے بھی اتوار کی شب میری قید کی آخری رات تھی اور وہ حسب وعدہ پیر کی صبح کیسٹ اور انگوٹھی دے کر مجھے رہا کرنے والی تھی۔

رات، روشن اور خنک تھی ابھی چاند نہیں نکلا تھا لیکن ستارے جھلملا رہے تھے ایڈی، مجھے اپنی اسپورٹس میں لے کر کیمپس کے سامنے سے گزری اور پھر ہم شہر کی حدود سے نکل آئے۔ ہائی وے پر زیادہ ٹریفک نہ تھا۔ پھر بھی ایڈی نے رفتار چالیس سے آگے نہ بڑھائی۔ اس دوران ہم بے ربط گفتگو کرتے رہے اور پھر ریور برج پر پہنچ گئے۔ یہاں ایڈی نے رفتار اور کم کردی پل پار کرکے اس نے ایک ویران راستے پر گاڑی ڈال دی اور چند ہی لمحوں بعد گاڑی دریا کے متوازی سڑک پر دوڑنے لگی اس نے ایک جگہ گاڑی روک کر میری طرف دیکھا اور میں پہلو بدل کر رہ گیا۔

تیس منٹ بعد ہم شہر کی سمت میں واپس جا رہے تھے۔

''لین قید کی آخری رات ہے۔'' اس نے دھیرے

سے کہا ”کیا تم مجھے یاد رکھو گے۔“

”شاید...... نہیں......“ میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔

”اوہ، تم مجھ سے ناراض ہو۔“ وہ آزردہ ہو کر بولی۔

”شاید...... اوہ...... ایڈی...... سامنے دیکھو۔“ میں نے بوکھلا کر کہا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور ہیڈ لیمپس کی روشنی میں سڑک پر ایک شخص دونوں ہاتھ اٹھائے ہمیں رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

”ایڈی۔“ میں حلق پھاڑ کر چلایا کیونکہ اس نے رفتار میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

کار نہ رکی۔

میں نے ایک زوردار جھٹکا محسوس کیا۔ میری نظر عقب نما پر گئی اور میں دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر تقریباً رونے لگا۔ عقب نما میں مجھے ایک شخص تڑپتا ہوا نظر آیا تھا۔

”روک لو...... گاڑی روکو...... وہ زخمی ہو گیا ہے۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔

”شٹ اپ۔“ اس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”خاموش بیٹھے رہو احمق۔“

کچھ دیر بعد اس نے کار واپس موڑ لی لیکن اس مرتبہ دائیں طرف کی ویران سڑک پر ڈال دی میں سارے راستے خاموش بیٹھا رہا کار ایڈی کے زیر زمین گیراج میں داخل ہوئی تو میں جھرجھری لے کر رہ گیا میں جانتا تھا کہ ایڈی کی کار سے ٹکرانے کے بعد وہ شخص گرا تھا اور پھر شاید چاروں وہیل اس کے اوپر سے گزر گئے تھے۔

میں کار سے اترا تو وہ پہلے ہی اگلے بمپر کا معائنہ کر رہی تھی۔ ”تمہاری طرف کا بمپر ذرا سا ٹیڑھا ہو گیا ہے اور کوئی خاص نقصان نہیں ہوا۔“

میں اس کے لہجے پر کانپ کر رہ گیا، وہ واقعی سنگ دل تھی پہلی بار مجھے اس سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔

کچن میں پہنچ کر وہ معاً رک گئی اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ ”لیکن یقین کرو کہ اس حادثے پر مجھے بہت افسوس ہے لیکن میں گاڑی نہیں روک سکتی تھی۔“

”کیا وجہ ہے؟“

”صرف تمہاری وجہ سے لین اگر میں گاڑی روک کر اسے اسپتال لے جاتی تو اخبارات میں تمہارا نام بھی ضرور چھپتا اور اخبار جب مورگن ویل پہنچتے تو تمہاری بیوی یہ پڑھ کر کیا سوچتی کہ تم اس کی غیر موجودگی میں ایک اور لڑکی کے ساتھ رنگ ترنگ میں رہے تھے سنو...... ممکن ہے وہ اتنا زخمی نہ ہوا ہو۔“

”نہیں وہ مر چکا ہوگا۔“

”تم خوفزدہ ہو۔“ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا مگر میں نے اس سے کراہت محسوس کرتے ہوئے اسے دھکا دے کر الگ کر دیا۔ ”ہاں میں خوفزدہ ہوں، بے رحم عورت۔“

”پلیز آخری روز ایسی باتیں مت کرو، لین۔“ وہ ایک بار پھر قریب آئی تو میں نے زوردار تھپڑ اس کے گال پر مارا وہ لڑکھڑا کر دیوار سے جا ٹکرائی اسے اس حالت میں دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے قلبی طمانیت محسوس ہوئی اور میں نے اس کے پیٹ پر بھی جوتے سے ٹھوکر مار دی پھر میں فرنٹ روم میں آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

بہت دیر بعد وہ سسکیاں لیتی ہوئی ایک اور صوفے پر بیٹھ گئی میں نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں مجھے اس سے شدید نفرت کا احساس ہو رہا تھا وہ میری کیفیت کا اندازہ لگا کر کچھ دیر بعد بیڈ روم میں چلی گئی۔

اس رات میں صوفے پر ہی سو گیا لیکن بار بار میری آنکھ کھلتی رہی کیونکہ اب بھی وہ شخص میری آنکھوں میں گھوم رہا تھا جس کو ایڈی نے ٹکر ماری تھی۔

صبح ہوتے ہی میں نے اخبار اٹھا کر دیکھا حادثے کی خبر صفحہ اول پر تھی اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے عقب سے ایڈی کی آواز سنی۔

”مر گیا۔“ میں نے پلٹ کر جواب دیا۔ ”اس کے تین بچے تھے۔“ پھر میرا جسم غصے سے کانپنے لگا اور میں نے اخبار اس کے منہ پر دے مارا۔ ”پڑھ لو...... غور سے پڑھو اس کے تین بچے تھے جو اب یتیم خانے میں زندگی گزاریں گے بے رحم...... سنگ دل...... کمینی چڑیل۔“

وہ اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی اور پھر صوفے پر ڈال کر کمرے میں واپس چلی گئی۔

میں نے بھی آخری فیصلہ کر لیا آخری فیصلہ میں نے آتش دان میں چند لکڑیاں اور ڈال آگ مشتعل کی اور چھپی ہوئی خبر پر غور کرنے لگا۔ حادثے کے عینی شاہدین کا وجود تک نہ رہا لیکن پولیس کو لاش کے کپڑوں سے پینٹ

ٹکڑے ملے تھے جو یقیناً ایڈی کی کار سے الگ ہو کر چک گئے تھے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ اب وہی رنگ قاتل کار کی نشاندہی کرسکتا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ اگر وہ اس طرح ایڈی کی کار تک پہنچ گئے تو میں بھی اتنا ہی قصوروار قرار دیا جاؤں گا جتنی ایڈی......

اب میرے سامنے صرف ایک راستہ تھا۔ ایڈی اور اس کی کار سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔

پھر جب ایڈی فرنٹ روم میں واپس آئی تو اس کا چہرہ دھلا دھلا سا تھا وہ کالا سوئٹر پہنے ہوئے تھی اس کے ہاتھ میں ایک کیسٹ تھا۔

”خدا حافظ لین۔“ اس نے کیسٹ مجھے دیتے ہوئے کہا میں نے کیسٹ فوراً لے کر آتش دان میں ڈال دیا۔ ”انگوٹھی۔“

”خود اتار لو۔“ اس کا لہجہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ لیکن میں ذرا برابر بھی متاثر نہ ہوا اور میں نے بڑی بے دردی سے طلائی زنجیر کھینچ لی۔

”اف......!“ وہ تڑپ کر رہ گئی میں نے زنجیر سے انگوٹھی نکال کر اپنی انگلی میں پہنی اور زنجیر بھی آتش دان میں ڈال دی۔

”کیا واقعی جا رہے ہو؟“

”ہاں آج رات چلا جاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا اور اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ یہ سمجھ کر آئی تھی کہ میں فوراً روانہ ہو جاؤں گا۔ کیسٹ ضائع کرنے اور انگوٹھی واپس لینے کے بعد میں سکون سے صوفے پر بیٹھ گیا وہ بھی دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔ لیکن میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی پھر وہ اٹھ کر کمروں کی صفائی کرنے لگی میں صرف یہ سوچتا رہا کہ کیا پولیس والے رات ہونے سے قبل ایڈی کی کار تلاش کر لیں گے۔

ٹھیک آٹھ بجے میں اٹھ گیا بوربن کی پوری بوتل خالی ہو چکی تھی ایڈی فرنٹ روم کی ایک کرسی پر جس کی پشت میری طرف تھی نیم دراز ایک کتاب کے مطالعے میں منہمک تھی میں نے بوتل اٹھائی دبے قدموں اس کے عقب میں پہنچا اور اس سے قبل کہ وہ پلٹتی میں نے بوتل سر سے بلند کر کے پوری قوت استعمال کرتے ہوئے اس کے سر پر دے ماری، وہ کوئی آواز نکالے بغیر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ میں بوتل ایک طرف پھینک کر اس پر جھک گیا۔ اس کی سانس اب بھی چل رہی تھی۔

اگر وہ وہیں مر جاتی تو میرے لیے مسائل کھڑے نہ ہوتے مگر اس کا دل بدستور دھڑک رہا تھا۔

میں نے پھرتی سے کام لیتے ہوئے اس کے بے ہوش جسم کو فرکوٹ پہنایا پھر اپنا کوٹ پہنا تمام بتیاں گل کر دیں اور اس کے ہلکے پھلکے جسم کو اٹھا کر کار کی اگلی سیٹ پر ڈال دیا۔

گیراج سے نکلتے ہی میں نے اپنا رخ شمال کی طرف کر دیا بھری پری شاہراہوں کے بجائے ویران اور تنگ سڑکوں سے گزرتا ہوا کچھ ہی دیر بعد ریور برج پر پہنچ گیا میں نے کار اسی جگہ روکی جہاں حادثہ ہوا تھا۔

کار سے ایڈی کو کھینچ کر نکالنا زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا میں نے اس کے بے ہوش جسم کو کار کے اگلے وہیل کی سیدھ میں رکھا اور پھر کار میں بیٹھ کر پوری رفتار سے کار آگے بڑھا دی میں نے اس کی ہلکی سی بھی چیخ نہ سنی لیکن اس کی موت کا یقین کرنے کے لیے میں نے تین مرتبہ اس

تنہائیوں کا زہر اور ہم ہیں
دشمن سارا شہر ہے اور ہم ہیں
دیکھو کہاں تک لے جائے جنون آوارگی
اپنے گاؤں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
بیچ منجدھار ہے ناؤ بھی ڈگمگا رہی
بپھری ہر لہر ہے اور ہم ہیں دوستو
چاند نہا کر نکلا ہے روشنی کے تالاب سے
شب کا پچھلا پہر ہے اور ہم ہیں دوستو
کم شناس لوگ ہیں انجان سے راستے
کوئی اجنبی ہے اور ہم ہیں دوستو
کیا پاگل پن ہے ہاتھ میں چراغ ہیں
وقت سحر ہے اور ہم ہیں دوستو
لب مکان اور پیٹھ پیچھے خنجر ہیں
کوئی ظلمتوں کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو
حد نظر دور تک پیاس کے ریگستان عامر
شباب کی دوپہر ہے اور ہم ہیں دوستو

عامر زمان عامر...... بورے وال

کے اوپر سے کار گزاری پھر گاڑی سے اتر کر اس کے دل پر ہاتھ رکھا دل کی دھڑکنیں بند ہو چکی تھیں۔

پھر میں نے اسے اٹھا کر ڈرائیونگ سیٹ پر ڈالا، اس کی کمر کے گرد سیفٹی بیلٹ باندھی اور پھر گاڑی کو دھکا دیتا ہوا پل کی ریلنگ تک لے گیا۔ گاڑی بھی ایڈی کی طرح ہلکی پھلکی ہی تھی۔

مجھے گاڑی اسٹارٹ کرنے، گیئر میں ڈالنے اور پھر ایکسیلیٹر دبانے میں زیادہ مشکل نہ ہوئی، ایکسیلیٹر پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا لہٰذا گاڑی چار پانچ گز دور پہنچ کر خود بخود رک گئی۔

میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا لہٰذا اس مرتبہ ایڈی کے پیر نے ایکسیلیٹر پر رکھ کر دباؤ ڈالا گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھ کر ریلنگ سے ٹکرائی ریلنگ ٹوٹی اور اسپورٹس ایک آواز کے ساتھ دریا میں جا گری۔ اس کوشش میں مجھے بھی جھٹکا لگا تھا لہٰذا میں چند قدم دور جا گرا ور جب اٹھا تو میرے سر سے خون بہہ رہا تھا گھٹنے زخمی ہو رہے تھے اور آنکھ کے اوپر بھی زخم لگا تھا۔

میں دیر تک اندھیرے دریا میں جھانکتا رہا اور جب مجھے یقین ہوگیا کہ ایڈی اپنی اسپورٹس سمیت غرق ہو چکی ہے تو تھکے ہارے انداز میں پیدل ہی گھر جانے کے لیے پلٹ گیا اور یہی وہ مرحلہ تھا جہاں مجھے کچھ دور ایک شخص نظر آیا۔

''مسٹر کیا تم......!'' اس نے کچھ پوچھنا چاہا مگر میں اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی بھاگ کھڑا ہوا میں نے اپنے عقب میں اس کی آواز پھر سنی مگر رکا نہیں اور دوڑتا رہا کچھ دیر بعد میں کھیتوں میں پہنچ کر رک گیا۔ میں نے بے ترتیب سانس ٹھیک کی اور پھر شہر کی طرف جانے لگا۔

میں ہائی وے پر چل رہا تھا مجھے امید تھی کہ اب کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا مگر ابھی میں بہ مشکل دو میل ہی چلا تھا کہ مجھے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی اور دیکھتے ہی دیکھتے پٹرول کار نے مجھے پکڑ لیا مگر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ کار میرے قریب سے گزر گئی۔

جب میں اپنے گھر پہنچا تو صبح ہونے والی تھی میں اچھی طرح نہا دھو کر سگریٹ پینے لگا اب مجھے اخبار کا انتظار تھا چھ بجے اخبار آیا تو میں نے صفحہ اول دیکھا خبر جلی حروف میں موجود تھا۔

ایڈی جیکسن نامی ایک اٹھارہ سالہ لڑکی جس کا تعلق نیو آرلینز سے تھا تیز رفتاری کے باعث ہلاک ہوگئی پولیس کا کہنا ہے کہ اس کی اسپورٹس کار قابو سے باہر ہو کر ریور برج کی ریلنگ سے ٹکرائی اور دریا میں جا گری، کاؤنٹی شیرف نے انکشاف کیا ہے کہ یہ وہی کار تھی جس کی زد میں آ کر گزشتہ روز ایک آدمی ہلاک ہوگیا تھا اس کار کا پینٹ متوفی کے کپڑوں سے ملا تھا شیرف نے خیال ظاہر کیا ایڈی اتوار والے حادثے کی وجہ سے بہت پریشان ہوگی یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے ضمیر کے اس بوجھ سے پریشان ہو کر خودکشی کر لی ہو مزید تفتیش جاری ہے۔ اسی خبر کے ساتھ ایک اور خبر بھی تھی۔

پولیس کو ایڈی کے حادثے کی اطلاع ایک ٹاریسٹ آفیسر ہارووڈ نے دی اس کا کہنا ہے کہ وہ ایک درخت کے نیچے سو رہا تھا کہ اس نے ایک کار کو ریلنگ سے ٹکراتے اور دریا میں گرتے دیکھا۔ وہ فوراً ہائی وے کی طرف بھاگا تاکہ مدد حاصل کر سکے اسی دوران اس کی نظر ایک اور آدمی پر پڑی جو پکارنے پر فوراً وہاں سے بھاگ نکلا ہارووڈ کا کہنا ہے کہ تاریکی کی وجہ سے وہ فرار ہونے والے شخص کو شناخت نہ کر سکا تاہم......

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

اس روز میں کیمپس میں بہت مصروف رہا صبح کی کلاسیں لینا بہت مشکل ثابت ہوا لیکن میں نے بہرحال فرض نبھایا اور ایک بجے اپنے کمرے میں آ کر سستانے لگا میرے کمرے سے جمنازیم صاف نظر آتا تھا لہٰذا جب میری نظر ایک اجنبی پر پڑی تو میں چوکنا ہوگیا وہ طلبا سے باتیں کر رہا تھا پھر کسی طالب علم نے میرے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو اجنبی سیدھا میرے کمرے میں آ گیا۔

''آپ اسسٹنٹ کوچ، لین ہیں؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا پھر اس نے مجھے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ ''ذرا میرے ساتھ ہیڈ آفس چلیں۔''

میں نے زندگی میں پہلے کبھی پولیس اسٹیشن اندر سے نہ دیکھا تھا لیکن اس وقت مجبور ہو ہی گیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہ تھا۔

اب میلون نامی یہی افسر میرے سامنے کھڑا سگریٹ پی رہا ہے۔ ''اس کہانی کو دہرائیں تو اچھا ہے، لین......!'' وہ سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے بولا۔

''تم ایڈی سے واقف تھے؟''

''ایڈی؟'' میں نے چوکنا ہو کر کہا ''اگر تمہاری مر

لڑکی سے ہے، جو دریا میں کار سمیت گر کر مری ہے تو میرا

نی میں ہوگا۔''

''لیکن تمہیں یہ کس طرح معلوم ہوا کہ وہ دریا میں گر کر

ری ہے؟''

''اخبارات کے ذریعے۔'' میں نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

''وہ...... کالج آف فزکس کی طالبہ تھی۔''

''میری کلاس میں کبھی نہیں آئی تم خود کہہ رہے ہو کہ ں کا تعلق فزکس ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔''

''اوہ...... کیا تم اب بھی اس دعوے پر قائم ہو کہ تم اس ے واقف نہ تھے لین؟''

''یہ دعویٰ نہیں...... حقیقت ہے آفیسر۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ''سائمن ذرا اسے تو چلاؤ۔''

سائمن ایک کیسٹ پلیئر کی طرف بڑھ گیا میری سانس اٹک اٹک کر آنے لگی اور میں سوچنے لگا کہ کیسٹ تو میں نے ضائع کر دیا تھا میں نے خود آتش دان میں پھینکا تھا۔

پھر میں نے ایڈی کی آواز سنی اور اس کے بعد میری آواز کمرے میں گونجنے لگی وہی جملے تھے فحش، بے باک...... گندے اور غلیظ۔

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا کیسٹ تو میں خود نذرِ آتش کر چکا تھا تو کیا...... ایڈی کی روح مجھ سے انتقام لے رہی تھی۔

کیسٹ پلیئر بند کر دیا گیا۔

''ہاں...... لین...... اب کیا خیال ہے؟''

میں سمجھ گیا کہ اس چڑیل نے کیا حرکت کی ہوگی، اس نے مجھے کوئی اور کیسٹ دیا ہوگا۔

''ہمیں ایڈی کی خفیہ الماری سے درجنوں ایسے ہی کیسٹ ملے ہیں لین مگر یہ کیسٹ۔''

''ٹھیک ہے آفیسر۔ میں اس سے واقف تھا۔'' میں نے آخری دفاعی لائن پر پہنچتے ہوئے اعتراف کیا۔ ''میں صرف اس وجہ سے اعتراف نہیں کر رہا تھا کہ میں ایک بیوی کا شوہر ہوں اور اگر اس نے ان تعلقات کے بارے میں سن بھی لیا تو بڑا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ امید سے ہے اور

''مجھے تم سے ہمدردی

''میں تمہیں بعض ایسے نقطے بھی بتانا چاہ

میڈیکل رپورٹ میں شامل ہیں میڈیکل رپورٹ کے مطابق ایڈی کے سر پر کسی چیز سے حملہ کیا گیا تھا جس سے وہ بے ہوش ہوگئی تھی پھر اس کی ساری پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور پھیپھڑے پچکے ہوئے تھے وہ اس نوعیت کے حادثے میں اس طرح ہلاک ضرور ہو سکتی تھی بشرطیکہ سیفٹی بیلٹ بندھی ہوئی نہ ہوتی، سیفٹی بیلٹ سلامت ہے لہٰذا یہ کہنا غلط ہوگا کہ حادثے کی وجہ سے وہ اسٹیئرنگ وہیل سے اتنی شدت کے ساتھ ٹکرائی کہ اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور پھیپھڑے پچک گئے۔''

میں ساکت بیٹھا رہا میری قوتِ گویائی بھی ختم ہوگئی۔

''سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں اس کے کپڑوں پر ٹائر کے نشان ملے ہیں اس کے بالوں سے شیشے کے ذرے ملے ہیں جو کسی بوتل کے ہیں اسی قسم کے شیشے کے ٹکڑے اس کے فرنٹ روم سے بھی ملے اور وہیں بوربن کی ٹوٹی ہوئی بوتل بھی ہمارے ہاتھ لگی اور لین اس بوتل پر فنگر پرنٹس موجود ہیں۔''

میں اپنی ضد پر اڑا رہا مگر کب تک، میں رواروی میں اقبالِ جرم کر گیا۔

انہوں نے کیسٹ کو سربہ مہر کر کے میرے دستخط لیے اور پھر ایک فل اسکیپ کاغذ میرے سامنے رکھ دیا جس پر کوئی عبارت ٹائپ تھی میں صرف سرخ حروف پڑھ سکا۔

''اقبالِ جرم''

میں نے رات گئے اس پر دستخط کر دیے اور اب جیل میں ہوں یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر...... میں اپنی بیوی سے بے وفائی نہ کرتا تو آج اس مقام تک ہرگز نہ پہنچتا۔

اپنے دام میں

شاہدہ صدیقی

کسی بھی مصنف کے لیے ناول نگاری یا طویل کہانیاں تحریر کرنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن ایک صفحہ میں کسی مضمون یا آئیڈیا کو سمیٹنا دوسرے لفظوں میں مختصر نویسی بہت مشکل فن ہے۔

مغرب سے درآمد ایک مختصر کہانی' جیسے آپ نظر انداز نہیں کرسکیں گے۔

سراغرساں شیری ویسٹ پرہجوم ہوٹل لابی میں راستہ بناتی ہوئی لفٹ میں داخل ہوگئی۔ دسویں منزل پر اسے فورنزک ٹیم کا عملہ مل گیا جو پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔

"ہاں بھئی کیا معاملہ ہے؟" اس نے ایک افسر کیلی سے پوچھا۔

"جیک واٹکنس کی لاش ملی ہے۔" کیلی نے جواب دیا۔ "وہ اور اس کی بیوی اور ایک اور جوڑا یہاں ایک ہفتے کی تعطیلات گزارنے آئے ہوئے تھے۔"

"مجھے نام بتاؤ سب کے۔" شیری نے کہا۔

"بیوی کا نام ایلا ہے۔ دوسرے جوڑے کا نام ٹیری اور سنڈی جونز ہے۔"

شیری نے ایک چھوٹی سی نوٹ بک میں نام لکھ لیے تھے۔ "اب بتاؤ ہوا کیا ہے۔"

"دونوں جوڑے کیسینو میں، جوا کھیل رہے تھے۔ ان کا بعد میں شہر کے ایک بہت شاندار ریستوراں میں کھانے کا پروگرام تھا۔ وہ بڑی کلاس کی جگہ ہے۔ خیر، جیک واٹکنس تیاری کے لیے کیسینو سے سب سے پہلے اٹھ کر یہاں اپنے کمرے میں آیا تاکہ نہا دھو اور شیو کرکے کپڑے پہن کر تیار ہو جائے۔ باقی لوگ بعد میں آئے۔ جب وہ تیار ہو کے نکلے تو جیک کمرے سے باہر نہیں آیا تھا۔ تب ٹیری اسے بلانے کمرے میں آیا تو جیک اسے مردہ ملا۔"

"تو بیوی جب خود تیار ہونے آئی تو اس نے شوہر کو نہیں دیکھا تھا؟" شیری نے سوال کیا۔

"جیک واٹکنس خراٹے بہت لیتا تھا۔ اس کی بیوی اسی کمرے میں سو نہیں سکتی تھی۔ گھر میں بھی اس کی خوابگاہ الگ تھی۔ یہاں بھی ان کے کمرے الگ الگ تھے، اسی لیے اس وقت تک اسے پتا نہیں چلا جب تک ٹیری نے نہیں بتایا۔"

شیری سر ہلا کر رہ گئی۔

"جیک واٹکنس کی موت کیسے ہوئی ہے؟" شیری کا سوال تھا۔

"اسے گولی اس کے اپنے ریوالور سے ماری گئی ہے۔" کیلی نے بتایا۔ "وہ یہ ریوالور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ جوہری تھا اور اکثر اس کے پاس قیمتی جواہرات ہوتے تھے۔ اس بار حفاظت کی بجائے یہ ہتھیار ہی اس کی موت کا سبب بن گیا۔"

"اسے بہت قریب سے دل پر گولی لگی ہے، کافی خون بہا ہے۔ ابھی تم خود دیکھ لوگی۔ میڈیکل ایگزامنر کا کہنا ہے کہ اس قسم کے زخم سے موت چند منٹ میں ہی واقع ہو جاتی ہے۔"

کیلی سراغرساں شیری کو لیے مقتول جیک کے کمرے میں پہنچا۔ کئی پولیس اہلکار کمرے کو سراغوں کے لیے چھان رہے تھے۔ ان میں سے ایک شیری کے قریب آیا۔

"ہمیں ایک عجیب بات نظر آئی ہے۔ آپ دیکھیں گی کہ کمرے میں آتشدان ہے۔ ہوٹل والے اپنے مہمانوں سے اس کے استعمال کی توقع تو نہیں رکھتے کیونکہ یہاں سینٹرل ہیٹنگ ہے لیکن یہ آتشدان کام کرتے ہیں۔ کسی نے اس کمرے کے آتشدان کو استعمال بھی کیا ہے اور اس بات کو زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی۔ ہمیں آتشدان میں سے یہ چیزیں ملی ہیں۔"

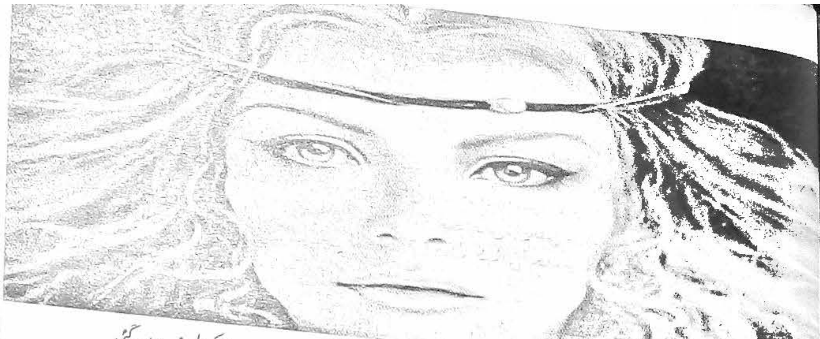

اس کے ساتھ ہی اس نے ایک شہادتیں جمع کرنے والی شفاف تھیلی شیری کو دکھائی جس میں اس نے راکھ میں لتھڑی کچھ چیزیں جمع کی ہوئی تھیں۔ شیری نے نوٹ کیا کہ راکھ کا ڈھیر کچھ مختلف سا ہے وہ لکڑی یا کاغذ کی جلی ہوئی راکھ جیسا نہیں تھا۔ دوسرے شہادتی تھیلے میں پلاسٹک اور دھات کے سات پگھلے ہوئے ٹکڑے تھے۔ ان کے ساتھ ایک جلا ہوا دھاتی ٹکڑا تھا جو کسی قسم کا کلپ لگ رہا تھا۔

"تم نے کمرے کی پوری تلاشی لے لی ہے؟" شیری نے پوچھا۔

ہاں! یہ فہرست دیکھ لیجیے۔" اس نے ایک کاغذ آگے بڑھایا۔

شیری نے پڑھا۔ "پانچ بنیان، پانچ انڈرویئر، بھورے موزوں کی تین جوڑی، دو جوڑی نیلے موزے، دو نیلی ڈریس قمیصیں، تین اسپورٹس قمیصیں، دو سویٹر، چھ پتلونیں: دو بادامی، دو نیلی اور دو کالی، ایک کالی بیلٹ اور چھ ٹائیاں، سب جدید قسم کی اور مختلف رنگوں کی پتلونوں اور قمیصوں سے میچنگ۔ دو اسپورٹس جیکٹس بھی تھیں، ایک بادامی اور دوسری نیلی، ایک جوڑی براؤن جوتوں کی اور ایک ٹریزز کی۔ ایک الیکٹرک ریزر، آفٹر شیو لوشن، ٹوتھ پیسٹ اور ٹوتھ برش۔ شب خوابی کا لباس اور سات رومال۔"

"بس یہی ہے؟" شیری نے پوچھا۔

"ہاں۔ معمول کی کچھ اشیا جسم پر سے ملیں، جیسے بٹوا، چابیاں، کچھ نقدی۔ آپ لاش کے معائنے کے لیے تیار ہیں؟"

ہاں' آؤ۔" یہ کہتے ہوئے وہ بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔

جیک واٹکنس کی لاش بستر کے قریب فرش پر پڑی تھی۔ اس کی جسامت خاصی بڑی تھی اور وہ منہ کے بل پڑا تھا۔ اس کا دایاں بازو پھیلا ہوا اور بایاں جسم کے نیچے دب گیا تھا۔ جسم کے نیچے کافی خون نظر آ رہا تھا۔

واٹکنس انڈرویئر اور چپل پہنے ہوئے تھا۔ دایاں ہاتھ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس نے مرنے سے پہلے اپنا خون آلود ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی ہو۔" شیری بڑے غور سے لاش کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئی تھیں۔ اس نے بیڈ کی طرف رخ کیا۔

بیڈ پر شام کو پہننے کی ایک شاندار پتلون اور کوٹ پڑا تھا اور سرخ رنگ کا ریشمی کمر کا پٹکا جو کمر پر پتلون کے اوپر باندھا جاتا ہے، اس کے ساتھ سیاہ موزے۔ سیاہ جوتے بیڈ کی پائنتی کے پاس فرش پر پڑے تھے۔

"ایسا لگتا ہے کہ وہ کپڑے پہن ہی نہیں پایا۔" شیری نے کہا۔ "چلو! میں باقی لوگوں سے ملنا چاہتی ہوں۔ وہ سب کہاں ہیں؟"

"ایلا واٹکنس کے کمرے میں۔" کیلی نے جواب دیا۔

شیری' ایلا کے کمرے میں گئی جہاں تین افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ تینوں کی رنگت زرد اور اداسی چہروں پر چھائی ہوئی تھی۔ ایلا واٹکنس کا تعارف پہلے کرایا گیا۔ لگتا تھا وہ روتی رہی ہے۔ وہ پیلے رنگ کا ایک لمبا ایوننگ گاؤن پہنے

ہوئے تھی۔ جوتے اور پرس اس سے میچنگ کر رہے تھے۔ وہ چھوٹے قد کی عورت تھی۔

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا کہنے والی ہیں۔" وہ سسکی لے کر بولی۔ "آپ کہیں گی کہ جیک کو میں نے قتل کیا ہے کیونکہ میں اس کی عیاشیوں سے نفرت کرتی تھی لیکن یہ سچ نہیں۔ اس کے افیئرز تھے تو کیا؟ وہ محبت صرف مجھ ہی سے کرتا تھا۔"

شیری کی بھویں یہ سن کر اوپر اٹھ گئی تھیں اور اس کا رخ ٹیری جونز کی طرف ہو گیا تھا۔ کبھی وہ ہینڈسم رہا ہوگا اور اب اس پر عمر کے اثرات غالب آ رہے تھے۔ جونز ٹکسیڈو، سفید قمیص اور سیاہ بو ٹائی پہنے ہوئے تھا۔

"ایلا کافی صدمے میں ہے۔" ٹیری نے ایلا کے بارے میں کہا۔ "جیک اس سے واقعی بہت محبت کرتا تھا اگرچہ وہ ادھر ادھر منہ مارتا رہتا تھا۔ ہم دونوں پارٹنر تھے اور اس نے مجھ کو رازدار بنا رکھا تھا۔"

"پارٹنرز؟" شیری نے پوچھا۔ "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اب آپ پورے کاروبار کے مالک ہوں گے؟"

"ہاں لیکن......" ٹیری کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔

"اور آپ کا کیا کہنا ہے؟" شیری نے سنڈی سے پوچھا جو ایک دراز قد پروقار خاتون تھی اور سرخ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔

"آپ بہت خوب صورت ہیں۔ برا نہ مانیے گا اگر میں یہ پوچھوں کہ کیا جیک واٹکنس آپ میں بھی دلچسپی لیتے تھے؟"

"اوہ خدایا! نہیں۔" وہ بولی۔ "اس نے کوشش ضرور کی تھی۔ معاف کرنا ایلا لیکن سچ یہ ہے کہ تمہارے شوہر نے کئی بار دلچسپی کا اظہار کیا لیکن میں نے ہمت افزائی نہیں کی اور ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق کبھی نہیں ہوا۔"

"اگر میری معلومات درست ہیں تو جیک واٹکنس ڈنر کے لیے سب سے پہلے تیار ہو نے اپنے کمرے میں گئے۔" سراغرساں شیری نے کہا۔ "جبکہ آپ تینوں کیسینو میں ہی تھے۔ کیا آپ سب ساتھ تھے؟"

"نہیں۔" ٹیری جونز بولا۔ "میں تو بلیک جیک کھیل رہا تھا۔"

"میں سلاٹ مشین پر تھی۔" ایلا واٹکنس نے بتایا۔

"اور میں راؤلٹ وہیل پر۔" سنڈی جونز نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ تینوں میں سے کوئی ایک جیک کے کمرے میں اس وقت سے پہلے گیا جو اس نے ظاہر کیا ہے۔" شیری نے کہا۔ "اس کی جیک سے جھڑپ ہوئی اور اس نے جیک کے ہی ریوالور سے اس کو مار ڈالا اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھے پتا ہے کہ وہ کون تھا۔ جونہی مجھے شہادتوں کا معائنہ کرنے کا موقع ملا مجھے یقین ہے کہ میں اسے ثابت کر دوں گی۔"

جب شیری نے موقع واردات کا معائنہ کیا تھا تو اس نے نوٹ کیا کہ کوئی چیز وہاں سے غائب تھی۔ جیک واٹکنس ایک شاندار ریستوراں میں شاندار ڈنر کے لیے جانے والا تھا لیکن کمرے میں کہیں سفید ڈریس قمیص، بو ٹائی یا بٹن نظر نہیں آئے جو ٹکسیڈو میں لگائے جاتے ہیں۔

پھر اسے جیک کے ہاتھ پر لگا خون یاد تھا۔ کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جس سے پتا چلتا کہ اس نے اپنا ہاتھ اس سے صاف کرنے کی کوشش کی ہو۔ شیری کا اندازہ تھا کہ گولی لگنے کے بعد جیک نے اپنے زخم کو دبایا ہوگا اور ہاتھ خون میں بھر گیا ہوگا اور پھر اس نے وہی ہاتھ قریب ترین شے سے ٹکرایا' اپنے قاتل کے کپڑوں سے۔

قاتل جیک کے کمرے سے خون آلود کپڑوں میں کیسے نکل سکتا تھا۔ لہذا اس نے وہ کپڑے اتارے، ان کو آتشدان میں جلایا اور جیک واٹکنس کی قمیص پہن کر ٹائی اور بٹن لگا لیے۔

گروپ میں قمیص، ٹائی اور بٹن والا صرف ایک ہی شخص تھا۔ ٹیری جونز۔

فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھولیں گی

بھاٹی گیٹ کاروبن گھوش	امین صدرالدین بھایانی
بازگشت	سلیم اختر
خوب صورت	محمد سلیم کرد

''بس کا کے نہ پوچھ لاہور شہر کی بے ہنگم ٹریفک کا۔ صرف شاہ عالمی اور اکبری منڈی تک ہی تو گیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو شادے کا۔ اُس نے مجھے کل ہی کہہ دیا تھا کہ استاد دونوں یہاں سے کٹھے ہی میٹری پک اپ پر نکل چلیں گے۔ سویرے کے جو ہم دونوں نکلے ہیں تو اب شام کا ویلہ ہونے کو آیا ہے تو واپس آئے ہیں۔ وہاں جاؤ تو ٹریفک جام اور واپس آؤ تو ٹریفک جام۔ سونے پہ سہاگہ وہاں کا پالیوشن۔ پہلے اکبری منڈی آٹا، سوجی، نمک، چائے، چینی، چاول، دالیں اور مرچ مصالحے لینا تھے۔ وہاں اتنا شدید ٹریفک جام تھا کہ بس اللہ کی پناہ! میٹری تو ظہر بھی قضاء ہوگئی۔ وہاں سے شاہ عالمی چونک اور پھر آگے رنگ محل چونک سے ہوتے ہوئے کسیرا بازار گئے۔ ہوٹل کی دیگیں جو قلعی کروانی تھیں اور کچھ نئے برتن بھانڈے بھی لینے تھے۔ فارغ ہو کر وہیں آگے شاہ عالمی کی نی ویں مسیت میں قضاء اور عصر پڑھی۔ واپسی میں بھی آدھے سے زیادہ وقت تو ٹریفک میں ہی پھنسے رہے۔''

رفیق استاد کے چہرے کے ساتھ اُس کی آواز سے بھی بھرپور تکان ظاہر ہو رہی تھی۔ اتنا کہہ کر وہ کاؤنٹر کے نیچے لگی دراز کھول کر چیزیں اُلٹنے پلٹنے لگا۔ اُس کا ہاتھ دراز سے باہر آیا تو انگلیوں میں ایک سی ڈی دبی ہوئی تھی۔ سی ڈی دیکھ کر مشتاق اور گامے کے چہرے پر ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ نظر آئی۔ ایک دوسرے کو آنکھ کے گوشے میچ کر کھسکنے کا اشارہ کیا اور ہوٹل کے باہر جانے والے دروازے کی جانب مڑ گئے تاکہ رفیق استاد کی ہدایت کے موجب شادے کی پک اپ پر لدے سامان کو ہوٹل کے عقبی گودام میں منتقل کر دیں۔

رفیق استاد نے سی ڈی کو نیچے جھک کر پلیئر میں لگا دیا اور پھر جھٹ سے ایک کل دبا دی۔ ذرا سی دیر میں اسپیکروں سے دھیرے دھیرے سنتور اور اُس میں مدغم ہوتی جلترنگ کی تانیں اُبھریں۔ ان دونوں سازوں کے مدھر سنگیت کے مختصر سے انگ کے اختتام پر پیانو کا چھوٹا سا انگ ابھر کر تھما تو خان صاحب مہدی حسن خان کی من موہنی سی مدھری آواز میں بول اُبھرے

پیار بھرے......!

بولوں کے درمیان ایک لمحے کا وقفہ آیا۔ پھر پیانو کی دو تانوں کے ساتھ اگلے بول سنائی دیئے اور ہمراہ طبلے کی سنگت کا آغاز ہوا۔ پیانو اور طبلے کا ساتھ بانسری کی ہلکی مگر دل موہ لینے والی تانوں نے دیا

دو شرمیلے نین
جن سے ملا میرے دل کو چین
کوئی جانے نہ کیوں مجھ سے شرمائیں
کیسے مجھے تڑپائیں
پیار بھرے دو شرمیلے نین......!!!

استھائی اور انترہ مکمل ہوا تو دیگر تمام آلاتِ موسیقی پرستار کی روح کو جھنجوڑتی تانیں حاوی ہوتی چلی گئیں اور وائلن نوازوں نے اُس کا بھرپور ساتھ دینا شروع کر دیا۔ رفیق استاد تو جیسے مہدی حسن کی آواز، ساتھ سنگت کرتی موسیقی کی تانوں، گیت کے رومانوی بولوں اور رُوح کی گہرائیوں تک اتر جانے والی مدھر دھن کے جادو کا اسیر ہی ہو چکا ہو۔ نیم وا آنکھوں سے سر دُھنتا ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی جہانِ دیگر کی سیر کرتا پھر رہا ہو۔

باہر کھڑے گامے نے جب ہوٹل کے دروازے سے اندر جھانکا تو رفیق استاد کو اِس حال میں دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ ناچ اُٹھی۔ مشتاق جو آٹے کی بوری کو پک اپ سے نیچے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا کے کاندھے کو ہلاتے ہوئے بولا۔ ''واہ بھئی واہ، ہیرو! اپنا استاد بھی کوئی تجھ سے کم نہیں۔ تو انڈین فلموں کے آئٹم سانگ سن کر تو وہ پاکستانی فلموں کے گانے سن کر ٹن ہو جاتا ہے۔ اندر جھانک کر تو دیکھ کیسا جھوم رہا ہے۔ کہیں کوئی گاہک اِس

حال میں دیکھ کر بل چکائے بنا ہی اڑن چھو نہ ہو جائے۔''

''ہاں یہ تو سچ ہے کہ اپنا استاد پاکستانی فلمی گیتوں کا بڑا ہی پکا عاشق ہے۔ بوڑھا ہونے کو جو آیا ہے اور اُس کی پسند بھی بوڑھوں جیسی ہی ہے۔ بھلا ''بیڑی جلئی لے'' اور ''ہلکٹ جوانی'' جیسے دھانسو آئٹم سانگز میں جو دم ہے وہ اُس کے اِن تھکے ہوئے گیتوں میں کہاں۔'' مشتاق آٹے کی ایک بوری پر دوسری بوری رکھتا ہوا بولا۔

''ہاں یہ بات تو نے سولہ آنے ٹھیک بولی۔ لیکن کچھ بھی ہو، اپنا استاد ہے دل کا راجہ، کیا سمجھا۔'' گاما اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تو اِس بات سے کون انکار کرتا ہے۔ تجھے استاد کا آسرا نہ بھی ملتا تو تیری خیر تھی۔ شکر کر کہ تیرا حال مجھ سا نہیں۔ نہ آگا نہ پیچھا۔ کوئی چھ برس کی عمر تھی میری جب استاد مجھے ایک دن موری گیٹ کے سامنے اُردو بازار کے ایک کونے پر کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے کوڑا چنتے ہوئے ترس کھا کر پکڑ لایا تھا۔ آج دس بارہ سال ہو گئے۔ اُس کی مہربانی ہے کہ اُس نے اپنے پاس رکھا، کھلایا پلایا، پہلے تو مجھے یہیں محلے ہی کے ایک سرکاری پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا اور پھر میرے شوق اور اچھی تعلیمی استعداد کے سبب شیراں والا گیٹ کے گورنمنٹ اسلامیہ ہائی اسکول میں داخلہ دلوایا۔ جہاں سے بڑے ہی اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد اب تیری دعاؤں اور اللہ کے بعد رفیق استاد کی مہربانیوں سے چند ماہ قبل ہی میرا داخلہ رجحان ٹسٹ پاس کر کے نیشنل کالج آف آرٹس میں فلم و ٹیلی وژن کے بیچلرز ڈگری کے چار سالہ پروگرام میں ہو گیا ہے۔ کالج سے آ کر ہوٹل سنبھالتا ہوں۔ استاد نے صرف داخلہ، رجسٹریشن اور امتحانی فیس ہی کی مد میں کوئی دس ہزار خود میرے ساتھ جا کر جمع کروایا اور اب ہر ماہ تقریباً پانچ ہزار فیس بھی خود ہی کالج جا کر اپنے ہاتھوں سے جمع کرواتا ہے۔ میں نے استاد سے کہا بھی تھا کہ مجھے کسی شام کے کالج میں ہی ایف اے شیف اے کر لینے دو لیکن وہ بولا۔ ''نہ کا کا نہ......! میں چاہتا ہوں کہ تو وہی تعلیم حاصل کڑے جس کا کہ تجھے شوق ہے۔ ویسے بھی سویرے سویرے ہوٹل کا کاڑوبار ذرا ٹھنڈا منڈا سا ہی ہوتا ہے۔ میں اور غفوڑ کام سنبھال لیا کڑیں گے۔ کاکا تو جم جم پڑھائیاں کڑ۔ اصل ڑونق میلہ تو دوپہڑ، شام اور ڑات میں ہی ہوتا ہے۔ تو نے بے فکڑ ہو کڑ سویرے کالج جانڑا ایں تے پڑھائی اور ہوٹل دوویں بہتے اچھے طڑیقے سے سنبھالنا ہے۔ آخڑ کو تو میٹرے ہوٹل کا منی جڑ ہے۔ پوڑے بھاٹی میں ہے ڑفیق استاد کی ٹکڑ کا کوئی ایک بھی ہوٹل نہیں۔ خبڑدار جو کالج میں کسی الٹے سیدھے چکڑوں میں پڑا۔ تو نے کوئی بھی ایسا ویسا کام نہیں کڑنا جس سے تیڑے ڑفیق استاد اور اُس کے ہوٹل کے نام پڑ کوئی بٹہ لگے۔''

''ہاں ہاں ساری رام کتھا کی اپن کو خبر ہے۔ بولے تو جیاستی ٹرٹینس منگتا۔'' گامے نے اپنی قمیض کے کالروں کو انگلیوں سے پکڑ کر اُچکایا اور گردن کو ذرا سا خم دیتے ہوئے بولا۔

''ابے جو استاد نے سن لیا نہ تو اب کی بار نہیں چھوڑے گا اور تیرے ساتھ رہ رہ کر تو میری زبان بھی اب یونہی ہر وقت پھسلتی ہی رہتی ہے۔ استاد سچ ہی کہتا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔'' مشتاق مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ویسے تو بھی تو میرے کچھ پیچھے ہی استاد کے پاس آیا تھا نا؟ کیا ہی اچھا ہوتا کہ جو تو بھی آگے اور پڑھ لیتا۔'' مشتاق نے اُس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''ہاں میں جب آٹھ نو سال کا تھا تو اپنے محلے یکی دروازہ جہاں پرانے کپڑوں کی جلال دین مارکیٹ کے ساتھ والے محلے میں ہمارا گھر ہے، میرا ابا وہیں پرانے کپڑوں کی دکان میں کپڑوں کی چھٹائی اور مرمت کرنے کی نوکری کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہے۔ وہاں سے پیدل چلتا ہوا داتا دربار لنگر کھانے جاتا۔ ایک روز وہاں استاد نے مجھے چند بڑے لڑکوں سے بچا کر گھر پہنچایا جو میرا لنگر چھیننا چاہتے تھے اور میرے نہ دینے پر مجھے مار رہے تھے۔ میری اماں نے مجھے اُس کے سامنے ہی کوسنے دے دے کر مارنا شروع کر دیا۔ ویسے قصور میرا ہی تھا...... وہ مجھے تیار کر کے اسکول روانہ کرتی اور میں روز اسکول سے بھاگ کر داتا دربار لنگر کھانے چلا جاتا۔''

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

استاد نے یہ ساری باتیں سن کر میری اماں سے کہا۔ "اُسے ڑوز اندڑون بھاٹی گیٹ، بازاڑ حکیماں والا میں میڑے ہوٹل بھیج دیا کڑیں۔ میں ڑوز کچھ پیسے بھی دے دیا کڑوں گا۔ میڑے پاس ایک اوڑ کاکا اِسی کی عمڑ کا ہے۔ یہ اُس کے ساتھ سکول چلا جایا کڑے گا۔ مشتاق پڑھا کو کاکا ہے۔ اُس کے ساتھ ڑہے گا تو اِس کا بھی دل پڑھائی میں لگ جائے گا اوڑ اِس کی آوارہ گڑدیاں بھی ختم ہو جاویں گی۔"

"لیکن مشتاق مامے......! تو نے تو پڑھ لیا لیکن اپن کا حال تو جو تب تھا سو اب ہے۔ استاد مجھے اسکول بھیجتا اور میں وہاں سے بھاگ کر پھر ہوٹل آ جاتا۔ یوں میرا نام کئی بار اسکول سے کٹا۔ بے چارا استاد تو بہت کوشش کرتا رہا لیکن اپنا پڑھائی میں جی ہی نہیں لگتا۔ پھر بھی جیسے تیسے کر کے استاد نے پیار، محبت، دھونس، ترلے، دھمکی، غصہ اور ناراضگی دکھا کر اور دو چار بار کی کمپارٹمیٹوں کے بعد میٹرک ۳۳ فیصدی نمبروں ہی سے سہی، پاس کروا کر ہی چھوڑا۔ لیکن اب تو وہ بھی مجھ سے ہار مان گیا ہے۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ اب آگے مجھ سے نہیں پڑھا جائے گا۔ باقی رہی بات فلمی بھاشا کی۔ یہ تو میں استاد کو تپا کر اُس کے مزے لینے کے لیے بولتا ہوں۔ تجھے تو پتا ہی ہے نہ کہ وہ ایسی باتوں سے کتنا چڑتا ہے۔"

اِن ساری باتوں کے دوران پک اپ پر لدھا سارا سامان گودام میں رکھوا کر جب دونوں واپس ہوٹل کے اندر آئے تو استاد رفیق اُسی طرح آنکھیں نیم وا کیے جھوم رہا تھا۔ اب ہوٹل میں مہدی حسن کی جگہ مجیب عالم کی آواز گونج رہی تھی۔

وہ میرے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں
میرے ہر خواب کی تعبیر بنے بیٹھے ہیں

استاد کا سر اور جسم گانے کی دھن پر جھوم رہا تھا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کاؤنٹر پر یوں چلا رہا تھا جیسے اُس گانے میں بجتا پیانو وہ ہی تو بجا رہا ہو۔ گانے میں جہاں جہاں پیانو رکتا تو ستار کے چھوٹے چھوٹے انگ بجنا شروع ہوتے۔ استاد اپنا ہاتھ سینے کے ساتھ اُلٹا کھڑا کر کے کہنی پر اپنی انگلیوں کو یوں چلانا شروع کر دیا جیسے اُس جیسا ماہر فن ستار نواز تو آج تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ مشتاق اور گامے سمیت ہوٹل میں بیٹھے بہت سے گاہکوں کی نظریں استاد پر ٹکیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں۔

"استاد سُنتا ذرا......" مشتاق کی تیز آواز سُن کر نیم وا آنکھیں کیے جھومتے رفیق استاد نے جیسے ہی آنکھیں وا کیں وہ فوراً ہی بولا۔ "آج کی خریداری کی ساری رسیدیں اگر دے دیں تو میں اُنہیں حساب کتاب میں چڑھا لوں۔"

"ہاں کاکا...... کیوں نہیں......، کیوں نہیں......، میڑے ہوٹل کا منی جڑ ہی نہیں بلکہ چیف اکاؤنٹینٹ اور جنڑل منی جڑ بھی تُو ہی تو ہے۔" یہ کہتے ہوئے رفیق استاد نے اپنی قمیض کی سامنے والی جیب سے بہت ساری رسیدیں نکال کر مشتاق کے ہاتھ پر دھر دیں۔ "اگڑ کچھ سمجھ نہ آوے تو بیشک جتنی واڑی چاہے پوچھ لینڑا اں۔" ابھی وہ اتنا ہی بولا تھا کہ وہ گانا ختم ہوا اور رونا لیلیٰ کی آواز ابھری۔

ہمیں کھو کر بہت پچھتاؤ گے جب ہم نہیں ہوں گے
بھری دنیا کو ویراں پاؤ گے جب ہم نہیں ہوں گے

مشتاق ساری رسیدوں کو سنبھالتا ہوا فوراً وہاں سے کھسک لیا کیونکہ یہ بات اُس سے بہتر بھلا کون جان سکتا تھا کہ اگر جواب وہ استاد کے سامنے ایک لمحہ اور کھڑا رہا تو پھر اُستاد گانے، دھن، شاعری، موسیقی اور ایک ایک ساز کی تعریف میں وہ وہ لیکچر پلائے گا کہ دماغ کی اُوپر نیچے اور آگے پیچھے کی ساری چولیں ہل کر رہ جائیں گی۔ مشتاق ایک کونے میں جا کر اپنے حساب کتاب اور گاما باورچی خانے کے کاموں کا جائزہ لینے میں جُت گیا۔ رفیق استاد کاؤنٹر پر بیٹھا گاہکوں سے وصولیاں کرنے کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا گانا جھومتا جھامتا سنے جا رہا تھا۔ جہاں ایک سی ڈی ختم ہوئی دوسری لوڈ کر دی۔ مغرب اور عشاء کی اذانوں کے وقت گیت مالائی سلسلے کو بند کر کے وہ مسجد نماز پڑھنے چلا گیا۔ اُس کی جگہ مشتاق کاؤنٹر پر آ بیٹھا اور اُس کے واپس آنے کے بعد مشتاق اور گاما باری باری نماز پڑھ آئے۔

کوئی رات ساڑھے نو کے قریب وہ تینوں کھانا کھانے کے لیے ایک میز پر آ بیٹھے۔ یہ روز کا معمول تھا۔ وہ رات کا کھانا ساتھ ہوٹل ہی میں کھاتے۔ اُس روز کھانے کی میز پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خاموشی تھی۔ سب سر جھکائے کھانا کھانے میں مشغول تھے۔ گامے نے میز کے نیچے مشتاق کے پیر کو اپنے پیر سے چھوا۔ وہ متوجہ ہوا تو گامے نے آنکھوں سے اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو۔ "استاد سے بات کرو......!" جواباً اُس نے اپنے سر کو نفی میں ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ "نہیں تم بات کرو......!" گامے نے یوں منہ بنایا جیسے کہہ رہا ہو۔ "تم بس استاد سے ڈرتے ہی رہنا......!!!"

"اپن کو ایک بات بولنے کا ہے استاد۔" گامے نے لقمہ نگلتے ہوئے کہا۔ "ہاں بولو کاکا غفوڑ کیا بات ہے؟" استاد نے پانی کے جگ سے گلاس بھرتے ہوئے پوچھا۔

"استاد وہ کیا ہے نا کہ تو ہم دونوں کو اتوار کے اتوار چھٹی دیتا ہے۔ ہم دونوں کو فلمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ویسے سچ پوچھ استاد دل تو اپنا سنے پلیکس جانے کا کرتا ہے لیکن وہاں کا ٹکٹ اپنی حیثیت سے بہت جیاتی ہے۔ سو میں اور مشتاق ماما داتا دربار روڈ والے بھائی سنیما میں لاسٹ شو دیکھنے چلے جاتے ہیں۔ مامے اور گامے نے سوچا کہ اب کی بار استاد کو بھی ضرور لے چلنا ہے۔ مت پوچھ استاد کیا پٹاخہ فلم ریلیز ہوئی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک آئٹم سانگ۔ اللہ قسم استاد یقین نہ آئے تو مامے سے پوچھ لے۔ وہ پچھلے ہفتے جو فلم دیکھی تھی نا۔ واہ کیا لش پش تھی۔ فلم کے آئٹم سانگ نے تو سنیما میں جیسے آگ ہی لگا دی۔ سنیما میں بیٹھے سارے منچلے ٹھرکی روپے دو روپے والی ریزگاری اسکرین پر اچھال اچھال کر ہیروین کو وہ داد دے رہے تھے کہ بس مزا ہی آ گیا۔ تو پھر استاد گل مک گئی جے۔ اب تم بھی اِس اتوار کو ہمارے ساتھ چل رہے ہو۔"

رفیق استاد گامے کی ساری بات خاموشی سے ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ سنتا رہا جسے کوئی معنیٰ پہنانا بڑا ہی مُشکل تھا۔ جیسے ہی گاما خاموش ہوا اُستاد نے اپنی نگاہیں اُس کے چہرے سے ہٹا لیں اور دُور خلاؤں میں کہیں گھورنے لگا۔

گاما دادطلب نگاہوں سے مشتاق کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ "دیکھا مامے......! تُو تو ایویں ہی استاد سے ڈر رہا تھا......!!!"

استاد کے چہرے پر سنجیدگی اور آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ "استاد تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟" مشتاق نے گامے کے بات کرنے کے دوران استاد کی مسکراہٹ کے پیشِ نظر ہمت پکڑتے ہوئے سوال کر ہی ڈالا۔

"کاکا تم لوگ جہاں کہو گے وہاں چلوں گا۔" استاد نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگو پہلے میں تم دونوں کو ایک کہانی سنانے لگا ہوں۔"

"کہانی......! کیسی کہانی استاد......!!!؟" مشتاق حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "سوال مت پوچھو، بس سنتے جاؤ۔"

"اچھا چلو استاد سناؤ کہانی!" مشتاق سعادتمندی سے بولا۔

"اِسی بھائی دڑوجے میں ایک نکا جیاء کاکا ڑہا کڑتا تھا۔" استاد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع ہوا۔ "چھوٹا سا تھا تو اُس کا ابا اللہ کو پیاڑا ہو گیا۔ اُس نکے جیءٔ کاکے کی عمڑ اُس ویلے کوئی چھے سات وڑے ہوگی۔ اُس سے تین چھوٹے بہن بھڑا اوڑ بھی تھے۔ بے بے اُس کی نے لوگوں کے گھڑوں میں کام کاج کڑنا شروع کڑ دیا لیکن پھڑ بھی گھڑ کا خرچہ چلانا بہت مُشکل ہو گیا تھا۔ ایک دن اُس کے ابے کا چھڑا بھائی جسے سارے بچے چاچا شوکی کہہ کڑ بلاتے تھے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

گھڑ آیا اور بے بے سے کچھ کہا۔ جاتے ویلے کاکے کا ہاتھ پکڑ کڑ ساتھ ہی لے گیا اور دونوں ایک مزدے میں سواڑ ہو گئے۔ مزدا بہت دیڑ تک چلتا ڑہا۔ شہڑ سے باہڑ نکل کڑ ویڑان سے علاقے میں ایک شٹاپ پڑ ڑکا تو چاچا شوکی کاکے کو لے کڑ اتڑ گیا۔ سڑک پاڑ ایک بہت بڑی جالی داڑ آہنی پھاٹک والی نیچی سی عماڑت تھی جس کا پھاٹک تو بند تھا لیکن باہڑ لوگوں کی ایک بھیڑ جمع تھی۔ جیسے وہ ساڑے ہی اندڑ جانا چاہتے ہوں۔ چاچا شوکی بھیڑ کو چیڑتا ہوا پھاٹک تک پہنچا۔ چوکیداڑ نے جو شاید اُسے پہچانتا تھا اندڑ جانے دیا۔ عماڑت کے ایک کونے میں چاچا شوکی چائے کی کنٹین چلاتا تھا۔ وہ کاکے کو مددگاڑ کے طوڑ پڑ کام کڑنے کے واسطے لایا تھا۔ چاچا شوکی ساڑا وقت ایک بڑے پتیلے میں چائے اُبالتا ڑہتا۔ چھوٹا کاکا ایک دوسڑے کاکے کے ساتھ جسے سب بالا بالا کہہ کڑ پکاڑتے اور عمڑ میں اُس سے کچھ چاڑ پانچ سال بڑا تھا، چائے کو شیشے کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں بھڑ کڑ لوہے کی ایک جالی جس میں چائے کے گلاسوں کو لٹکانے کے لیے گول گول دائڑے بنے ہوتے پھنسا کڑ عماڑت کے اندڑ بنے بڑے بڑے تاڑ یک کمڑوں اوڑ دوسڑی طرف بنے دفاتڑ میں کام کڑتے لوگوں کو چائے پہنچاتا اور پھڑ تھوڑی دیڑ بعد واپس جا کڑ چائے کے خالی گلاس سمیٹ کڑ واپس لے آتا۔ چند دنوں بعد اُسے پتہ چلا کہ بند پھاٹک والی وہ نیچی عماڑت جس کے باہڑ ہڑ وقت لوگوں کا ایک جمِ غفیڑ ہوتا ہے دڑ اصل لاہوڑ شہڑ کا مشہوڑ ایوڑ نیو اسٹوڈیو ہے اور وہ بڑے بڑے تاڑ یک کمڑے دڑ اصل اسٹوڈیو کے مختلف شوٹنگ فلوڑ اوڑ دوسڑی طرف فلم کومپنیوں، فلمسازوں، ہدایت کاڑوں، کہانی نویسوں اور بڑے بڑے اداکاڑوں کے دفاتڑ تھے۔"

"ایوڑ نیو اسٹوڈیو......! ارے استاد وہاں تو ایک زمانے میں پاکستانی فلمیں بنا کرتی تھیں اور اب وہاں ٹی وی ڈراموں کی شوٹنگ ہوتی ہے۔ کبھی کبھاڑ اکا دکا فلموں کی بھی شوٹنگ ہو جایا کرتی ہے۔ میں اور گاما ایک باڑ جا چکے ہیں وہاں۔ وہ تو یہاں سے بہت دور ملتان روڈ پر ہے۔" مشتاق سے ڑہا نہ گیا اور وہ بول ہی پڑا۔

"ہاں کاکا وہی ایوڑ نیو اسٹوڈیو۔" ڑفیق استاد کی آواز کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی۔ "ایک ڑوز وہ چاچا شوکی کے ساتھ کھڑا چائے بنا ڑہا تھا۔ ایک آدمی آیا اور چاچا کو ڑیکاڑڈنگ اسٹوڈیو میں جہاں کسی گانے کی ڑیکاڑڈنگ ہوڑہی تھی۔ بہت ساڑے لوگوں کے لیے چائے بھجوانے کا آڑڈڑ دیا۔ شوکی چاچا نے فٹافٹ چائے کے گلاس بھڑ کڑ جالیوں میں چڑھائے اور کاکے اوڑ بالے کو دے کڑ فوڑاً ڑیکاڑڈنگ اسٹوڈیو لے جانے کو کہا۔ کاکے کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی ایسے وقت میں ڑیکاڑڈنگ اسٹوڈیو جا ڑہا تھا کہ جب وہاں فلمی گانے کی ڑیکاڑڈنگ ہوڑہی ہو۔ وہ وہاں پہنچے تو اسٹوڈیو میں بے شماڑ سازندے جمع تھے۔ ایک میز پر سنتُوڑ (سنتُور) سجا ہوا تھا اور ایک سنتوڑ نواز مضڑاب (مضراب) سے جو اُس کے ہاتھوں کی شہادت اوڑ دڑمیانی انگلیوں کے بیچ ایسے دبا ہوا تھا جیسے سگریٹ دبایا جاتا ہے۔ انگلیوں کی پشت سے مضڑاب کا جو حصہ باہڑ نکل ڑہا تھا اُس پڑ اپنا انگوٹھا ڑکھے تاڑوں کو چھیڑ چھیڑ کر اُس کے سُڑوں کو جانچ ڑہا تھا۔ ایک طڑف ستاڑ نواز ایک بہت بڑے ستاڑ کی مختلف کلیں گھما کر تاڑیں کستا جاتا اور انگلیوں میں پہنے ہوئے مثلث نما آہنی چھلے (زخمہ) سے تنی ہوئی تاڑوں کے سُڑوں اور آہنگ کا اندازہ لگا ڑہا تھا۔ ایک طرف طبلچی طبلوں کی جوڑی لے کر فرشی نشست پر بڑا جمان تھا۔ دائیں جانب تین چاڑ قطاڑوں میں کئی وائلن نواز کڑسیوں پڑ بیٹھے دھیڑے دھیڑے اپنے سازوں کو چھیڑ ڑہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی ایک بہت ہی بڑا پیانو ڑکھا ہوا تھا۔ ان سب کا جائزہ لینے کے بعد کاکے کی نظڑیں کمڑے کے ایک کونے میں بنے چبوتڑے پڑ پڑی جہاں دو لوگ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا لمبا سا سنولا خُوش شکل اوڑ خوش لباس جوان شخص جو سفید پتلون قمیض میں ملبوس تھا اور جوتے بھی سفید ہی پہن ڑکھے تھے۔ اُس کے سامنے ایک ہاڑمونیم ڑکھا تھا اور ہاڑمونیم پڑ ڑکھے کاغذ میں سے کچھ پڑھ پڑھ کر تو ایک ہاتھ سے ہاڑمونیم کی دھونکنی کو ہلا ہلا کڑ دوسڑے ہاتھ کی انگلیوں سے ہاڑمونیم کی سیاہ و سفید کلوں سے کھیلتے ہوئے اُسے بجاتا جاڑہا تھا۔ ساتھ ہی ایک بہت ہی باڑعب سی شخصیت بڑاجمان تھی۔ اُس کے چہڑے کا وقاڑ گواہی دے ڑہا تھا کہ وہ کوئی

بڑا مہان فنکاڑ ہے۔ سفید شلواڑ قمیض، کالی سیاہ بند گلے والی کوٹی پڑ سیاہ شال کی بکل ماڑی ہوئی تھی۔ ہاڑمونیم لی لے پڑ کچھ گنگناڑہا تھا۔ ابھی کاکا اُس ساڑے منظڑ کے جادو میں ہی کھویا ہوا تھا کہ اُسے کسی نے کاندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ کاکے نے مُڑ کڑ دیکھا تو بالا کھڑا تھا۔

"باشاہو کی سوچدے پئے او" بالا مسکراتے ہوئے بولا۔ "ارے تمھارے چائے کے سارے گلاس تو ویسے کے ویسے ہی پڑے ہیں۔ دیکھ کیا رہے ہو۔ جاؤ سامنے خان صاحب اور دادا کو چائے دے آؤ۔"

"کون خان صاحب اوڑ کس کا دادا......؟" کاکا حیران ہوتا ہوا بولا۔

"ابے وہ سامنے دیکھ تجھے خان صاحب مہدی حسن خان اور دادا روبن گھوش نظر نہیں آ رہے کیا؟" بالے نے اُن دونوں کی طرف اشاڑہ کڑتے ہوئے کہا۔

"م......م......مہد......مہدی حسن......!" ماڑے حیڑت کے کاکا اتنا ہی کہہ سکا۔ مہدی حسن کو اُس نے دیکھا بھلے ہی نہ ہو لیکن وہ اچھی طڑ یوں اُنہیں جانتا تھا۔ جب اُس کا بہشتی ابا زندہ تھا اوڑ ڑیڈیو پڑ اُن کا گانا آتا تو ابا گانا سنتے وقت ہمیشہ ڑیڈیو کی آواز بڑھا دیتا اور واہ مہدی حسن واہ کہا کڑتا۔ خود اُسے بھی مہدی حسن کی آواز بہت بھلی لگتی تھی۔ اُن کے گھڑ کے پاس ماجھے حلوائی کی دکان پڑ بھی ساڑے وقت یا تو ملکہ ترنم نوڑ جہاں کے گانے بجتے یا پھڑ مہدی حسن کے۔"

"ماجھا حلوائی......؟" گامے کا منہ حیرت سے کھلا۔ "ہاں تم کیا جانو ماجھے حلوائی کو۔ کبھی وہ اپنے ہوٹل کے ساتھ ہی ساجھے حلوائی کی جو دکان ہے نا جہاں سے ساڑے دن نحوست ماڑے واہیات گانوں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ ماجھا پہلوان اُس کا ابا تھا جو شاید تم دونوں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے اللہ کو پیاڑا ہو گیا۔ اب اُس کا بیٹا ساجھا پہلوان دن بھڑ واہیات گانے چلا چلا کڑ محلے کے بچوں کا اخلاق بڑباد کڑ رہا ہے۔" استاد بولتا چلا گیا۔

"اب استاد ایسا تو نہ کہو۔ اُس کی وجہ سے محلے میں کیسی رونق لگی رہتی ہے اور یہ تو نئے زمانے کی موسیقی ہے۔ نہ رہے وہ مہدی حسن اور نور جہاں اور نہ ہی رہی اُن کے اور تمھارے زمانے کی موسیقی۔" مشتاق ساجھے پہلوان کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔

"بہت افسوس ہوا تمھاڑے منہ سے یہ سن کڑ۔ سن لو یہ وہ لوگ ہیں جو نہ بھلائے گئے ہیں اور نہ ہی بھلائے جائیں گے۔ ہاں البتہ تمھاڑی یہ نئے دوڑ کی موسیقی اور اُس کی عمڑ دو دن سے زیادہ کی نہیں۔" استاد کی آواز میں جوش تھا۔ "تو جانتا ہے مشتاق میں نے تجھے فلم اور ٹی وی کے مضمون میں گڑیجویشن کڑنے کے لیے ہی کالج میں کیوں داخل کڑوایا ہے؟"

"ہاں استاد اِس لیے کہ مجھے اِس شعبے میں جانے کا بہت شوق تھا" مشتاق مسکراتا ہوا بولا۔ "ہاں شُونق والی بات تو ڈُرست ہے تیڑی۔ پڑ ایک بات اوڑ بھی ہے۔ چل تو یوں سمجھ لے کہ جو کام مہدی حسن اور ملکہ ترنم نوڑ جہاں مڑحومین کڑ گئے ہیں نا وہ خود بھی ہمیشہ زندہ ڑہے گا اور اُن کو بھی سدا زندہ ڑکھے گا۔ ہماڑے کام کی عمڑ جانتا ہے کتنی ہے......؟ اُس کام کی عمڑ ہر ڑات ہوٹل کے بند ہونے پڑ دڑوجے پر تالا لگتے ہی پوڑی ہو جاتی ہے اور پھڑ اگلے ڑوز جب سویڑے غفوڑ تالا کھولتا ہے نا تو ہڑ ڑوز کی طڑ یوں ایک نیاء کھاتہ کھلتا ہے اور ڑات کو پھڑ ہمیشہ کی طڑ یوں تمام ہو جاتا ہے۔ اصل کام تو بس یہ لوگ کڑ گئے ہیں۔ اُن کا کیا کام ہمیشہ زندہ ڑہ کڑ اُن کو بھی لازوال کڑ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کاکا توں بھی کچھ ایسا کام کڑے جس کی عمڑ سویڑے شڑوع ہو کڑ ڑات ہی کو نہ مک جاوے۔" استاد کی نظریں تو مشتاق کے چہرے پر گڑی تھیں لیکن دیکھ وہ کسی اور ہی دنیا میں رہی تھیں۔ "ارے استاد کاکے کی کہانی کو تو آگے بڑھاؤ۔" گامے نے معاملہ بگڑتے دیکھ کر بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کاکا لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور اُس نے خان صاحب کو کانپتے ہاتھوں سے چائے کا گلاس پیش کیا۔ اگلا گلاس اُس نے روبن دادا کو پیش کیا۔ اُسے روبن دادا کی شخصیت اور اُن کا پہناوا بہت بھلا معلوم ہوا۔ گانے کی ریہرسل کے دوران کاکا کئی بار چائے لے کر اسٹوڈیو گیا۔ جب وہ آخری بار چائے کے گلاس سمیٹنے آیا تو عین اُس وقت گانے کی ریکارڈنگ شروع ہوئی۔ وہ سب کی نظروں سے بچتا بچاتا ایک کونے میں ستون کے پیچھے سکڑ سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ چھوٹا سا تو تھا وہ۔ کسی کی اُس پر نظر ہی نہ پڑی۔ تمام سازندے دم سادھے ہوئے تھے۔ مہدی حسن مائیک کے سامنے اپنے کانوں پر بڑے بڑے ائیرفون لگائے تیار کھڑے تھے۔ سازندوں کے عین سامنے روبن دادا اپنے ہاتھوں کو ہوا میں بلند کر کے بالکل تیار اپنی نگاہیں اُن پر ہی جمائے کھڑے تھے۔ روبن دادا نے اپنا ہاتھ گھما کر سنتُورنواز کو اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی اُس نے مضراب سے اپنے ساز کو چھیڑ دیا۔ پہلے سنتُور اور اُس کے ساتھ ہی جلترنگ کی تانیں اُبھریں اور تھمیں۔ پھر پیانو کا انگ ابھرا اور تھما تو مہدی حسن خان صاجب نے اپنی جادو بھری آواز میں بول کہے

پیار بھرے......!

بولوں کے درمیان ایک لمحے کا وقفہ آیا۔ پھر پیانو کی دو تانوں کے ساتھ اگلے بول سنائی دیئے اور ہمراہ طبلے کی سنگت کا آغاز ہوا۔ پیانو اور طبلے کا ساتھ بانسری کی ہلکی مگر دل موہ لینے والی تانوں نے دیا

دو شرمیلے نین
جن سے ملا میرے دل کو چین
کوئی جانے نہ کیوں مجھ سے شرمائیں
کیسے مجھے ترپائیں
پیار بھرے دو شرمیلے نین......!!!

''ارے استاد یہ تو وہی گانا ہے جو تم ہوٹل میں بجاتے ہو۔'' گاما چلا کر بولا۔ ''ہاں یہ وہی گیت ہے۔ اُس روز وہ گیت تو روبن دادا نے ریکارڈ کر لیا لیکن وہ گانا اس ننکے جئے کاکے کے دل و دماغ میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ریکارڈ ہو گیا۔'' استاد دُور کہیں خلاؤں میں گھورتا ہوا ڈوبتی آواز میں بولا۔

''استاد......! کہیں وہ کاکے تم ہی تو نہیں......!!!'' مشتاق شرارت بھرے لہجے میں بولا۔ ''اور وہ تصویر جو قائداعظم محمد علی جناحؒ اور علامہ اقبالؒ کی تصویروں کے نیچے لگی ہے وہ کہیں تمہارے روبن دادا ہی کی تو نہیں۔''

ایک ٹھنڈی آہ نما سانس کے بعد انتہائی ٹھہرے ہوئے لہجے میں استاد کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں وہ کاکا میں ہی تھا......! اور وہ تصویر روبن دادا ہی کی ہے......!!! آج میں سوچتا ہوں کہ اگر شوکی چاچا مجھے اُس روز اپنے ساتھ نہ لے گیا ہوتا تو شاید میں یہ نہ ہوتا جو آج ہوں۔''

''وہ کیسے......؟'' مشتاق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''اُس روز دادا روبن گھوش کے گانے کی ریکارڈنگ نے میرے اندر موسیقی سے ایک عجب سا لگاؤ پیدا! کر دیا۔ یہ لگاؤ وہ نہیں تھا جو ایک گانا گانے والے یا ساز بجانے والے کو موسیقی سے ہوتا ہے۔ یہ وہ لگاؤ تھا جو ایک موسیقی کے چاہنے والے کو موسیقی سے ہوتا ہے۔ یہ ایک خاص لگاؤ تھا۔ اب میں نے اسٹوڈیو میں ریکارڈ ہونے والے فلمی گانوں پر اپنی خاص توجہ دینا شروع کر دی۔ بطورِ خاص میں اِس ٹوہ میں رہتا کہ روبن دادا کی ریہرسل یا ریکارڈنگ کب ہے۔ میں پوری کوشش کر کے اُس دوران اسٹوڈیو کے اندر ہی گھسا رہتا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ روبن دادا کے گانے مجھ پر ایک خاص اثر کرتے۔ اُن کی بنائی ہوئی دھنیں میری رُوح کی تاروں کو چھیڑ جاتیں اور مجھ پر ایک جادو سا طاری کر دیتی ہیں۔ شاید روبن دادا کی موسیقی کی فریکوئنسی میری رُوح کی

فریکوئنسی سے میچ کرتی ہے۔''

''شوکی چاچا کے ساتھ کام کرتے مجھے تقریباً چھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ میں جو بھی تھوڑا بہت کما لیتا وہ اپنی بے کے ہاتھ پر دھر دیتا اور وہ اپنے کماؤ پوت کی کمائی کو اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ کر مجھے جھولیاں بھر بھر دعائیں دیتی۔'' اتنا کہہ کر استاد سانس لینے کو رکا تو مشتاق جیسے اِسی موقعے کی تلاش میں ہو یکدم بول پڑا۔ ''اور پڑھائی......؟''

مشتاق کے سوال پر استاد کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم آیا۔ ''جب میرا ابا فوت ہوا تو میں محلے ہی کے ایک سرکاری اسکول میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ گھر جہاں ہم رہتے تھے میرے ابا کے باپ دادا کی نشانی تھی، اس کے سوا میری غریب بے بے کے پلے اور کچھ نہ تھا۔ وہ نمازی ہم چار چین بھرا کا پیٹ بھرنے کے لیے اِدھر اُدھر گھروں میں کام بھی کرتی لیکن ہم دونوں کی ساری کمائی ملا کر بھی اتنے پیسے اکٹھے نہ ہو پاتے کہ وہ ہم سب کو نئے کپڑے ہی خرید کر دے سکتی تو بھلا پڑھائی کا خرچہ کہاں سے اُٹھاتی۔ میں دن بھر اسٹوڈیو کے فلوروں میں بھاگ بھاگ کر فنکاروں، ٹیکنیشنوں، پروڈکشن ورکروں، سینئر و جونیئر آرٹسٹوں، ایکسٹرا فنکاروں، فلمی کہانی نویسوں اور فلم کمپنیوں کے لوگوں کو چائے کے گرما گرم گلاس پہنچاتا۔ وہاں سب میرا ایسا خیال رکھنے لگے جیسے کوئی چائے لانے والا کا نہیں بلکہ اُن ہی میں جیسا کوئی فنکار یا فلم انڈسٹری سے وابستہ کوئی کارکن ہو۔ موسیقی اور خاص طور پر روبن دادا کے ساتھ خاص لگاؤ کو دیکھ کر لوگ مجھے چھوٹا روبن کہہ کر پکارنے لگے۔''

''وقت گزرتا رہا۔ مجھے اسٹوڈیو میں کام کرتے کوئی چھ ایک برس کا عرصہ گزر چکا تھا اور میری عمر کوئی بارہ تیرہ سال کی ہوگئی۔ ایک روز مجھے بالے نے بتایا کہ آج شام روبن دادا کے ایک نئے گیت کی ریکارڈنگ ہونے والی ہے۔ ہم دونوں میں یہ بات شروع ہی سے طے تھی کہ وہ مجھے ریکارڈنگ اسٹوڈیوز جانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے گا۔ جب کوئی گانا ریکارڈ ہوتا تو فلمسازوں اور ہدایت کاروں کی جانب سے شوکی چاچا کو خاص ہدایت ہوتی کہ تمام سازندوں، گلوکاروں اور موسیقار کو طلب کیے جانے سے پہلے ہی چائے وغیرہ ملتی رہنی چاہیے تاکہ وہ تازہ دم رہیں اور گانے کی بہترین ریکارڈنگ ہو۔ شام کو ریکارڈنگ ہال میں ریہرسل شروع ہوئی تو اسٹوڈیو میں خوب گہما گہمی نظر آنے لگی۔ سازندے انہماک کے ساتھ اپنے اپنے ساز تیار کر رہے تھے۔ وہ گانا گلوکار اخلاق احمد گا رہے تھے۔ میں دوسری بار جب چائے کے گلاس اکٹھے کرنے گیا تو فائنل ریہرسل کا آغاز ہو چکا تھا۔ میں نے ایک بڑے ستون کے پیچھے اپنا مخصوص کونہ پکڑ لیا اور وہاں آرام سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ سارا گیت کئی بار تمام سازندوں کی سنگت میں ریہرسل کیا گیا۔ میں اُس گانے کے بولوں اور دھن میں کچھ ایسا مگن ہوا کہ مجھے لگا کہ جیسے میں ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں نہیں بیٹھا بلکہ بادلوں پر سوار آسمان میں گھوم رہا ہوں۔ اُس گانا کا ایک ایک بول میرے دل و دماغ پر سمجھو جیسے نقش ہوتا جا رہا تھا۔ پھر نہ معلوم کب میں گانا سنتے سنتے وہیں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو گانا تو کب کا ریکارڈ ہو چکا تھا۔ سارے سازندے بھی جا چکے تھے۔ ریکارڈنگ انجینئر اور اُس کے عملے کا اکا دکا کارندہ اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ میرا ایورنیو اسٹوڈیو میں آخری دن تھا کیونکہ شوکی چاچا نے اپنی چائے کی کینٹین کسی اور کے ہاتھ بہت اچھے داموں فروخت کر دی تھی جس کا مجھے اُسی رات پتہ چلا۔''

''استاد تو پھر تم اُس کے بعد کبھی اسٹوڈیو گئے اور روبن دادا سے ملے؟'' مشتاق نے بے چینی سے سوال کیا۔

''اسٹوڈیو تو میں اُس دن کے بعد پھر کبھی نہیں گیا لیکن روبن دادا سے تو ہر روز ہر وقت ملتا تھا اور آج بھی ملتا ہوں۔ اُن کے گیتوں کے ذریعہ۔ بہرحال اب بے بے کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ میری آمدنی بند ہو جانے سے اُسے گھر کا خرچ چلانے میں بری دقت ہوگی۔ میں تھا تو اُس وقت صرف بارہ تیرہ سال کا۔ لیکن ہم جیسے بچوں پر نہ بچپن آتا ہے نہ ہی لڑکپن۔

ہوش سنبھالتے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔ میں نے بے بے کو سمجھایا کہ تو اتنی مزیدار ہانڈیاں پکا لیتی ہے۔ اگر ہمارے گھر کی نچلی منزل کو ہوٹل میں تبدیل کر دیا جائے تو اِس سے اچھا اور کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ اُوپر والی منزل کے دو کمروں میں سارا ٹبر رہ لے گا۔'' بے بے بولی۔ ''رفیق پتر......! بات تو تُو نے بہت عقلمندی والی کی ہے لیکن ہوٹل کھولنے، کرسیاں، میزیں، برتن بھانڈے، چائے کی پیالیوں، رکابیوں چھری چمچوں اور ڈھیر سارے راشن وغیرہ کی خریداری کے لیے تو بڑا روپیہ چاہیے وہ کہاں سے آئے گا؟'' میں نے کہا۔ ''شوکی چاچا نے اپنی کنٹین بڑے اچھے داموں فروخت کی ہے اگر وہ اِس اوکھے ویلے ہماری کچھ مدد کر دے تو ہمارا کام ہو سکتا ہے۔''

''میری بات بے بے کے دل کو لگی اور اللہ کی مہربانی کہ اُس نے شوکی چاچا کے دل میں نیکی ڈال دی اور وہ اتنی رقم ادھار پر دینے کو راضی ہو گیا کہ جس سے ہوٹل کے کام چلاؤ قسم کے سامان کا بندوبست تو ہو ہی گیا۔ اللہ کا نام لے کر ہم ماں بیٹے نے ہوٹل کا آغاز کیا۔ شروع شروع کے چند ماہ تو بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن میرے دل و دماغ پر روبن دادا کے اُس آخری دن والے گانے کے بول کسی تعویز کی طرح سے نقش ہو چکے تھے

سماں وہ خاب سا سماں
ملے تھے دل سے دل جہاں
کہاں لے کے چلا مجھے یہ دل میرا
وہ دن کبھی تو آئیں گے
مجھے گلے لگائیں گے
کبھی آتے ہوئے، کہیں آتے ہوئے
ہم انہی راہوں میں مل جائیں گے

بس میں دن رات اللہ میاں سے پانچ وقت کی نماز پڑھ کر تو خوب دعائیں مانگتا اور سارا دن اور رات دیر گئے تک ہوٹل کے کاموں میں جت کر بس یہ ہی گیت گنگناتا رہتا۔ مجھے ایسا لگتا کہ جیسے یہ گیت تو دادا نے بنایا ہی میرے لیے تھا۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکت سے کامل امید تھی کہ ان شاء اللہ وہ دن ضرور آئیں گے جو خود آگے بڑھ کر مجھے گلے لگائیں گے اور اللہ نے چاہا تو مجھے محنت و مشقت کی انہی راہوں پر چلتے ہوئے ایک نہ ایک دن اپنے سہانے خوابوں کی منزل ضرور مل جائے گی۔ اللہ پاک کا بڑا کرم ہے مجھ ناچیز پر کہ اُس نے میرے سارے خوابوں کو پورا کیا۔ میرا ہوٹل بھی چلا اور میں نے پرائیوٹ ہی سہی لیکن بی اے تک تعلیم بھی حاصل کی۔ اپنے سارے بہن بھرا کو پڑھایا لکھایا، اُن کی شادیاں کیں۔ ماشاء اللہ سے آج میں بال بچے دار ہوں اور تم دونوں بھی میرے بچوں جیسے ہی ہو۔ آج اللہ سوہنے کے کرم سے میرے ہوٹل کا شمار بھاٹی کے چند اچھے ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔''

استاد کی آنکھوں میں تیرتی نمی کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ کچھ دیر وہ تینوں یوں گم صم و خاموش رہے جیسے سوچ رہے ہوں کہ بات کہاں سے اور کون شروع کرے۔ اچانک گامے کو جیسے ہوش آ گیا ہو۔ اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''واہ استاد واہ......! تمھارا بھی جواب نہیں۔ تم نے ہم کو خوب اپنی کہانی میں لگا لیا۔ بھلا یہ کون سا وقت تھا اپنی داستان ہمیں سنانے کا۔ اتنے سالوں تک تو کبھی سنانے کا خیال نہیں آیا اور آج کچھ یوں سنائی ہے کہ لگتا ہے کہ ہم نے سنی نہیں دیکھی ہو۔''

''کاکا غفور......! یہ ہی تو درست ویلہ تھا اِس کہانی کو سنانے کا۔ اِس سے بہتر اور کوئی ویلہ کون سا ہو سکتا ہے۔''

''استاد اب یہ بجھارتے بوجھنا بند کرو اور صاف صاف بتاؤ کہنا کیا چاہتے ہو؟'' مشتاق استاد کی نم آلود آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ ''میں ابھی سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیے دیتا ہوں لیکن اُس سے پہلے سوال کا جواب دو۔ کون مجھے یہ بتائے گا کہ شہرِ لاہور کے کل کتنے دروجے ہیں؟''

مشتاق اور گامے نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ استاد کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بھلا اس عجیب سے سوال کا اُس کہانی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ گامے سے جب رہا نہ گیا تو وہ بول پڑا۔

''استاد بھلا لاہور کے دروازوں سے تمھاری اس رام کتھا کا کیا واسطہ......؟''

''اس بات کو چھوڑو اور بس میرے سوال کا جواب دو۔'' استاد رفیق کا چہرہ اور لہجہ دونوں ہی گھمبیرتا سے لبریز تھے۔ ''دس......!'' گامے نے ہانک لگائی۔ ''نہیں استاد دس نہیں اس گامے کو کیا پتہ۔ کوئی پندرہ کے قریب ہیں، کیوں استاد......؟'' مشتاق اندازہ لگاتے لہجے میں بولا۔

''نہ دس نہ پندرہ۔ ہیں تو پورے تیرہ دروجے لیکن کہا یوں جاتا ہے کہ بارہ دروجے اور تیرھویں موری۔''

''لیکن استاد آخر یہ دروازے ہماری بات میں کہاں سے بیچ میں آ گئے اور ان کا اِس بات سے بھلا کیا تعلق ہے؟''

اب تو مشتاق سے بھی رہا نہ گیا تو وہ بھی مارے حیرت کے پوچھ ہی بیٹھا۔

''بہت گہرا تعلق ہے۔'' استاد کے چہرے پر ایک عجب پُراسراری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ''یہ سارے دروجے صرف دروجے نہیں یہ لاہور شہر کی پہچان ہیں۔ یہ لاہور شہر کا دل ہیں۔ اِس کی روح ہیں اور سچ پوچھو تو یہ دروجے لاہور شہر کی اصل ثقافت ہیں۔ اپنے اِسی بھاٹی دروجے میں علامہ اقبالؒ دورانِ تحصیلِ علم ''اقبال منزل'' میں رہا کرتے تھے۔ مولانا حالی جب پانی پت سے لاہور آیا کرتے تو اُن کا قیام بھی بھاٹی دروجے میں ہی ہوا کرتا تھا۔ یہاں مغلیہ دور کی یادگار عمارتیں جواب ہر گزرتے دن کے ساتھ مٹی کا ڈھیر بنتی جا رہی ہیں۔ شاید تمھیں معلوم نہ ہو کہ محمد رفیع جیسا عظیم فنکار بھی ہمارے بھاٹی گیٹ ہی کا رہائشی تھا۔ بہرطور میں جب چھوٹا کاکا تھا تو جب بھی وقت ملتا پیدل پیدل ہی لاہور شہر کے ان سارے دروجوں کی سیر کو نکل پڑتا۔ یاویں کسی پاسے نکل جاؤ، ہماری تہذیب اور ثقافت ہی ثقافت دکھائی دیتی تھی۔ جس گلی، کوچے یا چوبارے وچ لنگ جاؤ تسی، بس موجاں ہی موجاں۔ اک پاسے ملکہ ترنم نور جہاں کی صدا سنائی دے رہی ہے تے دوجے پاسے مہدی حسن کے گلے کا بھگوان بولتا سنائی دیتا۔ لاہور شہر کے ان دروجوں میں شاید ہی کوئی ایسا گلی کوچہ ہو جہاں ان کی آوازیں سنائی نہ دیں۔ مگر آج وہاں سے گزرو تو ہر گلی میں کوئی نہ کوئی فاحشہ یا تو اپنی ہلکٹ جوانی کی دوہائی دیتی سنائی دے گی۔ کوئی سرِعام اپنے جگرے سے بیری سلگانے کی دعوت گناہ دیتی ملے گی۔ کوئی منی لوگوں کو اپنی بدنامی کا چرچہ کرتی تو کوئی انارکلی ڈسکو جاتی ملے گی۔ کوئی جلیبی بائی شرم و حیا کی جلیبیاں تلتی سنائی دے گی اور کوئی رضیہ غنڈوں میں پھنسی واویلا کر رہی ہوگی۔'' استاد ایک لمحے کے لیے رکا۔ ایک گہری سانس لے کر دونوں کی آنکھوں میں غور سے جھانکتے ہوئے بولا۔ ''سچ پوچھو تو غنڈوں میں رضیہ نہیں پھنسی......! غنڈوں میں تو ہم، ہماری ساری قوم، ہماری ثقافت، ہماری نئی نسل، اُن کا مستقبل اور آنے والی نسلیں سر سے پاؤں تک پھنس گئی ہیں......! اور اِسی ہلکٹ جوانی والی جگرے سے بیڑی جلانے کی دعوتِ گناہ دیتی منی، انارکلی، جلیبی بائی اور رضیہ کو چارہ بنا کر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پھنسایا گیا ہے اور مسلسل پھنسایا جا رہا ہے۔''

''استاد......تم بھی نا......، بس بات کا بتنگڑ بنانے کے ماہر ہو......'' گاما منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''استاد تم نے سنا نہیں اب تو فاصلے دور ہو رہے ہیں اور دوستیاں بڑھ رہی ہیں جسے امن کی آشا کا نام دیا جا رہا ہے اور تم ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بس بال کی کھال ہی اتارے جا رہے ہو۔

''امن، دوستی اور خوشگوار تعلقات سب بہت اچھی باتیں ہیں لیکن امن، دوستی اور تعلقات کی آڑ میں یہ سب کچھ جو

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ے لیے اچھا ثابت نہ ہوگا۔ کہیں سے آلو، ٹماٹو، پیاز، ادڑھک، مڑچیں، چینی، دال اوڑ چاول وغیرہ دڑآمد یا بڑآمد کڑ لینا اوڑ بات ہے لیکن ثقافت کے نام پڑ اُوچھا پن اور گھٹیا بازاڑی قدڑوں، موسیقی کے نام پڑ اخلاق باختگی اور شرم وحیا سے عاڑی اقداڑ کو پہلے تفڑیح کے نام پڑ منگوانا اور پھڑ اُسے معاشڑے میں سمونا اوڑ ڑچانا دوسڑی بات ہے۔ اگڑ یہ سب اتنا ہی اچھا ہوتا تو حضڑت علامہ محمد اقبالؒ جیسے عظیم مُفکڑ کبھی الگ ملک کا مطالبہ نہ کرتے اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ جیسے دُور اندیش انسان کبھی حضڑت علامہ محمد اقبالؒ کے دیکھے خواب کو سچ بنانے کے پیچھے ٹی بی کے موذی مڑض میں مبتلا ہوکڑ اپنی جان اُس ملک پڑ یونہی نچھاوڑ نہ کرتے۔'' استاد کا چہرہ جذبات کی شدت سے سُرخ ہو رہا تھا۔

''لیکن استاد یہ اب نیاء دور، نیاء زمانہ ہے۔ اُس نئے زمانے میں آپ کے زمانے کا سنگیت تو چلنے سے رہا۔'' مشتاق نے وکیلوں کے انداز میں اعتراض کرتے ہوئے کہا۔

''نئے دوڑ کا سنگیت......!'' استاد کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ ''تم جسے سنگیت کہہ ڑہے ہو وہ تو سنگیت کے پاؤں کی جوتی کہلانے کے بھی لائق نہیں۔ موسیقی کو تو ڑوح کی غذا کہا جاتا ہے۔ جب ڑوحوں کو ایسی شیطانی غذا ملے گی تو پھڑ معاشڑے میں ایسی ہی سیاہ شیطانی اقداڑ جنم لے گیں اور وہی سب کچھ ہوگا جو آج ہماڑے یہاں ہوڑہا ہے۔ چلو یہ ہی دیکھ لو کہ ہماڑے دوڑ کی موسیقی سُن کڑ دل و دماغ میں پاکیزگی بھڑ آتی تھی۔ میڑی زندگی کی کہانی میں نے تم لوگوں کو اسی لیے سنائی تھی۔ تم پوچھ ڑہے تھے نہ کہ اُس کا ان سب باتوں سے کیا تلق ہے۔ میڑے جیسے انسان جسے سوائے اللہ کے کسی کا بھی آسڑا نہ تھا اُس کو حوصلہ موسیقی نے ہی دیا اور آگے بڑھنے کا ڑاستہ دکھایا۔ جیسا سنو، پڑھو اوڑ دیکھو گے ویسے خیالات تمھاڑے ذہن میں جنم لیں گے۔ تمھارے دوڑ کی یہ مادڑ پدڑ آزاد موسیقی سوائے شیطانی و سفلی جذبات کو بھڑکانے کے علاوہ اور کڑ ہی کیا سکتی ہے......؟ دیکھ لو کہ ہماڑے دوڑ میں اور تمھاڑے اِس نئے دوڑ میں کتنا فڑق ہے......!!!''

پھر استاد ایک لمحے کے لیئے رکا اور غفور کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ''تم کہہ ڑہے تھے نا کہ استاد ہماڑے ساتھ ''ایٹم سانگ والی فلم دیکھنے چلو۔ میں اب بھی تمھاڑے ساتھ چلنے کو تیاڑ ہوں لیکن مجھے تم صڑف اتنا بتاؤ کہ کیا تم وہ فلم اپنی ماں بہنوں کو بھی دیکھنے کی دعوت اُسی طڑیوں دے سکتے ہو جیسے تم مجھے دے ڑہے تھے۔ باقی ڑہی یہ بات کہ وہاں ایٹم سانگ پڑ سنیما میں آگ لگ جاتی ہے اور لوگ سکڑین پڑ ناچتی گاتی ہیڑوین پڑ ڑیزگاڑیاں اچھالتے ہیں تو شاہی محلے میں بھی یہ ہی کچھ ہوتا ہے۔ تم لوگوں نے تو ثقافت اور شاہی محلے کے بیچ کا فڑق ہی مکا دیا ہے۔''

غفُور استاد کی نظڑوں کی تاب نہ لاسکا اور اُس نے اپنی نگاہوں کو جھکالیا۔ استاد اپنی کرسی سے تھوڑا سا اٹھ کر مشتاق پر جھک گیا اور اُس کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر بولا۔

''کاکا......، مجھے حیڑت تو تم پڑ ہے۔ تم فلم اور ٹی وی کے شُعبے میں نیشنل کالج آف آڑٹس سے گڑیجویشن کڑنا چاہتے ہوتا کہ آگے چل کڑ فلم یا ٹی وی کے شعبے میں جاکڑ اپنا نام بنا سکو۔ میڑی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تمھیں اپنی فلموں، اپنی موسیقی، اپنی ثقافت، اپنے فنکاڑوں اور اداکاڑوں کے باڑے میں ککھ پتا نہیں۔ اوڑ تو اوڑ تم یہ تک نہیں جانتے کہ لاہوڑ شہڑ کے کل دڑوجے کتنے ہیں۔ میڑے پیچھے دھڑلے سے ہلکٹ جوانی جیسے گھٹیا ایٹم سانگ سُنتے ہو۔ اتواڑ کی اتواڑ واہیات ایٹم سانگ والی گھٹیا فلمیں دیکھنے جاتے ہو۔ کیسے اِس شعبے میں جاکڑ کوئی ایسا کام کڑنے کے لائق بن سکو گے جس سے پتہ چل سکے کہ یہ کسی پاکستانی تخلیق کاڑ کی خالص پاکستانی تخلیق ہے۔ اپنے نام کو ڑوشن کڑنے کی فکڑ چھوڑ کڑ پاکستان کا نام اوڑ اُس کی ثقافت کو اونچا کڑنے کی فکڑ میں لگ جاؤ۔ پاکستان کے صدقے تمھاڑا نام آپو آپ ہی

ڑوشن ہو جاوئے گا......!!!''

اتنا کہہ کر استاد میز سے اٹھ کھڑا ہوا اور کاونٹر کی طرف چل پڑا۔ مشتاق نے گاے کی جیب میں ہاتھ ڈالا کرسی ڈی نکالی اور اُستاد کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ استاد کے عین سامنے جا کر سی ڈی اپنے ہاتھوں سے دوٹکڑے کر کے کاؤنٹر پر رکھ دی اور بولا۔ ''استاد کیا اِس اتوار مجھے اور گامے کو ایورنیو اسٹوڈیو لے جا کر وہ والا ریکارڈنگ اسٹودیو دکھا سکتے ہو جہاں تمھارا روبن دادا اپنے وہ شہاکار گیت ریکارڈ کیا کرتا تھا۔ جسے سن سن کر میرا رفیق استاد ایک کامیاب انسان تو بنا ہی لیکن آج مجھ جیسے ایک بے آسرا یتیم کے سر کا آسرا بھی بنا ہوا ہے۔ وہ تمھارا دادا روبن گھوش تھا اور تم ہمارے روبن گھوش ہو......!، بھاٹی گیٹ کے روبن گھوش......!!!

......☆☆☆......

باز گشت

سلیم اختر

آگ اور خون کے دریا پار کر کے امن و محبت کی پاک سرزمین پر
قدم رکھنے والے ایک انسان کا فسانہ وہ مر کر بھی زندہ و جاوید تھا۔
دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے دوستوں کی داستان،
محبت نے ان کی روحوں کو ایک کردیا تھا۔
حساس دلوں کے لیے بطور خاص، دیر تک یاد رکھی جانی والی تحریر

ٹرین کے اس حادثے کی تفتیش کے لیے میرا اور سرفراز کا انتخاب کیا گیا تھا۔ ہمارے سامنے مرنے اور زخمی ہونے والوں کی تصویریں بکھری پڑی تھیں کہ اچانک ایک تصویر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ فضل کی تصویر تھی اس کا جسم بری طرح کچلا گیا تھا۔

''فضل مر گیا!'' یہ خیال ذہن میں آتے ہی مجھے جھرجھری سی آگئی۔ ''نہیں، وہ نہیں مر سکتا۔ میں اسے نہیں مرنے دوں گا۔'' میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا مگر فضل کریم تو تخریب کاری کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ فضل میرا دوست نہ تھا مگر پھر بھی وہ میرے دوستوں ایسا تھا۔ میں نے پہلی بار اسے سندھ میں ایک بہت بڑے بزرگ کے مزار پر دیکھا تھا۔ فضل نے ملنگوں ایسا روپ دھار رکھا تھا۔ بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی، پیوند لگے کپڑے اور ہاتھ میں تسبیح مگر مجھے اس پر شک تھا کہ وہ یقیناً میرے وطن کا دشمن ہے۔ میں اور سرفراز نے اس کی حرکات وسکنات کا کئی دنوں تک خفیہ طور پر جائزہ لیا۔

ایک دن سرفراز نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ملنگ دنیا سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اسے گرفتار کرنا حماقت ہے۔'' مگر میں نہ مانا اور اسے گرفتار کرلیا۔ ٹارچر سیل میں جب میں نے اس پر سختی کی تو وہ یہی کہتا رہا۔ ''سائیں میں بے گناہ ہوں بموں کے دھماکے اور دیگر تخریبی کارروائیوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔'' لیکن مجھے شک تھا کہ وہ غیر ملکی جاسوس ہے۔

اس نے اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنا ماضی کھول کر سامنے رکھ دیا۔ وہ کہنے لگا۔ ''انسپکٹر سہراب خان! میں نے ہندو گھرانے میں جنم ضرور لیا تھا مگر اب میں پکا مسلمان ہوں۔ فضل میرا نام ہے۔ میری زندگی نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ میں نے زندگی کے سفر میں قدم قدم پر زمانے کی دھوپ چھاؤں دیکھی ہے۔ بچپن سے اب تک میں خاردار راستوں سے گزرا اور حالات کا دھارا مجھے یہاں لے آیا آج میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔'' وہ سانس لینے کو رکا اور دوبارہ بولا۔

''میرے بابو بھگت رام ایک بہت بڑے بزنس مین اور تعصب پرست انسان تھے۔ میرٹھ میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ میں نے وہیں جنم لیا۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں کومل اور انجنا تھیں گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ زندگی نہایت ہی آرام سے گزر رہی تھی۔ میرے ایک ماموں بھی میرٹھ میں رہتے تھے۔ ان کی دو بیٹیاں ارجنا اور رادھا تھیں۔ ان سے بڑا ایک بھائی منوج تھا۔ میری بڑی بہن کومل منوج کے دوست سے منسوب تھی۔ جب کہ میں ارجنا کی سہیلی رنجنا سے منسوب تھا۔ میرٹھ میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان دنوں چونکہ مسلمان پاکستان حاصل کرنے کی تحریک چلا رہے تھے اس لیے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف ہوگئے تھے۔ خاص کر ہندوؤں میں تعصب کا مادہ زیادہ ہی تھا۔ میرے والد اور ماموں نندا رام اس مشن میں پیش پیش تھے مگر اس کے برعکس میری دوستی مسلمان لڑکوں سے زیادہ تھی۔ ان میں وحید سرفہرست تھا۔ ہمارا ایک دوسرے کے گھروں میں آزادانہ آنا جانا تھا۔ ہم کلاس فیلو بھی تھے۔ ایک ہی اسکول میں پڑھتے اور اکٹھے ہی کھیل کود کرتے تھے۔ ہمارے اس کھیل میں میری بہنیں اور وحید کی چھوٹی بہن جمیلہ بھی شامل ہوتی تھیں۔ وہ تو بچپن کے دن تھے۔ اس وقت بھی منوج اور اس کے باپ کو میری اور وحید کی دوستی اچھی نہ لگتی تھی۔ وہ مجھے کئی بار منع کرچکے تھے کہ میں مسلمانوں اور خاص کر وحید سے میل جول نہ رکھوں مگر مجھے ان کی باتوں کی قطعی پروانہ تھی۔ مجھے صرف وحید اور اس کی دوستی سے غرض تھی وحید بھی دوستی کے معاملے میں نہایت مخلص تھا۔

وقت گزرتا رہا اور ہم جوانی کی حدود میں داخل ہوگئے۔ میری منگنی رنجنا سے ہوچکی تھی مگر وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انجنا آزادانہ گھوما پھرا کرتی تھی۔ کئی لڑکوں کے ساتھ اس کی دوستی تھی چونکہ اس کا خاندان ہم سے زیادہ دولت مند تھا اس لیے دولت کے غرور میں آکر وہ اپنی حقیقت بھول چکی تھی۔ اس کے برعکس رادھا ایک مکمل مشرقی لڑکی تھی۔ مگر ہم ایک دوسرے کو بہن بھائی سمجھتے پھر ہندو دھرم بھی خونی رشتوں کے ملن سے روکتا ہے۔ اس لیے میں اس کے بارے میں اس سے بڑھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں رنجنا سے شادی کسی بھی صورت میں نہ کروں گا۔ منگنی والدین کی مرضی سے ہوئی ہے مگر شادی میں اپنی مرضی سے کروں گا۔ میری بہنیں تو میرے دوست وحید سے آزادانہ طور پر ملتی تھیں مگر وحید کی بہن اب میرے سامنے نہ آتی تھی کیونکہ وہ اب جوان ہوچکی تھی اور اسلام میں پردہ لازمی ہے۔ کومل اور منوج ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے اور منگیتر بھی تھے۔ یہ حقیقت صرف میں یا وحید جانتے تھے کہ منوج کی بہن رادھا اور میری بہن انجنا دونوں ہی وحید کو پسند کرتی تھیں۔ وحید بھرپور جوان تھا اس کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی مگر وہ اپنی اس خوبی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ میری اور میرے گھر کے ہر فرد کی عزت اور احترام کرتا تھا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ ہمارے مذہب جدا جدا ہیں۔ وہ انسانیت کا علمبردار تھا۔ اسے صرف میری دوستی سے غرض تھی۔ وہ کہا کرتا تھا۔ ''آنند! ہم بچپن کے دوست ہیں بچپن بہت معصوم ہوتا ہے اس میں نفرت اور تعصب کا گزر نہیں ہوتا۔ ہماری دوستی ہر غرض، لالچ اور تعصب سے پاک ہے اور پاک رہے گی۔ ہم مذہب کو اپنی دوستی کی راہ میں حائل نہ ہونے دیں گے۔ ہم مسلمان امن اور خلوص کے علمبردار ہیں ہمارا مذہب ہر ایک سے محبت، اخوت اور دوستی کا درس دیتا ہے۔''

مجھے وحید کے بلند خیالات نہ صرف متاثر کرتے تھے بلکہ مجھے اس سے بھی اتفاق تھا۔ میں بھی یہ خواہش رکھتا تھا کہ ہندو مسلم بھائی بن کر رہیں۔ یہاں ہر طرف امن اور خلوص کی نہریں بہتی نظر آئیں۔ نفرتوں کا خاتمہ ہوجائے۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی بن جائیں۔ خود بھی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ میری اور وحید کی دوستی انہی اصولوں پر قائم تھی۔ وحید کے خاندان کے لوگ بھی بہت ہی سندر احساسات اور جذبوں کے مالک تھے۔ خاص کر وحید کے والد مجھ سے بہت ہی پیار کرتے تھے۔ وہ مجھ میں اور وحید میں کوئی فرق نہ سمجھتے تھے۔ اور ہمیشہ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب

کرتے۔ وحید کے گھر والے تعصب پسند نہ تھے۔ اخوت اور انسانی ہمدردی ان میں

جب بھی ان کے گھر جاتا تو وہ نہایت ہی گرم جوشی سے میرا استقبال کرتے۔ چائے اور کھانے میں مجھے اپنے ساتھ شریک کرتے۔ میں نے اس خاندان کے کسی بھی فرد کی پیشانی پر کبھی بھی بل نہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کے برعکس جب کبھی وحید میرے گھر آجاتا تو سوائے انجنا کے ہر ایک کے چہرے پر نفرت کی پرچھائیاں لہرانے لگتیں۔ کوئی بھی وحید سے محبت سے پیش نہ آتا۔ چائے وغیرہ انجنا ہی پیش کرتی میری بہن انجنا لاکھوں میں ایک تھی وہ خوب صورت بھی تھی اور خوب سیرت بھی وہ وحید کو چاہتی تھی۔ خود میری بھی یہ خواہش تھی کہ اگر وحید میرا ہم مذہب ہوتا تو یہ جوڑی کتنی پیاری رہتی مگر میں جانتا تھا کہ ایسا ناممکن ہے۔ انجنا کو بھی اس بات کا احساس تھا مگر پھر بھی وہ وحید کو من مندر کا دیوتا جان کر اس کی پوجا کر رہی تھی۔

منوج، کومل اور ارچنا میری اور وحید کی دوستی کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ منوج سفارش کے بل بوتے پر پولیس انسپکٹر بھرتی ہوا تو اس کے انداز ہی بدل گئے۔ اس کی شادی کومل کی سہیلی سے ہوگئی ان چاروں کی مخالفت عروج پر تھی کہ ان میں ایک اور ظالم اور بے درد شخص کا اضافہ ہوگیا۔ میرٹھ سے کچھ فاصلہ ایک گاؤں تارا گڑھ ہے۔ وہاں بھی ہماری برادری کے لوگ رہتے تھے۔ گنیش چند ہمارے ماموں کا بیٹا تھا۔ اس نے میٹرک کا امتحان گاؤں کے اسکول سے پاس کیا اور پھر ملازمت کے سلسلے میں میرٹھ آگیا۔ سکونت کے لیے اس نے ہمارے گھر کا انتخاب کیا۔ گنیش مسلمانوں سے نفرت اور دشمنی میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے نکلا۔ اس نے بھی میری اور وحید کی دوستی کی مخالفت شروع کردی۔ میں اور وحید ان لوگوں کے پست خیالات سے بخوبی واقف تھے اس لیے ہم نے ان کی پروانہ کی۔ گنیش میرے ہمراہ دو تین بار وحید کے گھر جا چکا تھا۔ وہ ان لوگوں کے خلوص اور چاہت سے بہت متاثر ہوا تھا پھر بھی وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں گنیش کو وحید کے گھر لے کر گیا۔ حالانکہ وہ اس قابل نہ تھا۔ نہ جانے کیسے اس نے وحید کی بہن جمیلہ کو دیکھ لیا اور اس پر فدا ہوگیا۔ وہ میری اور وحید کی غیر موجودگی میں بھی وحید کے گھر جانے لگا۔ اس نے جمیلہ کو محبت نامہ بھی لکھا کہ تم میری زندگی کی روشنی بن گئی ہو۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ میں تم سے عشق کرنے لگا ہوں۔

جمیلہ نے اس کے کسی خط کا جواب نہ دیا اور خاموش رہی۔

ایک روز گنیش خود ہی مجھ سے کہنے لگا۔ ''آنند! میرا ایک کام کردو۔''

اس نے مجھ سے وعدہ لے کر جب جمیلہ کا نام لیا تو میں برداشت نہ کرسکا۔ وہ میرے دوست کی بہن تھی، وہ دوست جو مجھے زندگی سے بڑھ کر عزیز تھا۔ ''گنیش! آئندہ جمیلہ کا نام تمہاری زبان پر آیا تو اچھا نہ ہوگا۔''

میری دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''جمیلہ بہت ہی خوبصورت لڑکی ہے۔ جب سے میں نے اسے دیکھا ہے میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ اس کی گوری رنگت، نیلی آنکھیں مجھے گھائل کرگئی ہیں۔ اگر میری دوستی تم اس سے نہیں کرا سکتے تو پھر شادی ہی کرادو۔''

''زبان کو لگام دو گنیش! میں جمیلہ کے بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ تم ہندو اور وہ مسلمان ہے۔ یہ ملاپ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ہاں اگر تم مسلمان ہوجاؤ تو پھر میں اس بارے میں سوچ سکتا ہوں۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں اپنا دھرم نہیں چھوڑوں گا۔ جمیلہ چاہے تو وہ ہمارے مذہب میں داخل ہوسکتی ہے۔'' گنیش نے کہا۔

میں نے غصے میں اس کا گریبان پکڑ لیا۔ بات ہاتھا پائی تک آگئی۔ میں نے گنیش کو معاف نہ کیا اور اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ گنیش نے مجھے دھمکی دی کہ وہ اپنی اس رسوائی کا بدلہ ضرور لے گا، مگر میں نے اس کی کسی دھمکی کی پروانہ کی۔ وہ میرے ماموں کے گھر چلا گیا کیونکہ اسے منوج کی اشیرباد حاصل تھی۔ انہی دنوں ملک تقسیم ہوگیا اور پاکستان

مسلمان میرٹھ سے ہجرت کرنے لگے۔ مجھے یہ امید تھی کہ وحید اور اس کا خاندان بھی پاکستان چلا جائے گا۔ مجھے وحید سے جدائی گوارہ نہ تھی مگر پھر بھی میں نے عہد کیا کہ اگر وہ ہجرت پر تیار ہوئے تو میں اسے نہ روکوں گا مگر وحید کے خاندان نے ہجرت نہ کی۔ انہوں نے میرٹھ میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی جائیداد اور اجداد کی نشانیاں چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے۔ میں نے بہت کوشش کہ وہ لوگ پاکستان چلے جائیں اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ ہندو اب مسلمانوں کا جینا حرام کر دیں گے۔ میں وحید کے خاندان کو کسی تعصب پسندی کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا تھا۔ مگر وحید کے والد ڈٹ گئے کہ میں کسی کے ڈر اور خوف کی وجہ سے اپنا گھر نہیں چھوڑوں گا۔ حالانکہ وحید کی ماں اور بہن بھی پاکستان جانے کی آرزومند تھیں۔ ان کے خاندان کے کئی لوگ پاکستان روانہ ہو چکے تھے مگر انکل مختار نے اپنا آبائی گھر نہ چھوڑا۔ میرے ابا جان اور ماموں کو جب علم ہوا کہ انکل مختار اور میرا دوست وحید نہیں رہیں گے تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ گئے۔ میں نے وحید کو یقین دلایا کہ میں اس کے ساتھ ہوں اور اس کے خاندان کے ساتھ دوستی نبھاتے ہوئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہاروں گا۔

اب جب کہ وحید کا خاندان اکیلا رہ گیا تو میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے اور وحید کے خاندان کو قریب لا کر نفرت، دشمنی اور تعصب ختم کر ڈالوں۔ انکل مختار نے میری ہاں میں ہاں ملائی اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا مگر میرے باپ اور ماموں نے دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹک دیا۔ انہوں نے مجھ پر بھی سختی شروع کر دی، جب میں نے ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ لیا تو انہوں نے مجھے مزید تعلیم کے لیے دہلی بھیج دیا۔ تعلیم حاصل کرنے کی خاطر میں نے وحید سے جدائی گوارہ کر لی۔ وحید نے بھی بخوشی مجھے اجازت دے دی حالانکہ ہم دونوں جانتے تھے کہ یہ محض ہمارے درمیان جدائی کے لیے کیا گیا ہے۔

میں نے دہلی کے ایک کالج میں داخلہ لے کر پڑھائی شروع کر دی۔ جب کہ وحید نے میرٹھ میں ہی اپنی تعلیم جاری رکھی۔ منوج کی تبدیلی بمبئی ہو گئی تھی جب کہ گنیش میرٹھ میں کوئی ملازمت کرنے لگا تھا۔

میں ہر ایک ماہ بعد میرٹھ آتا۔ گھر والوں سے مل کر میں باقی وقت وحید کی سنگت میں گزار دیتا۔ یہ ایک ماہ ہمارے لیے ایک صدی بن جاتا۔ وحید اور میں دونوں ہی اس جدائی کو شدت سے محسوس کرتے۔

وحید اپنے پاکستانی رشتے داروں کا اکثر ذکر کرتا اور کہتا۔ ''آنند! اگر تم اتنے مخلص اور محبت کرنے والے انسان نہ ہوتے تو میں بھی پاکستان جا چکا ہوتا۔ اب میرٹھ میں تنہائی اور اکیلے پن کا احساس کبھی کبھی مجھے رلا دیتا ہے۔ ہمارا کوئی بھی قریبی رشتہ دار یہاں نہیں ہے۔ یہ سب تمہاری دوستی کا کمال ہے کہ میں یہاں ہوں مگر پھر بھی کبھی کبھی تمہارے خاندان والوں سے بے حد خوف آتا ہے۔ میں تو ان لوگوں سے عاجزی سے ملتا ہوں مگر ان سب کی آنکھوں میں ہمیشہ اپنے اور اپنے خاندان کے لیے نفرت دیکھی ہے۔ حالانکہ ہم ایک ہی خدا کے بنائے ہوئے انسان ہیں۔ ہم بنیادی طور پر میرٹھ کے رہنے والے ہیں تو پھر یہ تفریق اور نفرت کیوں ہے۔ تم بھی تو اسی خاندان کے فرد ہو۔ پھر تو میں اور ان میں اتنا فرق کیوں ہے؟ میں ہر لمحہ ان کی طرف سے خطرہ محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں جب اپنے ابا جان سے ذکر کرتا ہوں اور انہیں پاکستان جانے کا مشورہ دیتا ہوں۔ تو وہ کہتے ہیں کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ اس لیے کہ میں مسلمان ہوں۔ میں اپنے باپ دادا کا مسکن چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہ ہندو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، مجھے اپنے خدا اور رسول ﷺ پر بھروسا ہے۔ میرے اندر ایمان کی طاقت ہے اسی ایمان کی قسم مجھے اپنے مذہب پر ناز ہے، فخر ہے، غرور ہے۔ اب میرا مرنا بھی یہیں ہوگا اور جینا بھی یہیں۔''

وحید اور اس کے ابا جان کی انسانوں سے محبت کرنے اور اپنے مذہب پر اعتقاد کی باتیں سن کر کبھی کبھی میرے من میں یہ خواہش ابھرتی کہ میں بھی اسلام قبول کر لوں۔

اس وقت تو میں اسلام کی برتری کا اور بھی قائل ہو گیا۔ جب میرا ایکسڈنٹ ہو گیا میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ اب میرا بچنا مشکل ہے۔ میرے والدین نے مندروں میں گھنٹیاں بجا بجا کر میری زندگی کی بھیک مانگی تھی لیکن پھر بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ میں بے ہوش تھا۔ میرے لبوں پر بار بار وحید کا نام آتا تھا مجبوراً میرے والدین کو اسے بلانا پڑا۔ اس نے میری زندگی اور موت کی کشمکش دیکھی تو وہ تڑپ اٹھا سجدہ میں گر گیا پھر رو رو کر اپنے پرودگار سے التجا کی کہ میرے دوست کو میری زندگی دے دے۔ میرے آنند کو بچا لے۔

میرے والدین نے بھی اس وقت تسلیم کیا کہ آنند! تجھے وحید کی دعائیں واپس لے آئی ہیں ورنہ ہم تو تم سے ناامید ہو چکے تھے۔ بھگوان نے ہماری ایک نہ سنی تھی مگر وحید کا خدا تمہیں واپس لے آیا ہے۔ خود میں بھی اپنے زندہ بچ جانے پر حیران تھا کہ یہ معجزہ ہی ہے ورنہ جس قسم کا حادثہ تھا اس میں میرے زندہ رہنے کی کوئی امید نہ تھی۔

اس روز جب میں وحید کے گلے لگ کر خوشی سے آنسو بہانے لگا تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ میں نے وحید کے ایمان کی طاقت دیکھ لی تھی۔ اس معجزہ ابراہیمی کی طرح میں بھی زندہ بچ گیا تھا جو آگ میں پھول کھلاتی ہے۔ جو خیر خواہ بچے سے کنواری مریم کی پاکیزگی کی گواہی دلواتی ہے۔

وحید کہنے لگا۔ ''آنند! جب میں تمہاری زندگی کی بھیک اپنے پروردگار سے مانگ رہا تھا تو مجھے روز ازل کی طرح سے یہ یقین تھا کہ میری چاہتوں اور محبتوں کا کفیل تمہیں موت کے منہ سے ضرور واپس لائے گا۔ وہ میرے ایمان کی آزمائش تھی جس میں سرخرو ہوا۔''

میں نے وحید کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے۔ آنسو میرے گالوں سے برسات کی طرح برسنے لگے۔ میں نے غصیلی آواز میں کہا۔ ''وحید! تم ہی نہیں تمہارا مذہب بھی عظیم اور سچا ہے۔ جب کہ میرا مذہب جھوٹا ہے۔ مجھے نفرت ہو گئی ہے جھوٹے بھگوان سے۔ میں...... میں اسلام قبول کر لوں گا۔ یہ میرا عہد ہے مگر اس کے لیے کسی مناسب وقت کا انتظار کرنا ہوگا کیونکہ میرا یہ عمل ہندوؤں کی نظر میں ایک بہت بڑا اور ناقابل معافی جرم بن جائے گا۔''

وحید نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس نے میری پیشانی پر بوسا دیا اور کہنے لگا۔ ''آنند! تمہارے اس فیصلہ نے مجھے ایک نئی توانائی بخشی ہے۔ آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی تم سے وہ سچ بول دوں۔ جو میں نے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا۔ آنند! تم مجھے بچپن ہی سے اپنے سے محسوس ہو رہے تھے میرے دل نے کئی بار خواہش کی کہ کاش تم مسلمان ہوتے لیکن میں نے اس خواہش کو اس لیے چھپائے رکھا کہ میرا مذہب دلوں کو مسخر کرنے والا ہے۔ جس نے تمہیں ہی نہیں ایک اور شخصیت کو بھی مسخر کر ڈالا ہے اور وہ ہے تمہاری بہن انجنا!''

پھر اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''آنند!...... وہ تمہاری ہی نہیں میری بھی بہن تھی۔ میں نے اسے ہمیشہ جمیلہ ایسی ہی سمجھا۔ مگر وہ کسی اور ہی راہ کی مسافر بن چکی ہے۔ شاید تم بھی جانتے ہو کہ وہ مجھے چاہتی ہے مگر میں نے اسے بہن کے سوا کچھ نہ سمجھا۔ لیکن وہ میری محبت میں بہت آگے بڑھ گئی ہے کئی بار چاہا کہ میں تمہیں حقیقت بتا دوں کہ انجنا کو روک لو۔ کہیں وہ ہماری دوستی کی راہ میں دیوار نہ بن جائے مگر میں چاہنے کے باوجود بھی ایسا نہ کر سکا، میں ہر وقت اسی خوف میں مبتلا رہا کہ اگر تمہیں حقیقت کا پتا چل گیا تو کہیں تم مجھے ہی مجرم نہ ٹھہرا دو۔ میں نے ہمیشہ انجنا کو نظر انداز کیا ہے تاکہ وہ مجھے بھول جائے، میرا خیال چھوڑ دے۔ میں نے اسے یہ بھی احساس دلایا ہے کہ ہمارا ملن مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ہمارے مذہب جدا جدا ہیں اس لیے خواب دیکھنا چھوڑ دو، مگر وہ کوئی بھی عذر قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ اس سے دور رہنے کی کوشش کی ہے مگر وہ باز نہیں آتی۔ اس کی محبت اور میری بے گناہی کا ثبوت یہ خط ہے جو انجنا نے حال ہی میں لکھا ہے۔''

وحید نے دو خط میرے ہاتھ میں دے دیئے۔ مجھے وحید پر اعتماد تھا۔ اس لیے میں نے اس کی کسی بھی بات کا برا نہ منایا۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ انجنا وحید کو پسند کرتی ہے میری بھی یہ خواہش تھی کہ دونوں ایک ہو جائیں مگر عملی طور پر یہ نا

ن تھا۔ میں نے انجنا کا خط پڑھنا شروع کیا اس نے لکھا تھا۔

''میرے اپنے وحید! تم لاکھ جفا کرتے رہو مگر میں وفا ہی کروں گی۔ میں اپنا جیون تمہارے نام کر چکی ہوں۔ تم میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہو۔ میرا جیون تم بن ادھورا ہے۔ لیکن تم نہ جانے کیوں مجھ سے دور دور رہتے ہو۔ پھر بھی مجھے یقین ہے کہ جذبے سچے اور ارادے نیک ہوں تو منزل کے راستے کی سب رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ مذہب کو میں اپنے راستے کی رکاوٹ نہ بننے دوں گی۔ مجھے اپنا نہیں تمہارا مذہب زیادہ عزیز ہے۔ تم ایک بار میری محبت کا اقرار تو کر کے دیکھو پھر میں یہ ثابت کردوں گی کہ جس سے پیار کیا جائے اس کی خاطر مذہب تو کیا سب کو چھوڑا جا سکتا ہے۔ میں اپنا مذہب چھوڑ رہی ہوں۔ محض تمہاری محبت کی خاطر۔ آج سے ہی مسلمان ہوں۔ میرا نام تم خود رکھو گے اور جب بھی آواز دو گے۔ میں تمہارے چرنوں میں اپنا سر رکھ دوں گی۔ آج سے میں مندروں میں نہیں جاؤں گی۔ اسلام کی باتیں اور اصول مجھے تم سکھاؤ گے۔ فقط تمہاری انجنا''

انجنا کا خط پڑھ کر مجھے ذرا بھی دکھ نہ ہوا۔ میں نے وحید سے کہا۔ ''انجنا نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ ہے۔ اگر تم بھی اس سے مخلص ہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کسی مناسب موقع پر میں اور انجنا دونوں اسلام قبول کرلیں گے۔''

وحید نے یقین دلایا کہ اس نیک کام میں ہماری ہر ممکن مدد کرے گا۔ وہ کہنے لگا۔ انجنا میری محبت میں اس قدر سنجیدہ ہو جائے گی میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ اب میں اس کا دل ہرگز نہ توڑوں گا! کہ اس نے محض میری محبت کی خاطر جو قربانی دینے کا عہد کیا ہے میں اس بھرم رکھنے خاطر جان بھی لڑا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

جب میں نے انجنا کو بتایا کہ میں بھی مسلمان ہونے کا عہد کر چکا ہوں تو وہ بہت خوش ہوئی۔ ہم ایک دوسرے کے ہم راز بن گئے۔ وحید کا اقرار سن کر انجنا تو ہواؤں میں اڑنے لگی۔ یوں ہی چند سال اور بیت گئے۔

وحید نے پڑھائی مکمل کر کے کاروبار سنبھال لیا۔ میں بھی میرٹھ میں پتاجی کے ساتھ مل کر ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹانا چاہتا تھا مگر محض وحید کی دوستی کی وجہ سے وہ نہ مانے اور سفارش کے بل بوتے پر مجھے بھی پولیس میں انسپکٹر بھرتی کروا دیا۔ میری تقرری دہلی میں ہوئی تھی۔ اب جب میں کمانے کے قابل ہو گیا تو مرے والدین نے ارچنا اور میری شادی کی تیاریاں شروع کردیں مگر میں نے صاف طور پر انکار کر دیا کہ میں ارچنا سے شادی نہیں کروں گا۔ سب نے بہت زور دیا مگر میں نے بھی ڈٹ گیا میں نے ارچنا میں ڈھیروں نقص نکالے۔ ادھر ارچنا کی بھی مرضی شامل نہ تھی کیونکہ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی لہٰذا بات بن گئی۔ اس کے بعد رادھا کی باری آئی تو میں نے اس سے بھی شادی کرنے سے اس لیے انکار کر دیا کہ میں اور رادھا سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ رادھا اور ارچنا سے شادی سے انکار پر میرے والدین اور ماموں میرے اور بھی خلاف ہو گئے۔ منوج نے دھمکی دی کہ وہ کومل کر سکھی نہ رہنے دے گا مگر میں نے کسی کی پروانہ کی۔ انہوں نے میرے اس انکار کو بھی وحید کی دوستی سے منسوب کیا۔ میں نے سب کچھ گوارہ کر لیا کیونکہ میری ارچنا سے جان چھوٹ گئی تھی۔ میں تو اس کی شکل سے بھی نفرت کرتا تھا۔

ان دنوں ہندوستان کے کئی شہروں میں ہندو مسلم فسادات عام ہو رہے تھے۔ جن میں زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہی ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کو شہید کیا جا رہا تھا۔ ان کے مکانوں اور گھروں کو آگ لگائی جا رہی تھی مگر پھر بھی مجرم اور قصوردار مسلمانوں کو ہی ٹھہرایا جاتا تھا۔ میں جب ایسی خبریں سنتا اور پڑھتا تو میرا دل بہت کڑھتا تھا۔ جی چاہتا کہ میں بغاوت کر دوں اور مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہوئے شہید ہو جاؤں مگر یہ سب کچھ اس قدر جلد ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے وقت اور منظم تیاری کی ضروری تھی۔ منوج اور گنیش دونوں میرٹھ میں تھے جب کہ میں دہلی میں ہی تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ میری تبدیلی بھی میرٹھ ہو جائے مگر ابھی تک اس میں کامیابی نہ ہوئی تھی۔

اس عرصے میں میری غیر موجودگی میں گنیش اور میری بہن انجنا کو ایک دوسرے سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ

انجنا کی مرضی کے خلاف ہوا تھا مگر وہ اس وجہ سے خاموش رہی کہ اس نے اپنا مستقبل وحید سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اور اب وہ صرف میرے حکم اور فیصلے کی منتظر تھی کہ کب ہم مسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اس منگنی کے بارے میں انجنا نے خط لکھ کر مجھے تفصیل بتادی تھی اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی تھی کہ میں جلد از جلد اس کے اور وحید کے ایک ہونے کا بندوبست کروں۔ ادھر وحید نے اس سلسلے میں اپنے والدین سے بات تو نہ کی تھی مگر نہ صرف اسے بلکہ مجھے بھی یہی یقین تھا کہ وہ مان جائیں گے اور میرا انجنا کا بھرپور ساتھ دیں گے۔ ہمارا مسلمان ہونا یقیناً ان کے لیے فخر کا مقام ہوگا۔

ان دنوں میرٹھ سے بھی مسلم کش فسادات کی خبریں آرہی تھیں میں دل ہی دل میں دعائیں مانگتا تھا کہ بھگوان میرے دوست وحید اور اس کے خاندان کو محفوظ اور سلامت رکھے۔

ایک شام کو میں انجنا اور جمیلہ دونوں کو اپنے مکان پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ دونوں سخت گھبرائی ہوئی تھیں۔ جمیلہ کی آنکھیں رو رو کر سوج چکی تھیں۔

میں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو انجنا بولی۔

''آنند بھیا! آپ کا دوست اور میرا پیار وحید چل بسا۔ ہمارے ہم مذہب لوگوں نے اس کا گھر جلا ڈالا ہے۔ سب کچھ راکھ ہو گیا ہے بھیا۔ صرف جمیلہ زندہ بچی ہے۔ میں بڑی مشکل سے اسے وہاں سے نکال کر لائی ہوں۔''

''کیا کہہ رہی ہو انجنا......! تم ہوش میں تو ہو؟ میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا تو وہ زاروقطار رونے لگی پھر وہ میرے گلے لگ گئی۔ میں اس سے پوچھتا رہا مگر وہ روئے جا رہی تھی۔ انجنا کی آنکھیں ساون بھادوں بنی ہوئی تھیں اور دوسری طرف جمیلہ تڑپ رہی تھیں۔

''ہاں آنند......! انجنا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میرا چاند سا بھیا وحید مر گیا ہے۔ اسے گنیش اور منوج نے شہید کر ڈالا ہے۔

وحید کی موت اور شہادت کی خبر سن کر میرا خون کھولنے لگا۔ مجھے گنیش اور منوج سے نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ کاش وہ میرے سامنے ہوتے تو میں ان کی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔ مگر اس وقت اپنے دوست کی ابدی جدائی کا رونا ہی میرا سوگ بن گیا۔ میں بلک بلک کر رونے لگا۔

''مجھے بتاؤ، یہ سب کیسے ہوا؟ بھگوان کی سوگند میں گنیش اور منوج کو کتے کی موت ماروں گا۔'' میں چلا اٹھا۔

انجنا مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ہمارے ذلیل اور بے غیرت کزن گنیش نے جمیلہ کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر وحید ان کے راستے کی دیوار بن گیا۔ اس نے اپنی بہن کی آن کی خاطر گنیش کا ہاتھ روک لیا۔ اور اسے ایسا سبق سکھایا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتا اس بات پر مسلم کش فسادات شروع ہوئے۔ یہ فسادات گنیش اور منوج کی ملی بھگت سے ہوئے۔ وہ وحید سے بدلہ لینا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جمیلہ کی زندگی برباد کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ایک رات منوج نے پولیس اور گنیش نے اپنے بدمعاشوں کے ہمراہ وحید کی حویلی پر حملہ کر دیا۔ وحید نے اور اس کے باپ نے کافی مزاحمت کی۔ وہ دونوں ان کے قابو میں نہ آرہے تھے۔ وحید نے جمیلہ کو زبردستی اس گھر سے نکل جانے کو کہا۔ اس نے جمیلہ کو میرے پاس بھیجا۔ میں نے جمیلہ کو ایک سہیلی کے گھر چھپا دیا کہ صبح تک ممکن ہے حالات بہتر ہو جائیں مگر صبح تک سب کچھ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ وحید کا پورا خاندان اور حویلی کا تمام سامان جل کر راکھ ہو گیا۔ میں اس درندگی پر بہت روئی مگر کچھ نہ کر سکی۔ جمیلہ کو میں نے دو دن اپنی سہیلی کے گھر چھپائے رکھا۔ منوج اور گنیش اس کی تلاش میں تھے۔ اگر یہ ان کے ہتھے چڑھ جاتی تو وہ نہ جانے اس کا کیا حشر کرتے۔ اس لیے میں بڑی مشکل سے اسے لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔ اگر میں اسے یہاں نہ لاتی تو منوج اور گنیش اس کی زندگی بھی برباد کر ڈالتے۔

انجنا کی زبانی انسانی درندگی کی انتہا سن کر میری آنکھیں ایک بار پھر برس اٹھیں۔ میں نے آگے بڑھ کر جمیلہ کے سر

اپنا ہاتھ رکھا اور کہا۔ ”جمیلہ بہن! آج سے میں ہی تمہارا بھائی وحید ہوں۔ میں اور انجنا آج سے مسلمان ہو رہے ہیں۔ میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے دوں گا مگر تمہاری آن پر آنچ نہ آنے دوں گا۔ میں اپنے دوست کے دشمنوں کو کبھی معاف نہ کروں گا۔ مجھے اس وقت تک چین نہ آئے گا جب تک ان کو موت کے گھاٹ نہ اتار دوں۔“

”تم ٹھہرو، میں اور انجنا ابھی آتے ہیں۔“ میں انجنا کے ہمراہ دہلی کی جامع مسجد میں چلا آیا اور امام مسجد کے ہاتھوں اسلام قبول کر لیا۔ مولوی صاحب نے میرا نام فضل اور انجنا کا اسلامی نام شکیلہ رکھا۔ اب میں اور انجنا مطمئن تھے۔ واپسی پر میں نے جمیلہ کو بتایا کہ ہم دونوں مسلمان ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب ہمیں اسلامی ناموں سے پکارا کرو۔

میں نے ایک بار پھر جمیلہ کو دلاسا دیا کہ میں اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دوں گا مگر ماں باپ اور بھائی کی موت نے اس کے چہرے کی تمام رعنائیاں چھین لی تھیں۔ اس کے چہرے پر موت کا سا سکوت نظر آتا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”فضل بھیا! اب میرا یہاں کیا رہ گیا ہے۔ اگر تم مجھے میرے رشتے داروں کے پاس پاکستان پہنچا دو تو میں تمام عمر تمہاری احسان مند رہوں گی۔“

”جمیلہ بہن! تم بے فکر ہو جاؤ۔ وہ جو ہم سے دور چلے گئے ہیں انہیں واپس لانا تو میرے بس میں نہیں ہے مگر پھر بھی میں تمہارے مستقبل کی خاطر اپنی جان بھی داؤ پر لگا دوں گا۔ تمہیں تمہارے عزیزوں کے پاس ضرور پہنچاؤں گا مگر اس کے لیے کچھ وقت درکار ہو گا۔ جب تک حالات بہتر نہ ہو جائیں، گنیش اور منوج سے میں بدلہ نہ لے لوں میں کچھ نہ کر سکوں گا۔ کل میں ملازمت سے استعفیٰ دینے کے بعد تمہیں اور شکیلہ کو ساتھ لے کر میرٹھ جاؤں گا۔ میں دیکھتا ہوں کون اب تمہاری طرف میلی آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے۔“

”وہ رات میں نے جمیلہ اور شکیلہ سے باتیں کرتے ہوئے گزار دی۔ وحید اور اس کے والدین کی موت کا دکھ مجھے رلاتا رہا۔ میں مستقبل کے پروگرام بناتا رہا۔

تین دن بعد میں جمیلہ اور شکیلہ میرٹھ کی طرف جا رہے تھے۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ میں میرٹھ پہنچتے ہی منوج اور گنیش سے ٹکر لے لوں مگر پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ ہم بجائے اپنے گھر جانے کے شکیلہ کی سہیلی کے گھر چلے گئے۔ میں نے جمیلہ اور شکیلہ کو اس کے گھر چھوڑا اور مسلمانوں والی آبادی میں کرائے کا مکان تلاش کر لیا۔ جمیلہ اور شکیلہ کو اس مکان میں چھوڑنے کے بعد میں اپنے گھر آ گیا۔

وہ لوگ شکیلہ (انجنا) کی گمشدگی کی وجہ سے پریشان تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ انجنا میرے پاس ہے تو ان کی جان میں جان آئی۔ ورنہ وہ تو اسے مسلمانوں کی کارروائی سمجھ رہے تھے۔ میرے بگڑے تیور دیکھ کر میرے پتا جی جان گئے کہ مجھے اپنے دوست وحید کے خاندان کا حشر معلوم ہو گیا ہے۔

انہوں نے مجھ سے ہمدردی کرنا چاہی تو میں پھٹ پڑا۔ ”بس کریں بھگت رام جی! بس کریں میں سب جان گیا ہوں۔ اب تو آپ خوش ہو جائیں کہ آپ کے بیٹے کی مسلمانوں کے ساتھ دوستی ختم ہو گئی ہے، مگر نہیں بھگت رام جی نہیں۔ دوستی ختم نہیں ہوئی بلکہ اب تو اور بھی مضبوط ہو گئی ہے۔ میرا دوست وحید مرا نہیں زندہ ہے۔ وہ میرے خون میں شامل ہو کر میری شریانوں میں دوڑ رہا ہے۔ یہ سب کچھ آپ لوگوں کی مرضی اور سازش سے ہوا ہے۔ اس کا بدلہ میں گنیش اور منوج سے ضرور لوں گا۔ آج سے میں آپ کا بیٹا نہیں بلکہ انکل مختار مرحوم کا بیٹا ہوں۔ میں اور انجنا دونوں مسلمان ہو گئے ہیں۔ اب میرا اور انجنا کا آپ لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے اس لیے ہندو سرکار کی ملازمت بھی چھوڑ دی ہے اب میرا نام فضل اور انجنا کا اسلامی نام شکیلہ ہے میں جمیلہ کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ میرا ایمان اب محبت ہے جب وحید کے ماں باپ اپنے دشمنوں کے بیٹے کا سواگت پھولوں سے کر سکتے تھے تو ان سے زیادہ محبت

کرنے والا کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا۔ ویسے بھی میری اور آپ کی جنگ ہمیشہ رہی ہے میں خود شروع کر رہا ہوں اس لیے کہ آپ نے مجھ سے میرا دوست اور اس کے ماں باپ چھین لیے ہیں، اب میں ان کا بیٹا بن کر آپ کا کفارہ ادا کروں گا۔ اسلام قبول کر کے میں بھی مسلمانوں کی آزادی سے رہنے کی جنگ میں شریک ہو گیا ہوں۔ اب آپ صرف اپنے بیٹے اور بیٹی کو مارنے کے طریقے سوچیں۔ مجھے یقین ہے جب کبھی بھی آپ...... منوج اور گنیش مسلمانوں پر گولیاں چلانے کا سوچیں گے تو آپ اپنے بیٹے اور بیٹی کی خاطر رک جائیں گے کہ کہیں نشانے پر آنند یا انجنا تو نہیں۔ جب بھی منوج پولیس کی وردی میں ہاتھوں میں پستول لیے اس محلے میں داخل ہو گا تو اس کا دل ایک لمحے کو ہی سہی مگر دھڑکے گا ضرور کہ کہیں اس کا اپنا خون ہی اس کی گولی کی زد میں نہ آ جائے۔ آپ کی اور ماتا جی کی زہر اگلتی زبانیں مسلمانوں کے لیے چپ ہوں گی تو وہی پل وہی لمحہ میری جیت کا ہو گا۔“

میں نے پتا جی کا ردعمل نہ دیکھا اور پھرتی سے اس محل نما کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ میں نے اپنے محلے والوں کو بھی بتا دیا کہ میں اور انجنا مسلمان ہو گئے ہیں اور اب ہمارا مرنا جینا مسلمانوں کے ساتھ ہو گا۔ میرے خاندان والوں نے بہت کوشش کی کہ میں واپس لوٹ آؤں مگر میں نے ان کی ہر بات ان سنی کر دی۔ میں نے محلے کے مولوی صاحب سے نماز اور دیگر مسائل سمجھنے شروع کر دیئے۔ میں روزانہ ہی وحید اور اس کے والدین کی قبروں پر جاتا اور ان کی مغفرت کی دعائیں مانگتا۔ وہاں جا کر میں بے قابو ہو جاتا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ساری زندگی وحید کی قبر کے پاس ہی بیٹھ کر گزار دوں۔ اس سے ہمیشہ کے لیے جدائی میری برداشت سے باہر تھی۔ بعض اوقات بہت دیر ہو جاتی تو جمیلہ اور شکیلہ مجھے لینے آ جاتیں۔

مجھے ہندوؤں کی طرف سے مسلسل دھمکیاں مل رہی تھیں کہ میں نے مسلمان ہو کر ہندو مت کا مذاق اڑایا ہے مگر مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔ میں تو صرف منوج اور گنیش کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے اس شہر میں رہ رہا تھا۔ اپنا بدلہ لینے کے بعد میں نے یہ شہر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ درندوں کے اس دیس میں، جمیلہ، شکیلہ اور میں کسی صورت میں بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ گنیش اب بھی منوج کے گھر میں رہ رہا تھا۔ اس کو انجنا کے مسلمان ہونے اور میرے ساتھ رہنے پر بہت غصہ تھا۔ میں انتظار میں تھا کہ وہ کسی دن میرے گھر آئے تو میں اس سے نمٹ لوں، ورنہ دوسری صورت میں مجھے منوج کے گھر میں جا کر ان کا کام تمام کرنا تھا۔

دو دن کے لیے مجھے اپنے بقایاجات لینے کے لیے دہلی جانا پڑ گیا۔ میں جمیلہ اور شکیلہ کو بھی ساتھ ہی لے جانا چاہتا تھا مگر وہ نہ مانیں۔ مجھے دہلی میں دو کی بجائے تین دن لگ گئے۔

تین دن بعد جب میں گھر لوٹا تو ایک اور جان لیوا صدمہ میرا منتظر تھا۔ منوج اور گنیش نے جمیلہ اور شکیلہ دونوں کی زندگی برباد کر ڈالی تھی۔ وہ دونوں مر چکی تھیں۔ میں اتنا بڑا صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ان ظالموں نے رات کے اندھیرے میں اس طرح سے درندگی کا کھیل کھیلا کہ اہل محلّہ کو خبر ہی نہ ہو سکی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی دونوں بہنوں کو لحد میں اتارا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ دکھ درد اور انتقام کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ میں نے اس رات نماز پڑھ کر پروردگار سے اپنی کامیابی کی دعا مانگی۔ میں نے اسی رات منوج کی کوٹھی میں گھس کر گنیش اور منوج دونوں کو قتل کر دیا۔ میرا ماموں نندرام سامنے آیا تو میں نے اسے بھی بھون ڈالا اور اسی رات میں میرٹھ سے فرار ہو گیا۔ میں دو ماہ تک بمبئی میں ایک دوست کے ہاں چھپا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ پولیس میری تلاش میں ہو گی۔ آخر کار میں غیر قانونی طریقے سے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے علاوہ اب میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

پاکستان آ کر مجھے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں دو ماہ لاہور میں مارا مارا پھرتا رہا مگر کوئی ٹھکانہ نہ بن سکا۔ وہاں سے میں کراچی چلا آیا۔ مجھے لوگوں نے بتایا تھا کہ کراچی بہت بڑا شہر ہے وہاں ملازمت آسانی سے مل جاتی ہے۔ میں

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

پڑھا لکھا تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ مجھے اچھی ملازمت مل جائے گی اور مجھے مالی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے گا۔ دو ماہ گزر گئے مگر مجھے کہیں بھی نوکری نہ ملی۔ جہاں کہیں بات بنتی نظر آتی وہاں مجھ سے شخصی ضمانت طلب کی جاتی مگر یہاں خدا کے سوا میرا کون تھا جو میری ضمانت دیتا۔ میں ہر جگہ اپنی داستان سناتا مگر لوگ مجھ سے ہمدردی کرنے کی بجائے مجھے ہندوستان کا جاسوس سمجھنے لگتے مگر میں نے لوگوں کی دل جلانے والی باتوں کی پروانہ کی اور نوکری کی تلاش کی دل جلانے والی باتوں کی پروانہ کی اور نوکری کی تلاش میں سرگرم رہا۔ اس عالم میں جب مجھے وحید، جمیلہ اور شکیلہ کی یاد آتی تو میرے زخموں کے منہ پھر سے کھل جاتے۔ دن تو ادھر ادھر بھٹکتے ہوئے گزر جاتا مگر رات میرے لیے عذاب بن جاتی۔ میں ان سب کو یاد کر کے بہت روتا مگر اس کے باوجود بھی میں نے پچھتاؤں کو نزدیک نہ آنے دیا۔ مجھے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ یہی احساس ہی میری ڈھارس بندھاتا اور میں نئے سرے سے ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ آخر کار میری محنت اور ہمت رنگ لائی اور مجھے ایک ہوٹل میں بیرا گیری مل گئی۔ میرے رہنے اور کھانے کا بندوبست بھی اسی ہوٹل میں ہی ہو گیا تب میں نے کچھ سکون کا سانس لیا۔

نیاز علی بھی اس ہوٹل میں ملازم تھا۔ جب اس نے میری دکھ بھری کہانی سنی تو اسے مجھ سے ہمدردی ہو گئی جو بعد میں محبت اور دوستی میں بدل گئی۔ اس لمحے مجھے وحید اور اس کی دوستی بہت یاد آتی۔ اس کا بدل تو مجھے زندگی بھر نہیں مل سکتا تھا مگر پھر بھی نیاز کی شکل میں مجھے ایک ہمدرد انسان مل گیا جس سے میں اپنے دکھ درد بانٹ سکتا تھا۔ نیاز نے بہت کہا میں شادی کر لوں مگر نہ جانے کیوں میں شادی سے دور بھاگتا تھا۔ کوئی آئیڈیل بھی نہ تھا۔ میں اپنی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دینا چاہتا تھا۔ یوں ہی کئی سال بیت گئے۔

ایک روز تین آدمی ہوٹل میں کھانا کھانے آئے ان کی ٹیبل پر میں نے ہی سروس کی۔ اب انہوں نے کھانا کھایا ہی تھا کہ وہ تینوں بے ہوش ہو گئے۔ ہوٹل منیجر نے پولیس کو ٹیلی فون کیا۔ جتنی دیر میں پولیس آئی دو آدمی جاں بحق ہو گئے جب کہ تیسرے کو اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں وہ طبی امداد ملنے کی وجہ سے بچ گیا۔ پولیس نے مجھے بھی شامل تفتیش کر لیا۔ ہوٹل کا کھانا لیبارٹری میں لے جا کر چیک کیا گیا تو اس میں زہر ثابت ہو گیا۔ باقی سب افراد تو بچ گئے مگر پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا کہ کھانے میں زہر میں نے ملایا ہے۔ پولیس نے میری خوب درگت بنائی پھر مجھے جیل میں بھیج دیا۔

میں نے اپنی بے گناہی کا یقین ہر ایک کو دلایا مگر میری کسی نے نہ سنی کیونکہ ثبوت میرے خلاف تھے۔ نیاز نے میری رہائی کی بہت کوشش کی مگر اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ پولیس والوں نے مجھے اس قدر پیٹا تھا کہ میں جیل کے اندر بیمار رہنے لگا۔ اخبارات نے اس خبر کو خوب اچھالا اور میری تصویر بھی نمایاں طور پر شائع کی۔ اخبارات نے میرے خلاف بہت کچھ لکھا اور اسے کسی دشمنی کا شاخسانہ قرار دیا حالانکہ ایسی بات نہ تھی۔ میری کسی سے کوئی دشمنی تھی نہ ہی میں کسی کو جانتا تھا۔ نیاز علی نے بہت کوشش کی اور بالآخر مجھے ضمانت پر رہا کرا لیا۔ مجھے ہوٹل کی نوکری سے جواب مل گیا۔ نیاز مجھے اپنے گھر لے گیا۔ مقدمہ چلتا رہا۔ لوگ مجھے غیر ملکی جاسوس اور قاتل کہتے۔ کوئی مجھ سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ نیاز نہ ہوتا تو میں شاید خودکشی کر لیتا مگر نیاز کی ہمدردیوں نے مجھے زندہ رکھا۔

ایک سال مقدمہ چلتا رہا۔ اخبارات میری ذات کے خلاف بغیر کسی ثبوت کے زہر اگلتے رہے مگر یہ میری خوش قسمتی کہ عدالت مجھ پر جرم ثابت کرنے میں ناکام رہی اور اصل مجرم جو ہوٹل کے کچن کا انچارج تھا گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مرنے والے آدمیوں کی کسی سے دشمنی چل رہی تھی۔ ان لوگوں کے دشمنوں نے ہوٹل کے باورچی کو ڈھیروں رقم دی کہ انہیں راستے سے ہٹا دے۔ باورچی نے بھی کمال ہوشیاری سے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس نے صرف اس سالن میں زہر ملایا جو اس وقت انہوں نے کھانا تھا۔ باورچی نے مجھے ڈھال بنایا اور کھانا میرے ہاتھوں بھجوایا مگر تفتیش کے دوران میں کئی حقائق سامنے آئے۔ یوں مجھے بری کر دیا گیا مگر اس کے باوجود

میرے جاننے پہچاننے والوں کی نگاہیں بدل

نے کراچی کو خیر آباد کہا اور اس مزار پر یاد الٰہی میں مشغول ہو گیا۔ خدا کو یاد کر کے اور عبادت

میں نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ یہاں کھانے اور رہنے کی سہولت تھی۔ اس لیے میں نے اس مزار کو ہی اپنا مسکن بنالیا۔''

وہ دم لینے کو رکا اور پھر دوبارہ بولا ''انسپکٹر صاحب...... یہ درست ہے کہ اس مزار کے علاقے میں کچھ جاسوس بھی ہوں گے مگر یقین کریں میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک سچا مسلمان اور پاکستانی ہوں۔ میں اب یہیں جیوں گا اور یہیں مروں گا۔ آپ کی ہر سزا مجھے قبول ہے مگر خدا کے لیے مجھے وطن کے غداروں میں شامل نہ کریں۔''

فضل کی زخم زخم داستان نے مجھے بھی رلا ڈالا۔ نہ جانے کیوں اس کی ہر بات مجھے سچی اور کھری لگی تھی۔ وہ بے گناہ اور بے قصور تھا مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''فضل! تم نے اسلام قبول کر کے جس عزم اور بہادری کا ثبوت دیا۔ وہ سراہے جانے کے قابل ہے۔ ماضی میں جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ کیونکہ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے آؤ ایک نئی زندگی کا آغاز کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، مجھے اپنا بھائی سمجھو۔ میں تمہارے دکھ درد بانٹوں گا تا کہ تمہارے زخم مندمل ہو جائیں۔ میں نے تم پر اعتماد کیا ہے مجھے یقین ہے کہ تم میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔''

فضل میرے ساتھ نہیں جانا چاہتا تھا مگر میں زبردستی اسے گھر لے آیا۔ جلد ہی میری کوششوں سے فضل کو ایک پرائیویٹ ادارے میں اچھی ملازمت مل گئی تو فضل نے گھر بھی علیحدہ کر لیا مگر ہم ایک دوسرے سے روزانہ ملتے۔ فضل واقعی محبتوں کا قدر دان نکلا۔ اس نے اپنے حسن اخلاق سے میرے خاندان والوں کے دل موہ لیے۔ وہ پکا اور سچا نمازی بن گیا۔ اس نے اپنے کردار اور عمل سے یہ ثابت کیا کہ وہ ایک صحیح معنوں میں مسلمان ہے۔ ہمارے تعلقات روز بہ روز مضبوط ہوتے گئے۔ فضل بھی ترقی کرتا گیا۔

فائزہ سے میری اچھی جان پہچان تھی۔ اس کے والدین بھی تخریب کاری کی بھینٹ چڑھ گئے تھے میری جان پہچان اس سے اسی سلسلے میں ہوئی تھی۔ مجھے اس سے بھی ہمدردی تھی۔ وہ اب اس دنیا میں اکیلی تھی۔ میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ وہ حسن اور خوبصورتی کا ایک مجسمہ تھی ایسی حسین لڑکی میں نے زندگی میں نہ دیکھی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر میں شادی شدہ نہ ہوتا تو اس سے ضرور شادی کر لیتا۔ فائزہ سے اب بھی میری ملاقات رہتی تھی۔ اس نے ابھی تک شادی نہ کی تھی۔ وہ یہی بتایا کرتی تھی کہ وہ ادھر ادھر ڈولتی ناؤ کی طرح زندگی گزار رہی ہے۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد عزیز رشتے دار منہ موڑ گئے ہیں۔ اب جو بھی ملتا ہے وہ میرے جسم کا طلب گار ہی ملتا ہے۔ کسی کو میری روح سے محبت نہیں ہے۔ بعض اوقات فائزہ پراسراری باتیں کرنے لگتی۔ وہ ایک فلیٹ میں اکیلی رہتی تھی۔ ایک دو بار میرا سرکاری کام کے سلسلے میں ادھر سے گزر ہوا تو اس کا فلیٹ بند ہی ملا۔ بعض اوقات خود ہی مجھ سے ملنے آجاتی۔ وہ یہی کہتی تھی کہ سہراب خان! مجھے صرف تمہاری شخصیت نے متاثر کیا ہے کیونکہ تم نے مجھے جینے اور زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا ہے اگر تم نہ ملتے تو میں بھی مر گئی ہوتی۔

میں کہتا۔ ''کیوں شرمندہ کرتی ہو فائزہ یہ تو میرا فرض تھا۔ جو میں نے نبھایا ہے۔ اور اب بہتر یہ ہے کہ تم شادی کر لو۔ تا کہ تمہیں تحفظ حاصل ہو جائے۔''

''یہ ذمے داری تمہاری ہے سہراب خان۔ جب بھی کوئی معقول اور میرے قابل شخص مل جائے تم مجھے اس کے پلے باندھ دینا۔ میں تمہارا بھرم ضرور رکھوں گی۔''

میں کہتا۔ ''ہاں جب بھی کوئی مخلص اور ہمدرد شخص میری نظروں میں آیا میں یہ کام فریضہ سمجھ کر انجام دوں گا۔''

اور اب جب سے فضل سے میرا واسطہ پڑا تو میں یہ جان گیا کہ فضل ایک مخلص اور ہمدرد انسان ہے۔ فائزہ اور فضل کی جوڑی خوب رہے گی۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ فائزہ اور فضل نے بھی میرے فیصلے سے اتفاق کیا۔ یوں ایک سادہ سی تقریب میں فضل اور فائزہ کی شادی ہوگئی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ان سے بڑھ کر میں بے حد مطمئن تھا کہ میں نے ان دونوں کو زندگی کا ساتھی بنا کر ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ دن یوں ہی گزرنے لگے۔

فضل اور فائزہ سے میری ملاقات ذرا کم ہونے لگی تھی کیونکہ فضل اب کمپنی کی طرف سے دوسرے شہروں کے دورے پر رہتا تھا۔ فائزہ نے گھر سنبھال لیا تھا۔

دو سال گزر گئے تھے مگر فائزہ کی گود ابھی تک ہری نہ ہوئی تھی جس کی وجہ سے فضل بے حد پریشان رہتا تھا۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق بظاہر دونوں میں کوئی نقص اور خرابی نہ تھی۔ فضل کو اولاد کی بے حد خواہش تھی مگر اس کے برعکس فائزہ کو اولاد کی اتنی خواہش نہ تھی۔ فضل بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ تھا۔ اسے امید تھی کہ پروردگار ایک نہ ایک دن اس کی دعا ضرور سنے گا اور اس کے آنگن میں بھی ننھے بچوں کی کلکاریاں گونجیں گی۔“

ایک روز فضل مجھ سے ملا تو وہ بہت ہی الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ فائزہ نے اب پر پرزے نکالنا شروع کر دئیے ہیں۔ وہ میری بات کم ہی مانتی ہے مجھے بتائے بغیر ہی گھر سے چلی جاتی ہے۔ اور اپنی مرضی سے واپس آتی ہے۔ روک ٹوک کروں تو جھگڑا شروع کر دیتی ہے۔ میں اسے نماز پڑھنے پر مجبور کرتا ہوں مگر وہ دینی باتوں پر توجہ ہی نہیں دیتی۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے نماز نہیں آتی۔ وہ کیسی مسلمان ہے؟ اس کے ماں باپ بھی کیسے بے پروا انسان تھے۔ جنھوں نے اپنی اولاد کو دینی احکام ہی نہیں بتائے۔“

میں نے اپنے طور پر فائزہ کو سمجھایا مگر اس پر میری باتوں کو کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے واقعی فضل کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے بھی اب ان کے گھر جانا اور ان سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔

فضل سے ملاقات ہوئے دو ماہ ہوگئے تھے اور اب اس کی تصویر دیکھ کر میری آنکھیں بھر آئی تھیں۔ فضل کی موت کا مجھے بے حد دکھ ہوا۔ حادثہ ہوئے تین دن گزر گئے تھے فائزہ کو بھی یقیناً خبر ہوگئی ہوگی مگر فائزہ نے مجھ سے ابھی تک رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں انکوائری نامکمل چھوڑی اور کراچی لوٹ آیا۔ میں نے اسپتال کے مردہ خانے سے فضل کی لاش حاصل کی اور اس کے گھر روانہ ہوگیا مگر وہاں تو تالا لگا ہوا تھا۔ فائزہ کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں گئی ہے؟ پڑوس والوں نے بتایا کہ فائزہ دو دن سے غائب ہے۔ مجھے فائزہ پر بے حد غصہ آیا۔ میں نے مکان کے تالے توڑ ڈالے اور فضل کی میت اندر لے آیا۔ میرے پاس وقت بہت کم تھا کیونکہ اس کے کفن دفن کا انتظام بھی مجھے ہی کرنا تھا۔ میں نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ اور بکھری ہوئی نظر آئی مگر میں نے اس طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ میں کسی کام سے دوسرے کمرے میں گیا تو فرش پر پڑے ہوئے ایک لفافے پر میری نظر پڑی۔ اس پر انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ ایک تجسس کے تحت میں نے وہ لفافہ اٹھالیا۔ اس پر ”پوجا“ لکھا ہوا تھا۔ لفافے کے اندر کوئی خط نہ تھا۔ مگر پھر بھی میں چونک گیا۔ میرا دماغ دور تک سوچنے لگا۔ میں جلد ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ فائزہ کے غائب ہونے سے میرے شک کو اور بھی تقویت مل گئی۔ میں نے جلدی جلدی فضل کی لاش کو دفنانے کا بندوبست کیا اور پھر فضل کے فلیٹ کی طرف لوٹ آیا۔ میں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور اس کے کمروں کی ایک ایک چیز کو چھاننے لگا۔ مجھے فائزہ پر شک ہوگیا تھا کہ وہی فضل کی موت کی ذمے دار ہے۔ اس لیے میں جلد از جلد معاملہ کی تہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

اسٹور روم کی تلاشی کے دوران میں مجھے ایک آڈیو کیسٹ ہاتھ لگ گئی۔ میں نے اسے ٹیپ ریکارڈ میں لگا کر آن کیا وہ کسی مرد کی آواز تھی جو پوجا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

”پوجا...... تم جس ہوشیاری سے کام کر رہی ہو وہ قابل تحسین ہے۔ تم نے فضل کے ساتھ شادی کر کے اچھا کیا تھا

مگر اب تم خود ہی کہہ رہی ہو کہ فضل کو تم پر شک ہوگیا ہے۔ یہ تمہارا قصور ہے لگتا ہے تم فضل کی محبت میں کھو کر اپنا اصل مقصد بھول گئی ہو۔ یاد رکھو اگر تم نے مزید کوئی غلطی کی تو تمہاری سزا موت ہوگی۔ اس سے قبل کہ فضل کو حقیقت معلوم ہو اور وہ ہمارے لیے کسی خطرہ کا باعث بن جائے۔ تم اسے ختم کر ڈالو، اس کی موت میں ہی ہمارے لیے زندگی ہے۔ جوں ہی فضل کسی دہشت گردی کی بھینٹ چڑھے تم اپنا ٹھکانا بدل دینا۔“

فائزہ کا اصل روپ میں جان گیا۔ میرا شک درست ثابت ہوا۔ فائزہ حقیقت میں ہندوستانی جاسوس پوجا تھی۔ میں اپنی کوتاہی پر پچھتانے لگا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوگئی۔ میں نے اپنے آپ کو اس ملازمت کے لیے نااہل جانا کہ میں جو چہرے پہچاننے میں ماہر تھا ایک لڑکی کے ہاتھوں دھوکا کھا گیا۔ پوجا نے مجھے بے وقوف بنا ڈالا۔ ریلوے کا حادثہ یقیناً تخریب کاری تھا۔ یہ تخریب کاری یقیناً پوجا نے کروائی تھی۔ محض فضل کو راستے سے ہٹانے کی خاطر اس نے کتنے انسانوں کا خون کر ڈالا۔ ایک بار پھر مرنے والوں کی خون آلود لاشیں میری نظروں میں گھوم گئیں۔ دکھ سے میری آنکھیں بھر آئیں۔ پچھتاوے کی آگ مجھے جھلسانے لگی۔

میں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے ملازمت چھوڑ دی کیونکہ میں اب سرکاری وردی پہننے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ فائزہ میرے سامنے آجائے تو میں اس کی بوٹیاں کر ڈالوں۔ مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سب کچھ اس قدر آسان نہ تھا...... اس لیے میں نے اس دن سے اپنے طور پر پوجا اور اس کے گروہ کی تلاش شروع کر دی ہے۔ میں نگر نگر بھٹک رہا ہوں مگر ابھی تک کامیابی حاصل نہیں ہوئی مگر پھر بھی میں ناامید نہیں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میں ایک نہ ایک روز پوجا تک پہنچ جاؤں گا۔ اس روز میں سمجھوں گا کہ میں نے اپنا فریضہ انجام دے دیا ہے، وطن کی مٹی کا جو قرض میرے کاندھوں پر ہے اور اس مشن کی تکمیل کے بعد ہی ادا ہو سکے گا۔ آپ لوگ میرے حق میں دعا کریں کہ خدا مجھے میرے نیک مقاصد میں کامیاب کرے۔

......☆☆☆......

خوب صورت

محمد سلیم کرد

اس کہانی کا کوئی تعارف نہیں بس ایک کہانی ہے اس احساس کی جو دل میں جنم لیتا ہے اور پھر جذبہ بن کر اظہار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

محرومی کا شکار دو جانداروں کی روداد' وہ بیابان جنگل میں اکیلے تھے۔

دس سالہ رجب غلیل ہاتھ میں لیے گھاٹی میں چلا آرہا تھا' آج وہ پچھلے تین گھنٹے کی سر توڑ کوشش کے باوجود اب تک خلاف معمول کوئی جنگلی کبوتر' تیتر اور نہ کوئی دوسری قسم کے پرندے کا شکار کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ یہ بات ہرگز نہ تھی کہ اس کے غلیل سے پھینکا ہوا پتھر عین اہداف پر نہ بیٹھتا نشانہ چوک جاتا' وہ ایک ماہر غلیل باز لڑکا تھا۔ وہ ہمیشہ پرندے کے سر کا نشانہ نہ لیتا بلکہ دھڑ کا نشانہ لیتا' تاکہ پرندہ عین موقع پر یا کچھ دیر بعد نہ مر جائے' اسے پرندے کے حرام ہونے کا خدشہ تھا اور وہ خود بھی بالغ نہ تھا کہ اسے خود ذبح کرتا لیکن آج وہ خالی ہاتھ تھا۔ جو شکار آج اسے نظر آئے تھے وہ رینج سے کافی باہر تھے۔ شکار کے شروع کے چند دنوں کے سوا کبھی خالی ہاتھ گھر لوٹا نہ تھا۔ تین چار زخمی پرندے لیے گھر پہنچتا تو اس کی سوتیلی ماں یہ دیکھ کر خوش ہو جاتی تھی' مگر آج رجب کو پختہ یقین تھا کہ وہ بالکل خالی ہی ہاتھ گھر لوٹے گا

اور سوتیلی ماں یہ دیکھ کر ضرور اس پر برسے گی۔

دراصل غلیل کے ذریعے پرندوں کا شکار صرف رجب کا شوق نہ تھا اس کے پیچھے دو اور اسباب کارفرما تھے۔ پہلی وجہ مختلف پرندوں کے گوشت کا لالچ تھا جو وہ اپنی سوتیلی ماں کو دیتا تاکہ اس پر چلنے والی تیز زبان بند ہو سکے۔ اور دوسری وجہ گھر سے باہر رہنے کا ایک بہانہ۔ رجب تین سال کا تھا اس کی ماں فوت ہو گئی۔ والدہ کے مرنے کے چھ ماہ بعد اس کے والد نے دوسری شادی کرلی۔ جب ننھے رجب نے اپنی ماں کی جگہ ایک دوسری عورت کو دیکھا تو اس کا معصوم ذہن حالات کو سمجھنے اور قبول کرنے سے بالکل قاصر تھا۔ کہاں گئی میری ماں؟ لوگ کہتے تھے اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں...... پھر کب آئے گی ماں؟ یہ عورت کون ہے؟ یہ کہاں سے آئی ہے؟ یہ ابو کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی اور باتیں کیوں کرتی ہیں؟ رجب کا ننھا دماغ بدلاؤ کو قبول کرنے سے انکاری تھا۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو تنہا اور اکیلا محسوس کرنے لگا۔

شروع میں تو سوتیلی ماں کا رویہ کسی حد تک محبت بھرا تھا لیکن گزرتے دنوں کے ساتھ اس کے رویے میں تبدیلی آتی گئی۔ سوتیلی ماں کی دیکھا دیکھی اس کے والد کے رویے میں بھی تبدیلی آ گئی۔ رجب کی مڈبھیڑ جب بھی سوتیلی ماں سے ہو جاتی تو اس کے والد ہمیشہ اپنی بیوی کے حق میں رجب کو ڈانٹ پلاتے۔

”شرم نہیں آتی تجھے یہ تیری ماں کی جگہ ہے......“

”پھر ماں تو نہیں ہے۔“ رجب ہمیشہ یہ مختصر جواب دیتا۔

جب گھر میں رمضان کی پیدائش ہوئی تو والد کے تمام رہی سہی محبتیں بھی ختم ہو گئیں۔ اب اس کی ساری توجہ اور محبتیں صرف رمضان کے لئے وقف تھیں۔ رجب گھر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ دن ہفتوں میں' ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلنے لگے۔ رجب خوف و نفرت اور بے رخی کے ماحول میں پروان چڑھتا ہوا دس سال کا ایک حساس مزاج رکھنے والا لڑکا بن گیا۔ رمضان گاؤں کے پرائمری اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ جب کہ رجب کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے میں اس کی سوتیلی ماں نے اس کے والد کو منع کیا تھا۔ جب رجب پانچ سال کا تھا ایک دن اس کے والد نے ارادہ ظاہر کیا۔

”رجب کو اب اسکول میں داخل کرانا چاہیے۔“ سوتیلی ماں جھٹ سے بولی۔

”یہ پڑھنے لکھنے والا لڑکا نہیں لگتا' کچھ بڑا ہو جائے تو اسے اپنے ساتھ باغ کے کام پر لگاؤ۔“ بیوی کا حکم سنتے ہی اس کے والد سر ہلانے لگا۔ شاید اس نے اپنی بیوی کا حکم سننے کے لیے اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا اب جواب آگے سے ”نا“ میں ملا تھا' تو اسے اس پر عمل بھی کرنا لازمی تھا۔ رجب کو پڑھنے لکھنے کا شوق تھا' لیکن وہ بے بس تھا' اس لیے چپ تھا۔ لیکن پھر بھی اسے اپنے سوتیلے بھائی رمضان سے کوئی بغض و حسد نہ تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ رمضان بھی اس کو پسند نہیں کرتا' اور ان دونوں کے درمیان ناپسندیدگی کی یہ کیفیت مزید بھرپور طریقے سے قائم و دائم رہے گی' پھر بھی وہ رمضان کے تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں اپنے دل میں کوئی بغض نہ رکھتا تھا۔

حالات کی بے رخی نے رجب کو اپنی عمر سے بڑھ کر سوچنے کی صلاحیت سے نوازا تھا وہ یہ بات اچھی طرح سے محسوس کر رہا تھا کہ اس کے متعلق ان تینوں کی رائے ایک ہے' اس کا والد' اس کی سوتیلی ماں اور سوتیلا بھائی اس کے متعلق ایک رائے رکھتے ہیں' اس لیے فی الحال اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہیے' ایسا کوئی قدم اٹھانے سے اجتناب کرنا لازمی ہوگا جس کے باعث اسے چھوٹی سی عمر میں گھر بیدخلی کا سامنا کرنا پڑے۔ پھر وہ اسی حکمت عملی کے تحت اپنے والد کی طرح اپنی سوتیلی ماں کا غلام بن کے رہ گیا۔ ہر حکم خاموشی سے بجا لانے لگا۔ پرندوں کا گوشت اس کی سوتیلی ماں کی مرغوب غذا تھی۔ اسی کمزوری کو مدنظر رکھتے ہوئے رجب نے سوتیلی ماں کی خوشنودی حاصل کرنے کے

بارے میں سوچا۔ اس کے گھر میں چھروں والی رائفل تھی اور نہ ہی وہ بندوق کے ذریعے شکار کر

اس حل کے لیے اس نے غلیل بنایا اور پرندوں کا شکار شروع کیا۔ ایک طرح سے یہ اس کی معصومانہ پالیسی تھی۔ شوق کا شوق' بک بک سے دور اور لالچ کا لالچ۔ پرندوں کے گوشت کی شائق سوتیلی ماں نے پہلے دن رجب کے شکار کیے ہوئے پرندوں کا گوشت کھایا تو دوسرے دن گوشت کے لالچ میں رجب کو خود شکار پر جانے کا حکم دیا۔

ایک دن رجب کے والد نے رجب کے شکار کے متعلق اپنی بیوی کی خوشی کے پیش نظر کہا۔

”شہر جانا ہوا تو رجب کے لیے ایک ایئر گن ضرور لاؤں گا۔“

”چھوڑیئے ایئر گن کو' آج کل ادنیٰ معیار کی ایئر گن بھی دو ہزار روپے سے کم نہیں ملتی اور اس کے چھروں کی قیمت الگ...... رجب غلیل کے ذریعے بہتر شکار کر رہا ہے۔“ سوتیلی ماں بولی تھی۔

بہرحال رجب اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔ شکار کی آڑ میں دن کا ایک حصہ سکون سے گزارنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ مگر آج شکار سے یکسر ناکام وہ گھر کی سمت بوجھل قدموں کے ساتھ لوٹ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ معمول کے مطابق اس کی سوتیلی ماں پرندوں کے گوشت کا بے چینی سے منتظر ہوگی اور خالی ہاتھ دیکھ کر ضرور گوشت کے بدلے اس کا بھیجہ کھائے گی۔

جنگل پر خاموشی کی چادر تنی ہوئی تھی۔ کہیں کوئی کسی پرندے کی چہچہاٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ وہ گھاٹی میں سست روی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا پھر اچانک سناٹے کو چیرتی ہوئی کراہ سے مشابہ مدھم سی آواز اس کے کانوں سے آ ٹکرائی۔ اس کے بوجھل قدم اپنی جگہ پر رک گئے۔ آواز اوپر سے آئی تھی اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ پھر کوئی چھوٹا جاندار جلد اس کی نظروں سے ٹکرایا جو اوپر پہاڑ کے کنارے تقریباً نو دس فٹ نیچے کی سمت واقع خودرو کانٹے دار جھاڑی سے لٹکا ہوا تھا۔ سورج پوری تمازت کے ساتھ آسمان پر چمک دمک رہا تھا۔ رجب غور سے دیکھنے لگا۔ بھیڑیے کا ایک بچہ خودرو کانٹے دار جھاڑی کی شاخ سے لٹکا ہوا تھا۔ دراصل شاخ بھیڑیے کے بچے کی ران کے آر پار تھی۔ اسی سبب بھیڑیے کا یہ ننھا بچہ نیچے گرنے سے بچ گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں درد سے بوجھل تھیں اور چہرے پر درد و اذیت کی پرچھائیں پھیلی ہوئی تھی۔

شکار میں ناکامی کے باعث رجب بیزاری اور غصے کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ بھیڑیے کے بچے کو اس طرح اوپر لٹکتے دیکھ کر اس کا پارا مزید چڑھنے لگا۔ ایک کراہ نکالنے کے بعد بھیڑیے کا بچہ اب تک خاموش تھا۔ شاید اس نے کراہ رجب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے نکالی تھی' تاکہ وہ اس کی مدد کر سکے۔

رجب قدم اٹھاتا پہاڑ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دائیں ہاتھ سے غلیل سنبھالا اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے غلیل کی پٹی میں موجود گول پتھر پر گرفت مضبوط کرلی' دوسرے لمحے اس نے غلیل کا رخ تقریباً اپنے سر پر لٹکتے ہوئے بھیڑیے کے بچے کی طرف کیا اور ربر پیچھے کی جانب کھینچنے لگا۔ اس کا نشانہ عین بھیڑیے کے بچے کی چھوٹی سی پیشانی تھی۔

”تو مجھ سے مدد مانگتا ہے ہاں...... میں تجھے نیچے اتاروں۔“ ”میں تجھے لٹکتے لٹکتے اوپر پہنچا دوں گا۔“ ”میں آج کوئی پرندہ نہ مار سکا۔ وہ خبیث عورت اپنی بکواس کے ذریعے میرا خون نچوڑ لے گی...... اب میں تیری پیشانی پھوڑ دوں گا......“ رجب نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

رجب کی آنکھیں بھیڑیے کے پلے کی آنکھوں سے دوچار ہو گئیں' درد و اذیت سے بوجھل دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں چھوٹی اور مختصر پیشانی اور ان سے اوپر دائیں بائیں دو چھوٹے چھوٹے کان رجب نشانہ لے چکا تھا۔

پھر اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں کوندا' ایک ایسا خیال جو رجب کے ضمیر کو جھنجوڑ کر بیدار کرنے میں مصروف تھا غلیل کے ربر کے تناؤ میں کمی آنا شروع ہو گئی۔

''ایک مصیبت زدہ بھیڑیے کے شیر خوار بچے کا شکار ایک حالات کی ستم ظریفی کا شکار انسان کا بچہ کیوں کرے؟ ہم دونوں بچے ہیں' مجھ سے میری ماں میرے بچپن میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی اور میں اس بھری دنیا میں اکیلا مارا مارا پھر رہا ہوں اور یہ ننھی سی جان ضرور اپنی ماں سے بچھڑ کر یہاں لٹک رہی ہے۔ ہم دونوں فی الوقت یکساں حالات سے دوچار ہیں اور بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ کمزوروں کو مارنا اور ان پر اپنا غصہ نکالنا بزدلی ہے۔'' ایسا سوچتے ہوئے رجب کے اعصاب تیزی کے ساتھ ڈھیلے پڑنے لگے۔ اور اس نے غلیل کا رخ نیچے کر لیا۔

''مجھے اس کو بچانا ہے' تاکہ یہ زندہ سلامت اپنی ماں کو مل سکے۔ جتنی بھی دیر ہو جائے اس کام میں سو ہو جائے...... مجھے اس کو ہر حال میں بچانا ہے۔ باڑ میں جائے خبیث عورت۔'' رجب نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کے دل میں سوتیلی ماں کا خوف زائل ہو رہا تھا اور اس کے اعصاب حیران کن طور پر پرسکون ہو رہے تھے۔ اس کو صحیح سلامت ماں سے ملانا ضروری ہے۔'' رجب نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا اور پھر لفظ ماں اس کے دل و دماغ میں جیسے گردش کرنے لگا۔ وہ نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر غیر ارادی طور پر ماں کا لفظ اس کے منہ سے خارج ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ماں کا دھندلا دھندلا سا خاکہ اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔ کشادہ پیشانی بڑی بڑی چمکدار آنکھیں۔ ستواں ناک' متناسب قد' وہ سرتاپا رجب کے لیے ممتا سے بھرپور محبت کی پیکر تھی۔ رونے دھونے اور ناراض ہونے کی صورت میں اس کا منانے اور سہلانے کا انداز شہد سے زیادہ ایسا شیریں کہ تمام کڑواہٹ اور ناراضگی پل بھر میں رفع ہو جائے۔ رجب تصور میں اپنی ماں کی آغوش میں مچل اور کھیل رہا تھا اور اپنے گرد و پیش سے بیگانہ تھا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ قدرت نے ایک ذمہ داری اس کے کمزور کاندھوں پر ڈالی ہے' اسے بہادری اور خوش اسلوبی کے ساتھ اسے سرانجام دینا ہے۔ رجب یہ سوچتے ہوئے جذبے کے ساتھ اٹھ گیا۔ اوپر لٹکتے بھیڑیے کے پلے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ خودرو کانٹے دار جھاڑی تک پہنچنے کے لیے پہاڑ کا جائزہ لینے لگا۔ خودرو کانٹے دار جھاڑی انتہائی خطرناک جگہ پر ایستادہ تھی۔ اوپر پہاڑ کے کنارے سے نیچے تقریباً نو' دس فٹ کے فاصلے پر واقع تھی اور اوپر سے نیچے اتر کر خودرو جھاڑی تک پہنچنا انتہائی مشکل بلکہ ناممکن تھا کیونکہ پہاڑ کے آخری کنارے سے لے کر خودرو جھاڑی تک کا جو درمیانی فاصلہ تھا وہ جگہ ایک سپاٹ فرش کی مانند تھا پیر جمانے کے لیے کہیں کوئی پائیدان سپورٹ نہ تھی اور نیچے سے اوپر جھاڑی تک کا درمیانی فاصلہ لگ بھگ سوفٹ سے بھی زیادہ تھا اور جھاڑی کے نیچے کی جگہ بھی ایک دائرے کی صورت میں سپاٹ فرش کی طرح تھی جو پھسلا کر انسان کو نیچے گرا سکتی تھی جب کہ بائیں طرف کچھ فاصلے پر جابجا ابھار بھی نظر آ رہے تھے جس پر پیر جما کر چڑھا جا سکتا تھا چند فٹ اوپر چڑھنے کے بعد بائیں مڑ کر پھر چند فٹ چلنے کے بعد دائیں مڑ کر اس راستے کو متبادل کے طور پر استعمال کر کے خودرو جھاڑی تک پہنچنا ممکن تھا سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ نیچے جابجا نوکدار پتھر کچھ ایسے انداز میں موجود تھے کہ اگر انسان تو کیا چھچھوندر بھی اتنی اونچائی سے گرتا اس کا سرمہ بن جانا یقینی بات تھی۔

رجب کوہستانی لڑکا تھا' ایسے دشوار گزار اور پرپیچ راہوں پر اترنے اور چڑھنے کا کافی تجربہ تھا لیکن اس جیسی ترچھی و کم پائیدان والی جگہ پر کبھی خود کو آزمایا نہ تھا۔ رجب کو ایک اور خدشہ بھی لاحق تھا۔ ننھے بھیڑیے کی ماں یا اس کی پوری فیملی ڈھونڈتے ڈھونڈتے بو سونگھتے سونگھتے یہاں تک وارد نہ ہو جائے۔ عموماً بھیڑیے ایک خاندان کی صورت میں رہتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اکٹھے چلے جاتے ہیں رجب کو یقین تھا کہ بھیڑیے کے پلے کی ماں ڈھونڈتے ڈھونڈتے

یہاں پہنچ ہی جائے گی اگر کسی چرند یا پرند کا چوزہ یا پلا کسی مصیبت میں پھنسا ہو تو اسے مصیبت سے

چرند پرند کی مائیں اس سوچ کے تحت حملہ آور ہوتی ہیں کہ اس کے بچے کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے پرندوں میں کوے کی بات کچھ الگ ہی ہوتی ہے جو شخص اس کے چوزے کو بلی یا کسی مصیبت سے بچا رہا ہوتا ہے' کوے کی چوزے کی ماں اپنی جگہ پوری برادری اس نیک انسان پر ٹوٹ پڑتی ہے اور کئی دنوں تک وہ ان کے عتاب کا شکار بنا رہتا ہے۔

یہ تو بھیڑیے کا بچہ تھا کوے کا چوزہ نہیں' ایک خونخوار درندے کا شیر خوار بچہ' جس کی ماں اپنے تیز اور نوکیلے دانتوں کے ذریعے ایک ہی وار میں چیر پھاڑ کر انسان کو ختم کر سکتی تھی۔

رجب کے پاس غلیل کے علاوہ ایک لمبے پل والا چاقو بھی تھا۔ اس کے سوا کوئی آتشیں ہتھیار نہ تھا کہ مادہ بھیڑیے کے آنے کی صورت میں آسانی کے ساتھ اپنا بچاؤ کر سکتا۔

رجب نے ہر حال میں بھیڑیے کے بچے کو بچانے کا دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

رجب نے غلیل کندھے پر ڈالا اور پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ منتخب کردہ راہ پر چڑھنے کے باعث وہ بالآخر جلد خودرو کانٹے دار جھاڑی کے تقریباً نیچے پہنچ گیا اور ننگی دیوار سے تقریباً چاروں ہاتھ پیر جما کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ چند ثانیے دم بھرنے کے بعد رجب ابھری ہوئی جگہوں پر قدم جما جما کر بھیڑیے کے بچے کے بالکل برابر پہنچ گیا۔ بھیڑیے کا پلا اپنے قریب آئے رجب کو دیکھ رہا تھا جس شاخ کے سہارے بھیڑیے کا بچہ لٹک رہا تھا وہ زیادہ موٹی تھی اور نہ مضبوط دکھائی دے رہی تھی لیکن ایک شیر خوار بھیڑیے کے بچے کا وزن سہار لینے کے لیے کافی تھا۔

رجب کو خدشہ تھا کہ شاخ کے شکنجے سے نکالنے کے دوران پلا مزاحمت ضرور کرے گا اس سوچ کے باعث رجب پلے کا سر سہلانے لگا تاکہ یہ سہل جائے اور بناء کسی چیخ و پکار کے کام کرنے دے۔ رجب نے دیکھا کہ بھیڑیے کا بچہ خاموش ہے وہ پلے کا اعتماد حاصل کر چکا ہے۔ رجب نے سائیڈ والی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کپڑے کا لپٹا ہوا تھیلا باہر نکالا رجب اپنے غلیل کے پتھروں سے پرندے مار گراتا تو ان زخمی پرندوں کو کپڑے کے اس تھیلے میں ڈالتا۔ رجب نے تھیلے کا دہانہ کھول دیا۔ ایک دفعہ پھر رجب بھیڑیے کے بچے کا سر سہلانے لگا۔ چند ثانیے سہلانے کے بعد اس نے پلے کی گردن کی کھال پکڑ کر دھیرے دھیرے سے اوپر کھینچنا شروع کر دیا۔ شاخ کا سرا کسی نیزے کی طرح نوکیلا تھا جو ران میں گھس کر دوسری طرف نکل گیا تھا۔ رجب نے تھیلا دونوں گھٹنوں کے درمیان پھنسا لیا تھا۔ بھیڑیے کے بچے کو اوپر اٹھا کر کھینچنے کے باعث شاخ ران سے نکل رہی تھی اور زخم میں رگڑ کھانے کی وجہ سے بھیڑیے کا بچہ بلبلانے لگا۔ زخم سے خون رسنے لگا لیکن رجب نے اپنے ہاتھ نہ روکے اور بالآخر اسے شاخ کے شکنجے سے آزاد کر لیا۔ اس کے چہرے اور کانوں پر بے شمار کانٹے چبھے ہوئے تھے رجب نے اپنے گھٹنوں کے درمیان پھنسا ہوا تھیلا ایک ہاتھ سے نکال کر اٹھایا اور پھر بھیڑیے کے گھائل شیر خوار بچے کو اس میں ڈال کر منہ بند کر لیا۔ رجب نیچے اترنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کا دایاں پاؤں پھسل گیا۔ فوراً اس نے کسی حد تک ایک ابھری ہوئی جگہ پر ہاتھ جمایا اور توازن کو برقرار رکھا۔ اس دورانیے میں تھیلے میں بند بھیڑیے کا بچہ بھی اندر مچلنے لگا تھا اگر وہ دونوں نیچے گر جاتے تو نیچے واقع بڑے بڑے نوکیلے پتھر دونوں کا قیمہ بناتے۔ رجب اترتے' ٹھہرتے' پیر جماتے احتیاط کے ساتھ بھیڑیے کے بچے سمیت نیچے اترنے میں کامیاب ہو گیا۔

رجب نے زمین پر بیٹھ کر احتیاط کے ساتھ تھیلے کا منہ کھولا' اندر بھیڑیے کا بچہ نیم غنودگی کی حالت میں نظر آیا۔ خون بہنے زیادہ دیر لٹکنے درد اور بھوک و پیاس کی وجہ سے وہ نڈھال تھا۔ رجب نے آس پاس نظریں دوڑائیں لیکن کہیں کوئی ذی نفس دکھائی نہ دیا۔ رجب نے تھیلے کا منہ ایک دفعہ بند کر لیا اور اسے اٹھا کر آگے بڑھنے لگا۔ تھیلا سوراخ دار تھا اس لیے اندر کسی بھی جاندار کے دم گھٹنے کا مسئلہ نہ تھا۔

رجب نے ایک درخت سے چند پتے توڑے اور انہیں اپنے ساتھ رکھا' پھر وہ پہاڑ کے سائے تلے واقع ایک صاف وشفاف جوہڑ تک پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنایا تھا اور اس پر وہ عمل کر رہا تھا۔ جوہڑ تک پہنچنے کے بعد اس نے تھیلا نیچے رکھ لیا پھر وہ چلو بھر بھر کر جوہڑ کا پانی پینے لگا۔ پانی صاف وشفاف اور ٹھنڈا میٹھا تھا خوب سیر ہو کر پانی پینے کے بعد اس نے زخمی بھیڑیے کے بچے کو تھیلے سے باہر نکالا اور چلو بھر کر پانی کے قطرے اس کے منہ میں ٹپکانے لگا ننھا بھیڑیا منہ کھول کر پانی کے قطرے قطرے حلق میں اتارنے لگا کافی سارے پانی کے قطرے حلق میں اتارنے کے بعد اس نے تھوتھنی کو دائیں بائیں ہلانا شروع کیا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''بس میں سیر ہو چکا ہوں۔'' پھر وہ کھڑا ہو کر چلنے کی سعی کرنے لگا۔ لیکن نہایت ہی دھیمی رفتار سے لنگڑا لنگڑا کر آگے بڑھ رہا تھا پھر وہ رک کر اپنا زخم چاٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ صرف کوشش' وہ اس کوشش میں بری طرح ناکام ہو رہا تھا' شاید زخم اور دیر تک لٹکنے کی وجہ سے اس کے پٹھوں میں کھنچاؤ آیا تھا' جس کے باعث اس کا منہ ران کے زخم تک پہنچنے سے قاصر تھا۔ اس نے یہ کوشش ترک کر دی اور زمین پر بیٹھ کر رجب کو اپنی چھوٹی چھوٹی سی آنکھوں سے دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ شاید وہ یہ بات جان چکا تھا کہ انسان کا یہ بچہ میرا ہمدرد اور مددگار ہے۔

''آؤ شہزادے میں تمہارا زخم صاف کر دوں۔'' رجب نے اٹھتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ پھر اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر زمین پر رکھے ہوئے سبز سبز پتوں کے قریب بیٹھ گیا۔ رجب دیکھ چکا تھا کہ وہ بھیڑیے کا نر پلا ہے رجب نے پہلے پتوں کے ذریعے زخم صاف کیا پھر پتھر کے ذریعے پتوں کو اچھی طرح کھوٹ کر زخم پر لگا دیا۔ رجب جانتا تھا کہ بھیڑیے کا بچہ یا اس کی ماں زخم کو چاٹیں گے تو یہ چند دنوں میں بھر جائے گا۔

زخم پر کھوٹے ہوئے پتے لگانے کے بعد رجب اس کے چہرے اور کانوں میں چھبے کانٹے نکالنے لگا۔

''وہ میری ماں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر چلی گئی...... میں تجھے تیری ماں سے ضرور ملوا دوں گا۔ شہزارے......'' رجب کہنے لگا۔

''ایک خونخوار درندے کا تو شیر خوار بچہ ہے' بڑا ہو کر تو بھی رات کی تاریکی میں بے رحمی کے ساتھ شکار کرے گا شہزادے...... فی الحال تم میری طرح مظلوم ہو۔''

ایسا سوچتے ہوئے رجب کے دل میں پھر اندیشہ سر ابھارنے لگا اس نے بھیڑیے کے پلے کو تھیلے میں ڈالا۔

منصوبے کے مطابق رجب واپس پلٹا۔ کیونکہ یہ جہاں لٹک رہا تھا اس کی فیملی یا ماں کا وہاں آس پاس ہونا یقینی بات تھی۔ وہاں جانا خطرے سے خالی نہ تھا' لیکن رجب کیا کرتا' وہ خود اس شیر خوار بھیڑیے کی دیکھ بھال نہ کر سکتا۔ رجب دوبارہ اس راستے پر چل رہا تھا جہاں سے آیا تھا۔

رجب بڑی تیزی کے ساتھ چلنے کے بعد جلد اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں بھیڑیے کا پلا لٹک رہا تھا رجب نے پلے کو فوراً تھیلے سے باہر نکالا۔ پھر رجب ایسے انداز میں چاروں اور دیکھنے میں مصروف ہو گیا جیسے بھیڑیے کی ماں آس پاس کہیں کسی درخت یا جھاڑی کے پیچھے موجود ہو۔ بھیڑیے کا زخمی بچہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ پھر ایک جگہ بیٹھ کر رجب کو بغور دیکھنے میں محو ہو گیا۔ اسے دراصل رجب سے انسیت ہو گئی تھی اور شاید وہ حیران تھا کہ رجب کیوں کھڑا ہے۔ اس کے پیچھے کیوں نہیں آ رہا ہے؟ رجب کی چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی وہ خطرے کی بو سونگھ رہا تھا۔ کندھے پر غلیل لٹکائے وہ پہاڑ پر مناسب راہ کا انتخاب کرتے ہوئے چڑھنے لگا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے بعد چاروں اور دیکھنے لگا سوائے چٹانوں اور درختوں کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا رجب چٹانوں کے کونے کھدروں اور درختوں کے تلے باریک بینی سے دیکھنے میں مگن تھا پھر جلد ایک سیاہ نکتے کی مانند کوئی چیز اس کی نظروں کا مرکز بن گئی خاص بات یہ تھی کہ وہ حرکت پذیر تھی اور لحہ بہ لحہ

گھاٹی کے قریب ہو رہی تھی۔ رجب کو اس سیاہ نکتے کے اسرار جانے کی بچھڑے ہوئے پلے کو ڈھونڈ رہی ہے اور اس کی بو سونگھ سونگھ کر یہاں آ رہی ہے۔ پھر وہ شے واضح دکھائی دینے لگی وہ ہلکے بھورے رنگ کا بھیڑیا تھا جو کبھی دوڑ کر اور کبھی سست روی سے آس پاس دیکھتا ہوا چلا آ رہا تھا بھیڑیے کا زخمی بچہ بھی ہلکے بھورے رنگ کا تھا جو اس وقت نیچے گھاٹی میں موجود تھا۔ ''شہزادے کی ماں پہنچ گئی۔'' رجب نے ایک مسکراہٹ سے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ وہ کافی حد تک نیچے گھاٹی میں قریب آ گئی اور اب وقفے وقفے سے غراہٹ کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی رجب چوٹی پر ایک محفوظ جگہ میں چھپ کر نیچے یہ نظارہ دیکھنے میں مستغرق تھا اب جب اس نے غراہٹ کی آواز نکالی تو نیچے موجود زخمی پلے کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اٹھ کر سامنے آواز کی سمت تقریباً لنگڑا لنگڑا کر دوڑنے لگا پھر وہ لمحہ آیا جس کا پہاڑ کی چوٹی پر چھپا ہوا رجب منتظر تھا بچے کی نگاہیں ماں سے اور ماں کی متلاشی نگاہیں اپنے بچھڑے ہوئے بچے سے دو چار ہوئیں پھر دونوں گویا بغل گیر ہو گئے۔

''کیسا خوبصورت نظارہ ہے۔ میرے پاس کیمرہ نہیں جو محفوظ کرتا۔'' رجب بڑبڑانے لگا۔

بھیڑیے کا بچہ پہلے اپنے منہ سے کچھ آوازیں نکالتا رہا پھر اپنی ماں کی چھاتی سے منہ لگا کر دودھ پینے لگا۔ اور ماں اس کی ران کے زخم کو چاٹنے لگی۔ جو آوازیں بھیڑیے کے بچے نے منہ سے نکالی تھیں۔ ان میں شکوہ تھا، درد تھا، اور دکھ بھی تھا مصیبت کے لمحوں کی کہانی تھی۔

پہاڑ پر موجود رجب یہ نظارہ بڑی خوشی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی روح دلشاد و مسرور تھی۔ اس نے زندگی کا سب سے اچھا شکار آج کھیلا تھا۔

''میں نے اپنی زندگی کا سب سے بہترین شکار آج کھیلا ہے، اپنی سوتیلی ماں کی خوشنودی کے لیے نہیں، بلکہ اپنے پروردگار کی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا کر یہ شکار کھیلا ہے۔'' رجب خوشی سے بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ اس کے دل و دماغ پر گویا تمام بوجھ اتر چکے تھے۔ اعصاب پرسکون تھے۔

بھیڑیا نے دودھ پلانے اور زخم چاٹنے کے بعد اپنے بچے کو لے کر واپس چلنے لگا زخمی بچہ لنگڑا لنگڑا کر چل ضرور رہا تھا لیکن رجب اچھی طرح دیکھ رہا تھا کہ پہلے کی نسبت لنگڑاہٹ میں قدرے کمی آئی تھی شاید یہ ماں کے دودھ کی تاثیر تھی یا ماں کی قربت کا اثر تھا بہر حال جو بھی تھا ماں کی آمد کے بعد یہ اچھی تبدیلی نظر آ رہی تھی زخمی بچہ ماں کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ وہ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگا' پھر چھوٹی تھوتھنی اٹھا کر چوٹی کی طرف دیکھنے لگا جہاں رجب چھپا بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔

''الوداع شہزادے۔'' رجب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ایک بار پھر وہ ماں کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ دور ہوتے جا رہے تھے' بالآخر وہ لمحہ بھی آ گیا دونوں رجب کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

......☆☆☆......

ذوق آگہی

سباس گل

‹اس ماہ کا انعام یافتہ اقتباس›

فلسفۂ زندگی

زندگی کو جب بھی دیکھا عجب ہی پایا، کبھی یہ دھنک کی طرح سات رنگ بکھیرتے ہوئے نظر آئی، کبھی گھمبیر بادل کی طرح اپنے اوپر اداسی کا گہرا خول لیے نظر آئی، کبھی میں نے زندگی کو دریاؤں اور سمندروں کی جوش مارتی ہوئی لہروں کی طرح متحرک پایا۔ کبھی میں نے زندگی کو برف پوش پہاڑوں کی مثل منجمد پایا، جو حرارت ملتے ہی چیخ جاتے ہیں۔ کبھی زندگی کو برستی ہوئی موسلا دھار بارش کی مانند پایا جو دکھوں اور غموں کی کثافت کو شفاف کر دیتا ہے۔ کبھی زندگی کو الجھی ہوئی ڈور کی مانند پایا جو رشتوں میں الجھی ہوتی ہے، کبھی زندگی کو میں نے خوب صورت تتلی کی مانند دیکھا جو اُڑتی ہوئی سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے لیکن جب میں نے زندگی کی حقیقت کو بہت قریب سے جانا تو سمجھ میں آیا کہ یہ تو خدا کی لازوال نعمت ہے جس کا ہم شکر ادا نہیں کرتے۔

شازیہ ہاشم......کھڈیاں خاص، قصور

یقین تعداد

اللہ کے حضور ایک عام شخص اور ایک عالم کے درمیان اور اس کے ادا کیے ورد اسماء یا وظیفے کے درمیان کرنٹ انرجی کا تبادلہ ہوتا ہے جسے عامل اپنے جسم میں جذب کر کے اس حاصل شدہ توانائی کو خیال کی لامحدود قوت پر لوڈ کر کے کسی انسان کو فائدہ پہنچانے کے لیے استعمال کرتا ہے ورد، اسماء یا وظیفے میں یقین تعداد بہت بنیادی حیثیت کی حاصل ہے۔ تعداد کا یہ راز صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ تعداد کے راز کی حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی اسم یا دعا معین کردہ مخصوص تعداد میں نہ پڑھی جائے تو اس اسم یا دعا کی طاقت ایکٹی ویٹ نہیں ہوگی۔ یا تعداد اگر بتائی گئی تعداد سے زیادہ کر دی گئی تو وہ کرنٹ جو اس اسم اور عامل کے درمیان انرجی پاور بن رہا ہے وہ تباہ کن انرجی میں تبدیل ہو جائے گا چنانچہ جب عامل اسماء کا یا دعا کا ورد یا یوں کہہ لیں کہ ان انرجی یونٹس کا ورد صادق نیت اور امور خیر کے لیے کرتا ہے۔ ایک غیبی قوت اور توانائی ایک نورانی پوٹینشل اس عامل سے مانوس ہوتی چلی جاتی ہے آہستہ آہستہ وہ عامل اس قوت توانائی کی پکار اپنے پاس محسوس کرنے لگتا ہے جو اس کو ماورائی دنیا سے وابستہ کراتی ہے۔

گل مہر......کراچی

احسان

احسان کرنا آدمی کو انسان اور دنیا کو جنت بنا دیتا ہے۔ جس معاشرے میں اس صفت کا فقدان ہو وہ معاشرہ انسانیت سوزی کا نمونہ بن جاتا ہے ایسے معاشرے میں امیر غریبوں کا خون چوستے نظر آتے ہیں۔ تاخیر اور ذخیرہ اندوز ضرورت مندوں کی مجبوری خرید کر انہیں ضروریات زندگی مہیا کر کے اپنی تجوریاں بھر لیتے ہیں طاقتور کمزور کو بے بس کر دیتا ہے۔ مادیت پسندی سے روحانیت کی شمع بجھ رہی ہے بزرگوں کے دیے اس سبق کو بھی بھول بیٹھے ہیں کہ خود بھی امن سے جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو مگر افسوس کہ ہم نے اس مقدے کا پہلا حصہ تو یاد رکھا مگر دوسرے کو بارگراں سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا ہے۔ یاد رکھو، اگر تم آزاد زندگی گزارنا چاہتے ہو تو دوسروں کی آزادی میں بھی مداخلت نہ کرو اگر سکون کی طلب ہے تو کسی کو بے سکون نہ کرو اگر مسرت چاہتے ہو تو دوسروں کے دکھ درد سمیٹنے کی کوشش کرو لیکن یہ بھی خیال رہے کہ دوسروں پر احسان کرو مگر اپنے احسان کو یاد نہ رکھو اور اگر کوئی دوسرا تم پر احسان کرے تو اسے فراموش نہ کرو۔

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

ڈاکٹر

آج کے اس معاشرے میں ڈاکٹروں کی بے حسی پر حیرت ہوتی ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے بظاہر جو مسیحا ہیں ان کے اندر خدمت خلق کا جذبہ مر چکا ہے ڈاکٹرز حضرات کو صرف اپنی جیب گرم کرنے سے غرض ہے۔ اے کاش لوگوں میں آج پھر جذبہ ایمانی پیدا ہو جائے انسانی دل جس طرح ساخت کے اعتبار سے نرم ہوتا ہے اسی طرح ہمدردی کے لحاظ سے بھی نرم ہو جائے۔ میں جب ڈاکٹروں کی غلفت کی وجہ سے لوگوں کو مرتے دیکھتا ہوں تو

میرا دل خون کے آنسو روتا ہے کہ اس مسیحاؤں کو کیا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر حضرات کیوں اپنا مثبت کردار چھوڑ چکے ہیں میری اپنے رب سے دعا ہے کہ ہمارے مسیحاؤں کے دلوں میں وہی جذبہ ایمانی پھر سے پیدا فرما دے، آج کے اس نفسانفسی دور میں انسان کو خطرہ سب سے زیادہ لاحق انسان سے ہی ہے قدرت حق نے انسان کو انسان کی مدد کے لیے بھیجا ہے جو انسان اس دنیا میں فقط دوسرے لوگوں کے لیے رہبر اور رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے دراصل وہی انسانیت کو سب سے زیادہ دکھ اور تکلیف دے رہا ہے۔ اگر ڈاکٹرز حضرات لالچ سے بے لوث خدمت خلق کو اپنا منشور بنا لیں اور تہہ دل سے ارادہ کر لے کہ میری زندگی کا مقصد فقط لوگوں کی بھلائی کا ہی ہے تو اس معاشرے میں کافی حد تک سدھار پیدا ہو جائے گا کبھی کبھی بہت افسوس ہوتا ہے جب ڈاکٹرز کے نزدیک ایک انسانی جان سے زیادہ انہیں اپنی جیب زیادہ عزیز ہوتی ہے میری اپنے رب کریم سے دعا ہے کہ اے باری تعالیٰ مسیحاؤں کو جذبہ ایمانی عطا فرما، آمین۔

علی رضا......منچن آباد

انمول موتی

- ❁ قلم امانت ہے اسے نیک مقصد کے لیے چلا۔
- ❁ آزادی کے چراغ تیل سے نہیں لہو سے جلتے ہیں۔
- ❁ مجاہد موت سے نہیں ڈرتا بلکہ موت اس سے ڈرتی ہے۔
- ❁ جب تم کسی سے دوستی کرو تو اس پر شک نہ کرو۔
- ❁ وفادار ہونا اہم ہے خوب صورت ہونا نہیں جس طرح کئی خوب صورت بادلوں میں پانی نہیں ہوتا اس طرح کئی خوب صورت لوگوں میں وفا نہیں ہوئی۔

ریاض بٹ......حسن ابدال

ماں باپ کا پیغام اولاد کے نام

○ جس دن تم ہمیں بوڑھا دیکھو تب صبر کرنا اور ہمیں سمجھنے کی کوشش کرنا۔

○ جب ہم کوئی بات بھول جائیں تو ہم پر غصہ نہ کرنا اور اپنا بچپن یاد کرنا۔

○ جب ہم بوڑھے ہو کر چل نہ پائیں تو ہمارا سہارا بننا اور اپنا پہلا قدم یاد کرنا۔

○ جب ہم بیمار ہو جائیں تو وہ دن یاد کر کے ہم پر اپنے پیسے خرچ کرنا۔

○ جب ہم تمہاری خواہش پوری کرنے کے لیے اپنی خواہشیں قربان کرتے تھے۔

محمد یاسر اعوان......رحیم یار خان

ذرا سوچیے

بدلتے وقت کے ساتھ لوگ کتنا بدل گئے ہیں یا شاید کے وقت اتنی تیزی سے نہیں بدلا جتنی تیزی سے لوگ بدل گئے ہیں بہت ہی دکھ ہوتا ہے جب لوگوں کی بے حسی دیکھتا ہوں بہتر سے بہتر کی تلاش میں لگے لوگ خود کو بہتر کیے بغیر بہتر کو تلاش کر رہے ہیں۔ اگر اچھے کی تلاش میں لگنے کی بجائے بندہ خود اچھا بننے کی کوشش میں لگ جائے تو یہ معاشرہ حقیقت اچھا ہو جائے گا۔ سب سے بڑی خامی ہماری اور ہمارے معاشرہ کی یہ ہے کہ ہم اپنی اصلاح تو کرتے نہیں بلکہ اپنے سے اچھے کی تلاش میں لگے رہتے ہیں ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر برائی کو اپنے سے نکال کر ہر اچھائی کو اپنے اندر جذب اور پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے آج ہم برے کی برائی کرتے نہیں تھکتے، تاریخ گواہ ہے برائی ہی کی وجہ سے کسی برے کو یاد کیا جاتا ہے اور اچھائی ہی کی وجہ سے کسی اچھے کی تعریف کی جاتی ہے۔ برا بندہ تو ختم ہو جاتا ہے پر اس کی برائی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور جب کوئی بندہ کبھی بھولے سے برے کو یاد کر لے تو لازماً وہ برے کو لعن طعن کرے گا اور دوسری طرف اچھے لوگوں کو دنیا ایسے یاد کرتی ہے اور محبت رہتی ہے گویا وہ اچھے لوگ ان کے درمیان موجود ہوں اور یہ تو ناممکن ہے فرض کیجیے اگر کوئی بندہ اچھے کی تعریف نہ بھی کرے تو یہ یقینا کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کی برائی بھی نہیں کرے گا۔

حسین خواجہ......منچن آباد

اذان اور موذن کی فضیلت

اذان و اقامت بظاہر نماز کے وقت کا اعلان نماز کا بلاوا ہے لیکن اگر ہم ذرا غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اذان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے جامع اور بنیادی کلمات حکم فرمائے ہیں جو دین کی بنیادی اصولوں کی تعلیم اور دعوت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں اذان و اقامت انتہائی بلیغ اور موثر دعوت

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ہے جو ہماری ہر مسجد سے روزانہ پانچ وقت دی جاتی ہے ہر مسلمان کو اذان کے معنی یاد ہونے چاہیے۔

آپ ﷺ نے اذان و اقامت کی ادائیگی کے متعلق کئی احکام ہمیں دیے ہیں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جب تم اذان دو تو آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر دیا کرو (یعنی ہر کلمہ پر سانس توڑ دو اور وقفہ کیا کرو) اور جب اقامت کہو تو رواں کہا کرو اور اپنی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا فاصلہ کیا کرو کہ جو شخص کھانے میں مشغول ہے وہ فارغ ہو جائے اور جس کو استنجے کا تقاضہ ہے وہ جا کر اپنی ضرورت سے فارغ ہو جائے اور کھڑے نہ ہوا کرو جب تک مجھے نہ دیکھ لو حضرت زید بن حارثؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ فجر کی نماز کے وقت رسول ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ تم اذان پڑھو میں نے اذان پڑھی اس کے جب اقامت کہنے کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے ارادہ کیا کہ اقامت وہ کہیں تو حضور ﷺ نے (میرے متعلق) فرمایا کہ اس صدائی نے اذان پڑھی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ جو اذان پڑھے وہی اقامت کہے جب موذن اذان دیتا ہے اور اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی کبریائی توحید اور رسول ﷺ کی رسالت اور دعوت کا اعلان کرتا ہے تو انسان کے علاوہ جن اور دیگر مخلوقات بھی اس کو سنتی ہیں اور یہ سب مخلوق قیامت کے دن اس کے حق میں شہادت دے گی۔

رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا وہی کلمات کہا کرو جو موذن کہتے ہیں یعنی اذان کا جواب دینے والا وہی الفاظ دہرائے جو موذن نے کہے پھر جب تم اذان کا جواب دے چکو تو دعا مانگو، جو مانگو گے دیا جائے گا۔

ملک جواد نواز قریشی……ڈیرہ اسماعیل خان

جمعہ کی سنتیں

اچھا لباس……

غسل……

خوشبو……

مسواک……

سرمہ……

سورۃ کہف کی تلاوت……

انیل خان……کراچی

حکمت کی باتیں

✦ جب زمانہ امن کا ہو اور حالات جنگ جیسے ہوں تو سمجھو عذاب ہے۔

✦ جو سوچو گے وہی پالو گے اس لیے اپنی سوچ مثبت اور تعمیری رکھیں۔

✦ بامقصد زندگی انسانیت کا پتا دیتی ہے۔

✦ یادیں ماضی کا حسن اور مستقبل کا سرمایہ ہوتی ہیں۔

✦ ہر شخص سچا دوست تلاش کرتا ہے لیکن سچا دوست بننے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

✦ تعلیم انسانیت بخشتی ہے لیکن بہت کم لوگ اس کی حقیقت سے باخبر ہیں۔

✦ کسی انسان کا پہلا پیار بننا کوئی بڑی بات نہیں بننا ہے تو کسی کا آخری پیار بنو۔

اسحاق……ملتان

اللہ کی شان

میں بھی کتنا ''عجیب'' ہوں!
صحت یاب ہوں تو ''اللہ پاک'' کو بھول جاتا ہوں۔
مصروف ہوں تو ''نماز'' بھول جاتا ہوں۔
برائی کروں تو ''انجام'' بھول جاتا ہوں۔
دیکھوں کو ''حیا'' بھول جاتا ہوں۔
کھاتا ہوں تو ''بسمہ اللہ'' بھول جاتا ہوں۔
کھالوں تو ''الحمد اللہ'' کہنا بھول جاتا ہوں۔
کسی سے ملوں تو ''سلام'' بھول جاتا ہوں۔
سوتے ہوئے ''توبہ'' بھول جاتا ہوں۔
غصے میں ہوں تو ''برداشت'' بھول جاتا ہوں۔
سفر پر جاؤں تو ''دعا'' بھول جاتا ہوں۔
کیا شان ہے میرے ''اللہ پاک'' کی وہ پھر بھی مجھے نوازتا ہے اور مجھے نہیں بھولتا۔ سبحان اللہ۔

اسلم حیات……لاہور

پیاری معلومات

✦ میرے پیارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں صرف ایک حج کیا' چار بار عمرہ کیا۔

✦ آپؐ 53 سال مکہ معظمہ میں رہے اور 10 سال مدینہ میں گزارے۔

✦ آپؐ کے 3 بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں بیٹوں کے نام محمد قاسمؓ محمد ابراہیمؓ محمد طاہرؓ تھا اور بیٹیوں کے نام حضرت زینبؓ حضرت رقیہؓ حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ تھا۔

✦ آپؐ کے دانت مبارک جنگ اُحد میں شہید ہوئے۔

✦ جب آپؐ بیمار تھے تو آپؐ کے مصلے پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے سترہ نمازیں پڑھائیں۔

✦ آپؐ نے جب اس دنیا سے پردہ فرمایا تو آپ کو حضرت علیؓ نے غسل دیا۔ آپ کی تدفین کے لیے حضرت ابو طلحہؓ نے لحد مبارک کھودی (سبحان اللہ)۔

✦ آپؐ نے فرمایا جو شخص سوتے وقت 21 بار پوری بسم اللہ پڑھے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ اس شخص کی ہر سانس کے بدلے نیکی لکھو۔

سبحان اللہ

مہوش……ٹنڈو الٰہیار

میں اور وہ

☆ میں چار سال کا تھا وہ جب وہ پیدا ہوئی
☆ میں نے اسکول میں داخلہ لیا تو وہ دو سال کی تھی
☆ میں پرائمری میں تھا وہ پریپ میں تھی
☆ میں ڈل میں تھا وہ پرائمری میں تھی
☆ میں میٹرک میں تھا وہ میٹرک میں تھی
☆ میں میٹرک میں تھا وہ FSC میں تھی
☆ میں میٹرک میں ہی تھا وہ BSC میں تھی
☆ میں میٹرک میں ہی تھا وہ MSC میں تھی
☆ میں میٹرک میں ہی تھا وہ PHD کر رہی تھی
☆ میں میٹرک میں ہی تھا وہ ڈاکٹر بن گئی
☆ کل اس کی شادی ہے اور میرا میٹرک کا پیپر ہے

قارئین! میرے حق میں دعا کیجیے گا۔

خالدہ حسین……بورے والا

انمول موتی

◉ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس گھر میں بہت خیر و برکت ہوگی جہاں کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھو کر کلی کرنے کی عادت ہو۔

◉ ہم خیال لوگ ہمسفر ہو جائیں تو منزل آسان ہو جاتی ہے۔

◉ مسکراہٹ ایک صدقہ ہے جو تم کسی کو کسی بھی وقت دے سکتے ہو۔

◉ پی حبت ایک

اس سے بھی نایاب ہے۔

◉ دنیا میں انسان تو بہت ہیں لیکن ان میں سے چند ایک ہی خوشبوؤں میں مہکتے ہیں۔

افضل انصاری……راولپنڈی

مہکتی کلیاں

◉ انسان ایک دکان ہے اور زبان اس کا تالا' تالا جب کھلتا ہے تو معلوم ہوتا ہے دکان سونے کی ہے یا کوئلے کی۔

◉ انسان بزدل اتنا ہے کہ سوتے ہوئے خواب میں بھی ڈر جاتا ہے اور بے وقوف اتنا ہے کہ جاگتے ہوئے بھی اپنے ربّ سے نہیں ڈرتا۔

◉ دل ٹوٹنا کیا ہوتا ہے اس چڑیا سے پوچھ جس کا ایک ایک تنکے سے بنا ہوا گھونسلا کسی سنگ دل نے اس کی آنکھوں کے سامنے توڑ دیا یا اس ماں سے پوچھو جس کا جوان بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے چل بسے۔

بتول زہرہ……میرپور خاص

حُسن

۞ حسن سیاہ بالوں میں نہیں بلکہ اس پاکیزہ ہالہ میں ہے جو اُن بالوں کے گرد محیط ہے۔

۞ حسن بڑی بڑی آنکھوں میں نہیں بلکہ اس نور میں ہے جو اُن آنکھوں سے پھوٹتا ہے۔

۞ حسن گلابی ہونٹوں میں نہیں بلکہ اس شیرینی میں ہے جو اُن ہونٹوں سے ٹپکتی ہے۔

۞ حسن خمدار گردن میں نہیں بلکہ اس کیفیت میں ہے جو ذرا آگے کی طرف گردن جھکانے سے پیدا ہوتی ہے۔

۞ حُسن جسم کی خوب صورتی میں نہیں بلکہ روح کی عظمت میں پوشیدہ ہے۔

۞ حُسن سفید رنگت میں نہیں بلکہ دل کے آئینے کے اُجلے پن میں پنہاں ہے۔

کمال شیخ……فیصل آباد

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

(اس ماہ کا انعام یافتہ کلام)

اے پاگل

کبھی جو تم مجھ کو
حد سے زیادہ
اداس پاؤ تو
میرا مزاج بہلانے کو
میری سوچیں بدلنے کو
تھوڑا احساس کر لینا
مجھے تم پاس کر لینا
اپنے لرزتے ہونٹ
میری پیشانی پر رکھ کر
میرے دکھ درد سمجھ لینا
سمجھ لینا کہ یہ پاگل
بے حد حساس لڑکی ہے
جو خوابوں کے جزیروں کی
گیلی نرم ریت پر
ننگے پاؤں تمہاری سنگت
کبھی سیپاں چنتی ہے
تو کبھی نرم پروں والی
تتلیوں کے پیچھے دور تلک بھاگتی ہے
سمجھ لینا کہ یہ لڑکی
زندگی کی خوشیوں کو
دھنک کے ساتوں رنگوں میں سمو کر
فلک کے پار اڑتی ہے
بڑے ہی خواب بنتی ہے
گر محسوس ہو جائے
تو بھلا کر سبھی باتیں
چپکے سے میرے ہاتھ پر
اپنا ہاتھ رکھ دینا
مجھے اپنا سمجھ لینا
اور کہہ دینا کہ اے پاگل
چلو اب ساتھ چلتے ہیں

نازسلوش ذشے...... میرپور آزاد کشمیر

ذرا ذرا

چاہتوں کے سلسلے اور بے خودی ذرا ذرا
وہ مختصر سی خواہشیں اور عاشقی ذرا ذرا
یہ دوریاں نزدیکیاں سب کہنے سننے کی بات ہے
ہیں لفظوں میں بھی فاصلے اور بندگی ذرا ذرا
کس ادا سے مانگ لوں کہ مل جائے تو مجھے
اک دعا منتظر لب اور عاجزی ذرا ذرا
کبھی ہجر میں کبھی قرار ہے کبھی دھڑکنوں سے الجھنیں
نا ہوش ہے نا خود کی خبر اور دیوانگی ذرا ذرا

میر
بڑی حسرتیں ہیں جینے کی اور زندگی ذرا ذرا
کلام: میر تقی میر
طوبی رفاعی...... کراچی

ٹوٹتا تارا

نہ تم مجھے اب فون کرنا
نہ میں تمہیں خط لکھونگی
نہ تم کبھی بیتے دن یاد کرنا
نہ میں گزری باتیں یاد رکھونگی
نہ تم اپنا درد کسی سے بانٹنا
نہ میں کسی سے کچھ کہونگی
اگر اتفاق سے زندگی کے کسی موڑ پر
تمہارا مجھ سے ہو جائے سامنا
تو تم مجھ کو نہ پہچاننا
نہ میں تم کو پکارونگی
ہاں مگر سنو
ایک کام کرنا
جب کبھی آسمان پر
دیکھو ٹوٹتا تارا
تو دعا کرنا
کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا
وہ کسی کے ساتھ نہ ہو

افشاں شاہد...... کراچی

تو بخشش کر

تیری ہے زمیں تیرا آسماں
تو بڑا مہرباں تو بخشش کر
سبھی کا ہے تو سبھی تیرے
خدا میرے تو بخشش کر
تیری مرضی سے اے مالک
ہم اس دنیا میں آئے ہیں
تیری رحمت سے ہم سب نے
یہ جسم اور جان پائے ہیں
تو اپنی نظر ہم پر رکھنا
کس حال میں ہیں یہ خبر رکھنا
تو چاہے تو ہمیں رکھے
تو چاہے تو ہمیں مارے
تیرے آگے جھکا کے سر
کھڑے ہیں آج ہم سارے
سب سے بڑی طاقت والے
تو چاہے تو ہر آفت ٹالے
تو بخشش کر
تو بخشش کر

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان

کالج گرل

جب وہ کالج گرل ہوا کرتی تھی
کتنی شوخ و شنگ ہوا کرتی تھی
چاندی سی صورت تھی اس کی
پھولوں کی طرح وہ ہنستی تھی
روح پر کوئی بوجھ نہ تھا
دل اس کا مایوس نہ تھا
کتنی گہری نیند وہ سوتی تھی
جاگتی آنکھوں سپنے دیکھا کرتی تھی
جیون تھا گلاب سا
اور وہ مہکا کرتی تھی
ہونٹوں پہ اس کے گیت مچلتے تھے
آنکھیں اس کی تب مسکاتی تھیں
کتنی آرزوئیں تھیں اس کی
کتنے خواب بنا کرتی تھی
وقت کا پہیہ آگے سرکا
اس کا پیارا کالج چھوٹا
وہ اپنے گھر بار کی ہو گئی
اس کو کئی مسئلوں نے گھیرا
الجھن کا تھا وہاں پہ ڈیرا
پہلے دل کے ارمان گئے
پھر ہونٹوں کی مسکان گئی
آنکھیں اس کی ویران ہوئیں
چین گیا پھر نیند گئی
پھول سا جیون خار بنا
غم گلے کا ہار بنا
اب وہ نم نم آنکھوں سے
یہ ہی سوچا کرتی ہے
جب وہ کالج گرل ہوا کرتی تھی
کتنی شوخ و شنگ ہوا کرتی تھی

شازیہ ستار نایاب

قید

ساون کی اک برستی شام میں
سنگ میرے وہ ہرجائی تھا
دل کا ہر موسم بہار سے آشنائی تھا
میں تھی قید اس کی چمکتی اور
پرشوق نگاہوں میں
گویا کائنات کی ہر شے سمٹ آئی تھی
بہت ہی والہانہ پن سے اس نے
اپنے اندر سمویا تھا ہر نقش میرا
اک جذب کے عالم میں
تھام کر ہاتھ میرا
بارش کی چند بوندوں کو
قید اس نے کیا
اور کہا
اسے سنبھال رکھنا
کبھی پھسلنے نہ دینا
اور مجھے بچھڑنے نہ دینا
میں آج بھی قید ہوں اس عہد میں
بند مٹھی میں سنبھالے

چند قطرے بارش کے
میں آج بھی کھڑی وہیں اس در پہ
مگر
اپنی قید دے کر وہ شخص بچھڑ گیا مجھ سے
کیے وعدوں سے مکر گیا مجھ سے
کیے وعدوں سے مکر گیا مجھ سے

اقرا سیف......فیصل آباد

نظم

اب سو جاؤں میں
دنیا سے خفا ہو جاؤں میں
ہنس لوں ساری دنیا پر
یا جی بھر کے پھر رو جاؤں میں
مجھے روند دیا میری خواہشوں نے
اس زخم سے روح بھی کانپ گئی
بڑا مشکل ہے اب خود سے لڑنا
میں تھک گئی میں اب ہانپ گئی
دل میں یہی تمنا ہے بس
تنہائیوں میں اب کھو جاؤں میں
اب سو جاؤں میں
دنیا سے خفا ہو جاؤں میں

حافظہ رضیہ رمضان......لاہور

دوستی

اے دوست میں تجھے ایک ایسی چیز سمجھاؤں
تجھے دوستی کے مقدس رشتے کے بارے میں بتلاؤں
اچھے دوست دنیا میں ہوتے ہیں بڑے نایاب
جو ساتھ نبھا کے کر دیتے ہیں کامیاب
ہوتا ہے وہ دوست جو ہر مصیبت میں کام آئے
چاہے جان ہو قربان مگر ساتھ نہ ٹوٹنے پائے
اگر دوست ہو اچھا تو اس کی ہاں میں ملاؤ
جب بھی بلائے تو سب کچھ چھوڑ کے چلے جاؤ
نہ حرص نہ دولت نہ ہی جفا مانگتی ہے
یہ دوستی تو بس دوست کی خوشیاں مانگتی ہے
اپنے دوست کو کبھی نہ تم خفا رکھنا
جہاں تک ہو سکے اس کی وفا میں وفا رکھنا
دوستوں میں اپنی قربت کو بڑھائے رکھنا
خلوص دل سے رومی محبت کو جگائے رکھنا

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

محبت

شکوہ عشق نہیں جرأت گفتار نہیں
میرے ہاتھوں میں کوئی جبر کی تلوار نہیں
ابن آدم ہوں انساں سے محبت کی ہے
آگ کا، چاند کا، پتھر کا پرستار نہیں
میں نے مانا کہ تو یوسف سے حسیں ہے لیکن
یہ میرا دل ہے کوئی مصر کا بازار نہیں
اے خدا مجھ کو محبت دے عبادت کے عوض
میں تو تیری کسی جنت کا خریدار نہیں
جس نے انساں سے محبت ہی نہ کی ہو اقبال
در حقیقت وہ خدا کا بھی طلبگار نہیں

کلام: علامہ اقبال
انتخاب: محمد یاسر اعوان......رحیم یار خان

غزل

لو آج آشکار اپنا ہر ہنر کرتے ہیں
اپنے اشعار میں ہم اب سفر کرتے ہیں
دستک دے رہی ہے ہمیں صبح زندگی
آج اونچا ہم اپنا سر کرتے ہیں
زندگی جہد مسلسل کا نام جب ہے ٹھہرا
یوں کونپلوں کو اکثر شجر کرتے ہیں
زمیں پہ رہنے کا وطیرہ تو سیکھیں
جانب آسماں جو اپنی نظر کرتے ہیں
جنہیں تلاش خود اپنے آپ کی ہو
وہی تو سناٹوں میں اپنا گھر کرتے ہیں
اس شخص کی نظیر کہیں ملتی نہیں سیف
جس کی وفا کا ذکر ہم سر بسر کرتے ہیں

سیف الاسلام......لیاقت آباد، کراچی

غزل

مت پوچھئے کتابِ ماضی میں کیا رکھا ہے
اِک ہرجائی کی یادوں کو سنبھال رکھا ہے
سپردِ خاک ہو چکی مسکراہٹیں سبھی
چہرے پہ آوارگی نے ڈیرہ لگا رکھا ہے
ڈوب چکا ہوتا کب کا ساگر میں لیکن ..!

یادِ ماضی کی ناؤ نے اُچھال رکھا ہے
شمع سے بھلا کیسا پروانے کا ہجر
اِن کا عجب رشتہ قدرت نے بنا رکھا ہے
رُک گیا اِک مدت سے خطوط کا سلسلہ
اِن کتابوں کے انبار میں کیا رکھا ہے
غمِ ہجر، فراق و تنہائی نے تابش
ازل سے دل پہ قبضہ جما رکھا ہے

ڈاکٹر علی حسنین تابش......چشتیاں

نظم

لکھنے کو بہت کچھ
دل مگر اداس سا ہے
زندگی خواہشوں کا پیراہن اوڑھے
حسرتوں کا سینے میں وبال سا ہے
درد کے جنون میں ثانی نہیں کوئی
وحشتوں کا رقص بے مثال سا ہے
آواز کا تعلق بے ربط ہوا تو
شک کے خوابوں کا جنجال سا ہے
یقین کی باتیں احترام سے بہت سنی
تعلق کی جو وضاحت مانگی وہ شخص حیران سا ہے
پیوند لگے دل کو قبول کوئی نہ کرے
دنیا کا یہ دستور اب عام سا ہے

شاعرہ: سارہ خان......بہاولپور

پیا......!

تیرے بن میں کون پیا؟
کل رات کے پچھلے پہر تم
چپکے سے خواب کی صورت
بند پلکوں کے دریچوں پر آ ٹھہرے
میں نے لاکھ کروٹیں بدلیں
اس خواب کو جھٹلایا مگر
میں کامیاب نہ ہو سکی پیا
تب دو موتی پلکوں سے ٹوٹ کر
میرے تکیے میں جذب ہو گئے
پھر لبوں سے درد کی صورت اک آہ نکلی
تیرے بن من کو لاگے روگ پیا
تیرے بن میں کون پیا؟
تیرے بن میں کون پیا؟

صباحت رفیق چیمہ......گوجرانوالہ

بند کتاب

میں بند کتاب کتاب ہوں
وقت کی دھول سے اٹی
میں بند کتاب ہوں
سالوں پر محیط ان تھک مسافت میں
خاکستر وجود کی طرح
مٹتی تصویر ہوں
ذرہ ذرہ صفحات پے بکھری زندگی ہوں
بے زبان تحریروں کا مجموعہ ہوں
سلب ہونٹوں کی ان کہی
غزلوں کا اسلوب ہوں
دریچہ ہوں ماضی کی یادوں کا
دھندلی آنکھوں کا خواب ہوں
آنکھوں سے بن چھلکے
اشکوں کی کہانی ہوں
اپنے تمام غموں اور ادھورے پن کیساتھ
میں مکمل اور مطمعن ہوں
کیونکہ
میں بند کتاب ہوں

وجیہہ سحر......جوہر آباد

قلعہ الحرمین

زرین قمر

”قلعہ الحرمین“ انقلاب عراق کی کہانی ہے جس کی ابتداء 1979ء میں صدام حسین المجیدا لتکریتی کے اقتدار میں آنے سے ہوئی۔ اس نے اپنے دور اقتدار میں عراق میں بہت سے محل تعمیر کروائے' جو مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ وہ محلات کی تعمیرات' ان کی سجاوٹ اور مجسموں کو جگہ جگہ نصب کروانے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ اپنے گرد بہت قابل اعتبار لوگوں کو دیکھنا چاہتا تھا چنانچہ لوگوں کے انتخاب میں بہت محتاط تھا۔ اس نے مختلف مقاصد حاصل کرنے کے لیے دنیا کے بہترین ماہرین کی خدمات حاصل کیں اور بذات خود ان سے مل کر انہیں کام سونپے پھر 1998ء میں اس نے ایک بری طاقت کے لیے عراق کو ”نو فلائی زون“ (No fly zone) قرار دیا اور یہیں سے اس کا زوال شروع ہوا۔ عراق میں بے شمار آرائشی محل تعمیر کروانے والے کو آخری لمحات میں ایک Spider hale سے گرفتار کیا گیا اور 31' دسمبر 2003ء کو اس کی پھانسی کے ساتھ عراق کی تاریخ کا ایک دور ختم ہوگیا۔

وہ 22 مارچ 1999ء کی شام تھی کنیڈین سائنسدان جیری اپنے دفتر کی ساتھی مونیک جیمن کی گاڑی میں بیٹھا اسے ایک مزاحیہ قصہ سنا رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی زندگی چند منٹوں ہی کی رہ گئی ہے۔ وہ دونوں برسلز کے اسپیس ریسرچ کارپوریشن کے دفتر میں ملازمت کرتے تھے کچھ دیر کے لیے ان کی گاڑی ایک بیکری کے سامنے رکی تھی اور مونیک گاڑی روک کر جیری کے ساتھ بیکری میں داخل ہوگئی تھی۔ اسی وقت ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی تھی۔ چنانچہ جب وہ دونوں بیکری سے باہر نکلے تو بارش سے بچنے کے لیے انہوں نے سر جھکائے ہوئے تھے اور تیزی سے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے تھے اور اپنے پیچھے چند گز دور کھڑی سیاہ کار کو نہیں دیکھ سکے تھے جس میں دو افراد بیٹھے تھے اور یہ کار پچھلے دو ہفتوں سے ان کا تعاقب کر رہی تھی' اس کار میں بیٹھے لوگوں نے ایک بار بھی جیری کو نظر انداز نہیں کیا تھا انہوں نے اسے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی لیکن وہ اس پر مستقل نظر رکھے ہوئے تھے۔ جیری کو اس عرصے میں ان پر بالکل شبہ نہیں ہوا تھا۔

مونیک نے ٹھیک دس منٹ بعد گاڑی ایک اپارٹمنٹ کے سامنے روکی تھی اور جیری بیکری سے لیا ہوا سامان لے کر گاڑی سے اتر گیا تھا۔ اس کے اوورکوٹ کا کالر اوپر اٹھا ہوا تھا اور سر پر رکھا ہیٹ کافی نیچے آیا ہوا تھا جس سے اس کا چہرہ تقریباً چھپ گیا تھا' اس کے کاندھے پر بھاری سیاہ رنگ کا بیگ لٹک رہا تھا جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا اور اس کا وزن تقریباً پندرہ کلو کے قریب تھا جس میں بے شمار کاغذات بھرے ہوئے تھے' سائنسی ریسرچ اور پروجیکٹس کے کاغذات جن میں مختلف تفصیلات موجود تھیں مونیک نے اس کے اترتے ہی اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ تک چلنے کی پیش کش کی تھی جسے جیری نے مسترد کر دیا تھا۔ پھر مونیک اسے اپارٹمنٹ کے دروازے میں چابی گھماتے دیکھتی رہی تھی اس کے بعد دروازہ کھول کر وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا تھا وہ اس آٹھ منزلہ اپارٹمنٹ کے چھٹے فلور پر رہتا تھا۔

وہ لفٹ کے ذریعے چھٹی منزل پر آیا تھا اور جیسے ہی اس نے لفٹ سے قدم باہر رکھا تھا فلور کی آٹومیٹک لائٹس

آن ہوگئی تھیں، اس کا بیگ اس کے کاندھے پر تھا، ایک ہاتھ میں بیکری سے لیا ہوا سامان تھا اور دوسرے ہاتھ میں اس کے کمرے کی چابیاں جنہیں وہ گھماتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

پھر جب وہ چابی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا تبھی پیچھے سے کسی نے اس پر لگاتار پانچ فائر کیے تھے جو صرف ایک میٹر کے فاصلے سے کیے گئے تھے، جیری اپنے دروازے سے ٹکراتا ہوا راہداری میں بچھے ہوئے قالین پر ڈھیر ہوگیا تھا۔ مارنے والے نے اسے چیک بھی نہیں کیا تھا وہ جانتا تھا کہ جیری کے سر اور گردن پر لگنے والی گولیوں نے اسے موت کی نیند سلا دیا ہے۔ مارنے والا تیزی سے لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچا تھا اور وہاں سے اپنے ملک کی ایمبیسی جا کر اسی رات اس شہر سے روانہ ہوگیا تھا۔

مرنے والا جیری دراصل ڈاکٹر جیرالڈ وِنسٹنبل تھا بہت ذہین گن ڈیزائنر جو دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کے لیے گنیں ڈیزائن کرتا تھا اور خاص طور سے ان دنوں وہ عراق کے صدام حسین کے لیے کام کر رہا تھا۔ جیری بل کی موت کے ساتھ ہی اس کی تحقیقات شروع ہوگئی تھی اور پتہ چلا تھا کہ کچھ بے نشان کاریں کافی عرصے سے اس کا پیچھا کر رہی تھیں پھر سارے یورپ میں مختلف مقامات پر بہت بڑے بڑے اسٹیل کے پائپس (بیرلز) کی سپلائی پکڑی گئی تھی جنہیں دنیا کی بڑی گنیں بنانے میں استعمال کیا جانے والا تھا اور یہ جیری بل کی ڈیزائن کی ہوئی گنوں کا ایک حصہ تھا جسے عراق لے جایا جا رہا تھا اور جس سے سپر گن تخلیق ہونا تھی جیری کے مرنے کے بعد اس کی موت کے سلسلے میں مختلف ممالک پر شبہ کیا جا رہا تھا لیکن کچھ ثابت نہیں ہوسکا تھا۔

اپنی موت سے کافی عرصہ پہلے 1988ء کے موسم سرما میں جیری کو عراقی سفارت خانے سے ایک کال موصول ہوئی تھی اور اسے عراق آنے کی دعوت دی گئی تھی جس کے نتیجے میں وہ عراق گیا تھا اور عراق کے امیر سعدی سے ملا تھا۔ جس کی حیثیت منسٹری آف انڈسٹری اور ملٹری انڈسٹریل آرگنائزیشن میں دوسرے درجے کی تھی پھر عراق کے ساتھ اس کا معاہدہ ہوگیا تھا وہاں اسے لوگوں سے صدام حسین کے بارے میں پتہ چلا تھا جس کی سفاکی مشہور تھی۔ معاہدے پر کام کرنے کے لیے اسے اس کی توقع سے دگنا معاوضہ دیا گیا تھا اور اس پروجیکٹ کو بے بیلیئن (Babylon) کا نام دیا گیا تھا پھر اس مشن کی کامیابی کے سلسلے میں مئی 1989ء کو بغداد میں اسلحہ کی ایک نمائش بھی کی گئی لیکن اس کے بعد جیری بل نے عراق سے نکلنے کا فیصلہ کیا اور اپنے تعلقات دوسرے ملکوں سے بڑھانا شروع کر دیئے۔

15 فروری 1990ء کو صدام حسین نے کردستان کے پہاڑی سلسلے میں واقع اپنے محل "سرسینگ" میں اپنے ذاتی مشاورتی کونسل کے لوگوں کی میٹنگ بلائی تھی اس کے لیے وہ خود بھی بڑے اہتمام سے تیار ہوا تھا اسے یہ محل بہت پسند تھا، یہ پہاڑی سلسلے کے سب سے اونچے مقام پر واقع تھا اور اس کی کشادہ کھڑکیوں سے اطراف میں موجود گاؤں بڑا خوبصورت منظر پیش کرتے تھے وادی میں لوگ چلتے پھرتے نظر آتے تھے لیکن محل کی کھڑکیوں کے شیشوں پر گلیزڈ کوٹ کی تین تہیں ہونے کی وجہ سے ان کے پیچھے کھڑی ہوئی شخصیت کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ اپنے ڈریسنگ روم کی کھڑکی میں کھڑا تھا اور باہر وادی میں پھیلتی صبح کی کرنوں کا جائزہ لے رہا تھا اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ طاقت ور ہے ایسی طاقت جس میں کسی اور کی شراکت داری نہیں ہے سولہ سال سے وہ عراق میں اس کا مظاہرہ کر رہا تھا اور کامیابی سے آگے قدم بڑھا رہا تھا۔

اس کا ڈریسر اس کے لباس کو آخری تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گرین کلر کی بیلٹ اپنے گلے میں V کی شکل میں ڈالی اسی وقت فضا میں ہیلی کاپٹروں کی آوازیں سنائی دیں اور صدام نے قریب رکھی سنہرے کور والی گن اٹھا کر اپنی بیلٹ میں لگالی اسی لمحے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی تھی کہ جن لوگوں کو میٹنگ کے لیے بلایا گیا تھا وہ سب پہنچ گئے ہیں۔

جب صدام حسین کانفرنس روم میں داخل ہوا تو وہاں موجود تمام افراد اس کے استقبال میں کھڑے ہوگئے۔ صدام جانتا تھا کہ وہ "سرسینگ محل" کسی بھی جگہ کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہے کیونکہ سرسینگ کے اطراف میں تین لائنوں میں اس کے سیکیورٹی گارڈز کا پہرہ تھا اور "امن لا خاص" کو اس کا بیٹا "کوسے" کمانڈ کرتا تھا اور کوئی بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چھت پر فرانس سے درآمد شدہ اینٹی کرافٹ میزائل لگے تھے اور اس کے فائٹرز پہاڑیوں کے اوپر فضاؤں میں موجود تھے۔

وہ بہت اطمینان سے شاہی تخت نما کرسی پر بیٹھ گیا جو ایک بڑی کانفرنس ٹیبل کے درمیان میں رکھی تھی جس کے اطراف میں کرسیوں پر اس کے قریبی وفادار موجود تھے 'صدام کی نظر میں کسی بھی شخص کے اندر صرف ایک خاصیت کا ہونا ضروری تھا اور وہ تھی اس کی "وفاداری" اس کا خیال تھا کہ اگر کسی فرد میں "وفاداری" ہو تو تجربہ سکھایا جاسکتا ہے پھر اس کی فہرست میں پہلا نمبر "فیملی" کے لوگوں کا تھا پھر رشتہ دار اور قبیلے آتے تھے۔ اس کا تعلق علاقہ تکریت کے "التریکت" قبیلے سے تھا اور عراق میں بڑے بڑے عہدے تکریتوں ہی کے پاس تھے اور ان کی بڑی بڑی خطائیں بھی معاف کر دی جاتی تھیں کیونکہ وہ صدام کے "وفادار" تھے ایک بار اس کے چھوٹے بیٹے "اودے" نے ایک ملازم کو بے تحاشا مارا لیکن اسے کچھ نہیں کہا گیا۔

اس کے سیدھے ہاتھ پر عزت ابراہیم بیٹھا تھا جو اس کا فرسٹ ڈپٹی تھا۔ اس کے ساتھ صدام کا داماد حسین کامل تھا جو MIMI کا ہیڈ تھا۔ اس کے بائیں جانب طحہ امادم بیٹھا تھا جو پرائم منسٹر تھا اور اس کے ساتھ "سدون حمادی" ڈپٹی پریمئر تھا ہر کوئی اس کے حکم کا تابع تھا۔ دوسری لائن میں مزید اہمیت رکھنے والی شخصیات موجود تھیں، اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد صدام نے اپنے داماد حسین کامل کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور اس نے ڈاکٹر سعدی کو اشارہ کیا جو ہتھیاروں کی خرید و فروخت میں اس کا دست راست تھا اور سعدی نے آنکھیں اٹھائے بغیر اپنی رپورٹ پڑھنا شروع کر دی۔

کوئی عقل مند آدمی صدام سے نظر ملانے کی جرات نہیں کرسکتا تھا کیونکہ صدام کا کہنا تھا کہ وہ آنکھوں کے راستے سامنے والے کی روح میں اتر جاتا ہے اور اس کی اس بات پر بہت سے لوگ یقین رکھتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر کسی کی آنکھوں میں صدام کو "غیر وفاداری" نظر آجاتی تھی تو وہ شخص پراسرار طریقے سے اپنے انجام کو پہنچ جاتا تھا جب سعدی رپورٹ پڑھ چکا تو کانفرنس روم میں خاموشی چھا گئی صدام کچھ لمحے تک سوچتا رہا۔

"یہ آدمی ...... یہ کینیڈین ...... کتنا جانتا ہے؟" اس نے پوچھا اس کا اشارہ سائنسدان جیری بل کی طرف تھا۔

"میرا خیال ہے زیادہ نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہے کہ ہم اس پر کام کرسکتے ہیں، سیدی۔" سعدی نے باادب انداز میں کہا۔

"کام کتنی جلدی شروع کیا جاسکتا ہے؟" صدام نے پوچھا۔

"بہت جلد...... اگر ابھی تک نہیں کیا ہے سیدی۔"

"اور وہ اسرائیل سے بات کر رہا ہے۔"

"جی سیدی! وہ مسلسل ان سے رابطے میں ہے۔ وہ سالوں سے ان کا دوست ہے وہ اکثر تل ابیب دوروں پر جاتا رہتا ہے اور وہاں کے ہتھیاروں کے اسٹاف آفیسرز کو لیکچر دیتا ہے۔ اس کے وہاں بہت سے دوست ہیں۔"

"کیا ہم اس کے بغیر پروجیکٹ مکمل کرسکتے ہیں؟" صدام حسین نے پوچھا۔

"وہ ایک عجیب شخص ہے۔" اس بار حسین کامل بولا تھا۔ "وہ اپنے سارے سائنسی کاغذات ایک بیگ میں ہر وقت اپنے ساتھ لے کر گھومتا ہے۔ میں نے اپنی انٹیلی جنس سے کہا ہے کہ وہ اس کے پیپر ورک کو دیکھیں اور اس کی کاپیاں حاصل کریں۔"

"کیا یہ کام ہوگیا؟" صدام نے اپنے کاؤنٹر انٹیلی جنس چیف حسن رحمانی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بہت جلد! سید رئیس...... کچھ تو ہم نے کر بھی لیا ہے...... پچھلی بار اس کے بغداد میں دورے کے دوران ہم نے ایک رات اسے بہت خوش کیا اس نے بہت ساری وہسکی پی لی تھی اور مدہوش ہو کر سو گیا تھا تب ہمارے آدمیوں نے کچھ کام کیا تھا۔ وہ کافی دیر تک گہری نیند سویا تھا، ہم نے اس کا بیگ لے لیا تھا اور اس کے ہر صفحے کی فوٹو کاپی کرلی تھی اور ہم نے اس کے ساتھ ہونے والی ساری تکنیکی گفتگو بھی ریکارڈ کرلی تھی اور تمام کاغذات اور شواہد اپنے کامریڈ ڈاکٹر سعدی کو دے دی تھی۔" اس بات پر صدام حسین نے پھر سعدی کی طرف دیکھا۔

"تو پھر ہم اس کے بغیر پروجیکٹ مکمل کرسکتے ہیں؟" صدام نے پوچھا۔

"جی! سید رئیس...... مجھے یقین ہے کہ ہم یہ کام اس کے بغیر بھی مکمل کرسکتے ہیں لیکن اس کے بعض فارمولے وہی سمجھ سکتا ہے پھر بھی میرے بہترین سائنسدان ان کا جائزہ لے

رہے ہیں ایک ماہ تک وہ انہیں سمجھ لیں گے اور باقی کام انجینئرز کرلیں گے۔" سعدی نے کہا اس بات پر حسین کامل نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ محتاط رہو۔

"وہ ابھی کہاں ہے؟" صدام نے پوچھا۔

"وہ چین کے لیے روانہ ہوچکا ہے سیدی۔" ڈاکٹر عبیدی نے کہا۔ "وہ 'الاسیڈ' راکٹ کے معاملے میں ہمیں پیچھے چھوڑ دینا چاہتا ہے سیدی...... اللہ رحم کرے...... ہم سے سودا نہ ہونے کی صورت میں اب وہ چین سے سودا کرنا چاہتا ہے۔ وہ ناکام ہوجائے گا۔ وہ مارچ میں واپس برسلز پہنچ جائے گا۔"

"کیا وہاں تمہارے آدمی ہیں! برسلز میں...... واقعی بہترین آدمی؟" صدام نے پوچھا۔

"جی ہاں سیدی! میرے آدمی وہاں ہیں، وہ دس ماہ سے اس کی نگرانی کررہے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ وہ اپنے آفس میں اسرائیلی افسران اور وفود سے ملتا ہے ہمارے پاس اس بلڈنگ کے اپارٹمنٹ کی چابیاں بھی ہیں۔"

"پھر اس کی واپسی پر یہ کام ہوجانا چاہیے۔" صدام نے کہا۔

"ٹھیک ہے، کام بغیر تاخیر کے ہوگا سیدی۔" ڈاکٹر عبیدی نے کہا وہ ان چار لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جنہیں اس نے برسلز میں جیری بل کی نگرانی پر مامور کیا ہوا تھا اس میں عبدالرحمٰن محی الدین سب سے بہتر تھا وہ ایسے کام پہلے بھی کرچکا تھا، ڈاکٹر عبیدی اس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ وہ یہ ذمہ داری بھی اسے ہی دے دے گا، اس کے بعد میٹنگ ختم ہوگئی تھی اور صدام کے داماد حسین کامل کے علاوہ دو افراد اور اس کے کمرے میں رہ گئے تھے اور باقی رخصت ہوگئے تھے۔

"اور دوسرا معاملہ؟ وہ کام کب ہوگا؟" صدام نے پوچھا اس کی نظریں اپنے داماد حسین کامل کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں۔

"مجھے یقین ہے سال کے اختتام پر ابوکوسے۔" اس نے جواب دیا اس نے اس وقت صدام کو اس کے گھریلو نام سے پکارا تھا اس طرح وہاں موجود دوسرے لوگوں کو اس نے احساس دلایا تھا کہ وہ صدام کی فیملی سے ہے اس کا قریبی رشتہ دار ہے چنانچہ اسے اس کے بڑے بیٹے "کوسے" کے حوالے سے پکارا تھا۔ صدام نے اسے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

"ہمیں ایک جگہ کی ضرورت ہوگی ایک نئی جگہ...... وہ کوئی موجودہ جگہ نہیں ہوگی۔ خفیہ ہوگی اور اس کا علم کسی کو نہیں ہوگا یہاں موجود لوگوں میں سے بھی سب کو نہیں۔" صدام نے کہا۔

"جی، سیدی۔" حسین کامل نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں صرف ملٹری انجینئر کو اس کا علم ہو اور بس...... کیا تم یہ کام کرسکتے ہو؟" صدام کی بات پر جنرل علی موصلی جو آرمی انجینئر تھا سیدھا ہوکر بیٹھ گیا وہ جانتا تھا کہ اب صدام کا مخاطب وہ ہے۔

"جی سیدرئیس! یہ میرے لیے فخر کی بات ہوگی۔" اس نے کہا۔

"جو اس کام کا انچارج ہوگا وہ تمہارا بہترین آدمی ہونا چاہیے۔" صدام نے کہا۔

"میں ایسے ایک شخص کو جانتا ہوں سیدی! ایک کرنل ہے وہ تعمیرات کا ماہر ہے، وہ کافی عرصے روس میں رہا...... اس نے وہیں تعلیم مکمل کی اور وہ روس کے بہترین ماہر تعمیرات کا شاگرد ہے۔"

"تو مجھے اس سے ملاؤ۔ یہاں نہیں بغداد میں...... دو دن کے اندر۔"

"جی سیدی!"

"صرف دو دن...... میں خود اس کام کو اس کے حوالے کروں گا...... کیا اس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟" صدام نے پوچھا۔

"جی سیدرئیس۔"

"کیا وہ میرا اور پارٹی کا وفادار ہوگا؟" صدام نے وضاحت چاہی۔

"جی جناب! وہ اس کے لیے جان بھی دے سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم سب بھی وقت آنے پر ایسا ہی کروگے۔" صدام نے کہا پھر کچھ دیر خاموشی رہی تھی۔

"مجھے امید ہے فتح ہماری ہوگی...... ایسا وقت نہیں آئے گا...... دعا کرو کہ ایسا وقت نہ آئے۔" صدام نے کہا پھر میٹنگ ختم ہوگئی تھی۔

●......●......●

وہ 16 فروری 1990ء کی صبح تھی جب عراقی فوجیں کویت کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ جمع ہوگئی تھیں۔ وہ ہتھیاروں سے لیس تھیں ان کے ٹینک ان کے راکٹ اور گنیں تیار تھیں اور انہیں صرف بغداد سے رئیس صدام کے

حکم کا انتظار تھا کرنل عثمان بدری اپنے کمانڈنگ جنرل الموصلی سے بات کرچکا تھا جو عراقی آرمی میں انجینئرنگ کے تمام شعبوں کا انچارج تھا اس نے عثمان بدری کو خاص ڈیوٹی دی تھی اور اسے سمجھایا تھا کہ اس کے آدمی پوری طرح ہتھیاروں سے لیس ہیں جب موصلی اس سے بات کررہا تھا تو عثمان بدری کی نظریں جنرل عبداللہ قدری پر لگی تھیں جو کچھ فاصلے پر ہی موجود تھا وہ ٹینک کمانڈر تھا اور اس وقت ری پبلکن گارڈ کے کمانڈنگ آفیسر سعدی سے بات کررہا تھا۔ وہ پورے کیمپ اور خاص طور سے صدام حسین کا وفادار تھا۔ عثمان بدری کا خیال تھا کہ وہ سب کسی اہم خبر کے بارے میں جانتے ہیں پھر جنرل موصلی نے اسے بتایا تھا کہ صدر صدام اس سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ حیران رہ گیا تھا۔

"وہ کسی کو تمہیں لینے بھیجیں گے۔" موصلی نے اسے بتایا۔

"لیکن کیوں؟" عثمان بدری نے حیرت سے کہا وہ خاصا پریشان نظر آرہا تھا اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"تم آفیسرز کوارٹرز ہی میں رہنا...... تمہیں چوبیس گھنٹے وہاں موجود رہنا ہے کسی بھی وقت کوئی تمہیں لینے آسکتا ہے۔" موصلی نے کہا تو عثمان بدری نے پریشانی سے اپنے ہونٹ کاٹے وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہوگئی ہے کہ اسے اس طرح طلب کیا گیا ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک کرنل سے ایک غلطی سرزد ہوگئی تھی جس کو صدام نے سخت سزا دی تھی اسے بھی صدام کے خاص سیکیورٹی گارڈ اپنے ساتھ لے گئے تھے اور وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا تھا۔

"ہاہاہا...... ہا" موصلی اس کے پریشان چہرے کو دیکھ کر زور سے ہنسا۔ "کیا ہوگیا تم کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ موصلی کے دانت اس کی بڑی بڑی مونچھوں میں سے جھانک رہے تھے۔

"پریشان مت ہو...... اس کے پاس تمہارے لیے کچھ کام ہے...... کوئی خاص کام۔" موصلی نے اسے بتایا لیکن اس کی پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خاص کام کیا ہے؟

کچھ ہی دیر بعد ایک سیاہ رنگ کی لمبی کار اسے لینے آگئی تھی جس میں صدام کے خاص سیکیورٹی گارڈ اپنی یونیفارم میں موجود تھے وہ ان کے ساتھ صدارتی محل روانہ ہوگیا تھا۔ راستے میں خاموشی رہی تھی کوئی بھی کسی دوسرے سے کوئی بات نہیں کررہا تھا، یہ عثمان بدری کی زندگی کی سب سے زیادہ اہم، یادگار اور حیران کردینے والی میٹنگ تھی اس وقت محل ...... اسٹریٹ پر واقع تھا۔ صدارتی محل میں پہنچنے کے بعد عثمان بدری کو ایک لمبے ہال نما کمرے میں لے جایا گیا تھا پھر گارڈ اسے وہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بس کمرے کے دروازے میں پہلے سے جو گارڈ کھڑا تھا وہی وہاں موجود تھا۔ بدری خاصا پریشان تھا وہ دو گھنٹے اس کمرے میں انتظار کرتا رہا تھا وہ کبھی بیٹھ جاتا کبھی دیوار پر لگی تصویروں کا جائزہ لینے لگتا، وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا کہ اچانک گارڈ نے زوردار انداز میں سلوٹ کیا جس کی آواز عثمان بدری نے بھی سنی اور وہ سمجھ گیا کہ صدر صدام اس ہال کی طرف آرہے ہیں وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا تھا۔

"ہونہہ! تو تم ہو وہ ذہین شخص Maskirovka والے؟" صدام نے کہا تو اس کی آواز سے خوشی جھلک رہی تھی۔ عثمان بدری نے آنکھیں نہیں اٹھائی تھیں کیونکہ اسے بتایا تھا کہ صدام حسین سے نظریں نہ ملائے پھر وہ خود کو روک نہیں سکا تھا اور اس نے صدام کی طرف دیکھا تھا وہ اس وقت بہت اچھے موڈ میں تھا، اس کی آنکھوں میں عثمان کو اپنے لیے محبت اور تعریف کی جھلک نظر آرہی تھی اس نے دل میں سوچا کہ سب ٹھیک ہے، اسے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں اس کا حوصلہ بڑھ گیا پھر صدام نے اسے بتایا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور جو کام اسے دیا گیا تھا اس کے جاننے کے بعد اس کا سینہ فخر سے تن گیا تھا۔

"تمہیں ہمارے پہاڑی علاقے میں ایک خفیہ محل کی تعمیر کرنا ہے۔" صدام نے کہا۔

"جی سیدی۔" عثمان بدری نے جواب دیا۔

"میں نے تمہاری بہت تعریف سنی ہے، تم نے تعمیرات کا فن کہاں سے سیکھا؟" صدام نے جاننے کے باوجود اس سے پوچھا تھا، شاید وہ اس کے منہ سے سن کر اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ اس کے لوگوں نے جو اطلاع عثمان بدری کے بارے میں دی ہے وہ درست ہے۔

"میں نے روس کی یونیورسٹی سے تعمیرات کی تعلیم حاصل کی ہے یہ ایک خاص فن ہے اس میں تعمیر اس انداز سے کی جاتی ہے کہ جو چیز تعمیر کی جائے وہ یا تو نظر نہ آئے اور یا پھر کچھ اور ہی نظر آئے جس ماحول میں وہ بنائی جاتی ہے وہ اسی کا حصہ نظر آتی

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

ہے اور انسانی آنکھ بھی اسے نہیں پہچان سکتی۔'' عثمان بدری نے جواب دیا۔ ''جگہ کا انتخاب بھی تمہیں ہی کرنا ہوگا۔ تمہیں تکریت کی پہاڑیوں میں جگہ ڈھونڈنا ہوگی اور تمہیں دنیا کی عجوبہ عمارت بنانا ہوگی اس کے لیے تمہیں منہ مانگا معاوضہ دیا جائے گا جو تمہاری زندگی میں تمہیں یا اگر تم نہ رہے تو تمہارے خاندان کو پہنچ جائے گا۔'' صدام نے کہا اس کے بعد عثمان بدری وہاں سے رخصت ہوگیا تھا۔

عثمان بدری نے اس عجوبہ تعمیر کے لیے جگہ کا انتخاب خود ہی کیا تھا اس مقصد کے لیے اس نے کئی روز ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر پہاڑی سلسلوں کا دورہ کیا تھا اور پھر ''جبل الحرمین'' کے اوپر سب سے اونچی چوٹی کو منتخب کیا تھا یہ جگہ کفریٰ سے شمال میں واقع تھی جہاں حرمین کی پہاڑیاں بڑے پہاڑوں میں تبدیل ہوجاتی تھیں' کام کے دوران اس نے آرام نہیں کیا تھا اس نے دن میں بیس بیس گھنٹے کام کیا تھا اس کے ساتھیوں نے بھی بہت محنت کی تھی اور مقررہ مدت میں کام مکمل کردیا تھا۔ پھر اس علاقے سے کام کرنے کے سارے نشانات مٹا دیئے گئے تھے۔ کنکریٹ کا ہر ٹکڑا اسٹیل کا ٹکڑا جو سورج کی روشنی میں چمک سکتا تھا ہر اسکریپ اور اسکریچ جو پہاڑیوں پر موجود تھا غائب کردیا گیا تھا۔

صدام کا محل جسے ''قلعہ'' کا نام دیا گیا تھا تعمیر ہوگیا تھا اور ماہر انجینئر عثمان بدری جو ایسی تعمیرات کا کا ماہر تھا جو یا تو نظر نہ آئیں یا وہ جو کچھ ہوں اس کے علاوہ کچھ نظر آئیں۔ 'قلعہ' اس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا' دور سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ تین پہاڑیاں کھڑی ہیں جن پر قلعے کی تعمیر کے بعد جگہ جگہ خودرو گھاس اور جھاڑیاں لگادی گئی تھیں ان پہاڑیوں کے گرد تین گاؤں بھی تعمیر کیے گئے تھے جن میں گھاس پھوس کے بنے ہوئے گھر تھے جن میں مقامی لوگوں کو لاکر رکھا گیا تھا ان کے مویشیوں میں بکریاں اور بھیڑیں کثرت سے تھیں۔ صدام کا یہ قلعہ انسانی آنکھ سے اوجھل تھا اور کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں واقع ہے۔

قلعے کی تعمیر کے دوران بدری نے کچھ اور لوگوں کو بھی دیکھا تھا جو وہاں بڑے بڑے بیرل لگا رہے تھے جو اتنے بڑے تھے کہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے' کچھ عرصے میں وہ اپنا کام مکمل کرکے وہاں سے چلے گئے تھے۔ تعمیر کا کام ختم ہونے کے بعد وادی میں صرف صدام کی افواج کے گوریلا فوجی رہ گئے تھے جن کو وہیں رہنا تھا' ان میں سے کوئی بھی باہر نہیں جاسکتا تھا' اگر کسی کو کہیں آنا جانا ہوتا تو اس کے لیے ہیلی کاپٹر استعمال کیے جاتے تھے جو زمین پر نہیں اترتے تھے وہاں کوئی بھی ہیلی پیڈ نہیں بنایا گیا تھا جو کسی کی موجودگی کا احساس دے۔ آنے جانے والوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوتی تھیں اس کے پائلٹ اور عملہ ایک سنگل ایئر بیس میں بند رہتے تھے جن سے نہ کوئی مل سکتا تھا نہ کوئی فون کرسکتا تھا' تعمیر کے بعد قلعے کو تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔

اسی اثنا میں کویت اور عراق کی جنگ شروع ہوچکی تھی جس میں عراق کو برتری حاصل ہورہی تھی اس جنگ کے اسٹارٹ ہونے سے پہلے ہی دنیا کے بڑے بڑے ممالک حرکت میں آچکے تھے اور اس جنگ میں اپنا اپنا موثر کردار ادا کرنے کی جدوجہد میں لگ گئے تھے جن میں امریکا سرفہرست تھا اور امریکی صدر جارج بش نے دنیا کے دوسرے ممالک کے سربراہان سے ہنگامی ملاقاتیں شروع کردی تھیں جس کے نتیجے میں امریکی فوجیں مڈل ایسٹ میں داخل ہوگئیں اور Desert sheild operation شروع ہوگیا۔

اس آپریشن کے دوران عراق کے نیوکلیئر پلانٹس کی کھوج شروع کردی گئی اس مقصد کے لیے سعودی عرب کے شہر ریاض کو استعمال کیا گیا' ریاض سے پروازیں کی جاتی تھیں جو غیر آباد علاقوں میں کسی بھی قسم کے نشانات کی کھوج لگانے کے لیے ہوتی تھیں تاکہ انہیں نیوکلیئر پلانٹس تک پہنچنے کے لیے کوئی گائیڈ لائن مل جائے' اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے میجر مک مارٹن کو اختیارات دیئے گئے جس کا تعلق SAS سے تھا اور اس کے ساتھ اس کی ٹیم کے علاوہ Daddy lomax (ایک ریٹائرڈ نیوکلیئر سائنسدان) اور Don walker (فائٹر پائلٹ) بھی تھے۔ اپنی چھان بین کے دوران وہ مشتبہ علاقوں کی تصاویر کھینچ کر ریاض میں موجود اپنے ہیڈ کوارٹر کو بھیجتے تھے جن کی مدد سے آگے کا لائحہ عمل ترتیب دیا جاتا تھا۔

وہ ایک سرد شام تھی جب ریاض ہیڈ کوارٹر میں ان ہیلی کاپٹرز کی بھیجی ہوئی تصاویر موصول ہوئیں جو عراق کے پہاڑی علاقوں میں سرچ کررہے تھے ان تصویروں کو فوراً کمپیوٹر سسٹم پر اپ لوڈ کردیا گیا اس وقت اس آپریشن کے لیے تعینات کی گئی شخصیات بھی وہاں موجود تھیں جنہوں نے وہ تصویریں دیکھیں۔

''ان تصاویر میں تمہیں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی؟'' Don wolker نے اپنے دوسرے ساتھیوں سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' مک مارٹن نے پوچھا۔

''یہ دیکھو..... یہ کیا ہے؟'' واکر نے تصویر میں ایک نقطے کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔'' مارٹن نے کہا۔ ''کچھ نہیں ہے بس ایک معمولی سی پہاڑی ہے۔'' اس نے بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''یہی تو مسئلہ ہے جناب۔'' اس بار لومیکس بولا تھا۔ ''وہ نظر آتا ہے جو نہیں ہے جبکہ اسے وہیں ہونا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟'' مارٹن نے چونکتے ہوئے سوال کیا۔ ''کسے یہیں ہونا چاہیے؟''

''گن..... ببلین گن؟'' لومیکس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم سب کو اس بارے میں معلوم ہے۔''

''ہاں! معلوم تو ہے لیکن یہاں؟ وہ گن تو بہت بڑی ہے کسی راکٹ کی طرح کوئی معمولی نہیں ہے جسے چھپایا جائے یہاں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔'' مارٹن نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو بہت بڑی گن ہے اس کا بیرل 180 میٹر کا ہے اور دہانہ ایک میٹر کا اور وہ ایک ہزار کلومیٹر تک مار کرسکتی ہے۔''

''اور اس وقت ہم جہاں ہیں وہاں سے اس کا فاصلہ ہم سے کتنا ہے جو مقام ایک تکونی پہاڑی کی صورت میں اس تصویر میں نظر آرہا ہے؟'' ڈون واکر نے پوچھا۔

''چار سو ستر کلومیٹر جنرل! ہم اس کی رینج میں ہیں کیا تمہارے فائٹرز وہاں تک فائر کرسکتے ہیں؟''

''نہیں!'' مارٹن نے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ اس جگہ کوئی گن یا میزائل نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ جگہ بالکل غیر آباد ہے یہاں کوئی سڑک نہیں' کوئی نشان نہیں' کوئی پاور لائن نہیں' کوئی بھی دفاعی نظام نہیں' کوئی ہیلی کاپٹر..... کوئی ریزروائر کوئی گارڈ' کچھ بھی تو نہیں دور دور تک بس ویرانی ہے یا سر اٹھائے منہ زور پہاڑ ہیں جن کے درمیان کچھ بھی نہیں۔'' مارٹن نے کہا۔

''فرض کرو کہ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی دفاعی نظام کو کہیں دور لگایا گیا ہو۔'' لومیکس نے کہا۔

''ہم نے پچاس پچاس میل تک جائزہ لے لیا ہے تمام سمتوں میں' لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔'' واکر نے کہا۔

''لیکن اس پر کیسے یقین کرلیا جائے' جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ عراقی اپنے قیمتی اثاثے ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں اور ان کا دفاع کرتے ہیں۔'' واکر نے کہا۔

''دیکھو! یہاں دیکھو.....'' واکر نے تصویر پر ایک مقام پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ جھونپڑیوں کا ایک سلسلہ ہے اور بغور دیکھنے پر پتہ چلے گا کہ یہاں بکریاں' بھیڑیں ہیں..... کچھ گھروں سے نکلنے والا دھواں بھی نظر آئے گا اور اس کے علاوہ ایسے ہی دو اور گاؤں بھی ہیں۔'' واکر نے وضاحت کی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ یہاں کچھ غریب لوگ جو یہاں کے آبائی رہنے والے ہیں وہی بسے ہوئے ہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں؟''

''ممکن ہے گنیں پہاڑیوں میں چھپی ہوئی ہوں۔'' لومیکس نے کہا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ 180 میٹر لمبے بیرل کی گن کو پہاڑی کے اندر چھپایا گیا ہوگا؟ یہ کیسے ممکن ہے..... اس کی نالی کہیں نہ کہیں تو نکلی ہی ہوگی..... جبکہ کہیں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آرہی ہے۔'' مارٹن نے کہا اور وہ سب ایک بار پھر تصویر کا جائزہ لینے لگے ایک مربع نما جگہ میں صرف تین پہاڑیاں تھیں لیکن وہ سب بالکل ویران نظر آرہی تھیں۔

''جنرل کیا میں ایک مشورہ دوں۔'' واکر نے کہا۔

''ہاں بولو۔'' لومیکس نے کہا۔

''اگر میں صدام کی جگہ ہوتا اور میرے پاس اتنا قیمتی کوئی ہتھیار ہوتا تو میں اس کی حفاظت کے لیے اپنے قابل اعتماد آدمیوں کو تعینات کرتا اور اسے حکم دیتا کہ اگر کبھی بھی قلعے پر حملہ ہوتو وہ بھی فائر کھول دے۔''

''اگر وہ گن یہاں پہاڑیوں میں کہیں موجود ہے تو اسے بڑی مہارت سے چھپایا گیا ہے۔'' مارٹن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اور ایک بار بٹن دبانے پر وہ اپنا کام دکھا سکتی ہے۔''

''لیکن وہ بٹن کہاں ہے؟'' لومیکس بولا۔

''اس کے لیے ان پہاڑیوں پر جانا ہوگا۔'' مارٹن نے جواب دیا۔

پھر یہ بحث ان کے درمیان دو گھنٹے تک چلتی رہی تھی پھر فیصلہ کیا گیا تھا کہ پہلے انہیں ڈھونڈا جائے اس کے بعد انہیں ایسے تباہ کیا جائے کہ ان کے تباہ ہونے کے بعد ہی عراقیوں کو پتہ چلے کہ کیا ہوا ہے' اس سے پہلے وہ بالکل لاعلم رہیں' پھر اسی رات ہی کرنل نیٹی کو اس مشن میں شامل کیا گیا تھا اور کارروائی کا آغاز ہوگیا تھا۔

پھر انہوں نے رات کے اندھیرے ہی میں کارروائی کی تھی اس مقصد کے لیے ریاض ایئر بیس سے تین ہیلی کاپٹران کی ٹیم کو لے کر روانہ ہوئے تھے اور تصویر میں نشاندہی کیے جانے والے مقام پر لے گئے تھے پھر ہیلی کاپٹر زمین پر نہیں اترے تھے بلکہ ٹیم کے افراد نے پیراشوٹس کے ذریعے چھلانگیں لگائی تھیں اور خاص مطلوبہ مقام پر اترے تھے۔ وہ اپنے ساتھ تمام ضروری سامان لائے تھے۔ تلاش کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی ان کے دو افراد شدید زخمی ہوگئے تھے اور ایک کی موت واقع ہوگئی تھی اس کا سبب وہ سنگلاخ چٹانیں تھیں جن سے وہ پیراشوٹ کے ذریعے اترتے ہوئے رات کے اندھیرے میں ٹکرائے تھے مرنے والے شخص کو وہیں ایک گڑھے میں ڈال کر اس کے اوپر کچھ پتھر ڈال دیئے گئے تھے اور ایک محفوظ مقام پر اپنا سامان چھپانے کے بعد زخمیوں کی دیکھ بھال کی گئی تھی۔ ٹیم میں سے کچھ افراد کی ڈیوٹی لگادی گئی تھی کہ وہ خاموشی سے اطراف کا جائزہ لیں اور کسی قسم کی کوئی آواز پیدا نہ کی جائے۔

●……●……●

اسی رات عثمان بدری بھی بغداد میں موجود تھا لیکن اس کی منزل فائٹرز بیس تھا۔ جہاں اس کا بڑا بھائی عبدالکریم اسکواڈرن کمانڈر تھا' اور یہ 'فائٹرز بیس' 1980ء میں بیلجیئن کنسٹرکشن کمپنی نے تعمیر کیا تھا اور یہاں بھی ہر چیز زمین دوز ہی بنائی گئی تھی۔ بیرکس' ہینگرز' فیول اسٹورز' ورک شاپس' بریفنگ رومز' کریو کوارٹرز اور ایک بڑا ڈیزل جنریٹر اس فائٹرز بیس کو پاور فراہم کرنے کے لیے' زمین کے اوپر جو واحد چیز نظر آ رہی تھی وہ تین ہزار میل لمبے رن ویز تھے لیکن ان کے ساتھ بھی کسی قسم کی بلڈنگز یا ہینگرز نہیں بنے ہوئے تھے اور بغور دیکھنے پر صرف کنکریٹ کا بنا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں سے ایک دروازہ تھا جو سیدھا زمین دوز فائٹرز بیس میں جاتا تھا۔

کرنل عبدالکریم بدری کافی عرصے سے یہاں اسکواڈرن کمانڈر کی خدمات انجام دے رہا تھا' اس کا چھوٹا بھائی عثمان بدری جب اس سے ملنے آیا تو پہلے وہ گارڈ پوسٹ پر اطلاع دی جس پر ایک فون کال کے ذریعے عبدالکریم کو اطلاع دی گئی اور چند ہی لمحوں میں ایک جیپ عثمان بدری کو لینے آ گئی تھی جو اسے لے کر اس انڈر گراؤنڈ بیس میں گئی جہاں عثمان بدری جیپ سے اتر کر کانکریٹ کی بنی ہوئی لمبی راہداریوں سے گزرتا ہوا عبدالکریم تک پہنچا تھا۔ عبدالکریم اسے دیکھ کر اپنی سیٹ سے کھڑا ہوگیا تھا اور اسے گلے لگالیا تھا اس کی عمر 37 سال کے قریب تھی' رنگ سانولا اور جسم سڈول تھا اور وہ اپنی یونیفارم میں بہت اسمارٹ نظر آ رہا تھا' ایک بار ایئر فورس جنرل نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ملک کا سب سے بہترین فائٹر پائلٹ ہے۔

"اوہ میرے بھائی! تمہیں یہاں کیا چیز کھینچ لائی؟" عبدالکریم نے پوچھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"میں بہت مجبور ہو کر یہاں آیا ہوں۔" عثمان بدری نے کہا تو عبدالکریم اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟ کیسی مجبوری؟" اس نے پوچھا۔

"ہماری فیملی کو ختم کردیا گیا ہے۔" عثمان بدری نے کہا تو عبدالکریم کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

"میں تفصیل سننا چاہوں گا۔"

"وہ ہمارے گھر میں گھس گئے تھے......؟ انہوں نے والدہ کو بہت مارا اور زخمی کردیا اور والد کو اٹھا کر لے گئے پھر ان کو مار کر واپس گھر میں پھینک دیا گیا۔" عثمان بدری نے کہا۔

"تمہیں کیسے اطلاع ملی؟" عبدالکریم نے پوچھا۔

"مجھے ایک پڑوسی نے فون کر کے بتایا تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو بہت برے حالات تھے میں نہیں بتا سکتا کہ میں نے کس طرح انہیں دفنایا ہے۔"

"پھر......؟ پھر کیا ہوا؟" عبدالکریم نے پوچھا۔

"پھر جب میں قبرستان سے واپس آ رہا تھا تو مجھے ایک شخص ملا اور اس نے مجھ سے کچھ اہم باتیں پوچھیں۔"

"تم نے اسے سب بتادیا؟"

"ہاں! میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔" عثمان بدری نے کہا۔

"تم نے اس زمین دوز "قلعہ" کے بارے میں بھی بتادیا جو تم نے بنایا تھا؟"

"ہاں! میں نے ساری سچائی بتادی۔"

"اور تم نے یہ بھی بتادیا کہ وہ کہاں پر ہے؟ تاکہ وہ امریکیوں کو یہ بات بتادے؟" عبدالکریم نے پھر پوچھا۔

"ہاں! کیا میں نے غلط کیا؟" عثمان بدری نے پوچھا۔

"یہ بتاؤ کہ عراق میں اس کے بارے میں تم کتنے لوگ جانتے ہیں؟" عبدالکریم نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"چھ افراد جانتے ہیں۔"

"ان کے نام بتاؤ۔ وہ کون کون ہیں؟"

"ایک تو رئیس صدام' دوسرا اس کا داماد حسین کامل جس نے رقم اور لیبر مہیا کیے' امیر سعدی جس نے ٹیکنالوجی فراہم کی اور ردا جس نے آرٹلری فراہم کی جنرل موصل جس نے انجینئرز فراہم کیے اور اس نے ہی مجھے اس کام کے لیے منتخب کیا تھا اور میں......جس نے وہ قلعہ تعمیر کیا۔"

"اور وہ ہیلی کاپٹر پائلٹس جو لوگوں کو وہاں لاتے اور لے جاتے تھے؟" عبدالکریم نے پوچھا۔

"انہیں صرف سمتیں بتائی جاتی تھیں لیکن یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ زمین کے اندر کیا ہے اور وہ بھی وہیں کسی بیس میں رہتے تھے انہیں کہیں اور جانے کی اجازت نہیں تھی اور وہ بیس کہاں ہے یہ میں بھی نہیں جانتا تھا۔"

"آنے والے لوگ؟' ان میں سے کتنے اس بارے میں جانتے ہیں؟"

"کوئی بھی نہیں......ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوتی تھیں آنے اور جانے کے وقت۔"

"اگر امریکیوں نے یہ "قلعہ" تباہ کردیا تو تمہارے خیال میں AMAM کے لوگ کس پر شک کریں گے' رئیس' منسٹرز' جنرلز یا تم؟" عبدالکریم نے کہا۔ اور عثمان بدری نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اوہ' میں نے کیا کردیا؟" اس نے تاسف سے کہا۔

"میں بھی خوفزدہ ہوگیا ہوں چھوٹے بھائی کہ تم نے ہم سب کو تباہ کردیا۔" عبدالکریم نے کہا۔

دونوں ہی تمام اصول جانتے تھے انہیں پتہ تھا کہ اب ان کے تعاقب میں موت ہے۔ عثمان بدری نے رونا شروع کردیا۔ عبدالکریم نے اٹھ کر اسے پھر سینے سے لگالیا۔

"تم نے ٹھیک ہی کیا برادر......اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس مصیبت سے ہم کس طرح باہر نکلیں گے۔" عبدالکریم نے کہا۔

"ابھی رات کے آٹھ بجے ہیں۔" عبدالکریم نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہاں عام لوگوں کے استعمال کرنے کے لیے کوئی پبلک فون لائنز نہیں ہیں صرف انڈر گراؤنڈ لائنز ہیں جنہیں فوجی ہی استعمال کرسکتے ہیں۔" عبدالکریم نے کہا پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔

"تمہیں والد کے گھر تک جانے میں کتنی دیر لگے گی؟" اس نے عثمان بدری سے پوچھا۔

"کم از کم چار گھنٹے۔" عثمان بدری نے جواب دیا۔

"میں تمہیں آٹھ گھنٹے دیتا ہوں تم واپس جاؤ اور ماں سے کہنا کہ تمام قیمتی سامان جمع کر کے گاڑی میں رکھیں وہ گاڑی چلا سکتی ہیں' اور اپنے آبائی قبیلے میں چلی جائیں اور وہاں پناہ لیں جب تک کہ ہم دونوں میں سے کوئی ان سے رابطہ نہ کرے......سمجھ گئے؟" عبدالکریم نے کہا۔

"ہاں......میں صبح سے سورج نکلنے سے پہلے واپس آجاؤں گا۔" عثمان بدری نے جواب دیا۔

"کل صبح ہونے سے پہلے میں ایران جانے والی ایک فلائٹ کو لیڈ کر رہا ہوں دوسرے لوگ پہلے ہی جاچکے ہیں یہ بھی ایک اسکیم رئیس کی بنائی ہوئی ہے اس طرح وہ اپنے اچھے فائٹرز جہازوں کو محفوظ کرنا چاہتا ہے......لیکن اس طرح سے ہماری جانیں بچ سکتی ہیں۔ تم میرے ساتھ ہی جاؤ گے۔"

"میرا خیال ہے کہ Migza تو سنگل سیٹر ہوتا ہے؟"

"ہاں لیکن میرے پاس جو ہے وہ ٹو سیٹرز ہے تم ایک ایئر فورس آفیسر جیسا لباس پہنو گے اور اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجائیں گے اب جاؤ۔" عبدالکریم نے یہ کہہ کر اسے رخصت کردیا تھا۔

پھر عثمان بدری دیئے گئے وقت تک تمام کام نمٹا کر واپس آ گیا تھا اور علی الصبح ہی عبدالکریم اور تین مزید فائٹر جہازوں کے ساتھ بغداد سے ایران کی طرف پرواز کر گیا تھا باقی جہازوں میں عبدالکریم کے ٹرینر پائلٹ موجود تھے اور وہ بھی ان جہازوں کو باحفاظت ایران پہنچانے کے پلان کا حصہ تھے۔

انہیں پرواز کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ انہیں دو امریکی فائٹرز نے گھیر لیا اور ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن عبدالکریم بدری نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا تھا ان کے

سامنے دو ہی راستے تھے یا تو خود کو ان کے حوالے کر کے قیدی بن جائیں اور یا فرار ہو کر ایران پہنچ جائیں انہوں نے دوسرا راستہ منتخب کیا تھا اور اپنے جہازوں کی رفتار بڑھادی تھی لیکن پھر موت نے انہیں مہلت نہیں دی تھی امریکی جہازوں نے فائرنگ شروع کر دی تھی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں......؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟" عثمان بدری نے خوف سے کہا جبکہ عبدالکریم بہت پر سکون تھا۔

"سکون سے...... میرے بھائی! ہم اپنے والد سے ملنے جا رہے ہیں اللہ اکبر۔" عبدالکریم نے نعرہ لگایا اور سامنے آتے ہوئے امریکی جہاز سے بچنے کے لیے جہاز کو ایک غوطہ دیا اس کے ساتھ ہی دو راکٹ اس کے جہاز سے ٹکرائے تھے اور جہاز شعلوں کی لپیٹ میں آ کر زمین کی طرف گرتا چلا گیا تھا۔

●......●......●

مائیک مارٹن اپنی ٹیم کے ساتھ "الحرمین" کے پہاڑی سلسلے میں کمپیوٹر پر ملنے والی تصویروں کی مدد سے بنائے گئے نقشے کی مدد سے راستہ طے کر رہا تھا اچانک انہیں کچھ فاصلے سے آتی ہوئی کچھ انسانی آوازیں سنائی دیں اور وہ چند جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ گئے۔

"یہ عراقی گارڈز ہو سکتے ہیں۔" لومیکس نے کہا۔ "یہ عربی بول رہے ہیں اور میرا تو خیال ہے کہ یہاں جو گاؤں ہیں وہ بھی گارڈز سے خالی نہیں۔"

"ہوں...... ہو سکتا ہے۔" مارٹن نے جواب دیا۔

"ان گارڈز کی موجودگی میں ہم آگے نہیں بڑھ سکتے یا تو ہمیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا یا ان گارڈز کا صفایا کرنا ہوگا۔' لومیکس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" مارٹن نے سرگوشی کی اور اپنے دو ساتھیوں کو اشارہ کیا جو رات کی تاریکی میں خاموشی سے آوازوں کی سمت کھسک گئے تھے پھر چند ہی لمحوں میں وہ واپس آ گئے تھے ان کے ہاتھوں میں ان کے خنجر تھے۔

"وہ تعداد میں تین تھے۔" ایک گارڈ نے کہا۔

"ان کی لاشوں کو چھپاؤ۔" مارٹن نے حکم دیا اور جلد ہی چند گارڈ فوجیوں نے ان لاشوں کو گڑھے میں ڈال کر جھاڑیوں اور پتھروں سے ڈھک دیا تھا' مارٹن نے پر نقشہ اپنے سامنے پھیلا لیا تھا۔ وہ صبح ہونے سے پہلے اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا کیونکہ دن کی روشنی میں عراقی گارڈز انہیں بخوبی دیکھ سکتے تھے۔

ایک گھنٹے تک چلنے کے بعد وہ اس مقام تک پہنچ گئے تھے جو ان کے خیال میں "قلعہ" ہو سکتا تھا اگر وہ قلعہ ہی تھا تو اسے بہت مہارت سے چھپایا گیا تھا کیونکہ وہ نیچے سے اوپر تک ایک بلند پہاڑی دکھائی دیتا تھا مارٹن اور اس کے چند ساتھیوں نے اس پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا تھا اور یہ چڑھائی آسان نہیں تھی۔

وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک پہاڑی پر چڑھتے رہے تھے کہ اچانک مارٹن کو پہاڑی میں ایک بڑی قدرتی دراڑ نظر آئی جو چار فٹ گہری اور دو فٹ چوڑی تھی جس کے اطراف میں جھاڑیاں لگی تھیں۔ مارٹن اس میں جھک کر جائزہ لینے لگا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا جدید کیمرہ نکال کر اس دراڑ کے اندر کیا تھا اور کیمرے کی آنکھ نے اسے وہاں موجود خوراک کا ذخیرہ دکھایا تھا جو تھیلیوں میں پیک تھا اور ایک ترتیب سے رکھا گیا تھا۔

پھر سورج طلوع ہونے سے پہلے مارٹن نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ڈیوائسز وہاں نصب کر دی تھیں اور ٹرانسمیٹر پر اپنے ہیڈ کوارٹر اطلاع دی تھی کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے ہیں اور فوراً ہی فیصلہ کیا گیا تھا کہ چار جہازوں کی مدد سے عراقی ایئر بیس پر حملہ کیا جائے گا جو بغداد کے شمال میں ہے اور اسے مشرقی تکریت کہا جاتا ہے اور جو صدام کی جائے پیدائش کی جگہ سے زیادہ دور نہیں ہے اس حملے کی سربراہی ڈون واکر کو کرنا تھی جو ماہر ایئر فائٹر تھا۔

صبح ہونے پر سورج کی روشنی میں مارٹن نے خود کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اس عجوبہ شاہکار کا جائزہ لیا تھا جو دنیا میں اپنی قسم کی واحد تخلیق تھی وہ ایک نظر میں پہاڑی ہی نظر آتی تھی ہر طرف گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں لیکن قلعے میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

پھر اس نے اندازہ لگایا تھا کہ دنیا کی عظیم عجوبہ گن جسے babylon کا نام دیا گیا تھا وہ ان تینوں پہاڑیوں کے درمیان بڑی مہارت سے نصب کی گئی تھی وہ گن نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اس تک جانے والی کنکریٹ کی بنی ہوئی سیڑھیاں جنہیں مٹی سے چھپا دیا گیا تھا اور اس تک جانے والے اسٹیل کے تار جنہیں جھاڑیوں اور گھاس سے چھپایا گیا تھا اس کے علاوہ پہاڑی پر جھاڑیاں ایک ترتیب سے لگی ہوئی تھیں جن میں ایک ترتیب سے گھاس چوکور چوکور ٹکڑوں میں لگی تھی اس نے مارٹن کے شک کو اور مضبوط کر دیا قدرت ترتیب سے جھاڑیاں اور گھاس نہیں اگاتی' یہ انسانی ہاتھوں ہی کا کمال تھا۔

پھر رات کی تاریکی میں جب امریکی جہازوں نے ڈون واکر کی سربراہی میں اس خفیہ قلعے اور Bablyon پر حملہ کیا تھا تو پوری وادی سرخ روشنی میں نہا گئی تھی اور جگہ جگہ اگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس کے چوکور ٹکڑوں کے منہ کھلے تھے اور ان میں سے گنیں جھانکنے لگی تھیں جو ہوائی جہازوں کے حملوں کا جواب دے رہی تھیں لیکن ایسا زیادہ دیر نہیں ہوا تھا جہازوں سے گرائے جانے والے راکٹوں نے Bablyon کو نشانہ بنا لیا تھا اور وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ جلتی ہوئی زمین پر آ رہی تھی اور صدام کے خوابوں کا قلعہ تباہ ہو گیا تھا۔

پھر وہاں بہت دیر تک گھمسان کی جنگ ہوئی تھی نیچے تین گاؤں میں موجود عراقی سیکیورٹی فوجیں بھرپور طریقے سے دشمن کی کارروائی کا جواب دے رہی تھیں۔ فضا سے مسلسل قلعے کے مختلف حصوں پر راکٹوں سے وار کیے جا رہے تھے اور وہاں موجود فوجیوں کو وہاں سے باہر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مارٹن اپنے جہازوں کو اپنی اور اپنے ساتھیوں کی موجودگی کے بارے میں بتا چکا تھا چنانچہ خاص اس حصے میں جہاں مارٹن موجود تھا کوئی فائر نہیں کیا جا رہا تھا' اور مارٹن اپنے ساتھیوں کے ساتھ بہت خاموشی اور آہستگی سے ڈھلوان حصوں سے کھسکتا ہوا پہاڑی سے نیچے آ گیا تھا' پھر انہوں نے اس علاقے میں اپنے چھپے ہوئے سامان کی بھی پروا نہیں کی تھی اور کوئی چیز اپنے ساتھ واپس نہیں لے گئے تھے وہ سب تیزی سے اس علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے اب وہ تقریباً بھاگ رہے تھے اور ان کا رخ اس واحد سڑک کی طرف تھا جہاں ان پہاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ وہ سب سادہ اور مقامی لباس میں تھے انہوں نے وہی لباس پہنا ہوا تھا جو یہاں کے گاؤں میں رہنے والے لوگوں نے پہنا ہوا تھا۔ مارٹن اپنی ٹیم کے آگے آگے تھا اور عربی میں چیختا جا رہا تھا۔

"خدایا رحم...... خدایا رحم......" یوں چیخنے کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ اگر انہیں اس طرح بھاگتے ہوئے کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ وہ یہاں کے مقامی لوگ ہیں اور حملہ ہونے پر اپنی جانیں بچا کر بھاگ رہے ہیں۔

تقریباً دو گھنٹے تک بھاگنے کے بعد وہ سڑک تک پہنچے تھے اور وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں اور ٹرکوں میں لفٹ لے کر بغداد کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ بغداد پہنچ کر انہوں نے ایک عجیب منظر دیکھا تھا وہاں ہر طرف امریکی فوجی نظر آ رہے تھے جن کے ہاتھوں میں گنیں تھیں اور وہ مختلف مقامات پر تعینات تھے جبکہ مقامی لوگوں کے گروہ کے گروہ بغداد کی گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے تھے وہ صدام کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور دکانوں کو لوٹ رہے تھے عجب سماں تھا لوگ سرکاری عمارتوں سے فرنیچر' تصاویر' ٹی وی اور جو بھی قیمتی چیز ان کے ہاتھ لگی تھی وہ لوٹ کر بھاگ رہے تھے' انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ لوگوں کے کچھ گروہ جگہ جگہ لگے ہوئے صدام کے مجسموں کو توڑ کر زمین بوس کر رہے تھے اور صدام کے محلات میں اب غیر ملکی فوجی موجود تھے جو وہاں کے قیمتی سامان سے فیض اٹھا رہے تھے۔ وہاں کے ٹھنڈے اور شفاف پانیوں میں نہا کر اپنے اوپر جم جانے والی صحرا کی ریت صاف کر رہے تھے اور محلات کے بڑے بڑے ہال کمروں میں ان کے دفاتر قائم ہو چکے تھے۔

امریکا اپنے اتحادی ممالک کی مدد سے یہ جنگ جیت گیا تھا لیکن صدام کے خاندان کے لیے ابھی جنگ جاری تھی صدام روپوش ہو گیا تھا اور اس کی تلاش جاری تھی پھر اسی تلاش کے سلسلے میں فوجیوں نے صدام کے آبائی گاؤں تکریف کا رخ کیا تھا اور موصل میں واقع اس کے ایک محل "الفلاح" پر حملہ کیا تھا وہاں اس کے بیٹے 'کوسے' اور "اودے" موجود تھے اس وقت وہاں چار افراد موجود تھے اور وہ معمولی اسلحہ سے ان فوجیوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اس فوجی گروہ سے تقریباً چار گھنٹے مقابلہ کیا تھا اس لڑائی میں صدام کے دونوں بیٹوں کے علاوہ اس کا تیسرا بیٹا اور کوسے کا بیٹا مصطفیٰ شامل تھا جو صرف 14 سال کا تھا وہ بھی اپنا دفاع کرنے میں اپنے والد اور چچاؤں کے ساتھ پیش پیش تھا اور ان کے ختم ہو جانے کے بعد بھی چار گھنٹے تک اکیلا فوج کا مقابلہ کرتا رہا تھا یہاں تک کہ وہ بھی ان کی گولیوں کا شکار ہو گیا تھا۔

صدام حسین کی تلاش آٹھ ماہ تک جاری رہی تھی لیکن اس کا کوئی سراغ نہ ملا تھا پھر 13 دسمبر 2003ء کو امریکی فوجوں کے operation Red down کے نتیجے میں صدام کو گرفتار کیا گیا تھا جو اپنے گاؤں سے قریبی علاقے کی انہی پہاڑیوں کے دامن میں واقع ایک گاؤں سے ملا تھا جہاں خفیہ محل تعمیر کیا گیا تھا۔ اس گاؤں میں جو کچے مکانات بنے ہوئے تھے وہ دو کمروں پر مشتمل تھے۔ ان کی چھتیں تختوں اور گھاس

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY www.pdfbooksfree.pk

تبت
مسحور کن خوشبو کا دیرپا احساس
رہے دن بھر آپ کے ساتھ!
TIBET TALCUM POWDER
تبت ٹالکم پاؤڈر صبح سے شام تک مہکائے
TTP/19/2K15

پہلوں سے [illegible] ایک [illegible] فاصلے پر موجود تھیں ان کے درمیان [illegible] جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔

13 دسمبر 2003ء کو امریکی فوج کے [illegible] الدوار [illegible] 1948ء میں بنی ہوئی فلم Red dawn کے نام سے موسوم کیا گیا تھا [illegible] اسے فوج میں بٹھایا گیا تھا اس نے ان لوگوں کی نشاندہی اس علاقے تک کی تھی جس علاقے میں صدام موجود تھا اس کے کہنے کے مطابق وہ ایک کچے مکان میں موجود تھا جہاں کچھ عرصے سے ایک دو مقامی افراد آتے جاتے تھے اس مکان کے گرد بھی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ امریکی ٹرک بہت خاموشی سے اس مکان کی اطراف میں پہنچ کر رک گئے تھے۔ پھر اس مخبر تکریتی کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ ٹرک سے اتارا تھا اور اسے لے کر مکان میں داخل ہو گئے تھے اندر دو مقامی لوگ موجود تھے جن میں سے ایک بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ وہ دونوں انہیں دیکھ کر گھبرا رہے تھے اور بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن فوجیوں نے انہیں پکڑ لیا تھا۔

"صدام کہاں ہے؟ بتاؤ صدام کہاں ہے؟" بار بار ان سے پوچھا جا رہا تھا۔

"ہم نہیں جانتے۔" وہ یہی جواب دے رہے تھے۔

فوجیوں نے اس جگہ موجود دونوں کمروں کا جائزہ [illegible] کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آئی تھی جس سے [illegible] صدام موجود ہے کافی دیر پوچھ گچھ کرنے [illegible] وہ دونوں مقامی لوگ اپنی [illegible] جھوٹ بولتے رہے کبھی [illegible] اشارہ کرتے کہ صدام [illegible] فوجی انہیں بری [illegible] صدام کا پتہ [illegible] ساتھ [illegible]

[illegible] صدام کو [illegible] گیا تھا۔

[illegible] سلمان [illegible] عبداللہ [illegible] عراق [illegible] تحقیقات [illegible] کی حالت میں ایک Spider hole سے گرفتار ہوا [illegible]

2003ء میں صدام کی حکومت ختم ہونے کے بعد عراق میں اتحادی [illegible] 2004ء میں ایک عبوری حکومت قائم کی گئی جس نے 2005ء میں انتخابات کروائے اس کے نتیجے میں عراقی گورنمنٹ بنی اور آج تیرہ سال گزرنے کے باوجود بھی عراق میں انتشار کی کیفیت پائی جاتی ہے جو دنیا میں ہتھیاروں کی بے جا [illegible] کا نتیجہ ہے۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ کیسے بنا
قرشی جامِ شیریں
پاکستان کا نمبر 1 فیورٹ ؟
یہ کوئی راز نہیں، بات ہے معیار کی۔
جامِ شیریں گلاب اور صندل کے 100 فیصد
خالص عرقیات سے تیار کیا جاتا ہے اور اس میں
پانی کا ایک قطرہ بھی شامل نہیں۔
قرشی انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، سارک،
مشرقِ وسطیٰ اور دولتِ مشترکہ کی خود مختار ریاستوں میں
سب سے زیادہ قومی و بین الاقوامی اسناد و اعزازات کا
حامل ادارہ ہے، جبکہ جامِ شیریں کے 265 اور
جامِ شیریں شوگر فری کے 276 کوالٹی ٹیسٹس اور چیکس
بھی اس کے اعلیٰ معیار کا ثبوت ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ قرشی جامِ شیریں بنا پاکستان کا نمبر 1 فیورٹ۔

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY